فہرست مضامین

دفتر رسالہ زندگی رامپور

چندہ سالانہ (صہ) فی کاپی (۸ر)

سید حامد علی پرنٹر و پبلشر نے ناظم پریس رامپور سے چھپوا کر دفتر زندگی، رامپور سے شائع کیا

مولانا ابواللیث صاحب ندوی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آئندہ عمومی انتخاب کی اہمیت کے پیش نظر نہ ہم اس سے الگ تھلگ رہ سکتے ہیں نہ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی کوئی الگ تنظیم قائم کر سکتے ہیں اور نہ موجودہ سیاسی پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کا ساتھ دے سکتے ہیں تو آخر ہمیں کرنا کیا چاہیے اور وہ بحالات موجودہ ہمارے لیے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

آج کی صحبت میں میں اسی سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں پھر ایک بار یہ یاد دہانی کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں میں جو کچھ عرض کروں گا اس کے مخاطب وہ لوگ نہیں ہیں جو اپنی بزدلی یا کسی مصلحت کی بنا پر یہ جرأت تو نہیں رکھتے کہ علانیہ اپنا رشتہ اسلام یا مسلمانوں سے منقطع کر لیں، لیکن درحقیقت وہ اپنی راہ ان سے الگ ہو کر اختیار کر چکے ہیں یا آئندہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور جن کے نزدیک قابل لحاظ چیز بس ذاتی غرض و مفاد ہے یا زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا دنیاوی مفاد، اس سے زیادہ ان کو نہ کسی چیز کی فکر ہے اور نہ پروا بلکہ ہمارے مخاطب وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور اسلام کے مفاد کے مقابلہ میں نہ کسی ذاتی مفاد کو ترجیح دینے کے لیے تیار ہیں اور نہ کسی قومی مفاد کو، یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس وقت کسی غلط راستے پر چل رہے ہوں، اور نادانستہ طور سے اسلام یا ملت کے دینی مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہوں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں ہمیں یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ہمارے خیالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں، لیکن پہلی قسم کے لوگوں سے تو ہمیں یہ توقع بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم اس سوال کے جواب میں جو کچھ عرض کریں گے اس کی پہلی ضرب ہی ان کے ذاتی اور دنیاوی مفاد پر پڑے گی اس لیے وہ پہلے ہی قدم پر ہم سے دور ہو جانے کے لیے مجبور ہیں۔

ہمارے نزدیک اس وقت مسلمانوں کے کرنے کا جو صحیح کام ہو سکتا ہے اس کی ابتداء اس منفی پہلو سے ہوتی ہے کہ

آئندہ انتخاب سے مسلمان کلیتہً الگ ۔ ا۔ نہ اس میں خود اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوں اور نہ کسی اُمیدوار کے لیے اپنا ووٹ استعمال کریں۔ یہ صحیح سمت پر چلنے کے لیے پہلا قدم ہے بشرطیکہ یہ شعور و ارادہ کے ساتھ اور صحیح محرکات دین کے تحت اُٹھایا جائے۔ یہ طریقہ ہمیں کیوں اختیار کرنا چاہیے اور اس سے کیا فائدہ یا نقصان پہونچ سکتا ہے، اس پر ہم آیندہ تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے، لیکن اس سے پہلے میں یہاں ایک شبہہ کا ازالہ کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت الیکشن سے جس علیحدگی کا مشورہ دیا جارہا ہے وہ علیحدگی اس طرح کی نہیں ہے جس میں اس وقت مسلمانوں کی اکثریت پہلے ہی سے خود بخود مبتلا ہے اور جس کی ہم اس سے پہلے مذمت بھی کرچکے ہیں، یہ دونوں علیحدگیاں بظاہر ایک سی معلوم ہوتی ہیں، لیکن درحقیقت دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پہلی علیحدگی کسی فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ مسلمانوں کی غفلت یا دل شکستگی کا نتیجہ ہے۔ مسلمان دل سے انتخابات سے علیحدہ نہیں رہنا چاہتے، لیکن حالات نے ان کو مجبوراً اس سے علیحدہ ڈال دیا ہے، اس لیے اگر حالات میں آیندہ تبدیلی واقع ہوجائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ کس ذوق شوق کے ساتھ اس میں حصہ لیتے ہیں اور اس کے برعکس ہم جس علیحدگی کا مشورہ دے رہے ہیں اس کا محرک غفلت نہیں بلکہ فکر ہے اور یہ بے اختیاری علیحدگی نہیں ہے بلکہ اختیاری علیحدگی ہے اور یہ علیحدگی ہر حیثیت سے بے تعلقی کے مترادف بھی نہیں ہے بلکہ یہ بھی اک سے تعلق ہی کی ایک قسم ہے کیوں کہ بے تعلقی اور تعلق اگرچہ ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن بہت سے حالات میں یہ تعلق ہی کے ہم معنیٰ ہوتی ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو یہ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

آئندہ انتخاب میں مسلمانوں کو بطور اُمیدوار کیوں کھڑا نہیں ہونا چاہیے؟ اس سوال کا جواب ہماری پچھلی معروضات کی روشنی میں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے لیکن وہ باتیں ایک دوسرے بحث کے دوران میں ضمناً پیش ہوئی تھیں اور ان سے اس متعین سوال کا جواب اخذ کرنے میں آپ کو دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت ہوگی اور ممکن ہے وہ باتیں اس وقت ذہن میں محفوظ بھی نہ رہ گئی ہوں، اس لیے آپ کی سہولت کی خاطر یہاں اس سوال کا جواب متعین طور سے علیحدہ مختصراً پیش کیا جارہا ہے، اس میں کچھ باتیں تو وہی ہیں جو اس سے پہلے گذر چکی ہیں اور کچھ باتیں مزید پیش کی جارہی ہیں تاکہ اس بحث کے متعلق ہمارا پورا نقطہ نظر آپ پر واضح ہوجائے۔

ہمارا خیال اس سوال کے ضمن میں یہ ہے کہ الیکشن میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے نہ دنیاوی حیثیت سے مفید ہوسکتا ہے اور نہ دینی پہلو ہی سے اس کی کوئی گنجائش ہے اور اس کے وجوہ مختصراً حسب ذیل ہیں۔

اس وقت مسلمانوں پر بدقسمتی سے دنیاوی نفع و نقصان کا پہلو زیادہ چھایا ہوا ہے، حتیٰ کہ جن لوگوں کی بحث و گفتگو

اشارات

مذہب سے شروع ہو کر مذہب ہی پر ختم ہو جانا چاہیے، وہ بھی جب اس پر کچھ گفتگو کرتے ہیں تو شروع سے آخر تک ان پر بھی یہی نقطۂ نظر
ایسا معلوم ہوتا ہے اور وہ بھولے سے بھی مذہب کا نام درمیان میں نہیں آنے دینا چاہتے اس لیے سب سے پہلے دُنیاوی پہلو سے غور کیجیے کہ الیکشن میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے کہاں تک مفید ہو سکتا ہے۔

(۱) ہندوستان میں جو قومی کش مکش ایک عرصہ سے قائم ہے وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے نہ صرف دُنیاوی حیثیت سے سخت تباہ کن ہے بلکہ وہ اسلام کے لیے بھی سخت خطرہ ثابت ہو رہی ہے، اس سے کم از کم اس کے فروغ کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں اور مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا اگر وہ کسی قومی مفاد کے تحت ہو گا تو وہ اس کش مکش میں مزید اضافہ کا باعث ہو گا اس لیے ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ خود ارادی طور پر اس الیکشن سے علاحدہ ہو جائیں، الیکشن میں ان کا حصہ لینا ان کے لیے نقصان اور تباہی کا باعث ہو گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اوپر جو بات قومی کش مکش کے ضمن میں لکھی گئی ہے اس سے ہر شخص ذاتی طور سے واقف ہو گا اس لیے اس کے متعلق کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ میں یہاں جمعیۃ العلماء کے دو بزرگوں کے کچھ اقوال اس غرض سے نقل کر دیتا ہوں کہ اس سے آپ کو یہ اندازہ کرنے کا موقع ملے گا کہ جو لوگ مسلمانوں کو موجودہ باطل سیاسیات میں زبردستی داخل کرنے کے حقیقی ذمہ دار ہیں اب ان کی فکر کا بھی اندازہ کیا ہوتا جا رہا ہے۔

مولانا نور الدین صاحب بہاری ناظم جمعیۃ العلماء اپنے ایک مضمون "ہندوستان کے مسلمان کیا کریں" میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ درست ہے کہ ان بزرگوں (گاندھی جی اور کانگریس ہائی کمانڈ کے "چند برگزیدہ وسیع الدماغ بزرگ") نے نیک نیتی سے اس ملک کو جمہوریت سکولر قرار دیا، مگر اس سے زیادہ یقینی یہ ہے کہ ملک کے باشندوں کا دماغ نہ سکولر ہے نہ جمہوری اور شاید اس ذہنیت کے پیدا ہونے میں عرصہ لگے۔ اگر اس مسئلہ کو اس طرح الجھاؤ میں رکھا گیا تو میرا یقین ہے کہ الیکشن کے زمانہ میں مسلمانوں کی تباہی اتنی بھیانک ہو گی جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی حکومت اپنے لا اینڈ آرڈر کو اس وقت بر سر کار لا سکتی ہے جبکہ اس کے نیچے کا عملہ حکومت کی پالیسی سے دیانت دارانہ تعاون کرے، مگر ہمیں اس کا اقرار کرنا چاہیے کہ آج نیچے کے عملہ کی اکثریت حکومت کی پالیسی کی وفادار نہیں اور خصوصاً اس مسئلہ میں .... پس اس تباہ کن پوزیشن میں نہایت سنجیدگی سے ہندوستان کے مسلمانوں کو غور کرنا ہے کہ آیا اس حق کو جو ملک کی برسر اقتدار پارٹی نے مسلمانوں کو دیا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے یا موجودہ ماحول اور ذہنیت کے پیش نظر اس وقت تک کے لیے جب تک ملک کی اکثریت کی ذہنیت جمہوری اور سکولر کے سانچے میں نہ ڈھل جائے اس وقت تک اس حق سے دستبردار ہو جایا جائے .... میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ تمام ملک کے مسلمانوں کو قطعاً اس حق سے دستبردار ہو جانا چاہیے اور آئندہ الیکشن میں کوئی حصہ نہ لینا چاہیے۔
لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا مقصد زندگی سیٹ اور عہدوں کا حصول ہے شاید وہ اس رائے سے متفق نہ ہوں گے، موجودہ فضا میں اس کی کامیابی کی کوئی راہ نظر نہیں آتی، پھر بھی وہ دستبردارانہ ہوں گے اس لیے میں تمام مسلم عوام سے ...

میں درخواست کروں گا کہ وہ اعلان کر دیں کہ جب تک ملک کی ذہنیت جمہوری گوارا نہ بنے گی ہم اس حق کو جو مسلمانوں کو دیا گیا ہے استعمال نہ کریں گے میرے نزدیک موجودہ فضا میں اس سے بہتر تباہی سے بچنے کی کوئی اور راہ نہیں ہے" (تیج ۹ راپریل ۵۰ء)

مولانا حامد الانصاری صاحب غازی نے جمعیۃ العلماء جون پور کے اجلاس میں خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا ہے:-

ہندو رہنما ۲۰ کروڑ ہندؤں کی نئی تخلیق کا کام اپنے وید اور دھرم شاستروں کے مطابق کرنا چاہتے ہیں پھر نئی قوم کو نئی مہم کے لیے ایک نئے نشانہ کی ضرورت ہوتی ہے ان لوگوں کے فیصلہ کے مطابق یہ نیا نشانہ ہندویین کے ۴ کروڑ مسلمان ہیں اور اس نشانہ پر ہندو قوم کو جمع کرنا ان کا نصب العین ہے۔

دگو رکھشا، جبریہ ہندی، کلیدی ملازمتوں سے مسلمانوں کی علیحدگی وغیرہ نمونوں کو بطور مثال پیش کرنے کے بعد یہ تمام باتیں صرف اس لیے آناً فاناً کی گئیں کہ تاکہ مسلمان نشانہ بن سکیں اور تمام ہندوؤں کو اس نشانہ پر جمع ہونے کا موقع مل سکے ......

سوال یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی عقل کا فیصلہ کیا ہونا چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہمارے دماغ کا فیصلہ یہی ہو سکتا ہے اور یہی ہونا چاہیے کہ ہم نشانہ سے ہٹ جائیں اور نشانہ کو خطا ہونے کا موقعہ دیں اور اس کا بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم کم سے کم عبوری دور کے لیے سیاست سے مکمل دستبرداری کی دستاویز پر دستخط کر دیں اور اپنی تعمیر و ترقی کے کام میں اس طرح گم ہو جائیں کہ اگر کوئی ہم کو اپنا سیاسی نشانہ بنانے کے لیے تلاش بھی کرنا چاہے تو ہم اُسے دستیاب نہ ہو سکیں" (مدینہ ۹ رمارچ ۵۰ء)

(۲) الیکشن میں حصہ لینے کی تین شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن یہ تینوں شکلیں مسلمانوں کے لیے غیر مفید بلکہ مضر ہیں۔

ایک شکل یہ ہے کہ مسلمان اپنی جداگانہ تنظیم قائم کریں اور اس الیکشن میں حصہ لینے کے لیے اپنے الگ نمائندے کھڑے کریں، لیکن اول تو اس وقت مسلمان جس انتشار اور ذہنی پراگندگی کے شکار ہیں اس میں خود ان ہی کا کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا دشوار ہے، بالخصوص ایسی حالت میں کہ ہندوستان کی موجودہ ذہنی حالت اس طرح کی کسی تنظیم یا اتحاد کی راہ میں ایک سنگ گراں کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسرے اگر یہ کسی درجہ میں ممکن بھی ہو تو اس سے الیکشن جیتنے کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا ہے، کیوں کہ ہندوستان کا آئندہ انتخاب جداگانہ طرز کی بجائے مخلوط بنیاد پر ہوگا، اس لیے مسلمان تنہا اپنے بل بوتے پر اسے جیت نہیں سکیں گے، ہندوستان کے کسی حلقہ میں بھی مسلمانوں کی اتنی اکثریت نہیں ہے کہ مسلمانوں کا مجموعی ووٹ کسی مسلمان اُمیدوار کو کامیاب بنا سکے، اس کے لیے بہر حال غیر مسلم ووٹروں کی حمایت کی ضرورت ہوگی اور یہ حمایت اگر کسی مسلم امیدوار کو حاصل بھی ہو سکے گی تو وہ یقیناً کوئی ایسا اُمیدوار نہیں ہوگا جس کی تائید مسلمانوں کی کوئی جماعت کر رہی ہو، یہ چیز عام غیر مسلموں کے نزدیک اس امیدوار کی نالائقی کی سب سے بڑی دلیل ہو گی۔ ان کا ووٹ صرف ایسے مسلم اُمیدواروں کو مل سکے گا جو ان کے معتمد علیہ ان کی کسی پارٹی کی طرف سے کھڑے ہوئے ہوں اور ایسے اُمیدواروں کو مل ہی جائیں گے ہم میں ایسے لوگوں کی کمی تو ہے نہیں جو آسانی سے اس شرط کو پورا کر دیں، اور اگر نہ بھی ہوں گے تو وقت پر پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ فہرست ایجاد کی ماں ہے جب تک مسلمانوں کے چند نام ممبران کی فہرست میں شامل نہیں ہوں گے ہندوستان کے سیکولرزم

کا سب باقی رہ جائے گا، اس لیے ہر قیمت پر ایسے اُمیدوار مہیا کیے جائیں گے۔

دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان الیکشن کے لیے اپنی جداگانہ تنظیم قائم کیے بغیر متفرق طور سے کسی ایک یا متعدد پارٹیوں کے ٹکٹ پر انتخاب کی طرف سے اُمیدوار کھڑے ہوں، لیکن اس ضمن میں یہ بات پیش نظر رہے کہ جہاں تک متحدہ طور سے شرکت کا سوال ہے ہم نے اس کا ذکر محض برسبیل فرض کر دیا ہے ورنہ مسلمانوں کی موجودہ پراگندگی کی حالت میں یہ بات کسی حال میں عملاً ممکن نہیں ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، اور ایک دوسری دشواری یہ بھی ہے کہ اگر مسلمان کسی طرح اپنا یہ نقص دور بھی کر لیں تو ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی بھی ایسی نہیں ہے جو ان کو ان کے مسلمان ہونے کی حیثیت میں قبول کر سکے۔ یہاں کی ہر پارٹی خواہ زبانی طور سے اس کا دعویٰ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس نقطہ نظر پر متفق ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر کوئی معاملہ نہ کیا جائے، کیوں کہ یہ چیز ایک قومی تصور کے خلاف ہے اور دوسرے آخر یہ پارٹیاں اپنے سامنے کچھ نہ کچھ اصول و مقصد بھی تو رکھتی ہیں اس لیے وہ اصولاً اس کے لیے کس طرح تیار ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنا دروازہ مسلمانوں کے لیے محض ان کے مسلمان ہونے ہی کی بنا پر کھول دیں۔ یہ بے اصولی ممکن ہے وہ خاص خاص حالات میں دوسروں کے ساتھ گوارا کر لیں جیسا کہ سننے میں آ رہا ہے کہ بعض مشہور اصولی جماعتیں الیکشن جیتنے کی خاطر ایسی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد کرنے پر آمادہ ہیں، جن کے درمیان باہم کسی تیسری پارٹی کی مشترکہ دشمنی اور مخالفت کے سوا اور کوئی رشتۂ اتحاد نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے مسلمانوں کے ساتھ وہ یہ بے اصولی گوارا نہیں کر سکتیں، کیوں کہ یہ بے اصولی ہونے کے علاوہ خود الیکشن میں ان کے لیے سخت نقصان دہ بات ہوگی۔ مسلمانوں کی حیثیت اس وقت ملک میں یہ ہے کہ یہ جس پارٹی میں شریک ہوں گے اُس کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے خواہ وہ اپنی جگہ اس وقت کتنی ہی بڑی اور مقبول پارٹی کیوں نہ ہو ملک میں ان کی غیر مقبولیت اتنی ہی بڑھ گئی ہے اس لیے کوئی نہایت ہی احمق پارٹی ہوگی جو اس موقع پر اس طرح کی حماقت کی مرتکب ہو سکے۔

بہرحال متفقہ طور پر کسی پارٹی میں مسلمانوں کی شرکت دونوں طرح سے دشوار ہے۔ خود اپنی حالت کی بنا پر بھی اور ان پارٹیوں کے حالات کی بنا پر بھی اس لیے الیکشن میں حصہ لینے کی اس دوسری شکل میں حصہ لینے کی عملی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ وہ الگ الگ ٹولیوں میں مختلف پارٹیوں میں شریک ہوں، اب آئیے دیکھیے اس سے آپ کو فائدہ کیا پہونچ سکتا ہے۔

یہ بات ناممکن نہیں ہے کہ مسلمان ملک کی مختلف پارٹیوں میں شریک ہو سکیں۔ ہندوستان کی تمام جماعتیں یہاں تک کہ مہاسبھا بھی مسلمانوں کو ٹکٹ دینے کے لیے تیار ہیں اور یہی نہیں وہ [illegible] دوں اور وزارتوں وغیرہ کی شکل میں اس کی کچھ نہ کچھ قیمت بھی دینے پر [illegible] آمادہ ہو سکتی ہیں لیکن یہ یاد رکھیے اس کی قیمت آپ کو اس سے زیادہ دینی پڑے گی، جتنی وہ آپ کو دیں گی، وہ چند عہدوں اور وزارتوں کے عوض میں آپ سے اس بات کا وعدہ لیں گی کہ آپ اپنے مسلمان ہونے کی حیثیت کو بالکل خیرباد کہہ کر ان میں شریک ہوں بشرطیکہ آپ کے نزدیک مسلمان ہونے کے معنی صرف اتنا ہی نہ ہو کہ آپ روزہ

ادا کریں، بلکہ یہ ہو جیسا کہ فی الواقع ہونا چاہیے کہ آپ کی حیثیت ایک اصولی پارٹی کی ہے جو اپنا ایک مخصوص مقصد اور پروگرام رکھتی ہے ــــــ اور جب اس متاع قلیل کے عوض میں آپ اپنی گراں قدر حیثیت جس پر دنیا ہی نہیں بلکہ آخرت کی کامیابی کا بھی دارو مدار ہے، چھوڑنے پر پوری طرح آمادہ ہو جائیں گے اور اس کے لیے کچھ عملی ثبوت بھی پیش کر دیں گے تو اس وقت آپ اس پارٹی کے ممبر ہو سکیں گے اور یہ ظاہر بات ہے کہ اس حیثیت کو قبول کر چکنے کے بعد آپ کو خود اپنے کو بھی یہ دھوکا دینے کا موقع باقی نہیں رہ سکتا کہ آپ اسلام یا مسلمانوں کے مفاد میں یہ سب کچھ کر رہے ہیں، اس کے بعد اسلام یا مسلمانوں کے فائدہ کے لیے آپ جو کارنامہ بھی چاہے انجام دیں، اس سے اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی جو اپنے اس طرز عمل سے آپ اسلام کو پہونچا چکے ہوں گے، اور اگر آپ سوچیں تو آپ کا طرز عمل خود آپ کی ذات کے لیے بھی سراسر گھاٹے ہی کا موجب ہوگا اپنی صحیح حیثیت چھوڑنے کے بعد آپ کیسی ہی دولت و عزت حاصل کر لیں اس کی تلافی کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی دھوکا ہی ہے کہ آپ اس کے بعد اسلام یا مسلمانوں کے فائدہ کے لیے کوئی کام کر سکتے ہیں۔ کسی پارٹی میں شرکت کے بعد آپ کو ہر صورت میں پارٹی ڈسپلن کا پابند ہونا پڑے گا، اس کے فیصلوں سے آپ سرمو انحراف نہیں کر سکتے، بلکہ آپ کی پوری حیثیت پارٹی میں ضم ہو جائے گی، یہاں تک کہ آپ اپنی زبان و دل کے بھی مالک نہیں رہ سکیں گے۔ ایسی حالت میں آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ اس پارٹی کے اندر رہتے ہوئے اسلام یا مسلمانوں کے فائدہ کے لیے کیا کام کر سکتے ہیں۔ جب تک کہ آپ اس پارٹی کو بنیادی طور سے بدل نہ کر دیں اور کوئی احمق ہی ہوگا جو موجودہ حالات میں اس امکان کا تصور بھی کر سکے یہ تو خیر دور کی بات ہے آپ کو تو اکثر حالات میں یہ بھی دیکھنا پڑے گا، جیسا کہ اس وقت آپ عملاً دیکھ رہے ہیں کہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے دوسرے ارکان کی نگاہوں میں کچھ کھٹک تو نہیں دے رہے ہیں، اور پھر اگر آپ کو اس پارٹی میں رہنا ہے تو اس طرح کے اشتباہ کو رفع کرنے کے لیے آپ کو شاید ایسی حرکتیں بھی کرنی پڑیں گی جو اسلام یا مسلمانوں کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی پارٹی کا اعتماد حاصل کر چکنے کے بعد الیکشن میں اس پارٹی کی طرف سے امیدوار بھی کھڑے کیے جائیں بلکہ اگر آپ کا نصیب زور آور ہوگا تو یہ بھی ممکن ہے کہ اگر وہ پارٹی الیکشن میں کامیاب ہو جائے تو آپ کو کوئی عہدہ و منصب بھی حاصل ہو جائے لیکن یہ یاد رکھیے یہ سب عنایتیں آپ کے "لائق" ہونے کی شرط پر ہوں گی نہ کہ اس بنیاد پر کہ آپ مسلمان ہیں اور ان عنایتوں سے آپ شخصی طور سے متمتع ہو سکیں گے، ان سے اسلام یا مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکے گا، کسی پارٹی میں شریک ہونے کے بعد اس کا تصور بھی آپ کے لیے جرم ہوگا جس کی کم سے کم سزا اخراج ہے۔

تیسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ آپ نہ اپنی قوم کی کسی پارٹی کی طرف سے کھڑے ہوں اور نہ کسی دوسری پارٹی کی طرف سے بلکہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیں۔ یہ شکل یقیناً بہت سے مفسدوں سے خالی ہے لیکن اسلام یا مسلمانوں کے فائدہ و نقصان کے ضمن میں یہ شکل لائق بحث نہیں ہو سکتی، کیوں کہ جب ایک طرف انتخاب مخلوط ہوگا اور دوسری طرف بڑی بڑی پارٹیاں اپنے دبدبہ اور طاقت اور وسائل و ذرائع کے ساتھ اپنے امیدواروں کو ساتھ لے کر میدان انتخاب میں اتریں گی تو اس وقت

لیے آزاد امیدواروں کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوسکتا ہے اور اگر کچھ امیدوار اپنے کل بھی آئے جوان کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا لیں یا ان سب کا مقابلہ کرتے ہوئے کامیابی سے ہم کنار ہو جائیں تو اصل معرکہ کی جگہ یعنی اسمبلیوں میں جہاں بہرحال کسی منظم اکثریت والی پارٹی کی فرماں روائی ہوگی اس طرح کے نمائندوں کا حال یہ ہوگا کہ اگر انھیں ایوانِ اسمبلی میں کچھ کہنے سننے کا موقع بھی ملے گا تو شاید وہ خود اکثر حالات میں خاموش ہی رہنے کو ترجیح دیں گے جیسا کہ اس وقت بھی اس طرح کے ممبرانِ اسمبلی کا حال دیکھا جارہا ہے یا اگر وہ ہمت کرکے کچھ بولیں گے بھی تو اس کی حیثیت نقار خانہ میں طوطی کی آواز کی ہوگی جس کا انجام معلوم ہے یا پھر وہ مجبور ہوں گے کہ اپنا رشتہ کسی پارٹی سے جوڑ لیں جس کے بعد ان پر وہی تمام باتیں صادق آنے لگیں گی جو اس سے پہلے ہم پارٹیوں کی شرکت کے سلسلہ میں عرض کر آئے ہیں

اب آئیے دینی حیثیت سے اس مسئلہ پر غور کیجیے۔

ہم جانتے ہیں کہ اسمبلیوں کی امیدواری اور ممبری کا معاملہ مسلمانوں کے لیے کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے جو اس وقت سامنے آرہا ہو، بلکہ ایک عرصہ سے مسلمان اسمبلیوں کے انتخابات میں کھڑے ہوتے اور ان کے ممبر ہوتے چلے آرہے ہیں اور اس وقت بھی وہ خاصی تعداد میں مرکزی اور صوبجاتی اسمبلیوں کے ممبر ہیں، جن میں متعدد بڑے اور نامور علماء و فضلاء بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ مسئلہ دینی نقطۂ نظر سے قابلِ غور ہے کہ ایسا کرنا کہاں تک شریعت کے مطابق ہے یہ ظاہر بات ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ چونکہ ایسا ہوتا چلا آرہا ہے اس لیے اب یہ چیز بحث سے خارج ہو چکی ہے اور محض ہوتے رہنے کی وجہ سے وہ ہمارے لیے جائز و مباح ہو گئی ہے۔ دین میں بلاشبہ تعامل کے اعتبار کا ایک درجہ ہے لیکن اس کے لیے اولین شرط دین کی مطابقت ہے اگر ایسا نہ ہو تو تعامل کوئی چیز نہیں ہے اور اس کا سہارا لینا تو جاہلی طریقہ ہے جس کو منکرینِ حق ہمیشہ حق کے مقابلہ میں اختیار کرتے رہے ہیں۔

واذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس
اللہ والی الرسول قالوا حسبنا ما	کی طرف آؤ، اور رسول کی طرف تو وہ جواب دیتے ہیں ہمارے لیے بس
وجدنا علیہ اٰبائنا۔	وہ طریقہ جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے۔

اور جب ہم اس نقطۂ نظر کے تحت غور کرتے ہیں تو مجالس قانون ساز کی ممبری کے لیے مسلمانوں کی امیدواری چند در چند وجوہ سے ہمیں غلط نظر آتی ہے۔

(۱) ایک اسلامی حکومت و ریاست کے اندر بھی عہدوں یا ایسی خدمتوں کے لیے جن میں عزت و حکومت بھی ملی ہوتی ہو خود امیدوار بننا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایات کے خلاف ہے، آپ نے فرمایا:-

لا تسأل الامارۃ فانک ان	حکومت طلب نہ کرو کیونکہ اگر وہ تمھیں بے طلب مل گئی تو اس کے

اعطیتہا عن غیر مسئلۃ اُعنت علیہا وان اعطیتہا عن مسئلۃ وکلت الیہا۔ (بخاری و مسلم)

سلطنت میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ملے گی، لیکن اگر تم کو طلب کے بعد ملی تو تم اس کے حوالہ کر دیئے جاؤ گے۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے:۔

انا واللہ لا نولی علی ھذا العمل احدا سألہ ولا احدا حرص علیہ

خدا کی قسم ہم حکومت کے کسی منصب پر کسی ایسے شخص کو مقرر نہیں کرتے جو اس کا خواستگار ہو اور نہ ایسے شخص کو جو اس کی حرص کرے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر یہ طلب و امیدواری کسی غیر اسلامی نظام کے کسی اعزازی منصب کے لیے ہو تو اس کی قباحت اور کتنی زیادہ بڑھ جائے گی۔ اور اس سے یہ بات بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ ایسے امیدواروں کی حمایت کرنا ایک مسلمان کے لیے کہاں تک جائز یا مناسب سمجھا جا سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کو اگر بروئے کار لایا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کا ہنگامہ انتخاب خود بخود بہت کچھ سرد پڑ جائے گا کیونکہ انتخاب کا ہنگامہ انہیں کے دم قدم سے زندہ ہے جو عہدوں کے بھوکے ہیں، یہ لوگ خود اپنے کو پیش کرتے ہیں اور پیش ہی نہیں کرتے، بلکہ اپنی کامیابی کے لیے معلوم نہیں کیا کیا انسانیت و شرافت سے گری ہوئی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں، رہے وہ لوگ جو ان کے مقابلہ میں واقعی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے ان سے زیادہ اہل بھی ہو سکتے ہیں تو وہ خود ہی اس ہنگامہ سے اپنے کو الگ رکھتے ہیں اور اگر وہ آگے بڑھنا بھی چاہیں تو موجودہ زمانہ میں ان کو پوچھتا کون ہے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

(۴) اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جس نے حکومت و سیاست کے ضمن میں بھی واضح ہدایات دی ہیں اور مسلمان جو اس دین کے ماننے والے ہیں، ان کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ وہ بس زندگی بھر اسی کا نام محبت سے لیتے رہیں یا اس کے خاص خاص احکام اور قسم عبادات چھانٹ کر الگ کر لیں اور ان پر عمل پیرا ہو کر اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں کہ انہوں نے پیروی دین کا حق ادا کر دیا بلکہ ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دین کو اس کی مجموعی شکل میں اختیار کرنے کی کوشش کریں اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے اس کے کسی جزو پر عمل پیرا نہ ہو سکیں تو کم از کم اپنے بچنے کی جگہ تو وہ اس کی خلاف ورزیوں سے پوری طرح بچنے کی فکر کریں، اور اسی کے ساتھ یہ واضح بات ہے کہ جو طریقۂ انتخاب ہندوستان میں رائج ہے اور جن پارٹیوں میں آپ شریک ہو کر الیکشن میں حصہ لے سکتے ہیں ان کے سامنے جو مقصد و پروگرام ہیں وہ اسلام کے مطابق نہیں ہیں، بلکہ بہت سے حالات میں اس کی ضد ہیں۔ ایسی حالت میں آپ اپنے دین کی اور خود اپنی ملی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کس طرح اس انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔

(۵) اس کے ساتھ مجلس قانون ساز کی حیثیت کو بھی سامنے رکھ لیجئے۔ ایک مسلمان کے کام کی بنیادی فکر ان الحکم الا للہ

بھی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کے لیے مخصوص جانے اور اس لیے کسی ایسی مجلس قانون ساز کا ممبر بننے کا امیدوار نہ ہو یا اس کے لیے کسی امیدوار کی تائید کرے، جہاں قانون سازی کا حق انسانوں کو دیا گیا ہو اور وہ کتاب و سنت سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنے اس حق کو استعمال کر رہے ہوں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہاں اللہ تعالیٰ کا علانیہ مذاق اُڑایا جاتا ہو۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ دستور ساز اسمبلی کے بہت سے ممبروں کو اس پر اعتراض ہوا تھا کہ آئین میں اللہ کے نام پر حلف اٹھانے کا اقرار درج کیا جائے اور اس موقع پر بہت سے ممبران نے اس طرح کی باتیں بھی کہی تھیں کہ جب اللہ پارلیمنٹ نہیں ہے تو اُسے ہمارے معاملات میں دخل انداز ہونے کا کیا حق ہے اور بعضوں نے تو اس موقع پر ایسے کلمے بھی استعمال کیے تھے جن کو قلم پر لاتے ہوئے بھی دل ڈرتا ہے۔

بہرحال یہ ہیں مختصراً وہ وجوہ جن کے تحت ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو الیکشن میں حصہ لینے سے عملاً اجتناب کرنا چاہیے۔ لیکن اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے نامناسب نہیں ہوگا اگر میں یہاں علماء ہند کے اُس متفقہ فتوے کا بھی ذکر کردوں جو غالباً ۱۹۲۰ء میں اُس وقت کے تقریباً سو سوا سو مشاہیر علماء کے دستخطوں سے تحریک کونسل کے سلسلہ میں شائع ہوا تھا جس میں متعدد شرعی وجوہ کی بنا پر کونسلوں میں مسلمانوں کی شرکت کو ناجائز (حرام) قرار دیا گیا تھا۔ یہ فرق ہے کہ ۱۹۲۰ء کے اسباب حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں، جس کی وجہ سے ہم بھی محسوس کرتے ہیں کہ اس فتوے کی بعض وجوہ شاید بعینہٖ اس زمانہ کے حالات پر منطبق نہ ہو سکیں، لیکن اگر دین کے بنیادی احکام وقت کے ساتھ بدل جایا نہیں کرتے اور اس عہد کی کونسلیں بھی اپنی متعدد حیثیتوں میں اس عہد کی کونسلوں سے مشابہت رکھتی ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فتوے کی حیثیت اب کس شکل میں کس طرح تبدیل ہو جائے گی۔ وہ جو چیز اس زمانہ میں ناجائز اور حرام تھی وہ اب جائز و مباح بلکہ بعضوں کے نزدیک واجب و فرض کس طرح بن جائے گی۔ اور باتوں کو تو جانے دیجیے اگر ان کے سلسلہ میں شرکت کے حامیوں کو کچھ زورِ کلام دکھانے کا موقع مل سکتا ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اکثر اس فتوے کی اس ایک دفعہ کے بارے میں وہ کیا ارشاد فرمائیں گے۔

> "کونسل میں اکثر غیر شرعی قانون وضع کیے جاتے ہیں جن کی تحریک یا تائید یا اس پر سکوت باوجود قدرت مخالفت کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ وان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ
> مگر مسلم ممبران کونسل یہ سب کچھ کرتے ہیں جن کے شواہد واقعات ماضیہ اور خود موجودہ قانون کا نفاذ ہے۔"

اس فتوے پر دستخط کرنے والے علماء میں سے بہت سے علماء اب زندہ نہیں ہیں لیکن خوش قسمتی سے اب بھی ان میں سے خاصی تعداد میں موجود ہیں، کاش یہ حضرات اپنے کسی بیان کے ذریعہ یا کسی اور طرح اس الجھن کو رفع کرا دیتے تو یہ ان کا ہم پر اور اُن دوسرے مسلمانوں پر جو ہماری طرح اس خلش میں مبتلا ہیں بہت بڑا احسان ہوتا۔ وہ اگر اس زمانہ میں دین کا مفاد اسی میں سمجھتے ہیں کہ خود کونسل کے ممبر بنیں یا اس کے امیدواروں کی تائید و حمایت میں ملک کے دورے کرتے پھریں تو

اشارات

وہ شوق سے ایسا کریں یہ ان کا ذاتی فعل ہے لیکن اس فتوے کے بموجب اس وقت اس مسئلہ کی شرعی حیثیت کیا ہے یہ اس سے الگ چیز ہے اور اس مسئلہ پر ان کی اسی حیثیت سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔

الیکشن میں حصہ لینے کی ایک دوسری شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان کسی طرح خود امیدوار کی حیثیت سے تو کھڑے نہ ہوں لیکن اپنا ووٹ وہ ضرور استعمال کریں اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بعض مخلص مسلمان مسلمانوں کو اسی طرح کا مشورہ دے رہے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک انتخاب میں حصہ لینے کی یہ شکل بھی مسلمانوں کے لیے نادرست ہے اس سے فائدہ کچھ بھی نہیں ہے اور نقصانات بہت زیادہ ہیں۔

پہلا نقصان تو یہی ہے کہ اس شکل میں مسلمان مختلف پارٹیوں کی کشمکش کی آماجگاہ بن جائیں گے اور اسی کشمکش میں ان کو نقصان کے سوا فائدہ کچھ نہیں پہونچ سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی تنظیم نہ ہونے کی حالت میں مسلمانوں کے ووٹ مختلف پارٹیوں کے لیے تقسیم ہو جائیں گے اس لیے وہ کسی پارٹی کو خوش نہ کر سکیں گے اور نہ اس سے کوئی دنیاوی منفعت حاصل کر سکیں گے بلکہ اس کے برخلاف یہ بات بہت سی پارٹیوں کی ناخوشی کا موجب ہوگی اور اس سے بحیثیت قوم ان کو نقصان پہونچے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اوپر جو وجوہ امیدوار نہ بننے کے سلسلہ میں مذکور ہوئے ہیں وہ اس بات کے بھی متقاضی ہیں کہ مسلمان ووٹر کی حیثیت سے بھی الیکشن میں حصہ نہ لیں، مثلاً اگر مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ کسی باطل نظام کے تحت قائم شدہ اسمبلی کی ممبری کے لیے امیدوار بنیں تو ان کے لیے یہ بھی ناجائز ہوگا کہ وہ اس کے لیے کسی امیدوار کی تائید بھی کریں، اور اسی پر دوسرے وجوہ کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

ان اسباب کے تحت ہمارا خیال ہے کہ مسلمانوں کو ووٹر کی حیثیت سے بھی آئندہ انتخاب سے علحدہ ہی رہنا چاہیئے باقی رہی یہ بات کہ مولانا نور الدین صاحب بہاری کے بقول جن لوگوں کا مقصد زندگی سیٹ اور عہدوں کا حصول ہے، وہ بہر حال انتخاب میں کودیں گے اور اپنے ذاتی اغراض کے لیے وہ مسلمانوں کو بھی اس آگ میں جھونکنے کی کوشش کریں گے، تو یقیناً ہم اور آپ ایسے لوگوں کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور ہم اور آپ اپنے لیے جس چیز میں سلامتی سمجھتے ہیں اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا چاہیے۔

اب آئندہ صحبت میں ان شاء اللہ ہم اس سوال پر بحث کریں گے کہ انتخابات سے اس طرح علحدگی اختیار کرنے سے کیا فائدہ اور کیا نقصان پہونچ سکتا ہے اور اس نقصان کی تلافی کی کیا شکل ہے یا وہ کس حد تک ہمارے لیے قابل انگیز ہے۔ اس بحث سے فارغ ہو کر ہم متعین طور سے بتائیں گے کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔

تیسیر القرآن

(۵)

سورۂ بقرہ از آیت (۳۵) تا آیت (۳۹)

مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۝

اس کے بعد ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو، اور اس میں سے (جو چاہو اور جہاں سے چاہو) فراغت سے کھاؤ، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم ظالم قرار پاؤ گے۔ پھر شیطان

---

۵۱ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی پیدائش زمین میں منصب خلافت کا بار اٹھانے کے لیے ہوئی تھی، اور اس لیے ان کی بابت زمین پر ایک مدت معینہ کے لیے آکر رہنے کا فیصلہ پہلے ہی سے ہو چکا تھا، مگر زمین، یعنی اپنی جائے تقرر، پر بحیثیت خلیفہ بھیجے جانے سے پہلے کچھ عرصہ کے لیے انھیں جنت میں رکھا گیا تھا، تاکہ ان کے قابل اعتماد کی آزمائش ہو جائے۔ چنانچہ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چن لیا گیا، اور حکم دے دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھٹکنا، پھر ان کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ ایسا کرو گے تو ہماری نظر میں ظالم ٹھیرو گے۔ یہ کریدنا کہ یہ کس چیز کا درخت تھا؟ یا یہ کہ یہ حقیقت ہے یا مجاز؟ اور اگر مجاز ہے تو اس سے مراد کیا ہے؟ بالکل فضول ہے، اولاً تو اس کی کوئی توضیح نبی اکرمؐ سے صحت کے ساتھ منقول نہیں، اور جب صورت یہ ہے تو پھر ایک ایسے معاملہ میں جس کا تعلق بالکل ہی غیب سے ہے قیاس و گمان کا کیا دخل۔ دوسرے جس مقصد کے لیے قرآن اس واقعہ کو بیان کر رہا ہے اس کے سلسلہ میں یہ چیز کسی پہلو سے ضروری نہیں ہے، [illegible] اور اس لیے ایک مقصد پسند انسان کے لیے یہ سوال بالکل ہی خارج از بحث ہے۔ علاوہ بریں خود قرآن کا اس مسئلہ سے کوئی تعرض نہ کرنا بھی اس کا سبب ہے۔ وہ واقعات کے بیان کے سلسلے میں اس اصول کا بڑی سختی کے ساتھ پابند ہے کہ اصل مقصد کے لحاظ سے جو بات غیر ضروری [illegible]

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا نے اس (درخت کی ترغیب) سے ان دونوں کے قدم ڈگمگا دیئے [۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) ہوں، انھیں نظر انداز کیا جائے۔ غرض اس انسان کو جو پہلا انسان تھا، چند روز جنت میں رکھا گیا، اور اس کی
اور اس کی اولاد کے اپنے فائدے کے لیے اس کے رجحان طبع کو آزمایا گیا، تاکہ اس کی طبیعت کے کمزور پہلو پہلے ہی سے اس کے سامنے آجائیں
اور وہ اپنا فرض خلافت انجام دیتے وقت پوری طرح ہوشیار رہے۔

اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مقام منتخب کرنا ایک اور مصلحت سے بھی زیادہ مناسب تھا۔ انسان کا پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے جنت میں رکھا جانا دراصل اس امر کا ایک خاموش اعلان تھا کہ انسان کا اصلی مقام سکونت تو جنت ہی ہے، اس لیے اس کو دنیا میں جہاں ایک خاص کام کے لیے بھیجا گیا ہے، رہتے ہوئے اپنے اس اصلی گھر کی اسی طرح فکر اور طلب رکھنی چاہیے جس طرح ایک مسافر کو اپنے وطن کی ہوا کرتی ہے۔ لیکن اگر اس نے شیطانی ترغیبات کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کی راہ سے انحراف کیا تو جس طرح وہ ابتداء میں جنت سے محروم کیا گیا تھا اسی طرح آخرت میں بھی محروم ہی رہے گا

[۱] یہاں پر "ظالم" کا لفظ بڑا ہی جامع اور معنی خیز ہے۔ ظلم دراصل حق تلفی کو کہتے ہیں، پس ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے۔ جو شخص خدا کی نافرمانی کرتا ہے، وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے۔ اولاً خدا کا حق، کیوں کہ وہ خالق اور پروردگار ہونے کے باعث اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرماں برداری اور رضاجوئی کی جائے۔ دوسرا ان تمام چیزوں کا حق، جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں، اور وہ اشیاء جو اس کار بغاوت میں استعمال ہوتی ہیں، ان سب کا اس انسان پر یہ حق تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ لیکن جب اس نے ان پر اپنے اختیارات کا استعمال خدا کی مرضی سے بالکل بے نیاز ہو کر کیا تو حقیقت میں ان پر ظلم کیا۔ تیسرا خود اپنا حق، کیوں کہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے، مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی خفگی اور سزا کا مستحق بناتا ہے، تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ ان ہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم، اور گناہ گار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] اس بات کی شرح قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر آتی ہے کہ شیطان نے ان کے قدموں میں کس طرح لغزش پیدا کی۔ یہاں پر جب شیطانی اغوا کی پوری تفصیل سامنے آئے گی تو واقعہ کی صرف تفصیل ہی نہ معلوم ہوگی بلکہ انسانی فطرت کے بعض اہم ترین نفسیاتی پہلو بھی روشنی میں آجائیں گے۔ یہاں مختصراً صرف اتنا جان لینا چاہیے کہ شیطان نے جس کی راندۂ درگاہ ہونے کے بعد ڈیوٹی ہی یہ قرار پائی تھی کہ انسانوں کو ورغلاتا اور نافرمانی رب پر اکساتا رہے، حضرت آدم کو مخلص دوست اور ہمدرد کے رنگ میں بڑی ہمدردی کے ساتھ یہ صلاح دی کہ اس درخت کو ضرور چکھو، جس سے تمہیں روکا گیا ہے، اس کا خاصہ یہ ہے کہ تم فرشتے بنا دیئے جاؤ گے، یا یہ کہ تم کو حیات جاوداں حاصل ہو جائے گی۔ یوں کہ حضرت آدم غفلت کی اور

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ

اور پھر انھیں اس (قابلِ رشک حالت) سے محروم کر دیا جس سے وہ اب تک لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اور ہم نے کہہ دیا کہ "تم سب یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب تمہیں ایک معین وقت تک زمین میں ٹھہرنا، اور وہیں زندگی بسر کرنا ہے۔" اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے۔ (اور

جائے جاوداں کے موہوم خیال میں کچھ اس طرح کھو گئے کہ انھیں اپنے آقائے حقیقی کے فرمان کا پاس و لحاظ باقی نہ رہا اور اس وقت کے پھل کھا بیٹھے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۳) ۱۵ یعنی بہشت بریں سے اتر کر زمین پر جا بسو۔ گو آدم علیہ السلام پیدا ہی اسی لیے کیے گئے تھے کہ زمین پر جا کر بسیں، اور خلافت کا فریضہ ادا کریں۔ مگر اس وقت نکلنے کے حکم کی جو نوعیت تھی، وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور سزا کے تصور سے خالی نہ تھی۔

۱۶ یعنی تم انسان ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔ اس لیے کہ تمہارے اندر احکامِ الٰہی سے روگردانی اور اپنی اغراض و خواہشاتِ نفس کی طرف جھک پڑنے کا رجحان پایا جاتا ہے، جس کا مظاہرہ ابھی ابھی ہوا اور جب تم صفا کی زندگی اور سکون بخشنے والی ہدایات کو چھوڑ دوگے، اور اپنے نفس کے اشاروں پر چلنے لگو گے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تم میں اختلاف ہو، کشمکش ہو، جنگ و جدل ہو، خون ریزی ہو۔

معلوم ہوا کہ دنیا میں امن، صلح اور اخوت و انسانیت کی صرف ایک ہی سبیل ہے اور وہ ہے خدا کے احکام و ہدایات کی مخلصانہ اطاعت۔

۱۷ یعنی قیامت تک کے لیے، جس کا وقت علمِ الٰہی میں متعین ہے۔ "ایک معین وقت تک" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس بات کا اعلان اللہ تعالیٰ نے اول روز فرما دیا تھا کہ دنیا کی زندگی غیر محدود نہیں ہے، بلکہ اس کو بہرحال ختم ہونا ہے اور اس کی حیثیت انسان کی کل زندگی کے مقابلہ میں بہت تھوڑی ہے۔ یہ دنیا بس زیادہ سے زیادہ ایک سرائے ہے، باقی اصل وطن تو یہی جنت ہے۔

۱۸ یعنی جس طرح ساری چیزیں آدم کو اپنے رب ہی کی جناب سے ملی تھیں، اس لیے کہ وہ بذاتِ خود اپنے اندر کوئی قوت تو رکھتے نہیں تھے، اسی طرح جرم سرزد ہو جانے کے بعد، اس کی معافی مانگنے کا طریقہ بھی ان کو اپنے رب ہی سے معلوم ہوا۔ چونکہ گناہ کے بعد معافی مانگنے کی توفیق دینا اور پھر معاف کیے جانے کا مسئلہ براہِ راست متعلق ہے اللہ کے قانونِ ہدایت و ضلالت سے، اس لیے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ حضرت آدم کو یہ توفیق یوں ہی بخش دی گئی تھی، بلکہ اس کے برخلاف یہاں بھی ٹھیک اسی قانونِ ہدایت کے مطابق عمل ہوا جس کا نفاذ آج ہے، اور قیامت تک رہے گا۔ خود قرآن کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۔)

فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا

توبہ[51] کی) تو اُس نے اس کی توبہ قبول فرمالی۔ یقیناً وہ بڑا ہی معافی دینے والا اور رحم کرنے والا ہے[52]۔ ہم نے کہا تم سب یہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) دوسرے مقامات پر اس امر کی تصریح موجود ہے کہ آدم علیہ السلام اس لغزش کا شکار تو ضرور ہوگئے، مگر اس کے بعد فوراً ہی ان پر شدید ندامت کی کیفیت طاری ہوگئی، اور اپنی اس حرکت پر وہ کچھ اس طرح درد و غم کی مجسم صدا بن گئے جس طرح کوئی بچہ اندرونی درد سے بے تاب ہو، اور سوائے ہاتھ پاؤں مارنے اور درد بھری چیخیں نکالنے کے اور کچھ نہ کر سکتا ہو۔ باری تعالیٰ نے ان کے اسی تاثر کی قدر کی اور اپنی سنت ہدایت کے مطابق انھیں معافی مانگنے کے طریقہ کی تلقین فرمائی کہ یوں اور ان لفظوں میں معافی طلب کرو۔

دراصل یہ بھی حضرت آدمؑ کے سامنے ان کی اپنی بے چارگی اور شدتِ احتیاج کا ایک مظاہرہ تھا، اس طرح نہیں براہ راست، اور ان کی اولاد کو ان کے واسطے سے محسوس کرایا گیا کہ انسان اپنے رب کی بخششوں اور ہدایتوں کا کس طرح کلی طور پر محتاج ہے کہ اگر وہ معافی مانگنا بھی چاہے تو اس کے لیے مناسب انداز، اور موزوں الفاظ بھی نہیں پا سکتا، تاوقتیکہ خود اس کا رب کچھ بخشنے والا رب ہی نہ بتائے۔ پھر انسان کی اپنے متعلق کیسی شدید غلط فہمی، بلکہ خوش فہمی ہوگی، اگر وہ اپنی پوری زندگی کے لیے خود ہی سیدھا اور کامیاب راستہ تلاش کر لینے کا دعویٰ کرے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [51] "توبہ" کے اصل معنی پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی سرکشانہ روش سے باز آیا، اور بندگی کی صحیح راہ کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے جبا بندہ کی طرف سے، اس کی نافرمانی کے باعث، نگہ کرم پھیر چکا تھا، اس کی عفو خواہی پر اس نے پھر اپنی نظر عنایت اُس کی طرف لوٹا دی، اور اس کی رحمت پھر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

[52] قرآن اس نظریہ کی تردید کرتا ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں، اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی ہوں گے۔ حاصل یہ ایک دل شکن نظریہ ہے، کیوں کہ جو شخص ایک مرتبہ گنہگارانہ زندگی میں مبتلا ہوگیا، اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے۔ اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد وہ ماضی کی تلافی، اور آئندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہو کہ تیرے بچنے کی اب کوئی امید نہیں، جو کچھ تو کر چکا ہے، اس کے نتائج ہر حال میں تیری جان کے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا، اور برائی کی سزا دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ تمھیں جو بھلائی پر انعام ملتا ہے، وہ تمھاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کا فضل ہے، چاہے عنایت فرمائے، چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس برائی پر تمھیں سزا ملتی ہے، وہ بھی اس برائی کا ایسا طبعی اور لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے رہائی ممکن نہ ہو بلکہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹ پر)

جو میری ، (وہاں) پھر ، اُتر جاؤ ، (زمین پر) ، سے

جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) اللہ تعالیٰ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے، چاہے سزا دے دے۔ البتہ اللہ کا فضل اور اس کی رحمت، اس کی صفت حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے، وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اس کے فیصلے بے ضابطہ اور غیر عاقلانہ نہیں ہوتے، نہ وہ اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال کرتا ہے۔ جب کسی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر دیتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اور صرف اُسی کی رضا کے لیے یہ بھلائی کی تھی، اور جب بھلائی کو رد کر دیتا ہے، تو اسے اس بنا پر رد کر دیتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل تو ضرور بھلے کام کی سی تھی، مگر اندر اس کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اُس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے، اور جس کے بعد شرمساری کی بجائے اور گناہ کرنے کی خواہش موجود ہو۔ اور اپنی رحمت سے معافی اُس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد بندہ اپنی حرکت پر شرمندہ اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم، کٹر سے کٹر کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی کا کوئی موقع نہیں ہے، بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم ہو، اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) ۵۳ اس فقرہ کا اعادہ معنی خیز ہے۔ اوپر کے جملے میں بتایا گیا ہے کہ آدمؑ نے توبہ کی اور اللہ نے قبول فرمایا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آدمؑ اپنی اس نافرمانی پر سزا کے مستحق نہ رہے، گناہ گاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا۔ اب یہ داغ نہ ان کے دامن پر رہا نہ ہی ان کی نسل کے دامن پر، اور نہ اس کی ضرورت باقی رہی کہ معاذ اللہ خدا اپنا "اکلوتا" بھیج کر نوعِ انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اسے پھانسی کے تختے پر چڑھاتا۔ برعکس اس کے اللہ نے آدمؑ کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہ فرمایا، بلکہ اس کے بعد انھیں منصبِ نبوت سے بھی سرفراز کیا، تاکہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتا کر جائیں۔ اب جو جنت سے نکلنے کا حکم پھر دہرایا گیا، تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضا نہ تھا کہ آدمؑ کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتا اور زمین پر نہ اُتارا جاتا۔ دُنیا ان کے لیے دار العذاب نہ تھی، کہ یہاں اُتارا جانا سزا یاب ہونے کے ہم معنیٰ ہوتا۔ انھیں تو زمین کی خلافت ہی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ اس لیے اصل تجویز تو ان کو زمین ہی پر اُتارنے کی تھی۔ جنت تو اس وقت ان کی اصل جائے قیام تھی ہی نہیں۔ یہاں تو صرف چند روز کے لیے ان کو رکھا گیا تھا، تاکہ ان کے رجحانات کا امتحان ہو جائے، اور خود انھیں اپنی طبیعت کے کمزور پہلوؤں پر ابتداء ہی سے تنبیہ ہو جائے۔

البتہ ان کے دُنیا میں اُتارے جانے کے لیے جو اس امتحان کے بعد کا وقت منتخب کیا گیا البتہ انتخاب وقت اپنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸)

مِّنِّیْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ — طرف سے کوئی ہدایت[۵] نامہ تمھارے پاس پہنچے تو دتمھارے لیے دو ہی شکلیں ہوں گی)، جو لوگ میری اس ہدایت (کو مان کر اس)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) اندر یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ اب تک ان کا جنت میں رہنا محض فضل الٰہی کی بنا پر تھا، اور یہ فضل اس لیے تھا کہ ابھی تک ان کی طرف سے کوئی بات ایسی نہیں ہوئی تھی جو اس فضل کے لیے مانع ہوتی، یا ان کے سلسلہ میں یہ سوال پیدا کرتی کہ وہ انعامات الٰہی کے مستحق نہیں۔ کیونکہ فضل الٰہی پانے کے لیے اثباتی طور پر مستحق ثابت ہونا ضروری نہیں بلکہ غیر مستحق نہ ہونا ہی کافی ہے۔ مگر جب ان کی طرف سے نافرمانی کا اظہار ہوا، جو ان کے ایک ذاتی فعل ہونے کے ساتھ ساتھ نوعی ضعف طاعت کی بھی ترجمان تھی، تو گو اسے ان کی درخواست پر معاف کر دیا گیا، لیکن اب یہ سوال پیدا ہو گیا کہ انھیں اور ان کی نسل کو، اب اثباتی طور پر اپنے استحقاقِ جنت کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا۔ اس لیے انھیں زمین پر اُتار دیا گیا، جو ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے عمل کی جگہ اور ایک آزمائش گاہ تھی۔ اب یہاں پر ہر انسان دراصل ایک مستقل کسب اور امتحان میں مصروف ہے، جہاں اس کو اپنے لیے یہ ثبوت فراہم کرنا ہے کہ میں اللہ کے فضل و کرم کا یعنی جنت کا مستحق ہوں۔ یہی وہ پہلو ہے جس کے پیشِ نظر کبھی کبھی قرآن یوں بھی کہتا ہے کہ "شیطان (کی ترغیب) نے آدم کو جنت سے نکلوایا" (سورۃ (۷)، آیت ۲۶)

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۵] یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنے امتحان میں کامیاب ہونے، اور خلافت کی ڈیوٹی ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے اپنے حال پر نہ چھوڑ دے گا، صرف اس کی فطری بصیرت ہی پر چھوڑ دیگا۔ محض اسی عہد بندگی پر اکتفا نہ کرے گا جو اس نے شروع میں تمام انسانوں سے لے لیا تھا، بلکہ وہ برابر دُنیا میں اپنے پیغام بھیجتا رہے گا، جو لوگوں کو ان کا فرض زندگی یاد دلاتے، اور ان کے سامنے سیدھی راہ پیش کرتے رہیں گے۔ یہ ان نعمتوں کی تکمیل کر دی تھی جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اب تک عنایت فرمائی ہیں، اور جن کا ذکر تم اللہ سے کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو" کے جملے شروع ہوا تھا۔

یہاں پر قرآن موجودہ علماء تاریخ کے اس عام نظریہ کی پوری تردید کرتا ہے کہ انسان کی مذہبی زندگی کی ابتدا مظاہر پرستی سے ہوئی، اور وہ فکری ارتقاء کرتے کرتے توحید کے تصور تک پہنچا ہے۔ اس کے بخلاف وہ حقیقت کی تصویر یوں پیش کرتا ہے کہ انسان نے جب اس زمین پر قدم رکھا، تو توحید باری کا تصور اس کے دل میں، اور اللہ کا بخشا ہوا ہدایت نامہ زندگی اس کے ہاتھوں میں موجود تھا۔ تصور معبود کوئی نرا فلسفیانہ نظریہ نہیں ہے، جو انسانی کاوش فکر کا نتیجہ ہو، اور جس نے ترقی کر کے تعدد سے وحدت تک رسائی حاصل کی ہو۔ بلکہ یہ اسی طرح اول روز سے اللہ تعالیٰ کا بخشا ہوا علم حقیقت ہے، جس طرح اس نے مادی فرد کل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸ پر)

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝

پر عمل کریں گے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا نہ کوئی غم[۹۱]، اور جنہوں نے ان کے ماننے سے انکار کیا، اور ہماری آیتوں[۹۲] کو جھٹلا دیا، وہ نذرِ جہنم ہونے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ[۹۳] رہیں گے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) کو پورا کرنے کے لیے انسان کو پانی اور ہوا گرمی اور روشنی پھل اور غلے وغیرہ اشیاء پہلے دن سے دے رکھی ہیں۔"

(حاشیہ صفحہ ھذا) ۹۱ خوف کا تعلق آنے والے اُمور سے ہوتا ہے، اور غم کا تعلق گذرے ہوئے اُمور سے۔ دراصل یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ کی ہدایت پر عمل کرنے والا اس مقام کا مستحق قرار دیا جائے گا جس سے نکل کر وہ گیا ہے یعنی جنت کا۔ چنانچہ جنت کی تعریف بھی بے شمار آیتوں میں ان ہی لفظوں سے کی گئی ہے کہ "وہاں نہ خوف ہوگا نہ غم"۔

۹۲ "آیت" کے لغوی معنی ہیں علامت اور نشانی کے۔ یہ لفظ قرآن مجید کے اندر چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں تو اپنے اسی اصلی لغوی معنی میں۔ کہیں ذریعہ استدلال یا، مجازاً یوں کہیے کہ، خود دلیل کے معنی میں، اور ایسا وہاں ہوتا ہے جہاں قدرت کے آثار، فطرت کے حقائق اور تاریخ کے واقعات کو "آیت" کہا گیا ہو، اس لیے کہ یہ باتیں کسی نہ کسی چھپی ہوئی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی اور اس کی پہچان کے لیے بطور علامت کام دیتی ہیں۔ کہیں معجزہ کے معنی ہیں، اس لیے کہ معجزہ بھی اس بات کی ایک علامت ہوتا تھا کہ یہ نبوت کا دعویٰ کرنے والا شخص فرماں روائے کائنات کا نمائندہ ہے۔ کہیں "آیت" سے مراد ہدایتِ الٰہی کی عبارت کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے کیونکہ وہ صرف حق اور راستی کی نشان دہی کرنے والا ہوتا ہے، بلکہ اس کی ظاہری اور معنوی خوبیاں اپنے جلیل القدر مصنف کی طرف سے ہونے پر کھلی علامت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

یہاں اس موقع پر آیت کا لفظ اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۹۳ "جہنم میں ہمیشہ رہیں گے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک جہنم رہے گی۔ رہی یہ بات کہ جہنم کب تک رہے گی؟ تو اس کی بابت قرآن صرف یہ بتاتا ہے کہ جب تک اللہ چاہے گا (سورۂ ہود آیت ۱۱۰)

اساسِ دین کی تعمیر

(۵)

۲- ایمان بالآخرت

مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی

عملی تطہیر ایمان بالآخرت کی اس فکری تطہیر کے بعد دوسرا قدم اس کے عملی جائزہ کی طرف اٹھانا چاہیے، جس کا مفصل ذکر ایمان باللہ کے سلسلے میں ہم کر چکے ہیں۔ یعنی ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اس ایمان میں کتنی طاقت، کیسا کچھ عملی تاثیر، کتنی پائیداری اور کتنی زندگی ہے؟ وہ روزمرہ کے معاملات میں ہم کو خدا پرستانہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر کتنا ابھارتا ہے؟ وہ ہمارے طرزِ زندگی میں شانِ حنیفیت پیدا کرنے کا کس قدر دل بوتا رکھتا ہے؟ ہم اس کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں؟ اگر اس عملی جائزہ سے آپ کو یہ حقیقت محسوس ہو کہ کم تر یا بیشتر، ہمارے فکر و عمل کی باگ ڈور خوفِ آخرت کے ہاتھوں سے چھوٹ جایا کرتی ہے تو خود ساختہ تاویلوں اور حیلہ جوئیوں کی روشِ عام سے بچ کر ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا دل میں اعتراف کر لینا چاہیے، اور یقین کر لینا چاہیے کہ جب خوفِ قیامت کے ذکر و بیان سے ہماری زبان کو اتنا تعلق ہے، اس کے تذکرا و تلقین سے ہمارے قلب کو اتنا تعلق نہیں ہے، اور ہمارے اندر جو ایمان بالآخرت ہے اس کی روح فی الواقع ابھی تک غفلت اور پژمردگی کی حالت میں مبتلا ہے۔ اس احساس و اعتراف کے بعد دوسرا فرض یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا علاج کیا جائے اور اپنی ساری طاقتوں کو مجتمع کر کے پورے زور کے ساتھ اس وبائے غفلت کے آہنی پنجوں سے اس مقدس روح کو آزاد کرایا جائے۔ یہ کیسے ہوگا؟ اس کے لیے آپ کو کم و بیش وہی تدبیریں کرنی پڑیں گی جن کا ذکر ہم ایمان باللہ کے سلسلے میں کر چکے ہیں یعنی :-

(۱) تحصیل یقین سب سے پہلے تو ہمیں چاہیے کہ اس باب میں نری تقلیدی روش اختیار کرنے سے اپنے کو بچائیں اور اس ایمان کو

محض باپ دادا کی ایک موروثی امانت سمجھ کر گلے لگائے رکھنے پر اطمینان کا سانس نہ لیں۔ کیوں کہ کسی خیال یا نظریے کو صرف اس بنا پر ماننا کہ ہمارے اسلاف و اکابر اس کو تسلیم کرتے آئے ہیں، اس نظریہ کے پیروؤں اور علم برداروں کی صف میں شمولیت کا دعوےٰ ثابت کرنے کے لیے تو کافی ہے، مگر کسی سینہ میں وہ آگ لگانے کے لیے قطعاً ناکافی بلکہ ناکارہ ہے جس کا وہ نظریہ مطالبہ کرتا ہے۔ کسی فکر کی نری تقلید میدانِ جد و جہد کے غازی اور جانباز سپاہی ہرگز نہیں پیدا کر سکتی۔ وہ اگر کچھ کر سکتی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس معرکہ کے لیے خیمہ بردار قلی مہیا کر دے۔ سینے میں آگ تو صرف وہ نظریہ بھڑکا سکتا ہے جو اتباعِ آباء کے پردے سے نکل کر انسان کی لوحِ قلب و دماغ پر براہِ راست اپنی صداقت کی آتشیں شعاعیں ڈال رہا ہو، اور میدانِ سعی و جہد کے جانفروش مجاہد صرف وہ فکر مہیا کر سکتی ہے جو کارخانۂ تقلید سے مستعار نہ لی گئی ہو بلکہ انسان کے اپنے شعور و تعقل میں گہری جڑیں رکھتی ہو۔ انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو اس نے خود محسوس نہ کیا ہو اس کو اُس چیز کے برابر کر لے جسے وہ خود محسوس کرتا ہو۔ محسوس کرنے والے کا بیان خواہ کتنا ہی مؤثر ہو، اور سُننے والا کتنا ہی گداز قلب کیوں نہ رکھتا ہو، بہرحال دوسرے کی روایت سے آدمی کبھی اتنا پائیدار اثر نہیں لے سکتا جتنا ذاتی مشاہدے کی صورت میں لیا کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے قادر الکلام شاعر کی زبان سے بھی سوزِ عشق اور دردِ فراق کے مضامین سن کر آدمی کے دل میں وہ تڑپ پیدا نہیں ہوتی جو خود عشق کی آگ میں جلنے اور ہجر کے انگاروں پر لوٹنے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ پس جب تک آدمی کا ایمان محض اس بنیاد پر قائم رہے گا کہ اس کے باپ دادا ان چیزوں کو مانتے تھے، اس میں نہ تو صحیح کیفیاتِ ایمانی پائی جا سکیں گی اور نہ وہ ایمان کے کامل تقاضے ہی پورے کر سکے گا۔ اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ایمان محض تقلیدی نہ ہو بلکہ ذاتی یقین و اذعان پر مبنی ہو۔

اس یقین اور اذعان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اِسے کہاں سے حاصل کیا جائے اور کس طرح؟ یہ ایک سوال ہے جو اس موقع پر خود بخود ذہنوں سے اُبھرتا ہے۔ لیکن یاد ہوگا کہ یہی سوال ایمان باللہ کے سلسلے میں بھی پیدا ہوا تھا۔ پس جو جواب اس کا اُس موقع پر دیا جا چکا ہے، وہی یہاں بھی کفایت کرے گا۔ اپنے اس یقین کو ایک لمحے کے لیے بھی ذہن سے اوجھل ہونے نہ دیجیے کہ قرآن ہی آپ کا رہنما اور مرجعِ کل ہے۔ اس سے رجوع کیجیے وہ بتائے گا کہ جس طرح ایمان باللہ کی استواری اس کے بتائے ہوئے طریقِ تفکر پر اور اس کے دیے ہوئے دلائلِ آفاق و نفس پر اور اس کے ذکر پر موقوف ہے، اسی طرح ایمان بالآخرت کی مضبوطی اور بیداری بھی ان ہی باتوں پر منحصر ہے۔ اوپر کی بحثوں کو پڑھ لینے کے بعد اب یہ غلط فہمی تو باقی نہ رہی ہوگی کہ قرآن نے توحید اور معاد وغیرہ مبادیٔ دین پر دلائل کا جو انبار لگایا ہے ان کا تعلق صرف منکرین ہی سے ہے، اور وہ صرف ان ہی پر ان حقائق کو ثابت کرنا اور ان پر حجت تمام کرنا چاہتا ہے، اور جو لوگ ان اصول و نظریات کو قبول کر چکے ہیں ان کی ضرورت کے دائرے سے یہ سارے استدلالات باہر ہیں۔ چنانچہ ایمان باللہ کی بحث میں اس بات کی دلائل کے ساتھ وضاحت کی جا چکی ہے کہ قرآن مومنوں کو بھی ان استدلالات کا حاجت مند ٹھیراتا ہے۔ ٹھیک یہی حال ایمان بالآخرت کا بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اہلِ ایمان آثارِ کائنات پر مسلسل غور و فکر کی نظر ڈالتے رہتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر قیامت کے ہونے والے زلزلے کی خوف ک

آوازیں پہلے کے مقابلہ میں اور زیادہ بلند اور قریب سے سننے لگتے ہیں۔ اہل ایمان کے قوائے فکر و عمل کی فطری نشو و نما پر اس نے جو تبصرے کیے ہیں ان میں سے ایک واضح تبصرے کے الفاظ پھر سُنیئے :۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ	بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، اور شب و روز کی آمد و شد میں (توحید باری اور یوم جزا کے وقوع پر) اُن ارباب عقل کے لیے کھلی ہوئی نشانیاں موجود ہیں جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے اور رکھتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے رہتے ہیں، (جس کے نتیجہ میں ان کی زبان پکار اٹھتی ہے کہ) خدایا! اس (کارخانے) کو تو نے عبث نہیں بنایا ہے تو بڑا بلند و برتر ہے، پس ہمیں جہنم کی سزا سے بچائیو!
(آل عمران - ۲۰)	

کیا اس ارشاد خداوندی کے باوجود یہ خیال کوئی صحیح خیال ہوگا کہ مومن کی ساری متاعِ ایمان، بالخصوص ایمان بالآخرت کی متاع، صرف سماع پر منحصر ہے، اور کارگاہِ فطرت کے اس کھلے ہوئے صحیفے پر جو دلائل منقوش ہیں ان سے وہ بالکل ہی بے نیاز ہے؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ آج ایسا ہو نہیں رہا ہے، بلکہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا ایسا ہونا ٹھیک ہے؟ پھر کلام اس بات میں بھی نہیں ہے کہ ایسا کرنے والے ایسا کرنے پر بھی مومن اور مسلم ہیں، کلام تو اس امر میں ہے کہ کیا ایسا کرنے پر بھی ہماری تصویر اس تصویر ایمان کا صحیح عکس ہو سکتی ہے جو قرآن نے کھینچی ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ قرآن نے تو ارباب دانش اور اہل ایمان لوگوں کا ایک امتیازی وصف یہ بھی بتایا ہے کہ وہ برابر خلقت کائنات میں تفکر کرتے رہتے ہیں اور اس کے پردوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا —— توحید باری اور قیام جزا کا —— سراغ پاتے رہتے اور مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، اور اس "مشاہدہ غیب" میں ان کی نگاہ کی بینائی اور جلوہ یابی برابر بڑھتی رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیامت اور محاسبۂ اعمال کا تصور ایک فطری انداز میں آپ سے آپ زندہ تر ہوتا چلا جاتا ہے گویا اس تصور کو اس کی خالص فطری غذا ملتی جاتی ہے اور وہ ایک تدریج، ترتیب اور توازن کے ساتھ پروان چڑھتا جاتا ہے، اور انسان کے شعور پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ صرف اس کی کبھی کبھار کی صدائے قال ہی نہیں بلکہ ہر وقت کی صدائے حال بن جاتا ہے، اور پھر دیکھیے "ہو" کا وہ اثر نہیں ہوتا جو اس پر قرآن کی آیتوں کا ہوتا ہے، خصوصاً ان آیتوں کا جن میں جزائے اعمال کا ذکر ہو۔ اب اگر ہم اس امتیازی وصف سے اپنے آپ کو بے بہرہ رکھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنے کو کم اندیش اور غافل سمجھنے سے انکار کریں اور اپنی تصویر ایمان کو ناقص ماننے میں لیت و لعل سے کام لیں۔ یہ تو اپنے ہاتھوں اپنا نقصان ہوگا جس سے ہر صاحب دانش —— یعنی مسلمان —— کو بچنا چاہیے۔ پھر یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قرآن نے ان الفاظ میں صرف ایک صورت واقعہ کی خبر دی ہے، بلکہ درحقیقت یہ انشاء کا قالب ہے جو خبر کے جامہ میں ملبوس کر کے پیش کیا گیا ہے۔ یعنی کہنا یہ نہیں ہے کہ

ایسا کرتا ہے، بلکہ فی الحقیقت کہنا یہ ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔

اسی طرح سورہ مرسلات کی ابتدائی آیات کو پڑھیے جہاں ہواؤں کے مختلف حالات اور ان کے گوناگوں اثرات کو یوم جزا کی آمد پر بطور قسم (شہادت اور دلیل) پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا	پھر جو (اپنی تعریف کے ذریعہ) لوگوں کو یاددہانی کرتی
عُذْرًا أَوْ نُذْرًا	رہتی ہیں تاکہ (غافلوں کے خلاف اللہ کی طرف سے) معذرت
إِنَّمَا تُوعَدُونَ	(اور حجت) ہو اور (خدا ترسوں کے لیے) ڈرا دینے کا کام
لَوَاقِعٌ۔	دے۔ (ہواؤں کے یہ مختلف حالات اور اثرات شاہد ہیں کہ)

جس چیز کی تمہیں دھمکی دی جا رہی ہے وہ وقوع میں آ ہی کر رہے گی۔

سورہ ہود کے اندر نافرمانی رب کی پاداش میں ہلاک ہو جانے والی چند بستیوں اور قوموں کی سرگذشت سنانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

إِنَّ	فِي	ذَالِكَ	یقیناً اس (داستانِ ہلاکت) کے اندر اس شخص کے لیے
لَآيَةً	لِمَنْ	خَافَ	(جزائے اعمال کی) ایک بڑی زبردست نشانی ہے
عَذَابَ		الْآخِرَةِ	جو سزائے آخرت کا خوف رکھتا ہو۔

ایسی آیتیں آپ کو ایک دو نہیں، بے شمار ملیں گی جن میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآنی دلائل جس طرح منکرین اسلام سے خطاب کرتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح ان کا رُخ پیروانِ اسلام کی طرف بھی ہوتا ہے، بلکہ جہاں تک عملاً ان سے فائدہ اُٹھانے کا تعلق ہے وہ تو صرف ان ہی کے لیے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر اہل ایمان بھی اپنے ادعائے ایمان کے دامِ خوش رنگ میں گرفتار ہو جائیں اور ان کلمات حق کی یقین آفرینی سے بے نیاز بن جائیں جو دلائل آخرت پر مشتمل ہیں، تو پھر نہیں معلوم ان کلمات کا اب مصرف کیا رہا اور اب وہ کس سے اپنے کمال منزل رسانی کی داد حاصل کر سکیں گے؟ کیا ان پاک کلمات کی اس سے بھی بڑھ کر کوئی مظلومیت ہو سکتی ہے؟

پس ہر صاحبِ نظر مومن کا فرض ہے کہ وہ ان آیات قرآنیہ پر مسلسل غور و تدبر کرتا رہے جن میں آخرت کے امکان و وجوب پر دلائل دیے گئے ہیں اور اس روشنی سے اپنی بینائی میں قوت بہم پہنچاتا رہے جو ان آیتوں کے اندر سے نکلی رہتی ہیں۔ بلاشبہ قیامت کی آمد غیب محض کے واقعات میں سے ہے اور کوئی انسان اس کو ایک شاہد حقیقت کی حیثیت سے نہیں پا سکتا، مگر قرآن کے اشارات میں ہمیں اس یقین کے سرچشمے ملتے ہیں کہ اس "غیب" کی جھلکیاں ضرور محسوس کی جا سکتی ہیں، کیوں کہ جزا و سزا اور یوم آخرت کے چہرے پر جو نقاب ہے وہ اتنی موٹی نہیں ہے کہ فہم و بصیرت کی گڑی ہوئی نگاہیں کچھ نہ پا سکیں، بلکہ یہ نقاب صرف اسی حد تک ادراکِ نظر سے مانع ہے جس حد تک کہ ایک حاملہ کا گوشت پوست اس کے حمل کے وجود کو عام نگاہوں سے چھپا سکتا ہے:۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ (اعراف - ۲۳)

یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کا جہاز کہاں لنگر انداز ہے؟ کہہ دو اس کا علم تو محض میرے رب کو ہے، اپنے وقت پر اس کو وہی بے نقاب کرے گا، لیکن اتنا تو ہر صاحبِ نظر دیکھ سکتا ہے کہ) آسمانوں اور زمین کے (شکم کے) اندر وہ ایک بھاری بوجھ کی طرح ہو رہی ہے، وہ جب بھی آئے گی بالکل اچانک نمودار ہو گی۔

یعنی جس طرح ایک نو مہینے کی حاملہ اپنی ہیئت کذائی میں خود اپنے حمل کا خاموش اعلان کرتی ہے اور اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے بچے کو منظرِ عام پر لے آنے کے لیے بس ایک حکم کی منتظر ہوتی ہے بعینہٖ ایسا ہی حال اس کائنات کے بطن میں قیامت کا بھی ہے کہ وہ اس کے "شکم" میں ایک "نو ماہہ حمل" کی طرح موجود ہے، اس کے بوجھ سے یہ "شکم" پوری طرح گرانبار ہے اور اسے نکال کر سامنے رکھ دینے کے لیے بس ایک حکم کی راہ تک رہا ہے۔ شکمِ کائنات میں اس حمل کی گرانباری اتنی نمایاں ہے کہ جس کی چشمِ خرد میں کچھ بھی بینائی ہو گی وہ اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۲) استحضارِ فکرِ آخرت اس تحصیلِ یقین کی کوششوں اور تدبیروں کے ساتھ دوسری چیز جو اس کام میں ضروری ہے، یہ ہے کہ آخرت کا یہ علم و یقین انسان کے دماغ کی حدود سے نکل کر اس کی روح کے نہاں خانوں میں سرایت کر جائے اور اس کے حافظہ کے اطراف و جوانب پر پوری طرح چھا جائے۔ اس کو خدائے قہار کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کا خیال حتی الامکان کبھی بھولنے نہ پائے۔ وہ کہیں بھی ہو، کسی حال میں بھی ہو، اس بڑے دن کے ہولناک محاسبے سے غافل اور بے فکر نہ ہو۔ آخرت کا یہ کبھی نہ فراموش ہونے والا اندیشہ ہی درحقیقت نیک روی اور صلاحِ عمل کی جان ہے، اور اسی بنا پر میزانِ الٰہی میں اس کا جو وزن ہے وہ وہم و خیال سے بھی ماورا ہے۔

قدرتی طور پر اب یہاں ایک خدا ترس انسان کی نگاہ پورے تجسس کے ساتھ یہ معلوم کرنا چاہے گی کہ وہ کیا ذرائع اور تدابیر ہیں جن کو اختیار کر کے اس سرچشمۂ تقویٰ اور اس کلیدِ بندگی کو حاصل کیا جا سکتا ہے؟ سو یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس مہتم بالشان معاملہ کے اندر بھی ہماری رہنمائی کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے:-

پہلی چیز جو اس سلسلہ میں ہماری بڑی بھاری اعانت کر سکتی ہے، اپنی موت کا تصور ہے، اس موت کا تصور جس کا مشاہدہ انسان کو روز ہی ہوتا رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کو، جو قیامت کا مقدمہ اور حیاتِ اخروی کا دیباچہ ہے اور جس کو یاد رکھنا درحقیقت یومِ آخرت ہی کو یاد رکھنا ہے، برابر اپنی چشمِ تصور کے سامنے رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر چند حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اس چیز کو

اکثروا ذکر ھادم اللذات الموت — کثرت یاد کرتے رہو دنیوی لذتوں (کے اشتیاق) کو ڈھانے والی ہے، یعنی موت کو۔ (ترمذی۔ نسائی)

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

استحیوا من اللہ حق الحیاء ......
اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے ......

من استحیی من اللہ حق الحیاء ......
جو شخص اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق ادا کرنا چاہے اس کو لازم ہے کہ ......

ولیذکر الموت والبلی (ترمذی۔ احمد)
اپنے مرنے اور مرکر سڑ گل جانے کو یاد کرتا رہے۔

بخاری کی مشہور حدیث ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا شانہ پکڑ کر پورے اہتمام سے انھیں سکھایا۔

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔
دنیا میں ایک اجنبی بلکہ ایک راہرو کی طرح رہو تاکہ اس کا کوئی شے تم کو تمہارے اصلی وطن "یعنی اس دوسرے عالم سے غافل نہ کر سکے)

نہ صرف یہ بلکہ موت، قیامت، آخرت اور جزا و سزا کے خیالات کا استحضار اہل ایمان کے لیے اتنا ضروری ہے کہ اس کے لیے شارع نے اپنی کوئی امکانی تدبیر اٹھا نہیں رکھی اور اس کی خاطر بعض ایسے افعال کا بھی حکم دیا جو فی نفسہٖ خام کار لوگوں کے مبتلائے فتنہ ہو جانے کے امکانات سے خالی نہ تھے، چنانچہ قبروں کی زیارت کی ممانعت کرنے کے کچھ دنوں بعد اس کی اجازت دے دی گئی بلکہ اس کی ترغیب اور تاکید بھی فرمائی گئی ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

نھیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا
میں نے تمہیں قبروں کے پاس جانے سے روک دیا تھا، مگر اب تم جایا کرو

زیارت قبور کی یہ ممانعت کیوں ہوئی تھی؟ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ ابتدا میں لوگ توحید کے جامع اور تفصیلی تصور کو ہضم نہیں کر سکتے تھے اور زمانہ جاہلیت کے مشرکانہ آداب و رسوم سے، جن کے وہ برسوں عادی رہ چکے تھے، ان کے دل و دماغ پر پوری طرح مانجھ کر قابل اطمینان حد تک مجلّی نہیں کیے جا سکے تھے اس لیے اندیشہ تھا کہ کہیں اپنے بزرگوں کی قبروں پر جا کر نادانستگی کی حالت میں اضطراری طور پر کچھ ایسی حرکتیں نہ کر بیٹھیں جو لوازم توحید کے منافی ہوں جیسا کہ بنی اسرائیل کی تاریخ بتاتی ہے کہ چونکہ مصر میں رہ کر قبطیوں کے مشرکانہ عقائد و اعمال سے وہ مانوس ہو گئے تھے اس لیے حضرت موسیٰ کے ہمراہ سفر کرتے وقت جب ان کا گذر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جس نے اپنے معبدوں میں بے شمار مورتیوں کو خدا کے تخت پر بٹھا رکھا تھا تو اپنے اسی ہادی و سردار سے، جو ان کو اوّل روز سے ایک ہی دیکھے خدا کی پرستش کا درس دے رہا تھا، بے تابانہ اور بے باکانہ اس خواہش کا اظہار کر بیٹھے کہ اِجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (جس طرح ان کے بہت

سے محفوظ نہیں ہمارے لیے بھی ایک معینہ مدت یاد رہیے اسی شرک زدہ ذہنیتوں کی طرف سے یہی خطرہ تھا جس کے پیش نظر ہادی اعظم نے اس وقت تک قبروں پر جانے سے بھی عام مسلمانوں کو روک رکھا جب تک کہ ان کے اندر توحید کی پوری روح اپنے تمام لوازم و مقتضیات کے ساتھ اتر نہیں گئی۔ پھر جب یہ ہو چکا تو آپ نے اپنی گذشتہ ممانعت کو واپس لیتے ہوئے اس کی اجازت دے دی اور صرف اجازت دے دی بلکہ اس کی تاکید بھی کر دی۔ اس اجازت اور تاکید کی غایت اور ضرورت کیا تھی جس کے عظیم تر فوائد کی خاطر اس زیارت قبور کا حکم دیا گیا جو بہرحال بالفعل نہ سہی، بالقوہ کسی نہ کسی مرحلہ پر ہیج کر شرک کا نہ دساوس کو ابھارنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے؟ اس کا جواب بھی خود اسی پاک زبان سے سنیے جس نے یہ حکم دیا ہے۔

عن ابن مسعودؓ ان رسول اللّٰہ	حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلے اللّٰہ علیہ وسلم قال نھیتکم	نے فرمایا "میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا
عن زیارۃ القبور فزوروھا	تھا، مگر اب تم ان کی زیارت کیا کرو کیونکہ قبروں کی زیارت
فانھا تزھد فی الدنیا و تذکر	دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے اور آخرت کو یاد دلاتی ہے۔
الآخرۃ (ابن ماجہ)	

مسلم کی ایک حدیث میں زیارت قبور کی یہی غرض و غایت ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے۔

......فزوروا القبور فانھا تذکر	......سو قبروں کے پاس جایا کرو، کیونکہ وہ موت
الموت۔	کو یاد دلاتی ہیں۔

پس فکر آخرت کو ہر دم تازہ رکھنے کا سب سے بڑا وسیلہ یہ ہے کہ انسان اپنی موت کو کثرت سے یاد کرتا رہے اور اس طرح ایمان آخرت کے ساتھ اپنے تعلق کو پائیدار کرتا ہوا اس مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے جس کی نشان دہی حضرت ابن عمرؓ کی اس زریں نصیحت میں موجود ہے۔

اذا امسیت فلا تنتظر الصباح	جب شام ہو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح کر لو تو شام
واذا اصبحت فلا تنتظر المساء (بخاری)	کا انتظار نہ کرو۔

پھر موت اور آخرت کی اس یاد کو بار آور کرنے کی خاطر اس شہر خموشاں کی سیر بھی کرتے رہنا چاہیے جہاں ہمارے ہی جیسے انسانوں کی بستی ہے مگر جو اب عمل کے میدان سے نکال کر اپنے رب کے حضور بے چارگی کے عالم میں لا کھڑے کیے گئے ہیں۔ یقیناً اس منظر کے اندر ایک نگاہ عبرت پذیر اور دل خوف آشنا کے لیے بہت کچھ سامان فکر آخرت موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان تریاق کو اپنے حق میں خود زہر بنا لے اور قبروں کو سامان فکر آخرت بنانے کی بجائے خدائی طاقتوں کا یا روحانی فیض کا لیکٹ "سب اسٹیشن" بنا کر ان ہی کو پوجنا یا ان پر مراقبے اور اعتکاف کرنا شروع کر دے۔

دوسری چیز جو اس فکر آخرت میں زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ بنتی ہے وہ سارے قرآن کی بالعموم اور

آیات کی بالخصوص جن میں قیامت کے پر ہول کوائف و مناظر بیان کیے گئے ہیں، حضورِ قلب کے ساتھ تلاوت ہے چنانچہ قرآن مومنوں کی صفت یہی بتلاتا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا۔ (الانفال۔ ۱۰)

سچے مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب ان کو اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

پھر اس تلاوت کا بھی اعلیٰ و افضل طریقہ مطلوب یہ ہے کہ قرآن کو نماز کے اندر پڑھا جائے جب کہ انسان اپنی کامل شانِ عبدیت میں ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ سے اس کو انتہائی قربت حاصل ہوتی ہے۔ نماز کے اندر پڑھنے سے آیاتِ قرآنی کا اثر دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ مگر اب تو صورتِ حال یہ ہو چکی ہے کہ نماز کے لیے ان سورتوں کا انتخاب مشکل ہی سے کیا جاتا ہے جو ایک سانس میں ختم نہ ہو سکیں، اور اس پر مزید ستم یہ کہ جو کچھ بھی پڑھا جاتا ہے اس کے مفہوم و مطالب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی روشن ہدایتیں اور اس کی پہاڑوں تک کو تھرتھرا دینے والی قوتیں ہمارے لیے بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔ جس پیمانہ سے ہم نے ان کو ناپا، کیا وجہ ہے کہ اسی پیمانہ سے وہ ہم کو نہ ناپیں!

(۳) لذّاتِ دُنیا سے بے رغبتی

تیسری چیز جو اس سلسلہ میں ضروری ہے یہ ہے کہ انسان دنیوی مرغوبات سے بے نیاز سا خوگر بنتا جائے، خواہ کام و دہن کی لذتیں ہوں خواہ مال و زر کی آرزو یا جاہ و شہرت کی طلب ہو، خواہ اختیار و اقتدار کی ہوس، ذاتی سربلندی کی خواہش ہو خواہ وطنی اور قومی بالاتری کی اُمنگ، ہر شئے سے اپنے کو اونچا کر لے، دُنیا کا کوئی مفاد اپنے اندر اتنی طاقت نہ رکھتا ہو کہ اسے آخرت کے تقاضوں سے غافل بنا دے یا اس کو مجبور کر کے اُسے دُنیا پرستی اور فکرِ آخرت کے درمیان اس طرح کی مصالحت کرانے پر آمادہ کر دے۔ جس کا ذکر اوپر گزر چکا۔ اس سلسلہ میں وہ تقویٰ کی رہ نمائی کرے گا جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار کیا ہوا اور سراہا ہوا فقر ہے اور جس پر آپ نے فخر فرمایا ہے۔ مادیت اور مفاد پرستی کے موجودہ طوفان میں انسان کا اپنے آپ کو اس سے بچالے جانا بلاشبہ بڑا ہی مشکل کام ہے مگر اس مشکل سے بہرحال زیادہ مشکل نہیں جو آنکھیں بند ہوتے ہی سامنے آئے گی۔

ہم ایمان بالآخرت کی اس بحث کو ختم کرتے ہوئے اس ضرورت کی طرف پھر توجہ دلائیں گے کہ اللہ کے دین کی پیروی کا عہد اقامت کا نام لینے سے پہلے ہمیں تمام دوسرے محرکات سے اپنے دلوں کو پاک کر کے صرف آخرت کی بازپرس کے احساس کو سامنے رکھنا چاہیے۔ نیز یہ کہ ایمان بالآخرت میں سے تقلیدی جمود نکال کر اس کے اندر ذاتی معرفت اور بصیرت کی بیدار روح پیدا کر فی چاہیے۔ یقیناً وہ بھی مسلمان ہی تھے جو ہوا کے تیز و تند جھکڑوں کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ بس وہ یوم موعود آ گیا جب ہمیں اپنی کمائی میں سے ایک ایک پائی کا حساب دینا پڑے گا، اور یہ گمان ایک مجسّم خوف بن کر ان کے ذہنوں کو اس طرح گھبرا دیتا تھا کہ وہ پناہ ڈھونڈنے کے لیے مسجد نبوی کی طرف دوڑ پڑتے تھے۔ اور ان کے مقابلہ میں ایک ہم بھی مسلمان ہیں جن کے سکونِ خاطر میں آج

(بقیہ صفحہ (۳۰) پر)

تاریخ دعوتِ اسلام کا ایک زرّیں ورق

مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری

تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے تذکرۂ دعوت میں دعوتِ اسلام کا کام کرنے والوں کے لیے اسوہ موجود ہے لیکن قرآن کریم کے بعض اشارات کی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتوں میں کچھ خاص قسم کی مناسبت و مطابقت پائی جاتی ہے، سورۂ ابراہیم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہو رہا ہے۔

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝ اللَّهِ الَّذِي لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ

اے پیغمبر! ہم نے کتاب (قرآن) کو تمہارے پاس اس لیے بھیجا کہ تم لوگوں کو تاریکیوں کی طرف سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ ان کے پروردگار کے حکم سے (یعنی) اس خدائے غالب اور ستودہ کے راستے کی طرف جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔

اور تھوڑی ہی دور آگے چل کر حضرت موسیٰ کی دعوت کا اس طرح حوالہ دیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ۝

ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ یہ حکم دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لیجا اور انہیں ایام اللہ کی یاد دلا، بیشک اس میں ہر صبر و شکر کرنے والے کیلئے (خدا کی قدرت کی) نشانیاں ہیں،

سورۂ مزمل میں تو کفار مکہ کو مخاطب کر کے کھلے لفظوں میں ارشاد فرمایا گیا ہے

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝

ہم نے تمہاری طرف ایک رسول کو تم پر شاہد بنا کر اسی طرح بھیجا ہے جس طرح فرعون کی طرف ایک رسول (موسیٰ) کو

فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا ۝

بھیجا تھا، سو فرعون نے اپنے رسول کی نافرمانی کی۔ انجام کار ہم نے اسے سخت وبال کی گرفت میں پکڑ لیا۔

ان دونوں دعوتوں کی اس مناسبت خصوصی کی بنا پر ضرورت ہے کہ دعوت اسلامی کے کارکن حضرت موسیٰ کے تذکرۂ دعوت کا خاص طور پر غور و تعمق کے ساتھ مطالعہ کریں۔

حضرت موسیٰؑ کی ولادت

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں سے تھے، اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے آپ کنعان کے باشندے تھے جو اب تک فلسطین کہلاتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام آپ کے بیٹے تھے، حضرت یوسف کے سوتیلے بھائیوں نے از راہِ رشک و حسد آپ کو کنوئیں میں ڈال دیا۔ اور ایک تجارتی قافلے نے آپ کو کنوئیں سے نکالا اور مصر لے جاکر وہاں کے وزیر سلطنت کے ہاتھ فروخت کر دیا حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی پیغمبرانہ سیرت و کردار اور دانش و بصیرت کے باعث بادشاہ مصر کی نظر میں اس قدر اعتماد و احترام حاصل کر لیا کہ اس نے ملک کے نظم و نسق کا پورا اختیار آپ کے سپرد کر دیا، اس طرح اختیار و اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے خاندان کو کنعان سے مصر بلا لیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل جب تک خدائی نظام حیات پر کاربند رہے اور خدا پرستانہ اخلاق و عمل ان کا شعار زندگی رہا، ان کو مصر میں عزت و سربلندی حاصل رہی، لیکن جب انھوں نے خدا کے تعلیم کردہ طریق زندگی کو ترک کر دیا اور خدا پرستی و نیک عملی کی بجائے ہوا و ہوس کی غلامی اور بداعمالی میں مبتلا ہو گئے تو خدا نے ان کو تمام شرف و امتیاز سے محروم کر دیا اور مصر میں ان سے زیادہ ذلیل و خوار کوئی دوسری قوم نہ رہی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے بنی اسرائیل کی زبوں حالی اور بیچارگی کی کیفیت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے،

نَتْلُوْا عَلَیْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰی وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَیَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ (پارہ ۲۰- القصص)

ہم تم کو موسیٰ اور فرعون کے کچھ سچے حالات اہل ایمان (کی عبرت پذیری) کے لیے سناتے ہیں، فرعون سرزمین مصر میں سرکش ہو رہا تھا اس نے وہاں کے باشندوں کو متعدد گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اس میں سے ایک گروہ کو اس نے کمزور بنا رکھا تھا اس گروہ میں جو بیٹے پیدا ہوتے ان کو وہ ذبح کروا ڈالتا اور جو لڑکیاں پیدا ہوتیں ان کو زندہ چھوڑ دیتا بیشک وہ مفسدین میں تھا۔

منکرین خدا تو کائنات کے ظہور و خلقت ہی کو ایک اتفاقی واقعہ قرار دیتے ہیں، پھر اقوام و ممالک میں جو انقلابات و حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں ان کے بارے میں خدا کے ارادے اور اس کی مشیت کا کیا ذکر؟ وہ تو جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہیں کانوں سے سنتے ہیں، اور تاریخ کے صفحات میں پڑھتے ہیں، انھیں سے قوموں اور ملکوں کے انقلابات

حوادث کے اسباب و نتائج اخذ کرتے ہیں، مدعیان عقل و دانش کی اس سے بڑی عقل باختگی اور بے دانشی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ خلق کی موجودگی میں خالق کا انکار کرتے ہیں، اور ان میں جو خالق کو مانتے بھی ہیں وہ مخلوق کے متعلق ظہور پذیر ہونے والے واقعات و حوادث میں خدا کے ارادے اور اس کی مشیت کو نہیں مانتے، لیکن کائنات کی سب سے بڑی حقیقت خدا اتنی ہے اور کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے سب خدا کے ارادے اور اختیار سے ہو رہا ہے، چنانچہ جب کبھی کوئی مدعی وحی و نبوت دنیا میں موجود رہا اس نے اپنی قوم میں رونما ہونے والے واقعات و حوادث کے متعلق بتایا کہ وہ کس طرح خدا کی مشیت اور اس کے ارادے سے ظہور میں آ رہے ہیں، بلکہ اس نے کتنے آئندہ پیش آنے والے واقعات و حوادث کی بھی خبر دی۔ جو ٹھیک وقت پر ظہور میں آ کر رہے، اگر وحی و نبوت کا سلسلہ خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نہ ہو چکا ہوتا، اور کوئی پیغمبر موجود ہوتا تو وہ آج بھی بتا سکتا تھا کہ جو واقعات پیش آ رہے ہیں ان کے وجوہ و اسباب کیا ہیں اور ان کے ظہور میں کس طرح خدا کی مشیت کار فرما ہے۔ بنی اسرائیل کے آلام و مصائب اور فرعونیوں کے ظلم و جور کی انتہا ہو گئی تو بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کی تعزیر کے لیے ارادۂ الٰہی حرکت میں آیا، چنانچہ ارشاد ہے۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝

ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو سرزمین مصر میں کمزور کر دیے گئے تھے، اور ان کو امام بنا دیں اور وارث ٹھہرائیں اور زمین میں ان کو قوت و استحکام عطا کریں اور ان کے ذریعہ فرعون اور ہامان اور ان کی افواج کو وہ چیز دکھا دیں جس سے وہ ڈرتے رہتے تھے۔

(پارہ ۲۰۔ القصص)

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اقوام و ملل کو پیش آنے واقعات و انقلابات کی نسبت اکثر خدا نے اپنی جانب کی ہے، خود حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو جو واقعات پیش آئے، ان کے متعلق قرآن مجید نے اسی حقیقتِ حال کا اظہار کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے اسی دورِ تعذیب و ابتلاء میں پیدا ہوئے جب فرعون بنی اسرائیل کے نومولودوں کو بے دریغ قتل کرا دیا کرتا تھا، اس لیے حضرت موسیٰ کی ماں شدتِ اندوہ و غم سے آپ کو دودھ تک نہ پلا سکتی تھیں، سوچتی تھیں نہ معلوم کب فرعون کو خبر ہو جائے اور وہ نومولود کی شمعِ حیات کو گل کر دے، لیکن

وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی ماں کو الہام فرمایا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے نہ فکرمند ہوں کسی طرح کا غم کریں اطمینان سے دودھ پلائیں، اور اگر انہیں ایسا ہی خوف دامن گیر ہو تو وہ حضرت موسیٰ کو صندوق

میں بند کر کے، صندوق کو دریا میں ڈال دیں دریا کی لہریں صندوق کو ساحل پر پہنچا دیں گی اور صندوق کو فرعون کے گھر والے اٹھالیں گے اور بالآخر خدا حضرت موسیٰ کو ان کے پاس لوٹا دے گا۔ فَإِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِي وَلَا تَحْزَنِي إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ وَجَاعِلُوهُ مِنَ الْمُرْسَلِينَ (پھر جب تو بچے کے بارے میں ڈرے تو اسے دریا میں ڈال دینا اور کسی طرح کا خوف اور غم نہ کرنا ہم اس کو تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اسے رسول بنائیں گے)

حضرت موسیٰ کی ماں نے ارشاد الٰہی کے مطابق عمل کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا صندوق دریا میں بہتا بہتا شاہی محل کے قریب پہنچا اور فرعون کے گھر والوں نے صندوق کو دریا سے نکال لیا، صندوق کھولا گیا تو اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام موجود تھے فرعون کو خیال ہوا کہ نہ جانے یہ کیسا بچہ ہے اور پرورش پاکر یہ کیسا ثابت ہو اس لیے اگر آپ کو قتل کرادے لیکن مشیت الٰہی کے خلاف کیوں کر ہوسکتا تھا۔ فرعون کی بیوی کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیکر معصومیت پر پیار آگیا۔

وَقَالَتِ امْرَأَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝

فرعون کی بیوی نے کہا یہ بچہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرو کچھ بعید نہیں جو یہ ہمارے کام آئے یا ہم اسے بیٹا بنالیں یہ سب (انجام کار سے) بے خبر تھے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے ارشاد الٰہی کی تعمیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا کے حوالے تو کردیا لیکن دل قابو میں نہ تھا۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو حکم دیا کہ وہ صندوق کے پیچھے پیچھے جائیں اور دور سے دیکھتی رہیں کہ صندوق کے ساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے، چنانچہ وہ اسی طرح شاہی محل میں داخل ہوگئیں، وہاں یہ حالت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر دائیوں کا دودھ روک دیا تھا وہ کسی دائی کا دودھ پیتے ہی نہ تھے اس لیے فرعون کے گھر والے پریشان تھے کہ بچے کی پرورش کے لیے کیا صورت کریں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن کو موقع مل گیا انھوں نے کہا اگر حکم ہو تو میں ایسے گھر والوں کا پتہ بتاؤں جو اس بچے کی اچھی طرح پرورش کرسکتے ہیں اور اس کی خیر خواہی کا پورا پورا حق ادا کرسکتے ہیں، فرعون کے گھر والوں نے یہ تجویز منظور کرلی اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں شاہی محل میں بلوائی گئیں اور آپ ان کے سپرد کر دیے گئے، اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو اس طرح ذکر فرمایا ہے۔

فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

پس ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ (ہر حال میں) سچا ہو کر رہتا ہے لیکن بہت سے لوگ اسے نہیں جانتے۔

یہاں ایک خاص بات قابل غور ہے، آپ اوپر دیکھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں سے فرمایا تھا کہ اگر تجھے اپنے بچے کی جان کا خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا ہم اسے تیرے پاس لوٹا دیں گے إِنَّا رَادُّوهُ إِلَيْكِ

یہاں فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا تھا لیکن بہت سے لوگ اس بات کی حقیقت سے غافل ہیں کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔

یہاں ہمارے لیے غور طلب بات یہ ہے کہ کیا ہم مسلمانوں سے بھی اللہ تعالیٰ کے کچھ وعدے ہیں؟ اور کیا ہم مسلمانوں کا طرزِ عمل اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ خود ہم بھی (ولکن اکثر الناس لا یعلمون) کے حکم میں نہیں آتے؟ آج ہم بھی تو صرف ظاہری اور مادی ساز و سامان پر نظر رکھتے ہیں اور اسی کے مطابق ہمارے فیصلے اور عمل ہوتے ہیں ہمارے نزدیک نہ خدا کے احکام کی اہمیت باقی ہے اور نہ خدا کی نصرت و یاری پر ہمارا اعتماد ہے۔ قرآن مجید میں ہمارے متعلق خدا کے وعدے بھی ہیں اور اس کی وعیدیں بھی لیکن یہ کتنی محرومی اور نامرادی کی بات ہے کہ ہم مسلمان خدا کی نافرمانی کر کے اس کی وعیدوں کے ہدف تو بن رہے ہیں لیکن ہم سے یہ نہیں ہوتا کہ خدا کی فرماں برداری کر کے اس کے وعدوں کے مستحق بنیں، خدا کے قوانین مسلمانوں کی خاطر سے معطل تو ہو نہیں سکتے وہ بہر حال نافذ اور جاری رہیں گے اگر مسلمان خدا کے فرماں بردار ہوتے تو ان کے حق میں ان قوانین کا نفاذ و اجرا ہوتا جو خدا کے فرماں بردار بندوں کے لیے ہیں، لیکن اگر وہ اس کے برعکس خدا کی نافرمانی کر رہے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کے لیے عقوبت و سزا کے قوانین اپنا کام کریں، مسلمان اس حقیقت سے غافل ہیں۔ وہ اپنے اعمال و اخلاق کی طرف تو نظر نہیں کرتے نہ اصلاح حال کی کوشش کرتے ہیں، وہ اپنے آلام و مصائب اور اپنی ہلاکت و تباہی کا تمام تر ذمہ داران لوگوں کو قرار دیتے ہیں جو ان کے لیے عقوبت و سزا کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

حضرت موسیٰ کا مصر سے خروج

حضرت موسیٰ علیہ السّلام فرعون کے محل میں پرورش پا کر سن بلوغ کو پہنچ گئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو علم و حکمت سے بہرہ ور فرمایا جیسا کہ ارشاد ہے۔

فَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے یہ بات مخفی نہ تھی کہ وہ بنی اسرائیل سے ہیں، اب آپ عمر اور ربانی علم و حکمت کے جس مقام پر پہنچ چکے تھے اس کی بنا پر یہ ناممکن تھا کہ فرعون اور اس کی قوم کی جانب سے بنی اسرائیل پر جو مظالم ڈھائے جا رہے تھے ان سے آپ کے جذبات و احساسات مجروح نہ ہوتے اور بنی اسرائیل کی مجبوری و بے چارگی آپ کے قلب مبارک میں درد و خلش پیدا نہ کرتی، چنانچہ آپ ایک روز رات کے سناٹے میں شہر میں نکلے تو ایک مقام پر دیکھا کہ دو شخص باہم لڑ رہے ہیں جن میں سے ایک اسرائیلی تھا اور ایک فرعونی، فرعونی اسرائیلی کو زبردستی بیگار میں دھرنا چاہتا تھا، اور اسرائیلی انکار کر رہا تھا، اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو پکارا اور مدد کی درخواست کی حضرت موسیٰ اکثر فرعونیوں کے ظلم و تشدد کے واقعات دیکھتے رہتے تھے اس لیے آپ کا غصہ حدِ ضبط سے باہر ہو گیا اور آپ نے فرعونی کو اس زور کا گھونسہ مارا کہ اس کا کام تمام ہو گیا، آپ کا مقصد فرعونی کو ہلاک کرنا نہ تھا، آپ صرف اسرائیلی کو اس کی گرفت سے نجات دلانا چاہتے تھے، لیکن جب وہ آپ کے ایک ہی گھونسہ سے ہلاک ہو گیا تو آپ اپنی سخت گیری پر بہت نادم اور پشیمان ہوئے اور

اسی وقت خدا کی جناب میں استغفار کیا، کہ اے پروردگار میں نے اپنے اوپر ظلم کیا، تو تو مجھے بخش دے۔

صبح کو حضرت موسیٰ علیہ السّلام شہر میں نکلے تو ڈرتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ کہیں کل کے واقعہ کا لوگوں کو علم تو نہیں ہو گیا ہے، اور ان کے خلاف کوئی کارروائی تو نہیں ہو رہی ہے کہ پھر وہی کل والی صورت پیش آئی، جس شخص نے حضرت موسیٰ سے کل مدد مانگی تھی اور اس کی وجہ سے ایک سخت حادثہ ہو گیا تھا آج پھر ایک فرعونی کے مقابلہ میں آپ سے مدد کی درخواست کر رہا تھا۔ آپ نے اسے ڈانٹ کر فرمایا تو بڑا نالائق آدمی معلوم ہوتا ہے۔ تاہم چونکہ حضرت موسیٰ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ فرعونیوں کی طرف سے اسرائیلیوں پر مظالم ہوتے رہتے ہیں اور اسرائیلی بہرحال مظلوم ہیں، اس لیے آپ نے اسرائیلی کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا، اسرائیلی نے سمجھا آپ اسی پر خفا ہوئے ہیں اور اسی پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اگلے روز کا سماں اس کی نظروں میں تھا، وہ چلا اٹھا، — موسیٰ کیا تم چاہتے ہو کہ جس طرح تم نے کل ایک آدمی کو مار ڈالا اسی طرح مجھ کو مار ڈالو، تمہارا مقصد امن و اصلاح نہیں بلکہ تم جابر اور متشدد بن کر رہنا چاہتے ہو۔

اب تک کسی کو پتہ نہ تھا کہ کل کے فرعونی کا قاتل کون ہے، لیکن اس شخص کے شور کرنے سے لوگوں کو اس کی خبر ہو گئی، یہ خبر فرعون کے دربار تک بھی پہنچی، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے ہاتھ سے دار السلطنت میں شاہی قوم کا ایک فرد مارا جائے اور حضرت موسیٰ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے، فوراً دربار میں اس مسئلے پر غور ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے قتل کا فیصلہ کر دیا گیا، دربار میں ایک شخص حضرت موسیٰ کا معتقد تھا وہ بھاگا ہوا آپ کے پاس آیا اور اس نے آپ کو اطلاع دی کہ امرار دربار آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں اس لیے آپ کو میرا خیر خواہانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ فوراً سرزمین مصر سے نکل جائیں۔

اس اطلاع کے بموجب حضرت موسیٰ علیہ السّلام مصر سے مدین کی طرف روانہ ہو گئے، اور مسافت کی سختیاں اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے حضرت شعیب علیہ السّلام کے پاس پہنچے جو خدا کے پیغمبر اور اہل مدین کے امام و پیشوا تھے

فَلَمَّا جَاءَهُ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ
لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ
(پارہ ۲۰۔ القصص)

تو جب موسیٰ شعیب کے پاس پہنچے اور ان سے سرگزشت
بیان کی تو شعیب نے کہا، اب کسی طرح کا خوف نہ کرو تم
ظالم لوگوں سے نجات پا گئے۔

حضرت شعیب علیہ السّلام کی دو صاحبزادیاں تھیں آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے فرمایا، " میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک بیٹی سے اس شرط پر تمہارا نکاح کر دوں کہ تم آٹھ برس تک میری نوکری کرو اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے احسان ہوگا اور اس کے بارے میں تم پر کسی طرح کا جبر نہیں کروں گا۔ انشاءاللہ تم مجھے ایک بھلا آدمی پاؤ گے "

حضرت موسیٰ نے کہا — " یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے پا گئی (مجھے اس کا اختیار ہوگا کہ) میں ان

دونوں مدتوں میں سے جو مدت بھی چاہوں پوری کر دوں، مجھ پر کسی طرح کی زیادتی نہ کی جائے، اور ہم نے جو بات طے کی ہے اس پر اللہ شاہد ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو فرعون جیسے متمرد اور سرکش فرماں روا کے مقابلے میں کھڑے ہو کر اسلام کی دعوت پیش کرنی تھی اس کے ظلم و عدوان کے خلاف عدل و حریت کا نعرہ بلند کرنا تھا اور بنی اسرائیل جیسی عظیم الشان قوم کی اصلاح و ہدایت کا اہم ترین فرض انجام دینا تھا اس لیے قدرت کی کرشمہ سازیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی پرورش جسمانی تو خود فرعون کی آغوش میں کرائی اور اب روحانی تربیت کے لیے ایک پیغمبر کی ہم نشینی کا سامان کر دیا، سچی حریت و آزادی کیا ہے؟ اور حقیقی تہذیب و انسانیت کسے کہتے ہیں؟ اس کا علم و اندازہ مصنوعی تہذیب و تمدن کے مرکز میں نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ایسی ہی فضا درکار تھی جو ایسے مرکز سے دور ہو اور مدین میں آکر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو یہ فضا میسر آگئی گو مدین بھی وقت کی تہذیب و مدنیت سے بالکل خالی نہ تھا بایں ہمہ نبوت کدہ، نبوت کدہ تھا۔

حضرت موسیٰ نے وہ مدت پوری کر دی جو آپ اور حضرت شعیب کے درمیان طے پائی تھی تو آپ نے اپنی اہلیہ محترمہ کو ساتھ لے کر مدین سے کوچ فرمایا، راستے میں جب آپ کوہِ طور کے دامن میں پہنچے تو رات ہو چکی تھی سردی بھی پڑ رہی تھی اور راستے کا پتہ بھی نہ چلتا تھا، کچھ دور پر آگ روشن نظر آئی حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ تم یہیں ٹھیرو میں آگ کے پاس جا رہا ہوں میں وہاں سے تمہارے تاپنے کے لیے تھوڑی آگ بھی لے آؤں گا، اور امید ہے کہ وہاں سے راستے کا پتہ بھی چل جائے گا، یہ کہہ کر آپ اس مقام پر گئے جہاں آگ روشن نظر آئی تھی تو وہاں اور ہی معاملہ پیش آیا، سولہویں پارے سورۂ طٰہٰ آنحضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اس واقعہ کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے۔

هَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ إِذْ رَاٰ نَارًا
فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوْٓا إِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا
لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى
النَّارِ هُدًى ۝ فَلَمَّآ أَتٰهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝
إِنِّيْٓ أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ إِنَّكَ
بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَأَنَا اخْتَرْتُكَ
فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ إِنَّنِيْٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ
إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ
لِذِكْرِيْ ۝ إِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيْهَا

کیا تمہیں حضرت موسیٰ کا وہ واقعہ نہیں معلوم جب انھوں نے آگ دیکھی تو اپنی بیوی سے کہا تم ٹھیرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں تمہارے لیے اس میں سے کچھ انگارہ لاؤں یا اس آگ کے پاس سے راستے کا کچھ پتہ لگا لاؤں پھر جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو ندا دی گئی کہ اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں پس اپنی جوتیاں اتار دو تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو اور میں نے تم کو اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے، پس تمہیں جو وحی کی جاتی ہے اسے سنو، بے شبہ میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں لہذا میری ہی بندگی بجا لاؤ اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو بیشک قیامت آنے والی ہے میں

لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی ○ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰی ○ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰی ○ قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی ○ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰی ○ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰی ○ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰی ○ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰی ○ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰی ○ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ○

چاہتا ہوں کہ اس (کے وقت) کو پوشیدہ رکھوں تاکہ ہر ذات کو اس سعی کا جو وہ کرتا ہے بدلہ دیا جائے پس وہ شخص جو اس (دن) پر یقین نہیں رکھتا اور اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے تجھ کو اس (کی تیاری سامان) کرنے سے روک نہ دے، (پس ایسا ہوا تو تم ہلاک ہو جاؤگے اور اے موسیٰ یہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ موسیٰ نے جواب دیا، یہ میری لاٹھی ہے میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے اور بھی کئی طرح کے فائدے ہیں، خدا نے کہا، اے موسیٰ اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو موسیٰ نے اسے ڈال دیا۔ پس وہ یکایک سانپ بن کر دوڑنے لگا، خدا نے کہا اسے پکڑ لو اور خوف نہ کرو میں اسے ابھی پہلی حالت پر لوٹا دوں گا (ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور اپنا ہاتھ اپنے بازو سے ملا لو (وہ) کسی عیب کے بغیر سفید روشن نکل آئے گا یہ دوسرا معجزہ ہے (جو میں نے دیا) اور یہ اس لیے کہ ہم آئندہ تمہیں اپنی قدرت کی بڑی نشانیاں تمہیں دکھائیں، اب تم (یہ نشانیاں لے کر) فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ حد سے گزر چکا ہے۔

خدا کا جو بھی حکم ہو تقاضائے بندگی یہ ہے کہ اپنے کو اس کی بجا آوری کے لیے پیش کر دیا جائے اور اگر اپنے اندر کوئی کمزوری محسوس ہو یا احساس بے سر و سامانی سد راہ ہو تو اس کے لیے اللہ سے التجا کی جائے، جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی کمزوریوں کے پیش نظر اللہ کی جناب میں التجا کی۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ○ وَيَضِيْقُ صَدْرِیْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ○ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ○ قَالَ كَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ○ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ ○

پروردگار! مجھے خوف ہے کہ وہ میری (رسالت کی) تکذیب کریں، میرا سینہ (اس کار عظیم کی ذمہ داری کے احساس سے) تنگ ہوتا ہے، اور (لکنت کی وجہ سے) میری زبان نہیں چلتی لہٰذا (میری معیت و تقویت کے لیے) ہارون کو بھی (حکم) بھیج دیجیے، مجھ پر ان کے ایک (قتل کا) دعویٰ بھی ہے، اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے بھی (انتقاماً) ہلاک کر ڈالیں، ارشاد ہوا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ رہ کر تمہارے حالات دیکھتے سنتے رہیں گے۔ لہٰذا اب تم فرعون کے پاس جاؤ، اور اس سے کہو کہ ہم (تیرے پاس) پروردگار عالم کی طرف سے اس بات کا پیغام لائے ہیں کہ تو ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔

اصغر علی عابدی صاحب

ہندوستان دوراہے پر

(۳)

اگر خدا پرستوں کا غلبہ ہو جائے اب دیکھیے کہ خدا پرستانہ نظام کے چھا جانے سے بھارت میں زندگی کی کون سی قدریں ابھریں گی اور کس قسم کے واقعات ظہور میں آئیں گے۔

(۱) خدا پرستی کے غلبہ کا پہلا اور بنیادی نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ بھارتی عوام کے مذہبی جذبات کو تقویت پہنچے گی اور ہر شخص خدا پرستانہ طریق پر بہتر سے بہتر زندگی گزارنے کی فکر میں لگ جائے گا۔ اس طرح بھارت کے لوگوں کے فطری اور تاریخی حق کا تحفظ ہوگا اور وہ مذہب کو چھوڑنے پر مجبور ہونے کی بجائے اس کی اصلاح، تجدید، اور مذہبی انقلاب کے عنوانات پر غور کرنے لگیں گے۔ خدا پرستانہ نظام زندگی چونکہ کسی مذہبی عقیدے یا مادہ پرستانہ عقیدے کو جبراً اور بہ زور بدلنا نہیں چاہتا، اس لیے وہ کوئی مصنوعی طریقہ ایسا اختیار نہ کرے گا جس کے ذریعہ لوگوں کو کسی ایک نظریہ کا غلام بنایا جائے اور ایک نئے مسلک کا قلادہ زبردستی اُن کی گردن میں ڈال دیا جائے۔ اس کے برعکس خدا پرستانہ نظام میں تمام انسانوں کو اپنے عقائد پر چلنے، اپنے اپنے معاشرتی اصولوں کا تحفظ کرنے، اور اپنی اپنی قومیتوں اور تاریخی تہذیبوں کا رکھ رکھاؤ کرنے کی پوری پوری آزادی حاصل ہوگی، حتیٰ کہ مختلف گروہ اپنے سماجی دائروں میں اپنا قانون نافذ کرسکیں گے اور اپنے ضابطہ فوجداری کے مطابق اپنی برادری کے لوگوں کو سزائیں دلواسکیں گے۔ خدا پرستانہ اسٹیٹ ان کو اس طرح آزادی دینے کے باوجود بیرونی حملوں سے اُن کی حفاظت اپنے ذمہ فرض سمجھے گا، اور بہت قلیل معاوضہ پر اُن کی جان، مال، عزت، آبرو، اور عبادت گاہوں کی نگرانی کرے گا۔ خدا پرست اسٹیٹ میں کسی شخص کی وفاداری یا غیر وفاداری جانچنے کے لیے اس کو اسٹیٹ کے ساتھ فوجی تعاون کرنے یا کوئی اور خدمت انجام دینے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس پر کوئی بھاری بوجھ ڈالنے سے ہمیشہ پرہیز کیا جائے گا۔ خدا پرستانہ سماجی نظام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ایک خدا تمام انسانوں کا مالک، آقا، اور حاکم ہے اس لیے اس کے راج میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر ظلم اور زیادتی کا حق نہیں پہنچتا، خدائی نظام میں سب کے لیے بھلائی ہونا ضروری ہے۔

(۲) دوسری اہم تبدیلی یہ ہوگی کہ بھارت کے اندر جو اخلاقی قدریں اور مذہبی حقائق بکھرے پڑے ہیں وہ منظم ہو کر

خدا پرست سماج میں عورت مرد کا ملاپ وقتی اور عارضی ہونے کے بجائے محبت اور پریم کی دائمی بنیادوں پر رکھا جائے گا۔ اور ہر عورت اور ہر مرد کو باہر کے اسٹیٹ کے علاوہ گھر کے اندر بھی ایک "اسٹیٹ" بنانے کا حق دیا جائے گا جس کے اندر چھوٹا سا معاشی سسٹم ہوگا، چھوٹا سا اخلاقی نظام ہوگا، چھوٹے پیمانہ کی سیاست ہوگی، اور چھوٹے سے دائرے میں رہنما اور پیرو ہوں گے، خاندانی نظام کے اس دائرے کو خدا پرستانہ نظام زندگی پورے ملک کے سماجی نظام کے لیے ایک یونٹ (اکائی) قرار دے گا۔ اس یونٹ یا اکائی کی ترقی پر بھارتی تمدن کی ظاہری ترقی اور اٹھان کا انحصار ہوگا۔ گھر کے اس چھوٹے سے تجربہ خانے میں جو نئے نئے تمدنی اصول بنیں گے وہ سوسائٹی کی جان ہوں گے، اور اس طرح کے لاکھوں کروڑوں "ٹریننگ سنٹروں" سے تربیت یافتہ جو سپوت باہر آئیں گے وہ بڑے پیمانے پر زندگی کے نظام کو کامیابی سے چلا سکیں گے۔ اسی لیے آزادانہ میل ملاپ کے ایسے تمام طریقے سخت جرم سمجھے جائیں گے جو اس سماجی نظام کی اینٹوں کو اپنی جگہ سے اکھیڑنے والے اور اس سوشل سسٹم کی عمارت کو گرانے والے ہوں گے جنسی مزاج اور بوالہوسی کو حکومت نہایت سختی کے ساتھ روکے گی۔

(۴) خدا پرستانہ عہد میں بھارت میں جو معاشی اصول رائج ہوں گے۔ ان کے ذریعہ حکومت ایک ایک شخص کو روٹی کپڑا اور مکان فراہم کرنے کی غیر مشروط ذمہ داری لے گی۔ اس کے بعد وہ ہر فرد کو ہر طرح کی آزادانہ تجارت اور کاروبار کی آزادی دے گی، لیکن ایسے تمام طریقوں کو سختی سے روکے گی جو ایک شخص کی جیب میں اس کے واقعی حق سے زیادہ دولت پہنچانے والے ہوں، سود خواری، بلیک مارکٹنگ، معاشی لوٹ کھسوٹ ( ) اور اس اختیار کی تجارت جو سماج کے لیے نقصان دہ ہو، سختی سے بند کی جائے گی۔ ( ) "مہذب چوری" اور "غیر مہذب چوری" کے راستے میں بڑے بڑے پتھر حائل کیے جائیں گے، اور "قانون کے سخت ہاتھ کے ذریعہ بھی انہیں روکا جائے۔ دوسری طرف سوسائٹی کے ایک ایک فرد کے عام اخلاق کو اس قدر بلند کیا جائے گا کہ اگر کسی کے پڑوس میں کوئی بھوکا ہو تو وہ جب تک پڑوسی کو کھانا نہ کھلائے چین کی نیند نہ سو سکے۔ مالدار تاجروں، کارخانہ داروں اور صاحب الفقدر راحت پیشہ لوگوں کے مال میں سے ایک خاص حد پر ٹیکس کے ایسے لوگوں کے لیے جو معاشی دوڑ میں ان سے پیچھے رہ گئے ہوں، ایک حصہ الگ کر لیا جائے گا، اور صرف ایسے ہی بے زر لوگوں پر صرف کیا جائے گا۔ اس طریقہ سے سوسائٹی کے غریب اور مفلوک الحال افراد کا معیار زندگی بلند ہوگا اور ان کی مالی حالت بہتر سے بہتر ہوتی چلی جائے گی خدا پرستانہ عہد کی معاشی زندگی کا بنیادی اصول یہ ہوگا کہ "ہر شخص اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق کمائے، لیکن جن لوگوں میں صلاحیت کم ہے ان کا حق اپنے مال میں سے نکال دے۔ یہ اس لیے کہ اس کے اندر جو صلاحیتیں زیادہ ہیں وہ خدا کی دین ہیں، اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی وجہ سے جو کچھ وہ زیادہ پیدا کرے اس کا ایک حصہ خدا کے ان بندوں کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے جن کو اس نے کم صلاحیتیں دی ہیں۔

اس طریقے سے سارے ایک طرف انفرادی ملکیت ( ) کا حق بھی مل جاتا ہے اور

پنے اندر ایک اثر پیدا کریں گے۔ خدا پرست ریاست کی   اور ابدی حقائق (   ) پر رکھی
ئے گی۔ جن کو پہلے سے سب جانتے ہیں۔ اور بچہ بچہ تک ان کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس ریاست میں
عالمگیر قدریں مرتب اور منظم ہو کر ایک خاص   اختیار کر لیں گی۔ ان کی اس ترتیب سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے
نیا میں اس وقت جو نظامات چل رہے ہیں اُن کا دار و مدار برائی کی مختلف قدروں کی منظم شکل پر رکھا گیا ہے۔ اس کے برعکس اگر
چھائی کی مختلف قدروں کو منظم کر دیا جائے تو اس سے گھبرانے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔ بھارت کے سب لوگ جھوٹ بولنے
کو برا سمجھتے ہیں۔ چوری کرنے کو برا سمجھتے ہیں زنا کرنے کو برا سمجھتے ہیں رشوت اور بلیک مارکٹنگ کو برا سمجھتے ہیں، سود خواری کو
برا سمجھتے ہیں یہ لوگ ایشور کو مانتے ہیں اور سخت قسم کے مذہبی ہیں۔ لیکن ان تمام چیزوں کو مانتے ہوئے بھی جب سب مل کر ایک راج
بناتے ہیں تو اس میں یہ ساری برائیاں رچ بس جاتی ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے —؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بھارت کے لوگوں
کے سامنے اس وقت کوئی سوشل نظام ایسا نہیں ہے جو اچھائیوں کی بنیاد پر بنا ہو۔ اس لیے وہ مجبوراً اسی نظام کو ماننے لگے
ہیں جو برائی کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ خدا پرستانہ نظام ان کی اس ضرورت کی تکمیل کر دے گا وہ نظام ایک ایک شخص
کے دل کی آواز ہوگا اور تمام اچھائی پسندوں کا نمائندہ نظام ہوگا۔ اس نظام میں برائیاں دبیں گی اور اچھائیاں ابھریں گی
بد اخلاقی مٹے گی اور خوش اخلاقی ابھرے گی۔ ظلم، ناانصافی، اور بد معاشگی ختم ہوگی، اور عدل و انصاف پریم اور خوش معاشگی
میں جان پڑ جائے گی۔ الغرض تمام اچھی باتوں کے پرچار کی عام اجازت ہوگی کہ چاہے وہ کسی مذہب اور کسی دنیا سے تعلق رکھتی
ہوں۔ اور ایک ایک فرد کو بلا امتیاز نسل و ذات، اور مذہب یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اگر حکومت کے بڑے سے بڑے عہدیدار
میں بھی کوئی برائی دیکھتا ہے تو اسے پبلک پلیٹ فارم سے کہہ سکتا ہے۔ خدا پرستانہ اسٹیٹ میں اسٹیٹ کا مفاد اور اس کی
پالیسی سے زیادہ اعلیٰ اخلاق اور اس کا مفاد عزیز ہوگا۔ اور بڑی سے بڑی شخصیت کی خاطر بھی اُسے دبایا نہ جا سکے گا۔ شخصیت
چھوڑی جا سکتی ہے، حکومت کے کارندے اپنی جگہ سے ہٹائے جا سکتے ہیں، مگر اخلاق اور سچائی کے اصولوں کا بال تک بیکا
نہیں ہو سکتا۔

(۴) اس طرح کے اخلاقی نظام کے تحت جو معاشرتی ڈھانچہ بنے گا اُس میں عورت اور مرد کے کام کرنے اور ترقی کرنے
کے دائرے الگ الگ ہوں گے۔ اس میں ایک دائرہ دوسرے دائرہ پر منطبق نہیں ہو سکے گا عورت، عورت رہے گی، اور مرد
مرد رہے گا۔ عورت اپنا کام کرے گی اور مرد اپنا کام کرے گا، دونوں انسانی سماج کی گاڑی کے دو مختلف پہیے ہیں
اس لیے ان پہیوں کو ایک طرف کے دھرے پر لگانے کے بجائے اپنی اپنی جگہ پر لگایا جائے گا۔ تاکہ گاڑی چلے اور
پوری رفتار سے چلے۔ بھارت کے خدا پرستانہ اسٹیٹ میں عورت کے تمام حقوق کا تحفظ کیا جائے گا، حتیٰ کہ اس بات کی حفاظت
کی جائے گی کہ کوئی اس پر نظر بد تک نہ ڈال سکے، اس کی عزت، اس کی عصمت، اور اس کی مال و دولت کی اسٹیٹ نگراں
ہوگی۔ بھارت کی ہر عورت کو حقوق خود اختیاری حاصل رہیں گے۔ وہ اپنی مرضی کو استعمال کرنے میں بالکل آزاد ہوگی، اور
جس مسلک اور عقیدے کی وہ پیرو ہوگی اس کے مطابق اس کا حق دلایا جائے گا۔

ایک شخص کی انفرادی آزادی اور جدوجہد پر کوئی اثر نہیں پڑتا دوسری طرف سرمایہ داری کی طرح تمنّاؤں سے انحراف بھی پیدا نہیں ہوتے کیوں کہ ذاتی ملکیت ایک خاص حد کے اندر رہتی ہے اور خاص خاص اصولوں کے مطابق ترقی کرتی ہے۔ جس سے صرف کمانے والے شخص کو فائدہ پہنچنے کے بجائے پوری سوسائٹی کو مسلسل فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔

خدا پرستانہ نظام کو ماننے والوں میں جائداد کی تقسیم کا اصول بھی رائج ہوگا، اور ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کے ورثا میں چاہے وہ عورت ہوں یا مرد جائداد تقسیم کر دی جائے گی اس طریقہ سے زمینداری اور جاگیرداری کی تمام تکلیف دہ شکلیں ختم ہو جائیں گی۔

خدا پرستانہ نظام زندگی اسٹیٹ کی تمام اشیاء، پیداوار کے ذرائع، حتیٰ کہ انسانی جسم و جان سب کو خدا کی ملک قرار دیتا ہے، اور اس اعتبار سے بظاہر وہ اشتمالی ( ) نظر آتا ہے لیکن چونکہ وہ ان سب چیزوں کو انسانوں کے کسی گروہ کو چاہے وہ کمزوروں کا ہو یا حکوموں کا مالک نہیں قرار دیتا، بلکہ ہر چیز کو حتیٰ کہ ایک شخص کی اپنی جان اور جسم کو بھی خدا کی امانت قرار دیتا ہے اور ہر فرد کو اپنے ہی جیسے دوسرے فرد یا مجموعہ افراد کی دست بُرد سے بچاتا ہے اور آزاد رہ کر کام کرنے کی اجازت دیتا ہے، اس لیے وہ قطعاً کلیت پسندانہ یا اشتمالی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک قدرتی جمہوریت ہے جس میں جمہوریت کے تمام صالح اجزاء موجود ہیں۔

خدا پرستانہ اسٹیٹ عوامی راج، او جنتا راج کے نعرے لگا کر خود انسانوں کی تمام جائدادوں پر قابض نہیں ہو جاتا بلکہ وہ صرف " خدائی راج " کا نعرہ لگاتا ہے، اور انسان کی معاشی اور اقتصادی زندگی میں اس کو دوسرے انسانوں کی ناجائز اغراض کی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔ اور تمام انسانوں کی باہمی ہمدردی کے اصول پر معاشی ضابطہ بندی کرتا ہے۔ جب بھارت میں خدا پرستانہ نظام رائج ہو جائے گا تو سرمایہ داری کی تباہ کاریاں رہیں گی اور نہ اشتمالی جبر اور ظلم کا اندیشہ ہر چیز اعتدال پر آ جائے گی اور بیچ کے راستے پر چل پڑے گی۔

(۵) بھارت کے خدا پرست اسٹیٹ کی راج نیتی بھی آج کل کی سیاست سے بالکل مختلف ہوگی۔ اس میں انسان پر انسان کی حکومت نہ ہوگی۔ بلکہ تمام انسانوں پر صرف خدا کا راج ہوگا، سب انسان خدا کے نائب (VICEGERENT) ہوں گے اور سب مشترکہ طور پر حکومت کی امانت کے ذمہ دار ہوں گے۔ اس بنیادی اصول سے سماج کے مختلف اشخاص میں اقتدار کی کشمکش ختم ہو جائے گی، پارٹیوں کی اقتدار پرستی اور اس کے بے دستوری اور غیر دستوری طریقوں پر اقتدار حاصل کرنے تک وہ ختم ہو گی حکومت چلانے کے لیے چند چنے ہوئے افراد کے ہاتھ میں انتظام دیا جائے گا۔ یہ لوگ ملک اور قوم کے بے غرض اور صالح خادم ہوں گے اور عوام کے صحیح نمائندہ ہوں گے انتخاب کا طریقہ یہ ہوگا کہ جو لوگ خدائی نظام پر یقین اور ایمان رکھتے ہوں گے اور جن کا کردار لوگوں کی نگاہ میں بے داغ ہوگا، انہیں وہ خود اپنی طرف سے کھڑا کریں گے جو امیدوار (CANDIDATE) خود کھڑا ہوگا اُسے کوئی ووٹ نہ دے گا کیوں کہ

ایسے شخص کو اقتدار کا خواہشمند سمجھا جائے گا اور عوام کی رہبری کے لیے ایسا شخص قطعاً ناموزوں ہوگا۔

حکومت کا صدر بھی اسی طریقہ پر منتخب کیا جائے گا اور صرف دیانت دار، اور مخلص آدمی کو جس کی پرائیوٹ اور پبلک زندگی دونوں سے خوف خدا کا مظاہرہ ہوتا ہوگا اور جو خود صدارت کا امیدوار نہ ہو، جس پر تمام لوگوں کا نمائندہ مقرر کیا جائے گا، اس شخص پر اسٹیٹ کا ہر آدمی تنقید کرنے کا حق دار ہوگا، حتی کہ اگر اس کے علاوہ کوئی مقدمہ دائر ہو تو کھلی عدالت میں اس کی سماعت بھی ہو سکے گی، اسٹیٹ کا صدر دراصل اسٹیٹ کا سب سے بڑا خادم تصور ہوگا۔ اور وہ خدا کے سامنے ایک ایک فرد کی تکلیف اور مصیبت کے بارے میں جواب دہ ہوگا، خدا کی سپرد کردہ امانت یعنی اس کا نظام اور قانون نافذ کرنے میں وہ عوام کے سامنے بھی جواب دہ ہوگا، اور اگر وہ مملکت کے بنیادی دستور کی خلاف ورزی کرے گا تو ہر وقت اپنی جگہ سے ہٹایا جا سکے گا۔

بھارت کے خدائی اسٹیٹ میں کسی ایک پارٹی کی حکومت بھی نہ ہوگی، بلکہ حکومت تمام ملک کے عوام کی نمائندہ ہوگی اور جماعتی سیاست (POLITICS PARTY) سے بالاتر ہوگی، البتہ یہ ضرور ہوگا کہ جن لوگوں کے اندر یہ صفات کم ہوں گی وہ پیچھے چلیں گے۔ خدا پرست اسٹیٹ چونکہ ایک اصولی اسٹیٹ ہوگا، اس لیے اس میں ذمہ دار عہدوں پر صرف وہی لوگ ہوں گے جو اس اصول کا اپنی زندگی سے بہترین مظاہرہ کریں گے، موجودہ حکومتوں کے نظام کی طرح اس اسٹیٹ میں کوئی شخص سفارشوں کے بل بوتے پر، یا اقربا پروری، اور خوشامد نوازی کے اصول پر اوپر نہ آسکے گا، نااہل لوگوں کے ذمہ میں بھی کوئی ذمہ داری کا کام نہ سونپا جائے گا۔

جن لوگوں کے اندر اسٹیٹ کی پالیسی کو سمجھنے اس کو چلانے، اور اپنی زندگی سے اسٹیٹ کے نصب العین کی نمائندگی کرنے کی خصوصیات ہوں گی، وہی ہمارے بڑے بڑے کار پرداز ہوں گے، اور خدا پرست نظام کے کرتا دھرتا سمجھے جائیں گے۔ ( )

خدا پرست اسٹیٹ میں دستور سازی کے فرائض انسانوں کو انجام دینے نہیں پڑیں گے بلکہ معاشرتی، اخلاقی اور سماجی کاموں کے بارے میں دستور اور قوانین کا ایک بڑا حصہ خدا کا اپنا بنایا ہوا موجود ہوگا، جسے سب تسلیم کریں گے۔ اسی طرح معیشت، اور سیاست کے تمام بنیادی امور بھی پہلے سے طے شدہ ہوں گے، جن پر اسٹیٹ کا نیا ڈھانچہ بنایا جائے گا۔ اس طریقہ سے ایسے تمام مسائل حل ہو جائیں گے جن میں ہر زمانے میں انسانوں میں اختلاف رہا ہے۔

خدا پرست بھارتی اسٹیٹ میں ہر ذات، ہر طبقہ اور ہر قوم کے حقوق خود اختیاری ( ) محفوظ ہوں گے اور ان کو اپنے اپنے دائرے میں اپنی مرضی چلانے کا اختیار ہوگا۔ بنیادی حقوق (FUNDAMENTAL RIGHTS) میں بھی سب انسان برابر کے شریک ہوں گے، ہر شخص کو اپنی صلاحیت، کردار اور اوصاف (MERITS) کی بنیاد پر ابھرنے اور ترقی کرنے کے کھلے مواقع ہوں گے، لیکن جو لوگ بد باطن اور کمینہ خصلت ہوں گے چاہے وہ کسی ذات، قبیلے اور ملک سے تعلق رکھتے ہوں ہر طرف سے دبا دیے جائیں گے، ان کو سوسائٹی کا نظام

ہندوستان دوراہے پر

دیا جائے گا نہیں نظام دیا جائے گا حتی کہ حکومت کا قانون فوجداری، اور تعزیرات دیا ئیں گے خدا پرست اسٹیٹ
میں صرف اچھوں کا اور اچھائی کا ارتقا ممکن ہو سکے گا۔ اور اس میں نسل، زبان، اور ذات پات کی کوئی قید نہ ہوگی
اس کے برعکس بروں اور برائی کو ہر طرف سے گھیر لیا جائے گا اور اس میں بھی نسل، زبان، ذات پات اور حکومت
کے عہدیداروں سے رشتہ داری کی کوئی قید نہ ہوگی۔ ہر بڑا پکڑا جائے گا اور ہر بُرائی مٹائی جائے گی۔

یہ ہے خالص مادہ پرستانہ جماعتوں اور خدا پرستوں کے غلبہ کا مختصر سا موازنہ اس کو دیکھ کر بآسانی اندازہ
لگایا جا سکتا ہے کہ حق پر کون ہے اور بھارت کے مخصوص حالات تاریخی روایات اور بھارتی عوام کی موجودہ مشکلات
اور ان کے رجحانات کے اعتبار سے کون زیادہ مفید اور بہتر ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ خدا پرستانہ نظام کے بارے
میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں وہ صرف خیالی اور من گھڑت ہیں کیونکہ اس وقت دنیا کے کسی گوشے میں کوئی ایسی ریاست
موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر اس وقت کوئی ریاست موجود نہ ہو تو کیا تاریخ کے کسی دور میں بھی ایسی ریاست موجود نہ تھی۔
دیکھنا یہ ہے کہ اس قسم کا اسٹیٹ وجود میں آیا تھا تو اس قسم کے واقعات ظہور میں آئے تھے تاریخ گواہ ہے اور مخالف
سے مخالف مورخ بھی گواہ ہے کہ جب بھی دنیا کے کسی ملک میں خدا پرستی کی بنیاد پہ کوئی اسٹیٹ وجود میں آیا تو اس
میں اس سے کہیں زیادہ برکتیں نازل ہوتیں جتنی کہ بیان کی گئی ہیں۔

اس لیے خدا پرستانہ اسٹیٹ کے مندرجہ بالا نتائج کو خیالی قرار دینا خود ایک طرح کا خیال اور وہم ہے
جس کے چکر میں پڑ کر ایک آدمی اپنا بڑے سے بڑا نقصان تو کر سکتا ہے مگر جس خدا نے اس آکاش دھرتی کو بنایا ہے
اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

اساسِ دین کی تعمیر بقیہ صفحہ (۲۶)

کا بڑے سے بڑا قہر خداوندی کوئی ہلکا سا تلاطم بھی نہیں پیدا کر سکتا۔ یہی قرآن ہے جس کی ایک آیت فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ
بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا جب قیامت کے مناظر کا ایک پرتو دکھاتی ہے تو وہ آنکھیں جن کی طرف جہنم کی
چشم دید بھی اُٹھنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی، ابل پڑتی ہیں اور رات کا بڑا حصہ اسی رکعت کے قیام میں ختم ہو جاتا ہے اور زبان پیغمبر
...... اسی ایک آیت کو برابر دہراتی چلی جاتی ہے اور آخرت کی بازپرس کے احساس کی شدت ہے کہ نہ آنکھوں کو اشک باری سے رُکنے
دیتی ہے نہ زبان کو آگے بڑھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور آج وہی قرآن ہے جس کی رعد و برق کی سی دھمکیاں نہ ہماری آنکھوں
سے ایک قطرۂ اشک نکلوا سکتی ہیں اور نہ ہی تلاوت کے وقت ہماری زبانوں کی روانی میں کوئی رکاوٹ پیدا کر سکتی ہیں۔ یاد رہے
یہ ایک نادیدہ قلب حال ہے، اس کے ساتھ دین حق کی نہ اطاعت ہو سکتی نہ اقامت دین کی اطاعت و اقامت کے لیے ضروری
ہے کہ اس قلب حال کا بھی قلب حال کیا جائے۔ (باقی)

مولانا ابواللیث صاحب ندوی

رسائل و مسائل

مسلم قوم پرستی اور جماعت اسلامی

سوال:۔

(۱) ہندوستان کے عام مسلمانوں میں اس وقت پاکستان سے ہمدردی پائی جاتی ہے، اور جب قدر یہ ہندوستان تنگ و پریشان ہوں گے اسی قدر یہ جذبہ اور بڑھے گا۔ اور برانچوں کا بڑھنا بھی یقینی ہے۔ لہٰذا بغیر سوچے سمجھے ہر اس جماعت ملک یا قوم سے جو پاکستان کے خلاف ہوگی۔ ہندوستان کے مسلمان عمومی طور پر خلاف ہو جائیں گے۔

(۲) اب پاکستان پر نظر کیجئے۔ اسلامی جماعت نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے حکومت کی مخالفت میں قدم بڑھا رہا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اب جو قدم اسلامی جماعت نے اٹھایا ہے خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا ہے اور اب وہ اپنے فیصلہ سے قدم پیچھے نہ ہٹائے گی۔ تو یہ بھی صحیح ہے کہ پاکستان حکومت آسانی سے جماعت کے مطالبات کو منظور بھی نہیں کرے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جنگ اور زیادہ بڑھے گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمان اسلامی جماعت کے مخالف اور زیادہ ہوتے جائیں گے۔

(۳) ایک بات یہ بھی طے شدہ ہے کہ آپ کے لیے جس طرح یہ غیر ممکن ہے کہ آپ اپنی جماعت کو مودودی صاحب کی جماعت سے علٰحدہ کوئی دوسری جماعت بتائیں۔ اسی طرح یہ بھی غیر ممکن ہے کہ اگر خدا نہ خواستہ اس کی کوشش بھی جائے تو ہندوستان کے مسلمان اس قسم کی بات سے مطمئن ہو جائیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ آپ اپنے کو اس جماعت سے الگ کر سکتے ہیں اور نہ یہاں کے لوگ اس بات کو مان ہی سکتے ہیں۔

(۴) آپ کے کام کو جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ وہ پہلے لوگوں میں ایک ذہنی اور فکری انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے جائے عمل بھی ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ پہلے ہے۔ اس طبقہ کے اکثر حضرات کے اعزہ پاکستان حکومت میں ہیں اور جو ہندوستان میں ہیں ان کی نگاہیں بھی پاکستان پر لگی ہوئی ہیں۔ اور پکڑ رہے ہیں۔ ہندوستان کا مستقبل ان کو تاریک نظر آتا ہے اور اس کے برعکس پاکستان کا وجود ان کو درخشاں نظر آ رہا ہے۔ اور چونکہ یہ طبقہ ہمیشہ قوم کی نمائندگی کرتا ہے، لہٰذا

جب ہم مندرجہ بالا وجوہات پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ کے کام میں سخت رکاوٹیں نظر آتی ہیں اور آئندہ یہ رکاوٹیں روز بروز بڑھتی نظر آرہی ہیں۔ ایسی صورت میں اگر آپ کو ہندوستان میں کام کرنا ہے تو اس کے متعلق غور کیجیے کہ ان مشکلات کا کیا حل ہوسکتا ہے سنجیدگی سے غور کرکے کوئی حل نکالیے۔ یہ تو میں بھی واقف ہوں کہ آپ حضرات کا فیصلہ یہی ہندوستان میں رہ کر کام کرنیکا ہے۔ تو پھر جلد از جلد اس طرف متوجہ ہوجیے تاکہ مخالفت کو جو محض ابھی ابتدائی ہے جلد دُور کیا جاسکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ لٹریچر کا لفظ استعمال کرنے کی آپ حضرات میں ایسی عادت زیادہ ہوگئی ہے، کہ ہر وقت لٹریچر آپ حضرات کی نوک زبان ، اور نوک قلم پر ہے۔ کوئی گفتگو اور رپورٹ یا تحریر ایسی نہیں ہوتی جس میں باربار یہ لفظ نہ آئے اور بعض اوقات اس طرح استعمال ہوتا ہے کہ لٹریچر نے فلاں شخص میں یہ تبدیلی پیدا کی۔ ہمارا لٹریچر پڑھ کر فلاں پورا مسلمان بن گیا۔ ہمارے لٹریچر کا کیا کہنا اس میں یہ خوبیاں ہیں اور خوبیاں ہیں، ایک بار پڑھ لے تو پارس ہوجائے۔ تو میں یہ ڈرتا ہوں کہ اللہ کا کلام اور رسول کا پیغام قرآن و حدیث کے الفاظ متروک ہورہے ہیں۔ اور لٹریچر کا لفظ عام ہوگیا ہو۔ کمیونسٹ میں یہ دبابہت ہے۔ وہاں مبارک لیکن ہمارے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ لفظ غیر ارادی طور پر سرائت کرگیا ہے اور دخیل تو تقریر و تحریر ہوگیا ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اب بغیر مستحکم ارادہ کے یہ جا نہیں سکتا۔ اگر آپ مناسب خیال کریں تو اس کی طرف بھی توجہ فرمائیں اور جلد۔

تیسری بات یہ ہے کہ ہندوستان میں وقت کا تقاضا ہے اور آپ کی تحریک کے لیے بھی مفید ہے کہ کوئی مناسب طریقہ ایسا نکالیے کہ مسلمانوں تک آپ کے رفیق پہونچیں۔ اور اُن کو اللہ کی طرف لانے کی کوشش کریں۔ اس سے دو فائدے ہیں اوّل یہ کہ غریب مسلمانوں کا ہمارے اوپر حق ہے کہ ہم انھیں صحیح دین سے واقف کرائیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی اصلاح اور تحریک کی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اپنے اصولوں کو بدل دیں اور ہر کس و ناکس کو رکن بنالیں بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ عمل کا دائرہ کارکنان زیادہ وسیع کردیں، خصوصی حضرات کے علاوہ عامی مسلمانوں تک بھی پہونچیں۔ رفقاء کے لیے کام بھی نکل آئے گا اور فرض بھی ادا ہوجائے گا۔ میرے خیال میں غریب مسلمانوں اور جاہل مسلمانوں سے الگ الگ رہنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اول تو ایسے لوگ آپ کی توجہ کے زیادہ حقدار ہیں، کلمہ گو ہیں امّتِ رسول اللہ صلعم ہیں۔ دوسرے زیادہ الگ رہنے سے ہمارے دلوں میں نخوت و کبر کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ زیادہ خطرناک ہے۔ غریبوں میں کام کرنے اور ان کی خوشامد کرنے اور ان کے سامنے اپنے کو حقیر بنانے سے اس کا بہترین علاج ہوسکتا ہے۔"

جواب:-

آپ کا گرامی نامہ کئی روز ہوئے ملا تھا، لیکن اس میں کچھ باتیں تفصیلی جواب کی طالب تھیں، اس لیے اس کا جواب فرصت کے انتظار میں برابر ٹلتا رہا۔ آج تھوڑا سا وقت مل گیا ہے، اس لیے اس کا جواب لکھ رہا ہوں، لیکن شاید اس ایک خط میں میں اپنا پورا مدعا

واضح نہ کرسکوں۔ اس لیے اگر کوئی بات توضیح طلب باقی رہ جائے تو براہِ عنایت دوبارہ تحریر فرمائیے گا۔ ان شاء اللہ اس وقت میں تفصیلی طور سے لکھ سکوں گا۔

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کی جس ذہنیت اور اس کے جس نتیجہ کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے وہ کسی نہ کسی درجہ میں ہمارے نزدیک بھی مسلّم ہے اور اس کے تدارک کی کچھ نہ کچھ فکر کرنا ہم بھی ضروری سمجھتے ہیں، لیکن آپ کے خط سے یہ واضح نہیں ہوا کہ اس کے سلسلہ میں آپ کے نزدیک کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں؟ آپ نے بس صورتِ حال کا نقشہ کھینچنے پر اکتفا فرمایا ہے، کسی عملی تدبیر کی طرف رہنمائی نہیں فرمائی ہے۔ اگر آپ نے اس سوال پر کچھ غور کیا ہو اور کوئی متعین عملی تدبیر آپ کی سمجھ میں آئی ہو تو براہِ عنایت مجھے اس سے مطلع فرمائیے، ان شاء اللہ ہم اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے اور اگر وہ ہمارے لیے قابلِ عمل نظر آئی تو اس کو بے تکلف اختیار بھی کرلیں گے، لیکن اس کے سلسلہ میں چند باتیں واضح کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی بات یہ ہے کہ کوئی چاہے مانے یا نہ مانے یہ امرِ واقعہ ہے جس سے آپ غالباً واقف ہوں گے کہ پاکستان کی جماعت اسلامی سے ہمارا کوئی تعلق باقی نہیں رہ گیا ہے۔ دونوں جگہ کی جماعتیں، اپنی اپنی جگہ بالکل الگ ہیں اور اپنی آزادانہ مستقل حیثیت میں کام کر رہی ہیں، اس لیے ہم اس سلسلہ میں صرف وہی تدبیر اختیار کر سکتے ہیں جو ہمارے دائرہ عمل میں ہو، ایسی تدبیریں جن کا تعلق کسی درجہ میں بھی پاکستان کی جماعت سے ہو وہ ہمارے لیے قطعاً ناقابلِ عمل ہے اور ان کے اختیار کرنے سے ہم مطلقاً معذور ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم اپنے دائرہ عمل کے اندر بھی کوئی ایسی تدبیر اختیار کرنے کے قائل نہیں ہیں جس سے مسلمانوں کی خوشنودی تو حاصل ہو سکتی ہے، لیکن وہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف اور خدا اور اس کے رسول کی ناراضگی کا باعث ہو۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ کوئی تدبیر ہمارے نزدیک صرف تدبیر کے درجہ میں اختیار کرنی چاہیے، اس کو کسی حال میں مستقل مقصد کا درجہ نہیں دیا جا سکتا خواہ وہ اپنی جگہ کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو۔

ان تینوں باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی موجودہ ذہنیت خواہ اپنی جگہ ہمارے کام میں کتنی ہی بڑی رکاوٹ کیوں نہ ثابت ہو اس کا علاج ہمارے لیے آسان نہیں ہے اور اس کے وجوہ ظاہر ہیں۔

ایسے لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جماعتِ اسلامی پاکستان اپنی موجودہ سرگرمیوں کو جن کو اس نے اپنی پوری بصیرت کے ساتھ اسلام کی راہ سمجھ کر اختیار کیا ہے، چھوڑ دے اور یہ ظاہر بات ہے کہ اس بارے میں ہم کچھ کرنے سے بالکل مجبور ہیں کیوں کہ وہاں کا نظم جماعت ہم سے بالکل علیحدہ ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم خود محض کسی کو خوش کرنے کے لیے کسی فرد یا جماعت کو کسی ایسے کام سے روکنے کی خواہش کریں یا اسے غلط قرار دینے کی جرأت کریں، جس کا خلافِ حق ہونا ہم پر واضح نہ ہو سکا ہو۔ ایسی حالت میں آپ ہی بتائیں کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کی مخالفت سے بچنے کے لیے کیا تدبیر اختیار کرسکتے ہیں؟ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ جو چیز ہمارے لیے ممکن

اور واقعہ کا اظہار ہے کہ ہم کو پاکستان کے مسائل یا وہاں کی جماعت کی سرگرمیوں سے عملاً کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ وہاں کی جماعت جو کچھ کر رہی ہے اُس سے ہم اکثر حالات میں بالکل بے خبر ہی رہتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ ہماری واقفیت اخباری معلومات تک محدود ہے اور بس لیکن جب مسلمان آپ کے قول اس اعلان و اظہار کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہو سکتے اور اپنی ناواقفیت اور جہالت میں اتنے آگے بڑھ سکتے ہیں کہ بار بار اعلان کے باوجود وہ یہاں کی جماعت کو نہ صرف جماعت اسلامی پاکستان کا ایک جزو سمجھتے ہیں بلکہ وہ اس کو مولانا مودودی صاحب کی جماعت قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ ان کی جماعت اس وقت بھی نہیں تھی جب وہ ہمارے امیر جماعت تھے کیوں کہ یہ جماعت ایک اصولی جماعت ہے اس کو کسی شخصیت سے کوئی نسبت نہیں ہے، تو اس جہالت اور ناواقفیت کا علاج ہمارے پاس بجز صبر کے اور کیا ہے۔ یہ تو ہمارے بس کی بات نہیں ہے کہ ہم اپنے سب کام چھوڑ کر بس اس کو اپنا مدعا بنا لیں کہ مسلمانوں کے طرح طرح کے بے بنیاد اوہام و ظنون کا ازالہ کیا کریں، مسلم عوام کی یہ عجیب ذہنیت ہو گئی ہے کہ وہ ہمیشہ اوہام و ظنون ہی میں مبتلا رہنا چاہتی ہے، ایک طرح کے اوہام کا ازالہ کیجئے تو دوسری قسم کے اوہام ان کی جگہ لے لیں گے تو کوئی شخص یا ادارہ جو کوئی کام کرنا چاہتا ہے وہ کہاں تک ان کی بدگمانیوں اور شکوک کو اہمیت دے سکتا ہے۔ یہ لوگ اگر پاکستان سے اُمید میں لگائے بیٹھے ہیں تو اللہ ان کو یہ خواب مبارک کرے، لیکن ہمارا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان رہیں گے اور ان کو رہنا ہے اور ساتھ ہی یہاں اسلام کو زندہ رکھنے کے سلسلہ میں بھی مسلمانوں کو بہت کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ کی کوششوں میں اپنی وسعت و استطاعت کے موافق ہم بھی اپنا حصہ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ ہمارے لیے ذریعہ نجات بنے تو ایسی حالت میں اگر ہم سب کچھ چھوڑ کر مسلمانوں کی ناواقفیت یا جہالت کی باتوں ہی کے پیچھے پڑ گئے تو ہم عنداللہ اپنی کیا جواب دہی کر سکیں گے؟

پس ہمارے نزدیک تو مسلمانوں کی اس ذہنیت کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہم جو کچھ کام کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں اس میں اپنی پوری سرگرمی کے ساتھ منہمک رہیں۔ باقی رہیں مسلمانوں کی غلط فہمیاں تو انشاء اللہ وہ خود بخود آہستہ آہستہ دُور ہو جائیں گی، زمانہ خود بہت بڑا معلم ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ توقع ہے کہ ہمارے کاموں کے نتائج جب سامنے آئیں گے اور ان سے مسلمان واقف ہو جائیں گے تو اس وقت ان کی بہت سی غلط فہمیاں از خود رفع ہو جائیں گی، ان کی یہ ذہنیت زیادہ تر اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان بے چاروں کو نہ زمانہ کی کچھ خبر ہے اور نہ دین کی۔ ان کے دُنیاوی شعور و ادراک کا حال یہ ہے کہ وہ پاکستان کے موجودہ برسر اقتدار طبقہ سے اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کو ان کے موجودہ آلام سے نجات بخشیں گے اور ان حضرات کا حال یہ ہے کہ اُنھوں نے پاکستان کا دروازہ پاکستان جانے والوں کے لیے بڑی سختی کے ساتھ بند کر دیا ہے اور جو مسلمان بڑی بڑی توقعات لے کر وہاں پہنچ گئے تھے وہ ان کے طرز عمل سے مایوس ہو کر ہندوستان لوٹ رہے ہیں یا لوٹنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اور ان کے دینی شعور کا حال یہ ہے کہ ان کے نزدیک پاکستان کی ہمدردی محض یہ ہے کہ وہاں جو نظم حکومت بھی قائم ہو اور جس طرح کے لوگ بھی برسر اقتدار ہوں ان کی آنکھیں بند کر کے حمایت کی جائے اور یہ

بات کہ وہاں اسلامی نظم حکومت قائم ہو جس کے نام پر وہ وجود میں آیا ہے تو یہ ان کے نزدیک پاکستان کی دشمنی ہے اور اس کا نام لینے والے گردن زدنی ہیں!

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

تو جب حالات یہ ہوں تو کیا ایمان و عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو راضی کرنے کے لیے ہم اپنا کام چھوڑ دیں یا ان کو راضی کرنے کی کوشش میں اپنے کام کو نقصان پہنچانا گوارا کریں یا یہ کہ ہم مصلحتوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے اصلی اور حقیقی کام میں لگے رہے ہیں جو ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور جس کی کامیابی پر اس ذہنیت کے اصلاح پذیر ہونے کی بھی توقع ہے۔

آپ یقین رکھیں ہندوستان میں صرف اسی ذہنیت کے لوگ نہیں رہتے ہیں جن کا آپ نے تذکرہ فرمایا ہے بلکہ ایسے بے شمار لوگ ہیں اور ان میں سے بہتیروں سے ہم شخصی طور سے واقف ہیں جو اپنی دینی واقفیت اور دینی شعور کی بنا پر جماعت اسلامی پاکستان کی سرگرمیوں کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور چوں کہ وہ بھی اس حقیقت سے زیادہ تر ناواقف ہیں کہ ہمارا کوئی تعلق پاکستانی جماعت کی سرگرمیوں سے نہیں ہے اس لیے وہ اپنے حسن ظن میں ہمیں بھی شریک رکھتے ہیں حالانکہ واقعۃً ہم اس کے مستحق نہیں ہیں تو انھیں لوگوں کی طرح جو زیادہ تر اپنے ذاتی علم دین کی بنا پر یہ رائے رکھتے ہیں، اگر ہماری کوششوں سے دوسرے ناواقف لوگ بھی حقائق دین سے واقف ہو جائیں تو کیا ان کا موجودہ رویہ از خود تبدیل نہیں ہو سکے گا؟ اور اس کو بھی جانے دیجیے۔ واقعۃً یہ کام بہت دشوار کام ہے اور اس میں یقیناً بہت کافی وقت لگے گا۔ لیکن کیا آپ اس پر مطمئن ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بس یہی ایک قسم ہے کہ وہ کبھی یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ پاکستان کی جماعت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے وہ ہمیں صرف ہمارے کاموں کی وجہ سے مطعون کریں دوسروں کی کارگزاریوں کی ذمہ داری ہمارے سر پر نہ ڈالیں! میں سمجھتا ہوں ان میں ایسے لوگ بھی ہیں اور بہت بڑی تعداد میں ہیں جن کی ناواقفیت دور ہو سکتی ہے اور جو واقف ہونے کے بعد ہمیں خواہ مخواہ دوسروں کے جرم میں مطعون نہیں کریں گے۔ براہ عنایت اس مسئلہ پر غور کرتے وقت اس نقطۂ نظر کو بھی سامنے رکھیں اور اس کے بعد اپنے نتائج فکر سے مطلع فرمائیں۔

اس ضمن میں میں ایک بات کی طرف اور اشارہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بلاشبہ ہمارے کام کی نوعیت یہی ہے کہ ہم تعلیم یافتہ ذہین طبقہ سے اپنی امیدیں زیادہ وابستہ کیے ہوئے ہیں اور ان کے بارے میں آپ کا یہ فرمانا بہت حد تک درست ہے کہ وہ اس وقت اپنی نگاہیں پاکستان پر جمائے ہوئے ہیں، لیکن ہماری امیدیں ان کے ساتھ ان کی موجودہ حالت کی بنا پر نہیں ہے وہ تو بلاشبہ ایسی ہی ہے کہ وہ فی الحال ہمارے کام کی مخالفت ہی کریں گے کیوں کہ وہ اپنے علم دین کے مطابق پاکستان کو سب کچھ سمجھنے پر مجبور ہیں اور بدقسمتی سے ان کا سیاسی تصور بھی ایسے حالات میں پرورش پاکر بڑا ہوا ہے جس میں ان کا یاس و ناامیدی میں مبتلا ہونا ایک بالکل قدرتی بات ہے، لیکن چونکہ ان کی ذہنی استعداد اچھی ہے اور حالات بھی ان کو اپنے زاویہ نظر پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر رہے ہیں اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ اس وقت نہیں تو آئندہ چل کر وہ ضرور

کو ان کی ٹھیک شکل میں سمجھنے لگیں گے اور اس سے ان کے رویہ میں خود بخود تبدیلی واقع ہونا شروع ہو جائے گی۔ واللہ اعلم عنداللہ۔

(۲) لٹریچر کے سلسلہ میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس کا منشاء میں اچھی طرح سمجھ نہیں سکا، اس کے سلسلہ میں ہمیں بالعموم دو طرح کے معترضین سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک وہ لوگ ہیں جن کو جماعت اور اس کی دعوت سے اللہ واسطے کا بیر ہو گیا ہے اس لیے ان کو اس سے نفرت ہوتی ہے کہ کوئی شخص ان کے سامنے لٹریچر کا نام بھی لے اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو اس کے استعمال کی کثرت کو اس جذبہ کے ساتھ ناپسند کرتے ہیں کہ کتاب و سنت کے مقابلہ میں لٹریچر کی جو حیثیت ہونی چاہیے کہیں اس میں ہماری بے احتیاطی کی وجہ سے کوئی فرق نہ واقع ہو جائے۔ آپ سے ذاتی واقفیت کی بنا پر مجھے آپ کے بارے میں یہ حسن ظن ہے کہ آپ کا لٹریچر کے سلسلہ کا اعتراض، پہلے گروہ کی ذہنیت کا نہیں بلکہ دوسرے گروہ کے جذبۂ خیر کا نتیجہ ہے اس لیے میں پہلے گروہ کی ذہنیت کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا اور یوں بھی یہ لوگ ہمارے نزدیک کچھ زیادہ لائق اعتنا نہیں ہیں کیوں کہ لٹریچر سے ان کی یہ نفرت زیادہ تر ان کے جذبۂ حسد و بغض کا نتیجہ ہے یا ناواقفیت اور اس کی پیدا کردہ بدگمانیوں کا اس لیے ان کی خاطر ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ لٹریچر کا پڑھنا پڑھانا اور اس کا ذکر چھوڑ دیں کیونکہ چاہے ان لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند یہ واقعہ ہے کہ جماعت اسلامی کے لٹریچر نے بیشمار لوگوں کی زندگیوں میں ایک عظیم دینی انقلاب پیدا کیا ہے اور یہ بات ہمارے بہت سے مخالفین تک بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کو منظم شکل میں سمجھنے اور عہد حاضر کی باطل تحریکات کے مقابلہ میں مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھنے کے لیے یہ نہایت مؤثر ترین ذریعہ ہے، البتہ یہ بات ہمیں بھی ناپسند ہے کہ لوگ لٹریچر کو اس سے زیادہ اہمیت دیں، جتنی اہمیت اس کو اصولاً حاصل ہونی چاہیے، یعنی وہ کسی معنی میں کتاب و سنت کا قائم مقام نہیں ہو سکتا، اس کی جو کچھ بھی حیثیت ہے وہ محض یہ ہے کہ اس میں کتاب و سنت کو مؤثر اور دلنشیں انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور چونکہ یہ ایک انسانی کوشش ہے اس لیے دوسری قابل قدر انسانی کوششوں کی طرح اس میں بھی غلطیوں کا امکان ہے اور اس حیثیت سے وہ نہ کتاب و سنت کا قائم مقام ہو سکتا ہے اور نہ ان ہی کی طرح کے احترام و عزت کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے عام رفقاء پر لٹریچر کی یہ حیثیت واضح ہے اور وہ اسی حیثیت سے اس کو پڑھتے پڑھاتے ہیں لیکن اگر آپ کے تجربہ میں کوئی ایسی بات آئی ہو جو اس کے خلاف ہو تو براہ عنایت اس سے مطلع کیجیے۔ یہ بلاشبہ قابل افسوس اور قابل توجہ بات ہوگی اور اس کے انسداد کے لیے ان شاء اللہ ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے گی اور ویسے میں خود بہ نظر احتیاط بطور پیش بندی اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہوں جس سے جماعت کے لوگ واقف ہیں۔

(۳) تیسری بات کے سلسلہ میں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بارے میں یہ بدگمانی صحیح نہیں ہے کہ ہم عوام میں کام نہیں کر رہے ہیں یا ان میں کام کرنے کے مخالف ہیں۔ ہمارے پروگرام کے بہت سے اجزاء ایسے ہیں جن کا براہ راست تعلق عوام ہی سے ہے، مثلاً تعلیم بالغان، اجراء مکاتب، عمومی اجتماعات اور تبلیغی دورے وغیرہ۔ البتہ چونکہ ہم اپنی توجہات کو تمام تر عوام ہی میں محدود نہیں رکھنا چاہتے، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ایک حد تک کچھ ان سے بھی زیادہ اہمیت

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر)

محمد نجات اللہ صدیقی ۔

اخبار و افکار

سردار پٹیل کی موت

ہندوستان کے واقعات میں اس عرصہ کا اہم ترین واقعہ سردار پٹیل کی موت کا حادثہ ہے۔ ملک کی سیاست اور نظم حکومت کے اندر آپ کو جو مقام حاصل تھا اس کے لحاظ سے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ آپ کی موت ایک معمولی انسان کی موت نہ ہو کہ اس کا اثر اس کے اعزا اور اقربا اور خاندان تک محدود ہو بلکہ پورے ملک میں اس کو محسوس کیا جائے اور اس کا عام حالات پر کچھ اس طرح اثر مرتب ہو کہ اس کی طرف دھیان دینا ضروری ہو جائے۔

ہندوستان میں برطانوی عہد حکومت کی یادگار جو بے شمار نیم خود مختار ریاستیں موجود تھیں ان کو ہند یونین میں ضم کر دینا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن یہ سردار پٹیل کی ہمت و حکمت عملی ہی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے ان سب کو چار و ناچار ہند یونین کا جزو بننے پر مجبور یا راضی کر دیا۔ ان ریاستوں کا نظم براہ راست سردار پٹیل کے ہی ہاتھ میں رہتا تھا اور آپ نہایت حکمت و تدبر کے ساتھ ان کو اپنی آہنی گرفت کے شکنجہ میں کسے ہوئے تھے۔ سردار کے بعد یہ گرفت کہاں تک قائم رہ سکے گی، اس کا صحیح اندازہ آئندہ واقعات سے ہی ہو سکے گا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس گرفت کے ڈھیلے ہونے سے ہندوستان کے لیے نہایت خطرناک مسائل سر اٹھا سکتے ہیں، اس لیے سردار پٹیل کی وفات کا یہ پہلو ہندوستان کے لیے خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہے۔
پٹیالہ اور مشرقی پنجاب کی ریاستوں کی یونین (PEPSU) اور راجستھان کے اندرونی اختلافات کو سردار پٹیل نے جس طرح سلجھایا تھا وہ ان کے مرنے کے بعد کہاں تک باقی رہ سکے گا یہ بھی قابل غور مسئلہ ہے۔

نئے وزیر ریاست سے ہم مایوس نہیں ہیں ان کو ریاستوں کے حالات کا تجربہ ہے اور وہ ایک حد تک سردار پٹیل کی حکمت عملیوں سے واقفیت بھی رکھتے ہیں، وہ ان کے ساتھ برابر شریک کار رہے ہیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ وہ سردار پٹیل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے یہ وقت ہی بتا سکے گا کہ ان کی صلاحیتیں سردار کا کام کرنے میں کس حد تک مفید ثابت ہو سکیں گی۔

کانگریس کا شیرازہ تقسیم کے بعد جس طرح ڈھیلا ہونا شروع ہوا ہے اور اس کے اندر تفرق اور انتشار کا جو عمل برابر جاری ہے اس کے ٹھوس اسباب ہیں لیکن سردار اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ ان اسباب کو بہت کچھ روکے کھڑے تھے اس لحاظ سے آپ کا نہ رہنا کانگریس کے حق میں بڑی ہی محرومی کا باعث ہو سکتا ہے۔
ایک اچھا خاصہ طبقہ اس امر پر بھی تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ نہرو کی والہانہ اصول پسندی پر "حکمت عملی" اور "مصلحت بینی" دور اندیشی کی لگام لگانے والا نہ رہا۔ اس طبقے کے تاثر پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے لیکن اس امر کے بعض پہلو یقیناً قابل غور ہیں۔
بہرحال سردار کی موت نے اس بات کو اور ضروری کر دیا ہے کہ ملک کے سوچنے والے اشخاص سر جوڑ کر ملک کے الجھے ہوئے مسائل پر غور و فکر کریں اور ان کو پائدار بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کریں۔

غذائی صورت حال

ہند کی غذائی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ایک طرف قدرتی عوامل کے زیر اثر آسام کے ہولناک زلزلوں، مشرقی یوپی کے سیلاب اور بہار کی قحط نما صورت حال نے غذائی موقف کو خراب تر کیا ہو تو دوسری طرف ہمارے ملک کا [illegible] جو ہمارے نزدیک حکومت کی معاشی سرگرمیوں اور عام تاجروں اور پیداکنندگان کی زر پرستانہ ذہنیت دونوں کا نتیجہ ہے [illegible] اس کو اور [illegible] رہا ہے۔

ہمارے بیساکھی ہندستان اور تمام عوام کے معاشی مشکلات : مصائب کو خوفناک ترین صورت میں تبدیل کرنے والے ایجنٹ بن گئے ہیں نہ کہ ان کے خادم۔ یہ غلہ کو ذخیرہ کرتے اور روک رہے ہیں تاکہ لوگ بھوکوں مریں اور اپنی جیب کا آخری پیسہ بھی اناج کے چند دانوں کے لیے ان کی چوکھٹ پر ڈال جائیں۔ حکومت کی مشنری اس سلسلہ میں جس دیانت داری اور غیر جانبدارانہ سرگرمی کا مظاہرہ کر رہی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

مغرب کے بخشے ہوئے نظام زندگی کا لازمی نتیجہ بھی انتہا پسندانہ مفاد پرستی، مسلک خود غرضی اور مجرمانہ غفلت و لاپرواہی ہے — اس کے ختم ہوئے بغیر اس مسئلہ کے حل ہونے کی خواہش نیک تو ہو سکتی ہے لیکن بار آور نہیں ہو سکتی۔ کیا ہمارے عوام اور لیڈر اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے اور ایسے اصولوں کی تلاش میں سر جوڑ کر سوچنے کے لیے تیار ہیں جو سماج میں ذمہ داری، مفاد عامہ کا لحاظ، اور بے لوثی پیدا کر سکیں!۔

نیپال اور تبت

ملک کی عام معاشی ناہمواری اور بدحالی کی بنا پر آزادی کے بعد سے کمیونزم کی جس تیزی کے ساتھ ہمارے عوام و خواص میں نفوذ کا موقع ملا ہے اسے کون نہیں جانتا۔ پڑھے لکھے طبقے کے اذہان تو عموماً متاثر ہیں ہی لیکن اس عرصہ میں عوام بھی اس طرف سے اپنا وزن ڈالتے جا رہے ہیں۔ تلنگانہ اور حیدرآباد کے دوسرے علاقوں کی حالت اچھی نہیں۔ مشرقی یو۔ پی، بنگال اور بہار اور صوبے بھی اسی سمت میں جا رہے ہیں۔

ایسے میں نیپال اور تبت کے حالات کا "قابل توجہ" ہے جس تیزی کی طرح روس سرچھپانے سے مسئلہ نہیں حل ہوتا اگر بروقت توجہ نہ کی گئی تو کل کو جب ہند کی طویل سرحد پر اشترا کی فوجیں ہوں گی تو ملک ہند کے اندر بھی یہ سوادِ عظیم ٹوٹنے کے قریب ہوگا۔ ہم نہیں جانتے کہ موجودہ معاشی بدحالی و بے اطمینانی کو دور کرنے کے لیے حکومت کیا کر رہی ہے مختلف طبقات کی مدد کے لیے نظام معاشی میں کونسی بنیادی تبدیلیاں کی جا رہی ہیں؟ عام صارفین کی چیخ پکار کا حکومت نے کیا علاج سوچ رکھا ہے — ہم عوام کو متنبہ کرتے ہیں کہ اپنے مسائل پر خود توجہ دیں اور اپنی قسمت کو سرمایہ دارانہ ذہنیت اور مادہ پرستانہ فکر رکھنے والے لیڈروں کے حوالہ کرنے کے نتائج پر قبل از وقت غور کر لیں۔

رسائل و مسائل بقیہ صفحہ (۴۶)

ہم خواص کو بھی مخاطب کرتے ہیں جن میں اسلام اور حالات زمانہ اور ان کے تقتضیات کو سمجھنے اور ان کے مطابق عمل پیرا ہونے کی نسبتاً زیادہ صلاحیت ہوتی ہے اور عوام کا بناؤ بگاڑ بھی زیادہ تر انھیں کے بننے بگڑنے پر موقوف ہوتا ہے اور پھر اسی کے ساتھ ہم عوام میں جس طرح کام کرتے ہیں اس میں چونکہ ہم زیادہ تر اپنے متعین مقصود کے مطابق وسائل و ذرائع اختیار کرتے ہیں اور ہر حال میں کسی مخصوص طریقے کی پیروی ضروری نہیں سمجھتے اس لیے بہت سے ناواقف حال لوگوں کو ہمارے بارے میں بالعموم اسی طرح کی غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے جس کا آپ کے خط سے اظہار ہوتا ہے۔ اگر آپ ہمارے طریق کار کو اچھی طرح سمجھنا چاہتے ہیں تو براہ عنایت ہمارے کام کو محض مقامی کام کو سامنے رکھ کر سمجھنے کی کوشش نہ کریں کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ وہاں افراد کی کمی کی وجہ سے ہمارا کام اس طرح نہیں ہو رہا ہے جس طرح ہونا چاہیے یا جس طرح دیگر مقامات پر ہو رہا ہے اور ساتھ ہی اگر آپ دعوت دین نامی کتاب کچھ وقت نکال کر پڑھ لیں تو اس سے بھی آپ کو ہمارے طریق کار کے سمجھنے میں مدد ملے گی، اس ضمن میں خصوصیت کے ساتھ ہمارا نقطہ نظر ہے اس کو میں نے تقریباً دو سال ہوئے اجتماع فیض آباد کے موقع پر ایک تقریر میں پیش کیا تھا، اگر آپ اسے ملاحظہ فرمانا چاہیں تو غالباً ...... صاحب کے پاس مل جائے گی "الانصاف" میں اسی زمانہ میں شائع ہو چکی ہے۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ والسلام۔

Regd No A-688 "ZINDGI" Monthly RAMPUR U. P

مہینے میں دو بار شائع ہونے والا رسالہ

الحسنات

(رام پور - یو.پی)

اگر مسلسل آپ کے گھروں میں پڑھا جاتا رہے

تو ——— انشاء اللہ

- نو عمروں میں دینی روح پیدا ہوگی
- گھریلو ماحول میں اسلامی رنگ چھانے لگے گا
- آئندہ نسلیں اسلام پر قائم رہ سکیں گی
- اور آپ کی خواتین اقامت دین کی
جدوجہد میں آپ کی مددگار ثابت ہوں گی

ان مقاصد کے لیے آپ "الحسنات" کو
ایک اچھا معاون پائیں گے

ماہنامہ

زندگی

مرتبہ سید حامد علی

فہرست مضامین

دفتر رسالہ "زندگی" رامپور

چندہ سالانہ (۵) پانچ روپے، فی کاپی (۸)

سید حامد علی پرنٹر و پبلشر نے ناظم پریس رامپور سے چھپوا کر دفتر "زندگی" رامپور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آز مولانا ابو اللیث صاحب - ندوی

آئیے اب اس سوال پر غور کریں کہ مسلمان اگر آئندہ الیکشن سے علٰحدہ رہیں تو اس سے ان کو کیا فائدہ، یا کیا نقصان پہونچ سکتا ہے۔
لیکن کیا گذشتہ مباحث کے پڑھ لینے کے بعد واقعی نفع و نقصان کے پہلو سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے؟ -
پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم نے الیکشن سے علٰحدہ رہنے کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ ان کے ضمن میں خود بخود نفع و نقصان کا پہلو واضح ہوتا گیا ہے، کیونکہ ان دلائل کی اصل بنیاد یہی ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے یا نہ لینے سے کیا کیا دینی و دنیاوی فائدے و نقصان پہونچ سکتے ہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ ہماری بحث کی نوعیت زیادہ تر دینی ہے اور ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کے لیے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق ہم نے دینی وجوہ و دلائل فراہم کیے ہیں، اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ اس بحث سے فارغ ہونے کے بعد اب ہمارے لیے حقیقۃً اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے کہ ہم اس علٰحدگی کے نفع و نقصان سے بھی بحث کریں، کیونکہ جب امر کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بموجب اس کا اختیار کرنا ضروری ہے، اس کے بارے میں سود و زیاں کے نقطۂ نظر سے غور کرنا قطعاً غیر ضروری ہو جاتا ہے، اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اس کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے یا اس کے بارے میں اپنے آزادانہ غور و فکر کے لیے کوئی گنجائش سمجھتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ یا تو ضعف ایمان میں مبتلا ہے یا کم سے کم اس کے دل میں ایمان ہی نہیں ہے۔

وما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله	اور کسی ایمان دار مرد اور کسی ایمان دار عورت کو گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ
ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة	اور اس کا رسول کسی کام کا حکم دیں تو پھر ان کیلئے اس کام میں کوئی اختیار باقی
من امرهم۔	رہے۔

ایمان نام ہی ہے بے چون و چرا اور کامل اطاعت کا اور یہ خود قرآن نے صراحت کی ہے کہ ایک مومن کو ہر حال میں اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کا پابند ہونا چاہیے اور یہ پابندی بھی اس طرح ہونی چاہیے کہ اس کے دل میں اس کے خلاف کسی طرح کا شائبہ انکار و تردد بھی نہ پایا جاتا ہو۔

فلا وربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما	پس قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ
شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم	ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرائیں پھر
حرجا مما قضيت ويسلموا تسليما۔	اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور پورے طور پر تسلیم کر لیں۔

پس اگر آپ نے خدانخواستہ یہ فیصلہ نہ کرلیا ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کا فیصلہ خواہ کچھ ہو آپ ہر حال میں وہی کریں گے جو آپ کا دل چاہے گا یا جیسے اللہ حکیم وخبیر کے مقابلہ میں آپ اپنی ناقص عقل اور سمجھ بوجھ کے لحاظ سے اپنے لیے یا اپنی قوم کے لیے زیادہ مفید سمجھیں گے تو ہمارے خیال کے مطابق آپ کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں،

یا تو آپ کو یہ ثابت کرنا چاہیے کہ ہم نے جن وجوہ سے علیحدگی کا فیصلہ کیا ہے وہ شرعاً غلط ہیں اور الیکشن میں حصہ لینا ہمارے لیے ہر طرح جائز و مباح ہے، اس صورت میں آپ یقین کریں ہم ایک لمحہ کے توقف کے بغیر اپنی رائے بدل ڈالیں گے اور سب سے آگے بڑھ کر آپ کی تائید وحمایت کریں گے، لیکن اگر آپ ایسا نہیں کرسکتے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ آپ نہیں کرسکیں گے، تو مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کیلیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ آپ نفع و نقصان پر دھیان دیئے بغیر الیکشن سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کریں۔ کوئی نفع اس نفع کا بدل نہیں ہوسکتا کہ آپ اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت پر عمل کرنے کی توفیق پائیں اور نہ آپ کے لیے اس سے بڑا کوئی نقصان ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے شخصی یا قومی نقصانات کی خاطر جان بوجھ کر احکام شریعت کی خلاف ورزی کریں۔ یہ شیوہ کافرانہ ہے یا منافقانہ، اس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا، اور یہ قرآن کے الفاظ میں دینی و دنیاوی دونوں طرح کے خسران کا ہم معنی ہے۔

ومن الناس من يعبد الله على حرف
فان اصابه خير اطمأن به وان اصابته
فتنة انقلب على وجهه خسر الدنيا
والآخرة وذالك هو الخسران المبين

۔ اور بعض آدمی اللہ کی عبادت کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں، اگر ان کو کوئی نفع پہونچے تو اس عبادت پر ان کو اطمینان ہوجاتا ہے اور اگر ان کو کچھ آزمائش پیش آگئی تو منہ اٹھا کر کفر کی طرف چل دیتے ہیں، یہ لوگ دنیا اور آخرت دونوں کو کھو بیٹھے۔ یہی کھلا نقصان ہے۔

بہر حال گذشتہ ماہ کی بحث کے بعد جس میں ہم نے شرعی اور عقلی دونوں طرح کی دلیلوں سے الیکشن سے علیحدگی کی حمایت کی تھی اور جس کے ضمن میں خود بخود دینی و دنیاوی نفع و نقصان پر بہت کچھ روشنی پڑچکی ہے، اب نفع و نقصان کے سوال پر الگ سے کسی مزید بحث کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی، لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں احکام الٰہی کی بے چون وچرا اطاعت کا جذبہ بہت تھوڑا رہ گیا ہے، وہ نفع و نقصان اور سود و زیاں کو سب سے پہلے سامنے رکھتے ہیں اور اس پہلو سے اطمینان کیے بغیر وہ اس کی طرف قدم نہیں اٹھاتے، حتی کہ جو لوگ شریعت کے احکام پر چلنا چاہتے ہیں ان کے دلوں میں بھی کسی امر شریعت کے بارے میں اطاعت کا صحیح داعیہ اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ ان کو اس کے نفع و نقصان کے پہلو سے پوری طرح اطمینان نہ ہوجائے۔ اس لیے نامناسب نہیں ہوگا کہ ہم آگے قدم بڑھانے سے پہلے اس علیحدگی کے سوال پر کچھ مختصراً خاص اس نفع و نقصان کے پہلو سے بھی غور کرلیں۔

سب سے پہلے نقصانات کا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ کیا ہیں اور کہاں تک ہمارے لیے وہ احکام شریعت کے ترک کا بہانہ بن سکتے ہیں کیونکہ آج کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے لیے نقصانات کا تصور زبردست فتنہ ثابت ہورہا ہے، ان کو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دینی احکام کا تقاضا یہی ہے کہ باطل نظام کے اس سب سے بڑے فتنہ سے وہ اپنے کو الگ تھلگ رکھیں، لیکن وہ اس کے مطابق عمل پیرا ہونے سے محض اس لیے قاصر ہیں کہ جوں ہی وہ اس سے الگ ہونے کا ارادہ کرتے ہیں، نقصانات کا تصور سامنے آکر کھڑا ہوجاتا ہے اور وہ اس کے مقابلہ میں اپنے کو بالکل عاجز و بے بس محسوس کرنے لگتے ہیں۔

کچھ نقصانات تو ایسے ہیں جن کو آپ زیادہ سے زیادہ افراد کا انفرادی نقصان قرار دے سکتے ہیں، مسلمانوں کے عمومی نفع و نقصان سے جس سے اس وقت ہم بحث کرنا چاہتے ہیں، ان کا کوئی لگاؤ نہیں ہے، مثلاً اسمبلیوں کی ممبری بہت سے لوگوں کے لیے عزت و شہرت کا ذریعہ ہے ان کو ممبر بننے کے

[illegible] مستقل یا غیر مستقل عہدہ اور الاؤنس وغیرہ ملنے لگتا ہے، جو بہتوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، اور کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسمبلی کے ذریعہ سے عہدۂ پارلیمنٹری سکرٹری یا وزیر وغیرہ بنا لیے جاتے ہیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ ان فوائد میں کوئی فائدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے لیے دینی اور دنیاوی فوائد کو قربان کر دیا جائے، جو ہمارے نزدیک علٰحدگی سے پہونچ سکتے ہیں اور جن کو ہم آگے کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے والے ہیں اور نہ یہ فوائد ان نقصانات کی کسی درجہ میں تلافی کر سکتے ہیں، جو الیکشن میں حصہ لینے سے لازمی طور سے پہونچیں گے اور یہ دوسری قسم کے فوائد و نقصانات وہ ہیں جن کا دائرہ صرف افراد مسلمین تک محدود رہنے والا نہیں ہے بلکہ وہ بحیثیت مجموعی پوری امت مسلمہ کے مفاد سے متعلق ہیں، ایسی حالت میں کیا یہ انتہائی حماقت نہیں ہوگی کہ ہم چند افراد کے انفرادی فائدوں کی خاطر پوری ملت کے نفع و نقصان سے بے پروا ہو جائیں اور فائدے بھی ایسے کہ کسی باوقار اور غیور قوم کے لیے ان فوائد کو معرض بحث میں لانا بھی درحقیقت اس کی انتہائی ذلت کے مترادف ہے!

ہاں اس ضمن میں ایک بات کسی درجہ میں لائق اعتنا ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم مسلمان ممبروں کے ذریعہ اپنی آواز ارباب اختیار کے کانوں تک پہونچا سکتے ہیں، اور اس طرح ان کو اپنے حقوق و مطالبات کی طرف متوجہ کر سکتے ہیں یا اگر کچھ مسلمان وزارت کے عہدوں پر پہونچ جائیں تو وہ اپنے وزارتی اختیارات یا اثر و اقتدار کے ذریعہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ہمارے جائز حقوق اپنے دائرہ اختیار کے اندر دلوا سکتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک ایسا سمجھنا انتہائی ناواقفیت یا ناسمجھی کی دلیل ہے۔

اول تو ہندوستان کا آئندہ الیکشن مخلوط بنیاد پر ہوگا، اس لیے جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کسی ایسے مسلمان نمائندے کی کامیابی بہت مشتبہ ہے جو اسمبلی میں جا کر واقعی مسلمانوں کی نمائندگی کر سکے، مخلوط انتخاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ صرف مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہوگا بلکہ عام رائے دہندگان کا نمائندہ ہوگا جن میں اکثریت بہرحال غیر مسلموں کی ہوگی اور اس عمومی نمائندگی کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی شروع امیدواری سے لے کر اسمبلی کی ممبری اور اس کے بحث و مباحثہ اور کسی مسئلہ پر رائے دینے کے ہر مرحلہ پر اسے نہایت شدت کے ساتھ اپنی اس عمومی حیثیت کو برقرار رکھنا پڑے گا، ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ اول تو الیکشن میں کامیاب نہ ہو سکے، یا اگر کامیاب ہو جائے تو اسے اپنی "نالائقی" کا احساس یا تو اسمبلی کو قبل از وقت چھوڑ دینے پر مجبور کر دے یا پھر اس کو مجسمۂ سکوت بنا دے کہ وہ سب کچھ دیکھتا رہے لیکن کبھی زبان ہلانے کی جرأت نہ کرے اور یہی بات مسلم وزیروں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ وہ مسلمان ہونے کی بنا پر وزیر نہیں بنائے جاتے بلکہ پارٹی کے ممبر ہونے کی بنا پر منتخب کیے جاتے ہیں اور ان کے انتخاب میں اس عام اصول کے علاوہ کہ پارٹی کے ساتھ ان کے اخلاص و وفاداری کا کیا درجہ ہے ان کے مسلمان ہونے کی بنا پر ان کے بارے میں خصوصیت کے ساتھ اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی سیکولر جمہوری اسٹیٹ میں پوری طرح موزوں ثابت ہو سکتے ہیں یا نہیں اور تجربہ بتلاتا ہے کہ مسلمان وزراء ـــ الا ماشاء اللہ ـــ اس بات کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ اس معیار انتخاب پر پورے اتریں اور انتخاب کنندگان کو ان کی وجہ سے قوم و ملک کے سامنے رسوا ہونا نہ پڑے اور وہ اپنی اس کوشش میں "اللہ کے فضل" سے پوری طرح کامیاب بھی ہیں، یہ لوگ اپنے عام حالات میں سیکولر جمہوری اسٹیٹ کے اس مفہوم کو سامنے نہیں رکھتے ہیں، جو ان الفاظ سے سمجھا جاتا ہے بلکہ جمہور کے ذہن میں ان الفاظ کا جو مطلب ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ کام کرتے ہیں، ان کے نزدیک اگر مسلمانوں کی کوئی حق تلفی بھی گوارا کرنا پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس بات کے لیے تو وہ پوری طرح کوشاں رہتے ہیں کہ ان کے ساتھ ان کا کوئی لگاؤ کسی طرح ظاہر نہ ہو سکے ورنہ انتخاب کنندگان کی نظر انتخاب کی توہین ہوگی اور کیا عجب اس کی وجہ سے وہ ان کی نظر التفات سے بھی محروم ہو جائیں اور اس طرح مسلمانوں کی "خدمت" کا یہ ذریعہ بھی جاتا رہے۔ ہندوستان میں ایک وقت میں مسلم وزیروں کی تعداد کچھ

کم نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کی شکایات روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہیں اور یہ وزراء ان پر اس طرح خاموش ہیں گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ آپ ان
ہی وزراء پر اپنے مستقبل کے وزراء کو بھی قیاس کر سکتے ہیں، بلکہ اس وقت جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے وہ شاید ویسے بھی ثابت نہ ہو سکیں جیسے اس وقت
کے وزراء ہیں جن کے وجوہ ظاہر ہیں۔

دوسری بات جو اس ضمن میں اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ یہ خیال سراسر احمقانہ ہے کہ کسی قوم کے حقوق و مطالبات کا تحفظ اس پر موقوف
ہے کہ اس کے کچھ لسان القوم ہوں جو اس کی باتیں ایوان اسمبلی میں پہونچا سکیں جس زمانہ میں ارباب اختیار ایسے ہوتے تھے کہ ان کو از خود کسی قوم کے جذبات وخیالات
یا اس کے مطالبات کا علم نہیں ہوتا تھا اور وہ محض اپنی ناواقفیت کی بنا پر ان کی حق تلفیوں کے مرتکب ہو جایا کرتے تھے اس زمانہ میں تو یقیناً اس کی ضرورت
پیش آیا کرتی تھی کہ اپنی باتیں ان کے گوش ہوش تک پہونچائی جائیں اور ان کو اپنی حق تلفیوں کے ازالہ پر آمادہ کیا جائے لیکن اب زمانہ اس سے بالکل مختلف ہے۔
ارباب اختیار جاہل اور ناواقف حال لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کو ایک ایک بات کی خبر ہے اور ان کے ذرائع علم ایسے وسیع ہیں کہ وہ آپ کے دلوں کے
بھیدوں کا بھی حال معلوم کر لے سکتے ہیں، اس لیے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کے حقوق و مطالبات کا پورا ہونا بس اس پر موقوف ہے کہ کسی طرح وہ ارباب
اختیار کے کانوں تک پہونچ سکیں، بلکہ وہ تمام تر اس پر موقوف ہے کہ خود آپ کے اندر ان کے منوانے کی کتنی صلاحیت موجود ہے۔ بالفاظ دیگر آپ کے معاملات
کا فیصلہ اسمبلیوں کے اندر نہیں ہوتا ہے بلکہ ان کے فیصلے کی اصل جگہ اسمبلیوں کے باہر ہے۔ اگر آپ نے اپنی حالت ایسی بنا لی کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کا
وزن محسوس کیا جائے تو چاہے آپ زبان سے کچھ نہ کہیں وہ بات پوری ہو کر رہے گی، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو چاہے آپ سب کے سب اسمبلیوں میں پہونچ کر
شور و غل مچائیں، سوا ڈانٹ پھٹکار کے آپ کو کچھ میسر نہیں آئے گا۔ خود کانگریس کی پچھلی تاریخ اس حقیقت کی ترجمان ہے، اس کی آواز اس وقت کے ایوان
اقتدار میں اس وقت سنی گئی جب اس نے اسمبلیوں سے باہر رہ کر اپنے اندر وہ قوت پیدا کر لی کہ اس کی بات سنی جائے، ورنہ اس سے پہلے یہی ہوتا رہا ہے
کہ اگر کچھ لوگوں نے پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں اس مسلمہ اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسمبلیوں کا رخ کیا تو بہت جلد ان کو معلوم ہو گیا کہ
انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی شکایات محض اس لیے نہیں ہیں کہ کوئی اس کی بات ان کے کانوں تک پہونچانے والا نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ کچھ اپنی ہی
کمزوریوں میں چھپی ہوئی ہے، پنڈت جی اور ان کے ساتھیوں کی پرجوش تقریروں سے اکثر ایوان اسمبلی لرز اٹھا کرتا تھا لیکن، بر نالہ گرنے کی جگہ ستمگیں بھی اثر
میں ان تقریروں کے ذریعہ موثر فرق واقع نہیں ہوا۔ اور ایک بار کچھ اسی طرح کی غلطی خود کانگریس نے اپنی سرکاری حیثیت میں کی تھی، یعنی اس نے وزارتوں کے قبضہ
کے ذریعہ اپنا کام نکالنا چاہا تھا لیکن اسے فوراً ہی اپنی اس غلطی کا احساس ہو گیا اور بہت جلد اس کو سب کچھ چھوڑ کر اپنے اس میدان عمل میں واپس آنا پڑا جہاں
کی ہر بات پر واقعی دھیان دیا جاتا ہے اور جس کو خالی چھوڑ دینے سے بڑی سے بڑی آواز میں بھی کوئی قوت نہیں ہوتی ہے اور نہ اس کی طرف کوئی کان
دینے والا ہوتا ہے۔

بس ہمارے نزدیک اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ان کی آواز واقعی ارباب اختیار کے کانوں تک پہونچے اور سنی جائے تو اس کی حقیقی تدبیر یہ ہے
کہ وہ اپنی آواز ایسے گراموفونوں میں بند کرنے کی کوشش کریں جو اپنی مرضی سے بول بھی نہ سکتے ہوں اس طرح کے گراموفون، لوگوں کی تفریح
کا ذریعہ تو ضرور بن سکتے ہیں، لیکن ان کی آواز ارباب کار کو آپ کے حقوق و مطالبات کی طرف متوجہ نہیں کر سکتی، اس کے لیے آپ کو اس کے
کچھ کرنا پڑے گا جس کی تفصیل ان شاء اللہ ہم آگے توضیح کریں گے، لیکن یہاں یہ بات واضح کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کی

اپنی موجودہ شکایات کے ازالہ کے لیے جو اصل تدبیر ہو سکتی ہے،" مذکورہ بالا طریقہ، نہ صرف یہ کہ اس سے کوئی میل نہیں کھاتا بلکہ مختلف وجوہ سے وہ اس کو نقصان پہونچانے والا ہے، اس پر مفصل بحث تو غالباً آگے آئے گی لیکن اس کے دو ایک نقصانات کی طرف میں یہاں سرسری اشارہ کر دینا چاہتا ہوں۔

ممکن اور ناممکن کے سوال سے قطع نظر اس طریق عمل کی دو خرابیاں بالکل واضح ہیں۔

یہ طریق عمل بعینہٖ وہی طریق عمل ہے جو اب تک مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اختیار کرتے رہے ہیں، لیکن جس سے ان کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا ہے۔ ہندوستان میں ایک عرصہ سے مسلمانوں کی سیاست کا محور یہی رہا ہے کہ وہ کس طرح اسمبلیوں میں زیادہ سے زیادہ حق نمائندگی حاصل کریں، اور وزارتوں میں ان کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہو، اس کی خاطر انھوں نے خوشامدوں کی ذلت بھی گوارا کی اور مخالفتوں اور لڑائیوں کا خطرہ بھی مول لیا، اور بالآخر اس مقصد میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے، چنانچہ تقسیم سے پہلے ان کو غیر منقسم ہندوستان کی وزارتوں اور اسمبلیوں کی ممبریوں کا اس سے زیادہ حصہ حاصل رہا ہے جس کے وہ اپنے تناسب آبادی کے لحاظ سے مستحق ہو سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ باتیں ان کے دُکھ کا درماں نہیں بن سکیں، اور ہر کامیابی کے بعد ان کو پہلے سے زیادہ اپنی ناکامی کا احساس ہوتا گیا تاآنکہ آخری چارہ کار ان کو یہی نظر آیا کہ وہ اپنے لیے ایک علحدہ امن پاکستان کی شکل میں قائم کریں۔ پاکستان کا قیام مسلمانوں کے لیے خیر و برکت کا موجب ثابت ہوا، یا اس سے ان کے قومی مسائل اور زیادہ الجھ گئے یہ ایک علحدہ سوال ہے، جس سے یہاں تعرض کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے کم از کم یہ بات بالکل نمایاں طور سے سمجھی جا سکتی ہے کہ اس سے پہلے مسلمانوں نے وزارتوں اور ممبریوں پر جو تکیہ کیا تھا وہ ان کے لیے کچھ سازگار اور مفید ثابت نہیں ہوا۔ تو کیا ہندوستان کے مسلمان اسی آزمائے ہوئے نسخہ کو دوبارہ استعمال کرنا چاہتے ہیں؟ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لیے اس تدبیر کا سہارا ڈھونڈھنا تو اُس وقت بھی صحیح نہیں تھا، لیکن اب تو ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا سہارا ان کو بالکلیہ ترک کر دینا چاہیے، ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی مطلق گنجائش نہیں ہے، اس زمانہ میں قومی حقوق و مطالبات پر زور دینا اور وہ بھی قوم پرستانہ طریقوں کے ذریعہ، یہ ان حقوق کو پامال کرنے کے مترادف ہے، اول تو مسلمانوں کو اب اپنا صحیح مقام سمجھتے ہوئے خود ہی اپنے قومی حقوق و مطالبات کی فہرست پر نظر ڈالنی چاہیے کہ وہ ان کی واقعی صحیح حیثیت، یعنی ایک اصولی جماعت کے منصب کے لحاظ سے کہاں تک مناسب ہے اور ان میں اس کے لحاظ سے انھیں خود ردّ و بدل کر لینا چاہیے، لیکن اگر ابھی ان پر اپنی اصل حیثیت واضح نہیں ہوئی ہے اور وہ اپنی موجودہ حیثیت ہی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر انھیں اپنے حقوق و مطالبات کے منوانے کے لیے کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے، یہ اسمبلیوں کی نمائندگی تو اس کے لیے کچھ سودمند نہیں ہے۔

اس طرز عمل کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر اسے منافی اسلام سمجھتے ہوئے اختیار کیا جاتا ہے تو اس سے مسلمانوں کا

دینی حس مجروح ہوتا ہے، جس کا صدمہ بار بار سہنے کے بعد شاید ان کے دلوں سے وہ ایمانی حس بھی رخصت ہو جائے جس پر ان کی آیندہ ملی حیات کا دارومدار ہے اور اگر اسے منافی ایمان نہیں سمجھا جاتا ہے تو بھی یہ طریقہ، صحیح اسلامی طریقہ کے اختیار کرنے میں زبردست رکاوٹ ہے اور اس لحاظ سے اس کا انجام بھی وہی ہو سکتا ہے، جو پہلی شکل میں ہوگا، یعنی مسلمان، اسلام کے بتائے ہوئے صحیح طریقہ عمل کو اختیار کرنے کی بجائے، اسی طرح کی خود ساختہ تدبیروں کے آزمانے میں اپنا وقت گنواتے رہیں گے اور اس کے پیچھے وہ اپنی دُنیا بھی برباد کریں گے اور دین بھی، ذٰلک ھو الخسران المبین ——— (باقی)

ادارہ اور اہتمام کی طرف سے اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ پرچہ پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو سکے لیکن ؎

تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

اور اگر یہ نہ ہو تو آدمی اپنے عجز و بے بسی اور اپنی خواہش و ارادہ کے مقابلہ میں کسی اور بالاتر ارادہ و مشیت کا قائل ہی کس طرح ہو سکتا ہے،

عرفت ربی بفسخ العزائم

پچھلا پرچہ بعض پیش آنے والی ناگزیر مصروفیات کے پیش نظر مقررہ وقت سے بھی پہلے تیار کر دیا گیا تھا لیکن عین موقع پر معلوم ہوا کہ کاپیاں پلیٹ پر سے غائب ہو گئی ہیں، جس کی وجہ سے تقریباً نصف پرچہ دوبارہ پلیٹ پر لکھنا پڑا، اس میں چند روز کی تاخیر ناگزیر تھی،

ہمیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ پرچہ کے لیے ناظرین کو جو شدید انتظار رہتا ہے اس کی وجہ سے ان پر یہ تاخیر بہت شاق گذری ہوگی جس کا اندازہ ان بے شدید خطوط سے بھی ہو رہا ہے جو اس سلسلہ میں دفتر میں آچکے ہیں لیکن ظاہر ہے اس تاخیر میں ہمارے قصد و ارادہ کو کوئی دخل نہیں رہا ہے اس لیے ہمارا خیال ہے غالباً یہ اظہار واقعہ، معذرت کے لیے کافی ہے، ویسے جہاں تک افسوس کا تعلق ہے ہم اس معاملہ میں ناظرین سے پیچھے نہیں ہیں کیونکہ ہم خود اسے پسند نہیں کرتے کہ پرچہ وقت پر شائع نہ ہو سکے، بہرحال ہم آئندہ اس بات کی پوری کوشش کریں گے کہ آیندہ پابندی وقت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کر سکیں، لیکن اس کے سلسلہ میں ایک بات ناظرین کے علم میں رہنی چاہیئے کہ اس طرح کے اتفاقی حادثات کے علاوہ کچھ ایسی باتیں بھی ہو سکتی جن کی وجہ سے پرچے کی اشاعت میں کبھی دو ایک روز کی تاخیر ہو جایا کرے، مثلاً پرچے کے مستقل ابواب جن حضرات سے متعلق ہیں ان کو ان کے علاوہ اور بھی ضروری کام اور مصروفیتیں پیش آتی رہتی ہیں، اس لیے اگر اتفاق سے کبھی کبھی کچھ تاخیر ہو جایا کرے تو وہ اس پر زیادہ بے چین نہ ہوا کریں، اس طرح کے ماہوار پرچوں کے لیے دو چار روز کی تاخیر کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

اس پرچہ میں روئداد شوریٰ کی وجہ سے متعدد مستقل ابواب کے لیے گنجائش نہیں نکل سکی لیکن بہرحال یہ روئداد ایک ضروری اور مفید چیز ہے، اس لیے اُمید ہے کہ یہ ان ابواب کی پوری طرح تلافی کر سکے گی، جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرات اس کا خاص طور سے مطالعہ کریں، امیر جماعت کی ہدایت کے مطابق اس روئداد کے تمام قابل العمل اُمور پر فوراً عمل درآمد شروع کر دینا چاہیئے، اس کے لیے کسی مزید ہدایت کا انتظار نہ کیا جائے، ارکان، امرا جماعت اور قیمین، اپنے متعلق ہدایات کا اچھی طرح مطالعہ کر لیں۔

جو لوگ جماعت سے متعلق نہیں ہیں، ان کے لیے بھی انشاء اللہ اس روئداد کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا، اس سے ان کو جماعت کے مقاصد اور اس کے طریق کار وغیرہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

(ادارہ)

تیسیر القرآن

(۶)

(سورۂ بقرہ از آیت ۴۰ تا آیت ۴۶)

مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اے بنی اسرائیل![1]

---

[1] "اسرائیل" حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام تھا، جو حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ اسرائیل ایک عبرانی لفظ ہے، جس کا لغوی ترجمہ "بندۂ خدا" ہے۔ قوم یہود اِنہی کی نسل سے ہے اور اسی بنا پر وہ بنی اسرائیل یا اولادِ اسرائیل کہلاتی ہے۔ یہ لوگ حضرت موسیٰؑ کے پیرو ہیں، جو تقریباً تین ہزار برس پہلے مصر میں مبعوث ہوئے تھے۔ ان پر جو کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی تھی اور جس کے یہودی علمبردار ہیں، اس کا نام تورات ہے۔

ہم نے شروع میں یہ بات بتائی تھی کہ اس سورہ کا خاص خطاب یہود کی طرف ہے۔ یہ بات ابتدائے سورہ سے اب تک کی آیتوں میں صراحت کے ساتھ نظر نہیں آتی، بلکہ نہایت لطیف کنایات کے اندر سے صرف جھلکتی ہے۔ مگر اب ان لوگوں سے براہِ راست گفتگو شروع ہو رہی ہے، اور اس سے پہلے نبوتِ محمدیؐ کی جو دعوت کسی قوم یا جماعت کی تخصیص کیے بغیر بالکل عام انداز میں دی گئی تھی، اور اس کی صداقت پر جو عمومی استدلال کیا گیا تھا، وہ اب یہاں سے خصوصیت کا رنگ اختیار کر رہا ہے، اور بنی اسرائیل کا نام لے کر انھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، یا دوسرے لفظوں میں قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے، اور ان کی ان مخالفانہ سرگرمیوں پر سخت تنقید اور نفرت کا اظہار کیا جا رہا ہے جو ان کی جانب سے اس دعوت کے بالمقابل عمل میں لائی جا رہی تھیں۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تفہیم القرآن

بنی اسرائیل کے کردار کی جو تصویر آگے کے الفاظ میں دکھائی دے رہی ہے، اور ان کی ذہنیتوں کا جو تجزیہ کیا گیا ہے وہ قرآن کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں، دونوں کے لیے قابلِ توجہ ہے۔ ماننے والوں کے لیے اس واسطے کہ وہ اس آئینہ میں اپنی شکل دیکھ سکیں گے، وہ یہ معلوم کر سکیں گے کہ کتابِ الٰہی رکھنے کے باوجود قومیں کس طرح گمراہ ہو جاتی ہیں، اور کن کن راہوں سے، اور کیسے کیسے فتنے ان میں گھس پڑتے ہیں، اور پھر اس کا نتیجہ کس ذلت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے؟ نیز یہ کہ اس صورتِ حال کا علاج کیا ہوتا ہے؟ اور صحیح علاج اختیار کرنے کے بجائے علاج کا غیر مناسب اور مصنوعی طریقہ اختیار کرنے سے کس طرح حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جاتی ہے ـــــــ نہ ماننے والوں کے لیے اس واسطے کہ انھیں اندازہ ہو سکے گا کہ کسی بات کی سچائی معلوم کرنے کے لیے کتنے کھلے اور بے لوث ذہن کی ضرورت ہے، اور یہ کہ ایسے وقت انسان کے دماغ پر کس طرح تعصب کے جذبات چھا جایا کرتے ہیں، کبھی شعوری طور پر، اور کبھی غیر شعوری طور پر۔

جس وقت قرآن کی دعوت اُٹھی، اُس وقت یہود اپنے زبانی دعوے کے مطابق ایک کتابِ الٰہی کے پیرو اور حقیقت کے اعتبار سے بگڑے ہوئے مسلمان تھے، جن کا کتابِ الٰہی سے عملی رشتہ قریب قریب بالکل ٹوٹ چکا تھا، جن کی خدا فراموشی کو پہنچی ہوئی تھی، جو نیکی اور تقویٰ کے جوہر سے خالی، اور دُنیا پرستی میں پوری طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ عوام دین کے بنیادی اصولوں اور ابتدائی تقاضوں تک سے ناواقف تھے، دولت والے سود خواری اور عیش پرستی میں مصروف تھے، علما خدا سے غافل، حق کے چھپانے والے اور دین کے دُکاندار بن چکے تھے۔ غرض مجموعی حیثیت سے پوری قوم اخلاقی پستی اور ذہنی بے حسی کی انتہائی گہرائیوں میں پڑی ہوئی تھی۔ ایسے لوگوں کے اندر حق پسندی کا ذوق نہ صرف یہ کہ بگڑ جاتا ہے بلکہ ان کی انسانی فطرت بالکل اُلٹ جاتی ہے، اور وہ حق کی طرف سے اپنے اندر ایک سخت قسم کا انقباض پیدا کر لیتے ہیں، جس کے بعد یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ جب انھیں کسی حق سے سابقہ پیش آئے تو اس کو ٹھکرا دیں، اور آخر میں اس کے جانی دشمن بن جائیں۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس امر کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ ہوگا کہ ان یہودیوں نے قرآن کے پیغامِ خداوندی کو کن کانوں سُنا ہوگا۔

مگر بدقسمتی سے معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ بعض اسباب اور بھی درمیان میں موجود تھے جنھوں نے مخالفت کی اس ذہنیت کو اور پختگی بخشی۔ یہ بنی اسرائیل دینی اور نسلی غرور کا بُری طرح شکار تھے۔ وہ اپنے کو بنی اسمٰعیل کے مقابلے میں اتنا ہی برتر گمان کرتے تھے جتنا برتر آج کے برہمن اپنے کو اچھوتوں کے مقابلے میں سمجھتے ہیں۔ بنی اسمٰعیل کو وہ "اُمیّوں" کا گروہ کہتے تھے یعنی اَن پڑھوں، جاہلوں اور غیر مہذبوں کا گروہ، لہٰذا انھیں ابتدائی انسانی حقوق کا بھی مستحق نہیں سمجھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ خود یہ بنی اسمٰعیل بھی بنی اسرائیل کے اس ادّعائے برتری سے متاثر ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان کے ہاں ایک دستور سا ہو گیا تھا کہ جب کسی عورت کے بچے زندہ نہ رہتے تو وہ نذر مانتی کہ اگر میرا یہ بچہ زندہ رہ گیا تو میں اس کو یہودی بنا دوں گی۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی خاندان بنی اسمٰعیل میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے ان کو نبی تسلیم کر لینے کے معنی یہ تھے کہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کے درمیان

شاد برتری کا توازن یکسر الٹ کر رہ جائے، اور بنی اسرائیل ـــــ خدا کے "لاڈلے بیٹے" اور ساری دینی اور دنیوی نعمتوں کے "تنہا اجارہ دار" بنی اسرائیل ـــــ آج سے بنی اسمٰعیل کی دینی فضیلت کا، اور پھر کل سے دنیوی برتری کا بھی اقرار کرلیں۔ اتنی کڑوی گولی کا نگلنا آسان نہ تھا، بالخصوص اس قوم کے لیے جس نے صدیوں سے نسلی غرور اور خود پسندی کی میٹھی اور مزے دار غذائیں کھا کر پرورش پائی ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل سے اس نبوت کی سچائی تسلیم کرنے کے باوجود آتشِ حسد سے یہ لوگ دیوانے ہوگئے، اور اس کی تردید اور مخالفت میں برا جا کر کھڑے ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ آدم و ابلیس کے قصے کو پہلے بیان کیا گیا، اور اس کے ختم ہوتے ہی یکایک "اے بنی اسرائیل" کہتے ہوئے ان کی طرف گفتگو کا رخ پھیر دیا تاکہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوجائے کہ جس طرح ابلیس نے محض غرورِ نفس اور غرورِ نسل کی بناء پر آتشِ حسد سے جل کر آدم کی حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا، امرِ الٰہی سننے اور سمجھنے کے باوجود سجدہ کرنے کے لیے تیار نہ ہوا تھا ٹھیک اسی طرح یہ یہودی بھی حسد کے شیطانی جذبات کا شکار ہوکر جانتے بوجھتے ایک حق کا انکار کررہے ہیں، اور جس طرح اللہ کی کچھ خاص نعمتوں کو پاکر ابلیس نفس کے اس دھوکے میں مبتلا ہوگیا تھا کہ عزت و بزرگی میرا ایک پیدائشی حق ہے، اسی طرح یہ لوگ اپنی پچھلی پرعظمت تاریخ کا تصور کرتے ہوئے اس خیالِ خام میں مبتلا ہیں کہ ہم خواہ کچھ ہوجائیں، اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائیوں کے حق دار ہر حال میں ہم ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی عبرت ناک داستان سنا کر انھیں جھنجھوڑنا چاہا ہے کہ اب تک تم نے خود فریبی کی زندگی بہت گزار لی، ہوش میں آؤ، تمھارے باپ دادا کو نعمتیں اس لیے نہیں ملی تھیں کہ وہ ان کا پیدائشی حق تھیں، بلکہ وہ محض میرا فضل تھیں، اور اسی لیے بخشی گئی تھیں تاکہ ان کا شکر ادا کیا جائے، اور زیادہ سے زیادہ میری اطاعت و رضاجوئی کی جائے، نہ اس لیے کہ ان کی ناشکری کی جائے، اور میرے خلاف علانیہ بغاوت اختیار کرلی جائے۔ اگر ایسا کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ نعمت سلب کرلی جاتی ہے، اور عبرت ناک سزا دی جاتی ہے۔ ابلیس کا قصہ اس اصولِ مکافات کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ اور یہ جو تم آج، اقوامِ عالم کی امامت کے بعد ذلت کی زندہ تصویر بنے ہو تو دراصل یہ بھی اسی ضابطے کے سبب سے ہے، جس کی نوعیت تمھاری تاویلوں اور خوش فہمیوں سے بدل نہیں سکتی۔ اس لیے خام خیالیوں کو چھوڑ دو، اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو سنجیدگی سے حقائق کا مقابلہ کرو، اور اس پیغمبر پر ایمان لاکر غیر مشروط بندگی کا رویّہ اختیار کرو۔ قدرت کا ایک فیصلہ تھا سو ہوگیا، اور نبوت ایک ایسے شخص کو دے دی گئی جو تمھارے خاندان سے نہیں، اور اس لیے گویا تمھاری خواہشوں کے خلاف دی گئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ تمھیں خدا کی رضاجوئی کرنی ہے یا اپنے نفس کی؟ آیا تمھاری بندگی کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ اپنے آقا کے احکام کی پابندی کرو، خواہ وہ کسی بھی نسل اور ملک سے تعلق رکھنے والے کے ذریعے اور کسی زبان میں تم تک پہنچیں، یا یہ کہ اُن کی پابندی کرنے کے لیے شرطیں پیش کرو اور اپنے قومی اور ملی جذباتِ تعصب کی تسکین کا مطالبہ کرو؟

اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَآمِنُوا بِمَا أَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ

میری اُس نعمت[۵۱] کو یاد کرو جو میں نے تم کو عطا کی تھی، اور میرے (ساتھ باندھے ہوئے اپنے) عہد[۵۲] کو پورا کرو، میں تمہارے (ساتھ کیے ہوئے اپنے) عہد[۵۳] کو پورا کروں گا، اور صرف مجھ ہی سے ڈرو[۵۴]۔ اور اس کتاب[۵۵] پر ایمان لاؤ جسے میں نے نازل کیا ہے (جس کا حال یہ ہے کہ) وہ اس کتاب (کی پیشین گوئیوں) کے عین مطابق[۵۶] ہے جو تمہارے پاس ہے۔

---

۵۱ بنی اسرائیل کو دینی اور دُنیوی دونوں ہی قسم کی اعلیٰ ترین نعمتیں دی گئی تھیں۔ ان میں عرصہ دراز تک وحی و رسالت کا سلسلہ جاری رکھا اور بے شمار انبیا پیدا ہوئے، اسی طرح انھیں عظیم الشان اور بے مثال اقتدار و حکومت بھی بخشا گیا۔ اگرچہ "نعمت" سے مراد یہ دونوں ہی قسم کی نعمتیں ہیں، مگر اس جگہ خصوصیت سے دینی نعمت ہی کا تذکرہ ہے۔

۵۲ اس عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (توراۃ) پر ایمان رکھنا اور اُس کے احکام اور اس کی ساری ہدایات پر سچے دل سے عمل کرنا ہے خصوصاً اس حکم اور ہدایت پر کہ جب بھی کوئی خدا کا پیغام بر تمہارے پاس جائے، تم کو اُس پر ایمان لانا اور اُس کے مشن میں اُس کا ساتھ دینا ہوگا ــــ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۸۱ میں اس عہد کی تفصیل آئے گی جہاں انھیں خدا کی طرف سے آنے والے پیامِ حق کا گواہ بھی کہا گیا ہے۔

۵۳ یعنی تم کو دُنیا میں عزت، اور آخرت میں مغفرت عطا کروں گا۔ ان دونوں عہدوں کی یکجا وضاحت سورۂ مائدہ کی آیت ۱۲ میں موجود ہے۔

۵۴ یہاں ذکر دراصل اس عہد کا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے اپنے انبیاؑ کے ذریعے لیا تھا۔ ماضی کی بات حال کے پیرائے میں بیان کی گئی ہے جس میں بظاہر آج کے یہودیوں سے اُس عہد کے پورا کرنے کا مطالبہ ہے، مگر درحقیقت ان کی عہد شکنی، خدا فراموشی، باطل پرستی اور دُنیاداری پر گہری تعریض ہے۔

یہ بات کہ "مجھی سے ڈرو" اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے کہ ادائے عہد کی راہ، اور دین کی پیروی کبھی بھی مشکلات کے کانٹوں سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ لاکھوں دُشمنانِ حق راہ روکیں گے، مگر سوال یہ ہے کہ خوف ان رکاوٹوں اور مخالفتوں کا کھانا چاہیے، یا اللہ کا؟ ان دونوں میں کون زیادہ طاقتور اور قابلِ لحاظ ہے۔

۵۵ یہاں کتاب سے مراد قرآن ہے، قرآن پر ایمان لانا اس عہد کا واضح تقاضا ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا، اور جس کو اللہ تعالیٰ ابھی اوپر کے جملے میں یاد دلا چکا ہے۔

۵۶ "عین مطابق" یعنی ان پیشین گوئیوں کا صحیح مصداق ہے جو تمہاری اپنی کتاب (توراۃ) میں موجود چلی آ رہی ہیں، اور اس طرح جہاں خود اس کتاب کا کتابِ الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے وہیں وہ ان پچھلی کتابوں ــــ توراۃ و انجیل ــــ کی صداقت کا بھی ضروری ثبوت ہے۔ ورنہ اگر یہ نبی مبعوث نہ ہوتا، اور یہ قرآن نہ آتا تو اس کا انجام یہ ہوتا کہ وہ پیشین گوئیاں غلط ثابت ہو جاتیں، یا کم سے کم یہ کہ دُنیا ان کے صحیح یا غلط ہونے کا انتظار ہی کرتی رہتی جو ان کتابوں میں موجود تھیں، اور پیشین گوئیوں کا غلط ثابت ہونا خود ان کتابوں کے جھوٹی ہونے کا ہم معنی تھا۔

چونکہ جہاں تک اہلِ کتاب کا تعلق ہے، قرآن اور نبوتِ محمدیؐ پر یہ دلیل سب سے زیادہ واضح اور شک و تردد سے بالاتر دلیل تھی اس لیے اس موقع پر اسی کو اللہ تعالیٰ نے پیش فرمایا، اور پیش فرما کر ان سے مطالبہ کیا کہ اس کتاب پر ایمان لائیں۔

وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

پھر سب سے پہلے تم ہی اسے ٹھکرا دینے والے نہ بن جاؤ[1]، اور نہ ایسا کرو کہ حقیر سی قیمت پر میری آیتوں کو بیچ ڈالو[2]، (ہر حال میں) میرا ہی تقویٰ اختیار کرو۔ حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ نہ کرو[3]، اور (اس طرح) جان بوجھ کر حق (کی گواہی) کو نہ چھپاؤ[4]

---

[1] ان لوگوں کی ناشکری، حق دشمنی اور ناعاقبت اندیشی پر تعجب اور افسوس ظاہر کرنے کا کتنا بلیغ انداز ہے! چاہیے تو یہ تھا کہ یہ لوگ سب سے آگے بڑھ کر اپنے ایمان لانے کا اعلان کرتے اور وعدے کے مطابق نبی کے مشن میں اس کے دست و بازو بنتے۔ اس لیے کہ انھیں اس دعوت کو دعوتِ حق، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول پہچاننے میں ذرا زحمت نہ پیش آتی، مگر دنیا نے حیرت سے دیکھا کہ وہ اس دعوت کے معاملے میں "حزبِ مخالف" کے لیڈر بن گئے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کیا تمہارا مقام یہی تھا؟ اگر عرب کے مشرک، جو توحید، رسالت، وحی اور قیامت کے تصورات سے ناواقف تھے، اس پیغام کے سمجھنے میں دیر لگائیں تو ان کے لیے ایک وجہ بھی ہو سکتی ہے، مگر تم جو ان سب حقیقتوں کے جاننے والے، اور ان کے علمبردار رہے، اور پھر تمہاری آنکھیں نبی کے چہرے پر صداقت کا نور بھی دیکھ رہی ہیں، تمہارا دل اس کے نبی برحق ہونے پر گواہی بھی دے رہا ہے، تمہاری کتاب (تورات) اس کے رسولِ خدا ہونے کا اعلان بھی کر رہی ہے، صد افسوس کہ تم اس کی مخالفت میں سب سے آگے ہو، جب کہ تمھیں اس کی رفاقت اور نصرت میں سب سے آگے ہونا چاہیے تھا۔

حق کو حق جاننے کے باوجود اس کی مخالفت کا یہ واقعہ گو ایک پرانی حکایت ہے، مگر اس کا ایک پرانی حکایت کے طور پر نہیں بلکہ ایک نفسیاتی حقیقت کے طور پر مطالعہ کرنا اور جائزہ لینا چاہیے۔

[2] اللہ کی آیتوں کو یعنی اس کے احکام و ہدایات کو "حقیر قیمت" پر بیچنے کے معنی ہیں چند دنیوی فائدوں کی خاطر، یا نسلی و قومی جذباتِ تعصب کو تسکین دینے کے لیے، یا اپنی دینی پیشوائی کی محبت میں انھیں غفلت کی نذر کر دینا۔

[3] "حق" سے مراد دین کی حقیقت، اور تورات کے احکام و ہدایات اور ان کے صریح تقاضے ہیں، بالخصوص وہ ہدایت جس کا تعلق نبوتِ محمدی صلعم سے تھا۔ "باطل" سے مراد ان کے وہ من گھڑت نظریے ہیں جن کی بنیاد صرف خواہشات پر تھی۔

[4] یہ لوگ حقیقتاً نبیِ آخر الزمانؐ کی نبوت کے خدائی گواہ تھے، اس لیے ان کا فرض تھا کہ دنیا کے سامنے اس کے برحق، اور خدا ہی کی طرف سے ہونے کی شہادت دیں، مگر وقت آنے پر نہ صرف یہ کہ وہ خود اس پر ایمان نہیں لائے، بلکہ ان پیشین گوئیوں کو جو تورات میں اس بعثت سے متعلق موجود تھیں، انھوں نے پوری طرح چھپانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش آخرِ کار توریت کی عبارتوں میں تحریف کی حد تک پہنچ گئی۔ یہاں اسی شہادت کے نہ چھپانے اور اس کو برملا واضح کر دینے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ

نماز قائم[1] کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور میرے حضور جھکنے والوں[2] کے ساتھ تم بھی جھک جاؤ۔ کیا تم دوسروں کو تو نیکی کی تلقین کرتے رہتے ہو، پر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو[3]؟ حالانکہ تم کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے رہتے ہو[4]۔ کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے!۔ اور (اس راہِ خدا پرستی میں) صبر[5] اور نماز کے ذریعے (خدا سے) مدد لو۔

---

[1] یعنی تم نے نماز کو چھوڑ دیا ہے، اور اس کی جگہ نفس کی خواہشوں کی پیروی اختیار کر لی ہے، اسی طرح زکوٰۃ کا تم نام بھی بھول چکے ہو، اس کے بجائے دولت کی پوجا، اور سود خواری تمہاری سب سے بڑی پہچان بن چکی ہے۔ اس طرح تم نے نماز اور زکوٰۃ کو چھوڑ کر دراصل پورے دین کی حقیقت کھو دی ہے۔ اس کا طبعی نتیجہ یہی ہونا ہی تھا کہ تمہارا دل خدا پرستی کے ذوق سے بیگانہ ہو جائے۔ اس لیے تمہارا فرض ہے کہ اس کھوئی ہوئی حقیقتِ دین کو پھر سے ڈھونڈھ کر لاؤ اور اسے اپنے دلوں میں جگہ دو۔ اس کے بعد ہی تم سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ قرآن کے بارے میں انصاف اور سنجیدگی سے کام لوگے۔

یہاں اس بات کی طرف بھی توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ نماز اور زکوٰۃ ہر زمانے میں اسلام کے اہم ترین احکام رہے ہیں کیونکہ عملی لحاظ سے یہی دونوں چیزیں دین کی اصل بنیاد ہیں۔ البتہ ان کی شکلوں اور جزئی تفصیلات میں اختلاف ضرور رہا ہے۔

[2] "جھکنے والوں" کا لفظ تو عام ہے، مگر اس میں اصحابِ رسولؐ کی طرف ایک خصوصی اشارہ بھی ہے۔ دراصل یہاں غلط کار اور خود فریب یہودیوں کے سامنے خدا پرستی کا ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے انھیں بتایا گیا ہے کہ خدا کے سچے بندوں اور اس کے محبوبوں کی شکل یہ ہوتی ہے، نہ کہ وہ جو تم پیش کر رہے ہو۔

[3] یوں تو ابتدا ہی سے لفظ "بنی اسرائیل" کے عام ہونے کے باوجود اصل مخاطب یہود کے دینی پیشوا ہیں، مگر یہاں پر یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے، اور انھیں ملامت کی جا رہی ہے کہ تم عوام کو تو روز نیکی، روی کا وعظ فرماتے رہتے ہو، مگر ان وعظوں کا مخاطب کبھی اپنے آپ کو نہیں بناتے، آخر دل کی بے حسی اور بے غیرتی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے!۔ یہ کسی گروہ کے اخلاقی اور دینی زوال کی سب سے آخری حد ہے کہ اس کے ذمے دار اور سربراہ کار اس کے علماء و مشائخ نرے قول بن کر رہ جائیں، اور دین سے اپنا عملی رشتہ توڑ کر لوگوں کے سامنے صرف اس کے محاسن گنانے اور گرم گرم وعظ سنانے میں مشغول ہیں، محض اس لیے تاکہ اپنے تقدس کا سکہ جما سکیں۔ علمائے بنی اسرائیل کا یہ بہت پرانا کاروبار تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی اسی روش کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم دوسروں کے سر تو بڑے بڑے گٹھر لادتے ہو، مگر خود انھیں انگلی سے بھی نہیں چھونا چاہتے۔

[4] کتاب، یعنی تورات، جس میں یہ حکم تصریح کے ساتھ موجود ہے کہ خدا کے احکام بلا استثنا سب کے لیے ہیں، اور ان لوگوں پر تو ان کے اتباع کی ذمے داری دوچند ہے جو ان کے جاننے اور پڑھنے پڑھانے والے ہیں۔

[5] "صبر" کے عربی زبان میں بہت وسیع معنی ہیں، اور اصطلاحِ قرآن میں اس سے بھی زیادہ وسیع۔ لغتاً صبر کے معنی ہیں جم جانا، ثابت قدم رہنا۔ شرعاً صبر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا پرستی کی راہ پر اس طرح جم جائے کہ کوئی انفرادی، اجتماعی، خاندانی، وطنی، ملکی نفع یا نقصان اسے عدل اور حق کے مرکز سے نہ ہٹا سکے، اور نفس کی زبردست سے زبردست خواہش بھی اس کے پاؤں میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نماز (نفسِ انسانی کو لیے) نہایت شاق ہے، سوائے اُن لوگوں کے جن کے اندر فروتنی ہے، جنھیں یہ خیال دامن گیر رہتا ہے کہ انھیں اپنے رب سے ملنا اور اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔[ع]

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ صبر نفس پر شاق نہیں ہے، بلکہ اس انداز بیان سے دراصل بتانا ہی یہ مقصود ہے کہ صبر کا شاق ہونا ایک واضح امر ہے، ایسا واضح کہ اس کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ جس طرح اسی سورہ کی آیت ۱۵۳ میں ٹھیک یہی ہدایت جو یہاں یہودیوں کو دی جا رہی ہے، مسلمانوں کو دیتے ہوئے یوں فرمایا گیا ہے کہ [يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝] یعنی اے ایمان لانے والو! صبر اور نماز کے ذریعے (خدا سے) مدد لو، بلاشبہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کر لیا گیا ہے کہ "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" یہ نہیں کہا گیا کہ صبر کرنے والوں اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہے، اس لیے کہ نماز تو نام ہی ہے اللہ کی معیّت کا، جیسا کہ قرآن اور حدیث میں بے شمار مواقع پر اس کی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا اس بات کا کہنا ایک امرِ واضح کا بیان کرنا تھا اور اس طرح اس کا کوئی حاصل نہ ہوتا سوائے اس کے کہ اس کے واضح ہونے پر حرف آ جائے۔

[2] معلوم ہوا کہ حق شناسی اور حق پرستی کی بنیاد قیامت کا اندیشہ ہے، جس شخص کے دل میں یہ کھٹکا نہ ہوگا کہ اس کو ایک نہ ایک دن اپنی اس زندگی کا پورا پورا حساب دینا ہے، وہ کسی ہدایتِ خداوندی کے بارے میں سنجیدگی، توجہ اور راست بازی کا رویہ نہیں اختیار کر سکتا۔ اگر وہ پہلے سے اس کو نہیں مانتا رہا ہے تو للّٰہ اس پر اتمامِ حجت کیجیے، ایک بھی سُن کر نہ دے گا۔ اور اگر اس کا نام لیوا ہے تو بس نام ہی تک اس سے ناتا رکھ سکتا ہے۔ اس کی پوری عملی زندگی میں کہیں بھی اس ہدایت کا اثر دکھائی نہ پڑے گا۔ بخلاف اس کے جس کسی کے دل میں اندیشۂ آخرت ہوگا، وہ ہر آن اللہ تعالیٰ کا خشوع اپنے اندر رکھے گا، جس کا ظہور نماز کی شکل میں ہوتا رہے گا۔

مقالات

تاریخ دعوت اسلام کا ایک زریں ورق

(۲)

از مولانا ابو محمد امام الدین صاحب رامنگری

دعوت دین حق

حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر پہنچے، وہاں حضرت ہارون علیہ السلام آپ سے مل گئے، دونوں بھائی ارشاد ربانی کی تعلیم کے لیے فرعون کے دربار میں گئے، حق کی دعوت پیش کی اور اس سے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا، اس موقع پر حضرت موسیٰؑ اور فرعون میں جو گفتگو ہوئی اس کی کیفیت ایک مقام میں اس طرح مذکور ہے۔

قال الم نربك فينا وليدا ولبثت فينا	فرعون نے پوچھا جب تم بچے تھے تو کیا ہم نے تمہیں اپنے ہاں رکھ کر
من عمرك سنين وفعلت فعلتك	تمہاری پرورش نہیں کی، اور تم نے اپنی زندگی کے کتنے برس ہمارے درمیان
التي فعلت وانت من الكافرين قالَ	نہیں گذارے اور تم نے اس سے پہلے ایک فعل کیا تھا جو کیا تھا اور تو ناشکر
فعلتها اذا وانا من الضالين ففررت	گذار ہے، موسیٰؑ نے کہا، اس وقت مجھ سے وہ کام سرزد ہو گیا
منكم لما خفتكم فوهب لي ربي حكما	تھا جب کہ مجھ کو حقیقت کی تعلیم نہیں ملی تھی پھر جب مجھ کو تم سے خطرہ محسوس ہوا تو میں تمہارے پاس سے بھاگا
وجعلني من المرسلين وتلك نعمة	بعد ازاں میرے رب نے مجھے حکم عطا کیا اور مجھے اپنا رسول بنا دیا اور وہ
تمنها عليَّ ان عبدت بني اسرائيل	جو تیرا احسان ہے اور جس کا تو اظہار کر رہا ہے، یہی تو ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو
قال فرعون وما رب العالمين ؟ قال	غلام بنا رکھا ہے؟ فرعون نے کہا، اور رب العالمین کیا ہے جس کا حکم لیکر تم تیرے
رب السموات والارض وما بينهما	ہاں آئے ہو؟ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا، وہ جو آسمان و زمین اور جو کچھ
ان كنتم موقنين قال لمن حوله الا	ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے، بشرطیکہ تم یقین کرو، فرعون نے ان لوگوں
تستمعون ؟ قال ربكم ورب اباءكم	سے جو اس کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے کہا کیا تم سنتے نہیں ہو؟ موسیٰؑ نے اپنے
الاولين قال ان رسولكم الذي	سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا تمہارا رب بھی اور تمہارے آباؤ اجداد کا

ارسل الیکم لمجنون قال رب المشرق
والمغرب وما بینهما ان کنتم تعقلون ○
قال لئن اتخذت الٰها غیری لاجعلنک
من المسجونین ○ قال اولو جئتک بشیٔ
مبین، قال فات بہ ان کنت من
الصادقین ○ فالقی عصاہ فاذا ھی
ثعبان مبین ونزع یدہ فاذا ھی
بیضاء للناظرین ○

(الشعراء)

گا۔ سب جو پہلے گذر چکے ہیں فرعون نے اہل دربار سے مخاطب ہو کر کہا،
یہ تمہارا رسول جو تمہارے پاس بھیجا گیا ہے بے شبہ پاگل ہے، موسیٰ برابر سلسلہ
کلام جاری رکھتے ہوئے کہ وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے
سب کا رب ہے بشرطیکہ تم عقل سے کام لو، فرعون بولا اگر تم نے میرے سوا کسی کو
معبود بنایا تو تمہیں قید کر دوں گا، موسیٰ نے کہا، اور اگرچہ میں تیرے پاس اپنی
صداقت کی دلیل میں کوئی کھلی ہوئی چیز لے کر آیا ہوں، فرعون نے کہا، تو وہ چیز
پیش کرو اگر تم سچے ہو چنانچہ موسیٰ نے اپنے عصا کو زمین پر ڈالا جو ناگہاں
صاف سانپ بن گیا اور اس کے بعد انہوں نے اپنا ہاتھ باہر نکالا تو دفعتاً
وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید چکدار بن گیا۔

مصر میں سحر و شعبدہ کا عام رواج تھا اور وہاں بڑے بڑے باکمال ساحر اور شعبدہ باز موجود تھے، فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ید بیضاء کو بھی سحر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی ساحر سمجھا چنانچہ اس نے اہل دربار کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ شخص ماہر فن جادوگر ہے، اور چاہتا ہے کہ تمہیں اپنے جادو کے زور سے سرزمین مصر سے نکال دے، اب تم بتاؤ اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔

امراء دربار نے کہا "موسیٰ اور ان کے بھائی کو چند روز کی مہلت دی جائے اور ملک کے تمام شہروں میں نقیب بھیج کر تمام باکمال جادوگروں کو جمع کر لیا جائے" اس مشورے کے مطابق فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا کیا تمہارا مقصد یہ ہے کہ تم اپنے جادو کے زور سے ہمارے ملک سے ہمیں نکال دو، اگر تمہارا یہی مقصد ہے تو ایک دن مقابلے کا مقرر ہو جائے میں بھی اپنے جادوگروں کو بلاؤں گا، مقابلہ میں فیصلہ ہو جائے گا کہ کامیاب کون ہوتا ہے اور ناکامیاب کون؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی یہ تجویز منظور کر لی اور مقابلہ کا ایک دن مقرر ہو گیا۔

حق کی فتح

فرعون کے نقیب اطراف و جوانب میں پھیل گئے اور یوم مقررہ سے پہلے ہی ملک کے ماہر فن اور باکمال جادوگر پایہ تخت میں جمع ہو گئے، جادوگروں کو اپنی مہارت فن پر پورا پورا اعتماد تھا اور وہ اپنی کامیابی یقینی سمجھتے تھے، انہوں نے پہلے ہی انعام اور صلہ طے کرنے کی غرض سے فرعون سے سوال کیا اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا ہمارے لیے کوئی صلہ بھی ہے۔

فرعون نے کہا ــــ ہاں میں تمہیں اپنا مقرب اور ہم نشیں بنا لوں گا۔

مقابلے کا دن آ گیا، فرعون، اس کے درباری جادوگران، امراء اور عوام سب میدان مقابلہ میں جمع ہو گئے، ادھر اس

اجتماع کا تصور کیجئے، فرعون جیسا صاحب قہر و جلال بادشاہ، اس کے باجبروت درباری، شہر اور اطراف و جوانب کے باشندوں کا ہجوم، غیر ساحروں کا گروہ اور ان سب کے درمیان خدا کے دو بندے جو مصر کی ایک انتہائی مجبور و بے بس اور مقہور و مغلوب قوم سے رکھتے تھے، لیکن اس حالت میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب سے پہلے فرض نبوت ادا کیا، مجمع کو مخاطب کرکے فرمایا۔

ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذبا فیسحتکم بعذاب وقد خاب من افتریٰ ۝

تم پر افسوس، تم اللہ پر جھوٹا افترا نہ باندھو جس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ تم کو کسی عذاب میں مبتلا کرکے تمہیں نیست و نابود کر دے، اور جو بھی افترا پردازی کرے گا نامراد ہوگا۔

جو لوگ قبول حق کی صلاحیت کھو چکے ہوں اُن پر تذکیر و موعظت کا کیا اثر ہو سکتا تھا، ان کے پیش نظر دنیا تھی اور اس کی راحت و آسائش اور کامیابی اور کامرانی کے اسباب و لوازم تھے، وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ بیشک یہ دونوں ساحر ہیں اور اپنے سحر کے زور سے ہمیں سرزمین مصر سے نکال دینا اور ہماری اعلیٰ تہذیب و شائستگی کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم اپنے پورے ساز و سامان کے ساتھ ہم ان کا مقابلہ کریں، یہ ہماری قسمت کا فیصلہ کن موقع ہے، ہماری آج کی کامیابی ہمیشہ کی کامیابی اور آج کی شکست ہمیشہ کی شکست ہے۔

ساحران مصر کو اپنی کامیابی پر کامل یقین تھا، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرکے کہا "موسیٰ پہلے تم اپنا عصا پھینکو گے یا پہلے ہم پھینکیں" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا "نہیں پہلے تم ہی پھینکو" ساحروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں، جو سانپوں کی طرح دوڑتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اس شعبدے نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی خائف کر دیا۔ لیکن وحی الٰہی نے آپ کی اعانت کی ارشاد ہوا،

لا تخف انک انت الاعلیٰ والق ما فی یمینک تلقف ما صنعوا انما صنعوا کید سحر ولا یفلح الساحر حیث اتیٰ

خوف نہ کرو تمہیں غالب ہو گے تمہارے ہاتھ میں جو عصا ہے تم بھی اسے ڈال دو جادوگروں نے جو (شعبدے) بنا رکھا ہے وہ ان سب کو نگل جائے گا انہوں نے جو کچھ بنا رکھا ہے وہ ایک ساحر کے فریب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اور ساحر جہاں بھی آئے (معجزے کے مقابلے میں) کامیاب نہیں ہو سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارشاد الٰہی کی تعمیل کی، نتیجہ یہ ہوا۔

فاذا ھی تلقف ما یافکون فوقع الحق وبطل ما کانوا یعملون فغلبوا ھنالک وانقلبوا صاغرین۔

(الاعراف)

کہ موسیٰ کی لاٹھی اس طلسم کو نگلنے لگی جو ساحروں نے بنا رکھا تھا، انجام کار حق ثابت ہو گیا اور ساحروں نے جو طلسم بنا رکھا تھا وہ ملیا میٹ ہو کر رہ گیا، غرض فرعون اور اس کے ساتھی مغلوب ہو گئے اور غالب ہونے کی بجائے ذلیل ہو کر رہ گئے۔

جادوگروں کا قبول حق

جادوگروں کو اپنے کمال فن پر ناز تھا، ان کا خیال تھا کہ میدان مقابلہ میں کوئی ان سے بازی نہیں لے جاسکتا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں ان کو جو شکست و ناکامی ہوئی اس نے ان پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ حضرت موسیٰ خدا کے سچے رسول ہیں، چنانچہ ان کے اندر ایک انقلاب عظیم واقع ہوگیا اور ظلمت کفر کی جگہ نور ایمان کا چشمہ ابل پڑا۔

والقی السحرۃ ساجدین قالوا آمنا	جادوگر سجدے میں گر پڑے اور پکار اٹھے ہم جہان کے رب
برب العالمین رب موسیٰ وھارون	پر ایمان لائے جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔

(الاعراف)

فرعون کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کے شکوہ و دبدبہ سے بے نیاز ہو کر بھرے مجمع میں جادوگر اس طرح اعلان اسلام کر دیں گے اور حضرت موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کی رسالت تسلیم کرلیں گے، کیوں کہ اس کا مطلب فرعون کے خلاف اعلان بغاوت تھا، اس نے غضبناک ہو کر کہا، تم نے میری اجازت کے بغیر موسیٰ کے متعلق اپنے ایمان کا اعلان کر دیا، کچھ شبہ نہیں کہ یہ تمہاری ایک خفیہ تدبیر ہے جو تم نے اس شخص سے کر رکھی تھی، تم یہ چاہتے ہو کہ باشندگان مصر کو یہاں سے نکال دو، اچھا تم جلد ہی دیکھ لوگے کہ تمہاری اس سازش کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، میں تمہارے ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کٹوا دونگا، اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔

فرعون کو ان جادوگروں پر بہت بھروسہ تھا اسے یقین تھا کہ جادوگر اپنے کمال فن سے حضرت موسیٰ کو مغلوب کرلیں گے جس سے فرعون کی باطل خدائی کی اور دھاک بیٹھ جائے گی، لیکن جب خلاف توقع ساحروں کو ناکامی ہوئی اور انہوں نے اسلام کا اعلان کر دیا تو فرعون کو اندیشہ پیدا ہوا کہ جادوگروں کے اسلام کا اثر مصر کے دوسرے باشندوں پر بھی نہ پڑے اس لیے اس نے دانستہ جادوگروں پر یہ جھوٹا الزام لگایا کہ تم نے باشندگان شہر کے خلاف موسیٰ سے سازش کر رکھی ہے تاکہ ان کو یہاں سے بے دخل کر دو، اس طرح یہ مقصد بھی تھا کہ اہل شہر کو حضرت موسیٰ سے برانگیختہ اور بیزار کر دیا جائے۔

جادوگروں کی صدائے ایمان

جادوگروں کے لیے یہ انتہائی سخت آزمائش کا موقع تھا وہ صلہ و انعام اور اعزاز و اکرام کی امیدیں لے کر آئے تھے، لیکن اس کے برعکس عقوبت و سزا کا مرحلہ درپیش تھا، فرعون کی شقاوتوں اور سخت گیریوں سے جادوگر ناعلم نہ تھے، اس کے استبداد و ستم کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی جو حالت تھی وہ بھی جادوگروں کے پیش نظر تھی، فرعون نے کھلے الفاظ میں اپنے فیصلہ کا اعلان کر دیا موت اپنی ہولناکیوں کے ساتھ ساحروں کے سامنے کھڑی تھی، وہ زندگی

کی آخری سانسیں تھیں جو وہ لے رہے تھے۔ لیکن ان کے دلوں میں ایمان محکم اور حمایت حق کا جو جذبۂ صادق پیدا ہو چکا تھا اسے کوئی تخویف اور کوئی دہشت انگیزی دبا نہیں سکتی تھی، ان کی ایمانی آنکھیں خدا کے جلال و جبروت کو دیکھ رہی تھیں اس لئے اب ان کی نظروں میں فرعون کے شکوہ و دبدبہ کی کوئی حقیقت نہ تھی اب ان کے پیش نظر آخرت کی باز پرس اور خدا کی عقوبت کا سوال تھا جس کے مقابلے میں فرعون کی اذیت رسانی اور تکلیف دہی بالکل ہیچ تھی، چنانچہ فرعون کی ہولناک اور لرزہ خیز دھمکی کا ساحروں نے جواب دیا وہ مقتضائے ایمان کے عین مطابق اور اسلام کے عین شایان شان تھا۔

قالوا لن نؤثرك على ما جاءنا من البينات والذي فطرنا فاقض ما انت قاض انما تقضي هذه الحيوٰة الدنيا انا آمنا بربنا ليغفر لنا خطايانا وما اكرهتنا عليه من السحر والله خير وابقٰى ○

انہوں نے کہا، حق کی جو روشن دلیلیں ہمارے سامنے آ چکی ہیں ان پر اور اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے ہم تجھے ہرگز ترجیح نہ دینگے، تو (ہمارے ساتھ) جو معاملہ کرنا چاہے کر تو جو معاملہ بھی کریگا، اسی حیات دنیا کے ساتھ کریگا۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لا چکے ہیں، تاکہ وہ ہماری تمام خطاؤں کو معاف کر دے خصوصاً اس سحر کے گناہ کو جس کا تو نے ہم سے بجبر ارتکاب کرایا، اور اللہ (کا انعام و صلہ) بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔

دوسرے مقام پر ان کی دعا بھی منقول ہے جو اس نازک مرحلے پر اور زندگی کے اس آخری لمحے میں ان کی زبانوں پر تھی:

قالوا انا الى ربنا منقلبون وما تنقم منا الا ان آمنا بآيات ربنا لما جاءتنا ربنا افرغ علينا صبرا وتوفنا مسلمين ○

(الاعراف)

انھوں نے (فرعون کی دھمکی کے جواب میں کہا) ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں تو ہم سے انتقام نہیں لینا چاہتا مگر اس بات کا کہ ہمارے رب کی واضح دلیلیں ہمارے سامنے آ گئیں تو ہم نے ان پر یقین کر لیا (پھر انہوں نے اللہ سے یہ دعا مانگی) اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے (تاکہ فرعون کا ظلم و ستم ہمیں راہ حق سے پھیر نہ سکے) اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔

ایمان کی یہی تعریف ہے اور ہر مومن کی یہی آرزو اور یہی دعا ہونی چاہیئے کہ آزمائش کے ایسے لمحات میں وہ اسی سیرت و کردار کا اظہار کرے اور اس کی زبان پر یہی دعا ہو۔

فرعون کی تباہی اور بنی اسرائیل کی نجات

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے فرعون کو اسلام کی دعوت دی ان کے مطالبے پر اپنی سچائی کی نشانیاں پیش کیں کہ

کے نتائج و عواقب سے خبردار کیا، نیک عملی و خدا پرستی کی ہدایت کی، متنبہ اور ہوشیار کرنے کے لیے خدا کی طرف سے
معجزات نازل ہوئیں، منکرین نے رفع عذاب کی شرط پر ایمان لانے کے وعدے کیے اور ان کی خلاف ورزیاں کیں،
غرض دعوت و تبلیغ اور انتباہ و تنذیر کے جتنے مراحل تھے، سب طے ہو گئے، اور وہ وقت آگیا کہ اس منکر و سرکش قوم کا فیصلہ چکا
تو دوسرے پیغمبروں کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بھی سرکشوں اور منکروں کے حق میں بددعا کی۔

وقال موسیٰ ربنا انک آتیت فرعون	اے رب! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دُنیا کی زندگی
وملأہ زینۃ واموالا فی الحیٰوۃ	میں زیب و زینت کی چیزیں اور مال و دولت کی فراوانیاں عطا کر رکھی
الدنیا ربنا لیضلوا عن سبیلک	ہیں! اے رب کیا یہ اس لیے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں،
ربنا اطمس علیٰ اموالھم واشدد	اے رب! ان کے مالوں پر تباہی نازل کر اور ان کے دلوں پر ایسی
علیٰ قلوبھم فلا یومنوا حتیٰ	مہر لگا دے کہ وہ جب تک تیرا عذاب نہ دیکھ لیں، ایمان نہ لائیں۔
یروا العذاب الالیم قال قد اُجیبت	اللہ تعالیٰ نے جواب دیا، تم دونوں کی دعا قبول کی گئی لیس تم دونوں
دعوتکما فاستقیما ولا تتبعان	حق میں، استقامت سے کام لو، اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرو،
سبیل الذین لا یعلمون ○ (پ ۱۱ یونس)	جو طریقہ حق، کو نہیں جانتے۔

جب وہ وقت آگیا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومیت و غلامی سے نجات دلائی جائے، اور فرعون اور فرعونی عظمت
و شوکت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو وحی فرمائی کہ وہ رات کے وقت بنی اسرائیل
کو لے کر مصر سے روانہ ہو جائیں، اس واقعہ کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے اس طرح ارشاد فرمائی ہے۔

واوحینا الیٰ موسیٰ ان اسر بعبادی	اور ہم نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ ہمارے بندوں کو شب میں (مصر سے) نکال
انکم متبعون فارسل فرعون	لیجا، بے شبہ تمہارا تعاقب بھی کیا جائے گا (لیکن تم کچھ خوف نہ کرنا)
فی المدائن حٰشرین ان ھؤلاء	چنانچہ فرعون نے شہروں میں نقیب بھیجے (اور کہلا دیا کہ) یہ لوگ قلیل التعداد
لشرذمۃ قلیلون وانھم لنا	چھوٹی سی جماعت ہیں، اور انھوں نے ہماری پروانہ کر کے ہمیں غضبناک
لغائظون وانا لجمیع حٰذرون	کر دیا ہے، اور ہم ایک دہشت انگیز جتھا ہیں (فرعون اپنی پوری طاقت
فاخرجناھم من جنّٰت وعیون	جمع کر کے بنی اسرائیل کے تعاقب میں مصر سے نکلا۔ اس طرح ہم نے
وکنوز ومقام کریم کذالک	ان کو باغوں سے، اور چشموں سے اور خزانوں سے اور بہترین مکانوں سے
واورثنٰھا بنی اسرائیل	نکال دیا، ان کے ساتھ تو ہم نے یہ کیا، اور بنی اسرائیل
فاتبعوھم مشرقین فلما	کو ان تمام چیزوں کا وارث بنا دیا، غرض فرعون اور ان
تراء الجمعٰن قال اصحٰب موسیٰ	کے ساتھی سورج نکلتے نکلتے بنی اسرائیل کے پیچھے پہنچ گئے۔

انا لمدرکون قال کلا ان معی ربی
سیهدین فاوحینا الی موسی ان
اضرب بعصاک البحر فانفلق
فکان کل فرق کالطود العظیم
وازلفنا ثم الآخرین وانجینا
موسیٰ ومن معه اجمعین ثم
اغرقنا الآخرین ان فی ذالک
لآیت وما کان اکثرهم مومنین۰
(شعراء)

پھر جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے ساتھیوں
نے کہا اب تو ہم یقیناً پکڑے گئے، (کیونکہ بحر احمر سامنے تھا اور پیچھے
کا کوئی راستہ نہ تھی) لیکن موسیٰ نے کہا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، میرا رب میرے ساتھ
ہے وہ مجھے کوئی راہ بتائے گا چنانچہ ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا
سمندر پر مار (موسیٰ نے عصا سمندر پر مارا) پس سمندر کا پانی پھٹ
گیا اور ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ جیسا بن گیا اور دوسرے لوگوں کو بھی ہم
سمندر کے ساحل پر پہنچا دیا، اور موسیٰ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے
ان سب کو تو ہم نے بچا لیا اور دوسرے لوگوں کو ہم نے غرق کر دیا،
بیشک اس واقعہ میں (اہل عبرت) کیلئے بڑی نشانی ہے لیکن اکثر
لوگ ایمان نہیں لاتے ۔

(اساس دین کی تعمیر بقیہ صفحہ ۲۷)

نماز کا دیگر احکام شرع کی نگراں اور محافظ ہونا قرآن کے نزدیک اتنی زیادہ مسلم اور استوار حقیقت ہے کہ وہ بسا اوقات ایسے مواقع پر صرف نماز کا نام لے کر رہ جاتا ہے جہاں اس کا مدعا پورے مجموعۂ اخلاق و شرائع کے بیان کرنے کا ہوتا ہے۔ گویا اس کی نگاہ میں نماز احکام شریعت کے پورے مجموعے کی قائم مقام ہے، نماز جڑ ہے اور دوسرے سارے احکام اسی جڑ سے نکلنے والی شاخیں۔ چنانچہ جب قرآن سچے مومنوں کے اوصاف کا اجمالی تعارف کرانا چاہتا ہے تو بالعموم یہ جملہ استعمال کرتا ہے کہ ”وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے صالح اعمال کیے (الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ) لیکن اس ”عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ کے اجمال کو جب کبھی وہ تفصیل کی روشنی میں لانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے نماز کا نام لیتا ہے، مثلاً :-

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ الخ (بقرہ)

یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے صالح اعمال کیے
یعنی نماز قائم کی الخ۔

یہ اشارہ اسی بات کی طرف ہے جس کا ہم ذکر کرتے آرہے ہیں، یعنی یہ کہ نماز سرچشمۂ خیر و صلاح ہے، اور دیگر سارے خیر و صلاح اسی سے معرض وجود میں آتے ہیں۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ ایمان کے بعد صرف نماز کا ذکر کرتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتَابِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ ابھی نقل کیے جا چکے ہیں، وہاں پورے مجموعۂ شریعت کی پیروی کا مفہوم صرف اقامت نماز کے ایک لفظ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جب جڑ کا نام لے دیا گیا تو ضروری نہیں کہ اس سے نکلنے والی ایک ایک شاخ کا شمار کرایا جائے۔

(باقی آئندہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اساسِ دین کی تعمیر (۶)

(۳) نماز

مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی

تیسری چیز نماز ہے، جو تعمیر دین کے باب میں سنگِ اساس کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس کے بغیر حقیقت دین کا تصور بس اتنا ہی قابل قبول ہے جتنا کہ سورج کے بغیر دن کا تصور۔ اعمال صالحہ کی پوری فہرست میں سے یہی ایک عمل ہے جس کو اساسِ دین کا سنگِ اول ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ بلاشبہ صبر کا بھی شمار اسی زمرے میں ہے، مگر ایک تو حقیقتاً صبر کوئی مثبت شے نہیں، دوسرے اس کا وجود بڑی حد تک خود نماز ہی کا مرہون منت ہے، جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے واضح ہوگا اس لیے ایسا کہنا دراصل ایک مسلم حقیقت کا اظہار ہوگا، کہ نماز کی اقامت اور اس کی ٹھیک ٹھیک ادائگی پورے دین کی تعمیر ہے۔ لیکن جب تک یہ بات بیان اور استدلال کا جامہ نہ پہن لے، حدودِ ذہن میں مشکل ہی بار پا سکتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے نماز کی حقیقت اور پھر اس کی اہمیت سمجھ لی جائے، اس کے بعد ہی اس دعوے پر غور کیا جا سکتا ہے، ورنہ اس کے بغیر اس کو مان لینا صرف ایک رسمی حسن عقیدت ہے یا پھر تحسین ناشناس، جس کا عملی فائدہ کچھ نہیں، اور اس کو رد کر دینا ایک غریب بے بصری ہے، جس کے انجام بد سے زیادہ برے انجام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز کی حقیقت

نماز نام ہے اللہ تعالےٰ کے حضور اپنی غلامانہ اور فدویانہ حیثیت کے اظہار و اقرار کا، جس لفظ قرآنی کا ترجمہ فارسی اور اردو زبانوں میں "نماز" کیا گیا ہے وہ لفظ "صلوٰۃ" ہے جس کے لغوی معنی کسی کی طرف رُخ کرنے، بڑھنے اور قریب ہو جانے کے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب یہ لفظ اپنے لغوی مفہوم کی بے قید پہنائیوں سے نکل کر اصطلاح دینی کے حدود میں آجائے تو اس کا مطلب کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس وقت "کسی کی طرف" کے بجائے آپ "اللہ تعالیٰ کی طرف" کے الفاظ رکھنے پر مجبور ہوں گے اور صلوٰۃ کا مطلب ہوگا اس اللہ کی طرف سر بہ تن متوجہ ہو جانا، جو تنہا معبود اور اکیلا مقصود اور لاشریک محبوب ہے۔

نماز کی یہ اصل حقیقت ہے جو خود لفظ صلوٰۃ ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور اگر آپ فعل صلوٰۃ کی پوری تصویر اپنے سامنے رکھ لیں تو خود محسوس کر لیں گے کہ یہ نام اپنے مسمّٰی کا کیسا صحیح شارح، ترجمان اور قائم مقام ہے۔ نماز میں آپ کیا کرتے ہیں اور کیا پڑھتے ہیں؟ کرتے آپ یہ ہیں کہ پہلے اس خانہ کعبہ کی سمت رُخ کر لیتے ہیں جو خدا کی اطاعت اور بندگی کا مرکز اور اسی کی رضا جوئی اور فدویت کا دُنیا میں سب سے بڑا نشان ہے، جو ابراہیمی توحید اور عشق کا خاموش علم اور اسماعیلی فداکاری کی دعوت مجسّم ہے۔ پھر کانوں تک ہاتھ لے جاتے ہیں، جو اس امر کا اعلان ہے کہ بندہ دنیا و مافیہا سے کٹ کر دست بردار ہو کر اپنے آقا و مولا کے دربار میں حاضر ہو رہا ہے، پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر، نظریں جھکا کر، اعضا و جوارح پر عجز و نیاز کی خاموشیاں طاری کر کے مؤدب کھڑے ہو جاتے ہیں، چند لمحوں بعد سیدھی پیٹ خم ہو جاتی اور سر جھک جاتا ہے اور پھر ہاتھ اور گھٹنے، ناک اور پیشانی خاک پر ہوتے ہیں۔ ادب اور نگونساری کی ان ارتقا پذیر کیفیات کا منظر دیکھ کر بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحبِ جلال کی غیر محدود اور ہوش ربا عظمتوں کا اعتراف، اور کسی صاحبِ جمال کی بے نہایت خوبیوں کا اقرار کرتا ہے، اس لیے دست بستہ، خاموش اور مؤدب کھڑے ہو گئے، مگر دل نے کہا یہ عظمتیں اور یہ خوبیاں کچھ اور چاہتی ہیں، تو بندے نے پیٹھ جھکا دی اور سر نیاز خم کر دیا، اندر سے پھر آواز آئی کہ ابھی حق ادا نہیں ہوا، غلام نے اپنے وہ اعضا جن کا نام ہی عزت و شرف کا ہم معنی ہے، خاکِ عجز پر ڈال دیئے، اور اس کے بس میں اپنے آپ کو جتنا گرانا اور ڈال دینا، اور والہانہ شگفتگی کے ساتھ نثار ہو جانا ممکن تھا، کر گذرا، کیوں کہ انسانی دماغ اظہار تعظیم و محبت کے لیے ان تین ظاہری ہیئتوں کے سوا اور کوئی ہیئت تجویز نہیں کر سکتا ہے۔

پڑھتے آپ یہ ہیں کہ "اللہ سب سے بڑا ہے (اَللّٰہُ اَکْبَرُ)" میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رُخ اس ذات عالی کی جانب کر لیا جو آسمانوں کا اور زمین کا خالق ہے، اور میں ہرگونہ شرک سے دُور ہوں (اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ)" شکر و سپاس کا مستحق وہ اللہ ہے جو ساری کائنات کا پروردگار ہے (اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الخ)" پاک و برتر ہے میرا رب بزرگ (سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ)" پاک و برتر ہے میرا وہ رب جو سب سے اونچا ہے (سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی)" ساری سلامیاں، ساری نمازیں اور ساری مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں الخ (اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ الخ)" یہ اور اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں پڑھتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے یہ کیا باتیں ہیں جو آپ زبان سے ادا کرتے ہیں اور اس حالت ظاہری اور شانِ تذلل کے ساتھ ادا کرتے ہیں جس کا مختصر ذکر ابھی گذرا؟ اگر انسان کا دل بالکل ہی بے حس اور غفلت زدہ نہ ہو اور ان افعال اور کلمات کے تقاضوں کا اسے ہلکا سا بھی شعور ہو تو اس کی ارتقا پذیر روحانی رفعتوں اور باطنی پاکیزگیوں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اس لیے کہ یہ فعل نماز عمر میں یا سال اور مہینے میں ایک دو بار ادا کیا جانے والا فعل نہیں ہے بلکہ مسلسل روزانہ پانچ وقت ادا ہونے والی عبادت ہے۔

اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے نظر ڈالیے۔ دین کی اصل اور بنیاد خدا کی یاد ہے۔ دین کی یہ بنیادی نوعیت اتنی مسلم اور واشگاف ہے کہ قرآن کے جاننے والے کے لیے چنداں محتاجِ تعارف نہیں۔ اب نماز کو لیجیے اور دیکھیے کہ اس کی کیا حیثیت قرار دی گئی ہے، قرآن میں ہے:

ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى (اعلیٰ) — اس نے اپنے رب کو یاد کیا اور نماز پڑھی

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ۔ — میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

گویا اگر اللہ کو یاد کرنا ہو تو نماز پڑھنا چاہیے، کہ یہی کامل طریقِ ذکر ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کتاب و سنت میں ذکر کے اور طریقے بھی ملتے ہیں مگر ان کی حیثیت کامل اور مستقل طریقِ ذکر کی نہیں ہے، بلکہ وہ اسی ایک طریقِ کامل کے تضمنات ہیں، اور اس لیے ہیں تاکہ اس کے معاون بنیں اور حصولِ مقصد کے باب میں اس کے خدمت گذار بنیں۔ اب ان دونوں حقیقتوں کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھیے: اللہ کی یاد دین کی بنیاد ہے، نماز نام ہے اللہ کی یاد کا، اس سے ایک تیسری حقیقت ہاتھ آئی، اور وہ یہ کہ نماز جہاں تک عمل کا تعلق ہے، دین کی بنیاد ہے۔

نماز کی اہمیت

علمی طور پر نماز کی حقیقت جان لینے کے بعد اس کی عملی اہمیت پر غور کیجیے۔ جو شخص بھی نماز کی ظاہری اور باطنی، ساری تفصیلات کو سامنے رکھ کر غور کرے گا، اس پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ یہ شئے بندگی اصل اور مکمل روح ہے، یہ گو کہنے میں ایک عملِ صالح اور تنہا فعلِ عبادت ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے سارا دین اس کے اندر سمٹا ہوا ہے اور وہ پوری شریعت ہے، چنانچہ زبانِ رسالت نے گواہی دی ہے کہ نماز دین کا مرکزی ستون ہے، جو اس ستون کو قائم رکھے گا وہ اپنے دین کو قائم رکھے گا، اور جو اسے ڈھا دے گا وہ پورے دین کو تاراج کر کے رکھ دے گا (الصلوٰۃ عماد الدین من اقامہا اقام الدین ومن ھدمہا ھدم الدین)

اس سے بھی زیادہ وضاحت اگر مطلوب ہو تو حسبِ ذیل ارشاداتِ نبوی پر نظر ڈالیے۔

(۱) من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر — جس کسی نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔

(۲) بین الکفر والایمان ترک الصلوٰۃ — کفر اور ایمان کے مابین وجہِ امتیاز نماز ہے۔

کتنے لرزہ آفریں الفاظ ہیں؟ بڑی سے بڑی تاویل بھی ان کی لرزہ آفرینی ختم نہیں کر سکتی۔ وہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ صرف اتنا ہی ہوگا کہ ان ارشادات کو "اسلوبِ تغلیظ" پر محمول کر دے، اور قانون و سیاست کی حد تک انسان کو بچا لے جائے، مگر آگے کے لیے یقیناً وہ بھی کوئی اطمینان نہیں دلا سکتی۔ تمام احکامِ دین میں سے یہ نماز ہی ہے جس کے ترک کر دینے والوں کے نہیں، بلکہ جب باجماعت نہ ادا کرنے والوں کے حق میں اللہ کے رسول نے فرمایا تھا کہ "جی چاہتا ہے کہ اگر اندر ان کے ساتھ بچے اور عورتیں نہ ہوتیں تو ان کے گھروں کو آگ لگا دیتا" یہ اُس رسولؐ کے الفاظ ہیں، جس کی صفتِ امتیاز یہ ہے کہ وہ رحمۃ للعالمین تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نماز کو دین اور احکامِ دین کے اندر کیا مقام حاصل ہے۔

کلام رسول کو چھوڑ کر کلام اللہ کی طرف آیئے تو اسی حقیقت کے جلوے وہاں بھی نظر آئیں گے اور اتنی آب و تاب کے ساتھ نظر آئیں گے کہ تردد کی ساری تاریکیاں کافور ہو چکی ہوں گی۔ قرآن میں صرف یہی نہیں ہے کہ حکم نماز کا بار بار، صد ہا جگہ اعادہ کیا گیا ہے، بلکہ ایسا بھی کیا گیا ہے کہ اس کے ذکر میں بیان و ادا کے متنوع اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ اسالیب کا یہ تنوع نہ صرف نماز کی مطلق اہمیت ہی کا اظہار کرتا ہے، بلکہ اس کے متعدد پہلوؤں پر بالراست اشارہ کرتا ہے، اور اس طرح نماز کی اہمیت کا اجمالی تصور تفصیلی تعین اور کامل شرح صدر سے بدل جاتا ہے۔ ہم یہاں چند ایسی آیات درج کرتے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے مخصوص اسلوب بیان کی بنا پر نماز کی اہمیت کے کسی نہ کسی مخصوص پہلو کو نمایاں کرنے والی ہے:-

(۱) إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (سجدہ - ۱۵)

ہماری آیتوں پر صرف وہی ایمان لاتے ہیں جو، اس وقت جب کہ انھیں ان آیتوں کے ذریعہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے، سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں، اور اس طرح اپنے کو برتر نہیں ٹھیراتے، ان کے پہلو بستروں سے دور ہوتے ہیں اور وہ اپنے رب کو خوف و رجا کے عالم میں پکارتے ہوتے ہیں۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایمان کا پہلا لازمی مظہر نماز ہے۔ اس بات کو آپ اگر یوں کہہ دیں کہ نماز ہی ایمان کا ثبوت ہے تو گو الفاظ بدل جائیں گے مگر حقیقت نہ بدلے گی۔ اس آیت کے مماثل آیات سے قرآن کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ پہلے ہی ورق پر آپ کو یہ الفاظ ملیں گے۔

الٓمٓ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ الخ (بقرہ)

الف، لام، میم۔ یہ وہی کتاب (موعود) ہے اس میں کوئی شبہ نہیں، یہ سراپا ہدایت ہے متقیوں کے لیے، جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ (القیامہ)

پس نہ تو اس نے (کتاب الٰہی کو) مانا، نہ نماز پڑھی۔

وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ۔

اور جن لوگوں نے کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لیا اور نماز قائم کی بلاشبہ ہم (ان) اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔

یہ اور اس طرح کی بے شمار آیتیں ہیں جو ایمان کے بعد ہی نماز کا ذکر کرتی ہیں، جو نماز کے اولین ثمرۂ ایمان ہونے کا ثبوت ہے۔ اور بسا اوقات نہ صرف یہ کہ نماز کا ایمان کے بعد سب سے پہلے ہی ذکر کرتی ہیں، بلکہ صرف اسی کا نام لیتی ہیں، جیسے پچھلی آیت، کہ اس نے تمسک بالکتاب کے بعد کتاب کے دیگر سارے احکام سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف نماز ہی کا ذکر کیا۔ یہ

اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کی شرح و تبیین ابھی آگے چل کر اہمیت نماز کے ایک مستقل پہلو کے ذکر کے تحت آتی ہے۔ اس وقت صرف اتنی بات سمجھ لینے اور یاد رکھ لینے کی ہے کہ نماز ایمان کا تقاضائے لازمی اور اس کے وجود کا مظہر حقیقی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی حجاب باقی رہ گیا ہو تو سورۂ مدثر کے یہ الفاظ بھی پڑھ لیجیے، جس کے بعد یہ حجاب بھی اٹھ جائے گا:۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ الخ

تمہیں دوزخ میں کیا چیز لے آئی؟ جواب دیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے۔ الخ

ظاہر بات ہے کہ یہ کفار کا قول ہے، جن کا وہ جرم جو انہیں دوزخ کا ایندھن بنوائے گا، ان کا کفر ہوگا، اور پھر کفر سے پیدا ہونے والی نافرمانی معبود، لیکن وہ پوچھنے پر جواب یوں نہیں دیتے کہ ہم ایمان نہیں لائے تھے، اس لیے مبتلائے عذاب ہوئے ہیں، بلکہ جواب کی ابتدا یوں کرتے ہیں کہ نماز پڑھنے والے نہ تھے" اور باقی چیزوں کا ذکر اگر کرتے بھی ہیں تو بعد میں؛ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ پر ایمان اور نماز کی اقامت، ان دونوں باتوں میں اتنی زبردست پیوستگی ہے کہ بوقت ضرورت بلا تکلف ایک دوسرے کی قائم مقامی کر سکتی ہیں۔ گذشتہ مباحث میں سورۂ بقرہ کی جس آیت (۲۴۹) کا کئی بار حوالہ دیا جا چکا ہے وہ اس حقیقت کا سب سے زبردست گواہ ہے، اس نے غیر مبہم انداز میں بتا دیا ہے کہ وہ شخص ادائے نماز کا فرض گراں نہیں اٹھا سکتا جس کا قیامت پر یقین نہ ہو۔ گویا اس کا کہنا یہ ہے کہ نماز ہی ایمان بالآخرت کی کسوٹی ہے۔

ایمان اور نماز کا یہی گہرا تعلق ہے جس کی وجہ سے وحیٔ الٰہی ایمان کے بعد ہی سب سے پہلے نماز کا حکم دیتی رہی ہے۔ چنانچہ مضمون کے آغاز میں ہم اس کی بعض مثالیں بھی واضح کر چکے ہیں۔

(۷) قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ...... وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ

فلاح یاب ہوئے وہ ایمان لانے والے جن کی نمازوں میں خشوع ہوتا ہے .... اور جو اپنی نمازوں کی پوری نگہداشت کرتے ہیں۔

(مومنون۔ ۱ تا ۹)

بادی النظر میں یہ آیتیں صرف ایک سچے مومن کی امتیازی صفات بتانے والی ہیں، مگر واقعہ کے اعتبار سے یہ ایک عظیم ترین راز شریعت کی حامل بھی ہیں۔ اگر بات صرف اتنی ہوتی کہ ایک سچے مومن کے اعمال و کردار کے کچھ نمایاں خط و خال بتا دیے جائیں تو آخر کا جملہ (وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ) بالکل بے ضرورت ٹھیرتا ہے، یا پھر خلاف ترتیب اور بے موقع، حب کہ اللہ کا اعجازی کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ پھر اگر یہ جملہ موجود ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہونی چاہیے؛ اور یہ جاننا چاہیے کہ کیوں نماز کا ذکر مکرر فرمایا گیا اور دوسرے اعمال — لغو باتوں اور کاموں سے کنارہ کشی، زکوٰۃ کی ادائگی، عفت، ادائے امانت اور ایفائے عہد — کا ایک بار ذکر کافی سمجھا گیا؟ کیا اس اسلوب سے دوسرے مکارم اخلاق و اعمال کے مقابلہ میں نماز کی کوئی افضلیت اور خصوصیت نہیں ٹپک رہی ہے؟ قرآنی اسالیب بیان کا اداشناس تو درکنار ایک

عام صاحبِ ذوق اور نکتہ رس ادیب بھی اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا، اس کا مذاقِ سخن فہمی پکار اُٹھے گا کہ یقیناً اس انداز بیان سے نماز کی کسی خاص اہمیت کا انکشاف مقصود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ خاص اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب سوچتے وقت ہمیں ان آیتوں کے نظم کو ذرا غور سے دیکھنا چاہیے۔ یہ نظم آیات اس طرح کا ہے کہ پہلے نماز کا ذکر ہے، پھر چند دیگر بنیادی اعمال خیر کا بیان ہے، آخر میں پھر نماز کا تذکرہ آیا ہے اور اسی پر اس فقرہ (پیراگراف) کو ختم کرتے ہوئے بات مکمل کر دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی حیثیت ایک دائرے اور حلقے کی سی ہے، اور دیگر احکامِ شریعت اس کے اندر محفوظ ہیں، گویا شریعت کا عملی نقطۂ آغاز بھی نماز ہی ہے اور نقطۂ اختتام بھی۔ پوری شریعت کا بقا اسی کی بقا پر منحصر ہے اور یہی ایک اکیلی شے پوری شریعت کی نگران ہے۔

قرآن میں یہ حقیقت اتنی بار دہرائی گئی ہے کہ اس کا شمار کرنا مشکل ہے۔ آپ کسی بھی مدنی سورہ کو پڑھنا شروع کیجئے، آپ پائیں گے کہ جہاں کہیں بھی احکام و شرائع کا بیان ہے، ذکر اور نماز کی ہدایت اس کے پہلو بہ پہلو ضرور موجود ہے۔ کلامِ الٰہی منزلی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی ضابطے بیان کر رہا ہوتا ہے کہ یکایک کہیں اجمال کے ساتھ اور کہیں تفصیل کے ساتھ، ذکر و نماز کی، یا حمد و تسبیح کی تلقین آجاتی ہے، جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ ان ضوابط پر عمل اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کے ذکر سے تمہارا باطن نغمہ ریز ہو، اور وہ قوتِ انقیاد جو ان احکام و شرائع پر عمل کرنے کے سلسلہ میں درکار ہے، تم اسی وقت حاصل کر سکتے ہو جب تمہارے دل میں یادِ الٰہی کا سرچشمہ جاری ہو۔ اگر تمہارا ربابِ باطن خاموش ہو گیا اور اس کے تاروں سے اس نغمۂ لاہوتی کا ترنم بند ہو گیا تو معصیت کا زنگ اسے سیاہ بنا دے گا، اور اگر تمہارے دل میں یہ سرچشمۂ خیر خشک ہو گیا تو پھر اس سے صلاحِ عمل کا فیضان نہ ہو سکے گا۔ تمہاری زمامِ عمل خدا پرستی اور اتباعِ شریعت کے ہاتھوں سے نکل کر نفس اور شیطان کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔ یہ بات آیت مذکورہ بالا اور اسی طرح کی دوسری آیات سے واضح طور پر مستنبط ہو رہی ہے۔ مگر اس کی صداقت کا انحصار صرف اس استنباط ہی پر نہیں ہے بلکہ وہ بالراست بھی ثابت ہے اور قرآن نے ہمیں کھول کر یہ حقیقت بتا دی ہے کہ نماز سے بے توجہی کر کے انسان نرا بندۂ نفس ہو کر رہ جاتا ہے۔

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ — انھوں نے نماز ضائع کر دی اور شہواتِ نفس کے پیرو بن گئے۔

گویا پیروی نفس براہِ راست نتیجہ ہے اضاعتِ نماز کا، اور اس کی وجہ بالکل ہویدا ہے۔ انسان کی حیوانی جبلت ہر آن اسے خواہشِ نفس کی پیروی پر ابھارتی رہتی ہے، اور شریعت کی پیروی کا دارو مدار ہی اس بات پر ہے کہ نفس کو لگام لگائی جائے، اس لیے انسان کے اندر ہر دم ان دونوں تقاضوں میں سخت کشاکش ہوتی رہتی ہے۔ اس کشاکش میں تقاضائے نفس کو ٹھکرا دینے کے قابل ہوتا صرف وہی شخص رکھ سکتا ہے جسے اللہ اور آخرت پر کامل یقین ہو، یہ یقین اس کے اندر خشوع کی کیفیت پیدا کرتا ہے، اور یہ خشوع ہی ہے جو قیام و رکوع و سجود کے قالب میں ڈھل کر صورتِ نماز اختیار کرتا ہے۔ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ اور قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ کے جو الفاظ اوپر گذر چکے ہیں، ان سے خشوع اور نماز کا یہ ربط بالکل نمایاں ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کی یہ صفت اور تاثیر بیان کی گئی ہے کہ وہ انسان کو فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے، اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

نئی مجلس شوریٰ کا پہلا اجتماع حسبِ اعلان ۱۰ر جنوری کی صبح سے شروع ہوا۔ حسبِ ذیل ارکان شوریٰ شریک اجتماع ہوئے۔

(۱) یوسف صاحب صدیقی (ٹونک)
(۲) مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری (مدراس)
(۳) وی۔ پی محمد علی صاحب (مالابار)
(۴) مولانا صدر الدین صاحب۔
(۵) مولانا حامد علی صاحب
(۶) مولانا حبیب اللہ صاحب (ہزاری باغ)
(۷) عبد الحیٔ صاحب
(۸) حسنین سید صاحب۔ (دربھنگہ)
(۹) شاہ ضیاء الحق صاحب۔
(۱۰) محمد یونس صاحب۔ (حیدرآباد)
(۱۱) سید عبد القادر صاحب۔ (حیدرآباد)
(۱۲) محمد یوسف صاحب قیم جماعت
(۱۳) چودھری شیخ احمد صاحب۔

مولانا اختر احسن صاحب اصلاحی اپنی شدید علالت کی بنا پر شریک اجتماع نہیں ہو سکے۔ شاہ ضیاء الحق صاحب بھی اگرچہ اس دوران میں بہت علیل رہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اکثر اجتماعات میں شرکت کی۔

اجتماع کی کارروائی چار روز مسلسل جاری رہی۔ صبح و شام کے علاوہ شب میں بھی ایک نشست منعقد ہوتی تھی اور چوتھے دن تو نماز اور کھانے کے اوقات کے سوا تقریباً پورا دن اور رات کا تقریباً ساڑھے دس بجے تک کا وقت گفتگو اور مشوروں ہی میں گذرا۔

پہلے دن کی کارروائی امیر جماعت مولانا ابو اللیث صاحب اصلاحی ندوی کی افتتاحی تقریر سے شروع ہوئی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

حمد و ثنا کے بعد۔ محترم رفقا! مجلس شوریٰ کی باقاعدہ کارروائی اب شروع ہو رہی ہے۔ قبل اس کے کہ غور طلب

سائل پر غور و فکر شروع ہو، میں چند ضروری باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانی چاہتا ہوں۔

جماعتِ اسلامی اس مقصد کے لئے قائم ہوئی ہے جس سے بڑا کوئی اور مقصد ہو نہیں سکتا۔ یہ عہد نبوت کے ختم ہونے کے بعد اس کام کو انجام دینے کے لئے قائم ہوئی ہے جس کو انبیاء اسلام نے اپنی زندگی میں اپنا سب سے بڑا مقصد زندگی قرار دیا تھا جس کو قائم رکھنے کی اپنے پیرؤں کو خاص طور سے ہدایت کی تھی یعنی خود اللہ کی بتائی ہوئی ہدایت پر چلنے کی کوشش کرنا اور تمام خلق خدا کو اس کی طرف دعوت دینا۔ اس لحاظ سے آپ دیکھیں تو اس جماعت کے رکن بننے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے سب سے زیادہ دشوار اور ساتھ ہی سب سے زیادہ مقدس کام کے لئے ہم نے اپنی آمادگی کا اظہار کیا ہے جس سے خود بخود ہمارے اوپر بہت بڑی بڑی ذمہ داریاں عائد ہوگئی ہیں۔ جن کو ادا کرنا صرف اس لئے ضروری نہیں ہے کہ اس کے بغیر یہ آمادگی بالکل بے معنی سی بات ہے بلکہ ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کی فکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر ہم نام تو اس مقدس کام کا لیتے رہیں۔ لیکن اس کے تقاضوں کو پورا نہ کریں تو درحقیقت ہم اس مقدس کام اور اس کے حقیقی علمبرداروں کی توہین و تحقیر کے بھی مرتکب ہوں گے۔ جو یقیناً بہت بڑی بات ہے۔

لیکن محترم رفقاء! آپ کی ذمہ داریاں تو تمام ارکان سے بھی بڑھی ہوئی ہیں کیونکہ آپ جماعت کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں جو جماعت کے اندر ارکان کے لئے سب سے بڑی ذمہ داری کا منصب ہے۔ جماعت کے اہم معاملات میں میں آپ سے مشورہ کروں گا اور یقیناً عام حالات میں اہم ترین فیصلے میں آپ ہی لوگوں کی رایوں اور مشوروں سے کروں گا اس لئے خصوصیت کے ساتھ آپ کی ذمہ داریاں بہت شدید ہیں۔ میں نے حتی الوسع یہ سمجھ کر آپ کو مجلس شوریٰ کی رکنیت کے لئے منتخب کیا ہے کہ آپ مشورہ کی ذمہ داریوں کے لئے بہت زیادہ اہل ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں مجھے خصوصیت کے ساتھ کوئی خاص بات عرض کرنی نہیں ہے البتہ تذکیر اور یاد دہانی کے طور پر چند باتوں کی طرف میں آپ کی توجہ کو مائل کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ آپ جماعت کی رکنیت اور اس کے بعد مجلس شوریٰ کی رکنیت کی اہمیت اور اس کی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس کرتے ہوئے خود اس بات کا احساس کریں کہ آپ کی ذمہ داریوں کا تقاضا یہ ہے کہ جو معاملہ مجلس شوریٰ میں پیش ہو اس پر نہایت سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کریں۔

(۲) رائے پوری دیانت اور خلوص کے ساتھ دینے کی کوشش کریں۔ کسی معاملہ میں خدانخواستہ کسی خواہش نفس طرفداری بے جا عصبیت اور اشتعال وغیرہ کو دخل انداز ہونے کا موقع دیں۔

(۳) جس معاملہ میں آپ اپنی رائے کو دیانتداری کے ساتھ جماعت کے حق میں مفید سمجھتے ہوں اس میں تو بخل سے کام نہ لیں لیکن ہر معاملہ میں ہر حال میں اظہار خیال کرنا کچھ ضروری نہیں ہے۔

(۴) بات اختصار کے ساتھ پیش کریں معاملات بہت ہیں اور اس کے مقابلہ میں وقت تھوڑا ہے اس لئے اختصار کے بغیر چارہ نہیں - لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنا مدعا واضح نہ کریں مطلب محض یہ ہے کہ غیر ضروری پھیلاؤ سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کریں -

(۵) مخالف رائے کو سنجیدگی کے ساتھ سنیں-

(۶) درمیان گفتگو میں دخل انداز نہ ہوں اور نہ آپس میں بات چیت شروع کریں -

(۷) آپ مجھے مشورہ دینے کے لئے جمع ہوئے ہیں اس لئے آپ کا خطاب براہِ راست مجھ سے ہونا چاہئے کسی اور رفیق دوران کارروائی میں خطاب نہ کریں -

(۸) جب آپ سے کسی معاملہ میں گفتگو کے لئے کہا جائے تو اس وقت آپ گفتگو کریں اور جب آپ سے رُک جانے کی خواہش کی جائے تو پھر کسی طرح کی ناگواری محسوس کئے بغیر رُک جائیں -

اسی طرح کی اور باتیں ہیں جن کے بارے میں میں اپنے رفقاء سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ ان کا پورا پورا لحاظ کریں گے، لیکن اس ضمن کی ایک اور خاص بات ہے جس کی طرف میں خصوصیت کے ساتھ آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ بات یہ ہے کہ ہم آپ اس وقت جس اہم ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں درحقیقت اس کی ادائیگی اللہ کے فضل پر موقوف ہے، اس لئے آپ کو خود اپنے بارے میں بھی برابر خدا سے یہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ وہ آپ کی مشکل معاملات میں رہنمائی فرمائے اور یہی دعا آپ میرے حق میں بھی کرتے رہیں- حقیقتاً ہم جو کام موجودہ حالات میں کرنا چاہتے ہیں وہ بڑا اہم کام ہے- جب تک خدا کی رہنمائی اور توفیق ہمارے شاملِ حال نہ ہو ہم کچھ نہیں کر سکتے "

اس تقریر کے بعد امیر جماعت نے فرمایا کہ ایجنڈے کے مسائل پر غور کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اجتماعات شوریٰ کے موقع پر ہم نے جو باتیں طے کی تھیں پہلے اُن کا جائزہ لے لیا جائے کہ وہ کیا تھیں اور ان پر کس حد تک عمل درآمد ہو سکا ہے تاکہ ہم گذشتہ مباحث میں وقت صرف کرنے سے بچ سکیں اور آئندہ جو کچھ ہمیں کرنا ہے اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں ہمیں سہولت ہو -

اس تمہید کے بعد امیر جماعت نے گذشتہ سال کے دونوں اجتماعات شوریٰ کی کارروائی اس طرح پڑھکر سنائی کہ ہر امر فیصل شدہ کے بارے میں انہیں ضروری تفصیلات کے ساتھ ساتھ بیان کرتے جاتے تھے -

اس کارروائی میں تقریباً پون گھنٹہ صرف ہوا - اس سے فارغ ہو کر امیر جماعت نے فرمایا کہ اب ہمیں اپنی مالی حالت کا بھی اندازہ کر لینا چاہئے تاکہ آئندہ معاملات کا فیصلہ کرتے وقت ہم اپنی اس حالت کا لحاظ کر سکیں- مالیات کے ضمن میں امیر جماعت نے کہا کہ ابھی ایک آدھ مہینے پہلے ان کی دعوت پر سید حسین صاحب الہ آبادی نے یہاں آکر

خرچ کے پرانے حسابات کی جانچ پڑتال کی ہے اور اس کو قاعدہ کے ساتھ ترتیب دیدیا ہے۔ لیکن ان کو بعض وجوہ سے طلب واپس جانا ضروری ہو گیا اس لئے وہ اس وقت باقاعدہ گوشوارۂ آمد و خرچ تیار نہیں کر سکے اور جانے کے بعد بھی وہ ابھی تک اپنے والد بزرگوار کی علالت اور بعض دوسری پریشانیوں کی وجہ سے حسب وعدہ وہاں سے گوشوارہ تیار کر کے بھیج نہیں سکے اس لئے اس کام کو سید عبد القادر صاحب نے جو تربیت کے سلسلہ میں پہلے سے مرکز میں مقیم تھے امیر جماعت کی حسب ہدایت مکمل کیا ہے چنانچہ امیر جماعت نے ان کا مرتب کردہ گوشوارہ ان کو دیا کہ وہ اسے پڑھ کر سنائیں۔

سید عبد القادر صاحب نے اس کی تفصیلات سے ارکان کو آگاہ کیا اور ارکان نے ان کے ضمن میں اپنے سمجھنے کے لئے جن باتوں کی مزید توضیح کی خواہش ظاہر کی ان کی رجسٹر آمد و خرچ کو سامنے رکھ کر توضیح کر دی گئی۔ ارکان نے پوری تفصیلات سننے کے بعد حساب و کتاب پر اپنا اظہار اطمینان کیا۔ امیر جماعت نے فرمایا کہ ارکان اگر آمد و خرچ کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو یہ رجسٹر حاضر ہیں لیکن کسی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ایجنڈے پر غور

ان دونوں کارروائیوں سے فارغ ہو کر ایجنڈے کی پہلی دفعہ پر غور شروع ہوا جو شعبہ جات مرکز کے جائزہ اور اُن کی تنظیم جدید سے متعلق تھی!

سب سے پہلے امارت اور قیمی کے شعبوں کا جائزہ لیا گیا، امیر جماعت نے تفصیل سے بتایا کہ اس وقت ان شعبوں سے متعلق کیا کیا کام ہیں اور آئندہ ان میں کیا کیا اضافے ہونے والے ہیں جن کے سننے کے بعد تمام ارکان نے محسوس کیا کہ امیر و قیم دونوں پر کام کا بہت زیادہ بار ہے اس لئے دونوں کی مدد کے لئے علاوہ شاہ ضیاء الحق صاحب کے جو پہلے سے قیم جماعت کی معاونت کر رہے ہیں، دو جدید معاونین کا بندوبست کرنا ضروری ہے، طے کیا گیا کہ شعبوں کی تنظیم اور کاموں کی تقسیم جدید، جدید معاونین کے اضافہ کے بعد امیر جماعت ان رفقاء کے مشوروں سے کر لیں گے! ان دو جدید معاونین کے سلسلہ میں کئی نام تجویز ہوئے اور اُن میں سے مناسب اشخاص کا انتخاب امیر جماعت پر چھوڑ دیا گیا۔

اس کے بعد مکتبہ کا نظم و نسق زیر بحث آیا۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ مکتبہ ہماری آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے اس لیے اس کا انتظام بہت مضبوط بنیادوں پر ہونا چاہیے اور اس کے مطابق کچھ اصولی باتیں طے کر کے آئندہ مکتبہ کا نظم و نسق درست کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

دوسرے شعبہ جات مرکز میں کسی خاص ردو بدل یا اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ البتہ درسگاہ اور ثانوی تعلیم

میں کچھ اضافے تجویز کیے گئے جن کا ذکر ان کی ضمن میں آگے آئے گا۔

آڈیٹر، خازن اور محاسب کا انتخاب

مرکز کے رام پور منتقل ہونے کے بعد، پچھلے خازن و محاسب جناب ہدایت علی خاں (ملیح آباد) اور منشی عبدالرؤف صاحب (بنگلور) سے کام لینا ممکن نہیں رہ گیا تھا اس لیے امیر جماعت نے مقامی رفقاء کے مشورہ سے ان کی بجائے جناب غلام رحمانی صاحب کو مقامی رکن جماعت کو خازن اور عبدالحی صاحب کو محاسب مقرر کر لیا تھا، لیکن اس کے متعلق انھوں نے ارکانِ شوریٰ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا اس لیے یہ مسئلہ غور کے لیے پیش ہوا، ارکانِ شوریٰ نے امیر جماعت کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ غلام رحمانی صاحب بدستور خازنِ جماعت رہیں اور حساب وکتاب کا کام عبدالحی صاحب کی بجائے مرکز سے متعلق کسی رفیق کے سپرد کر دیا جائے۔ مرکزی حساب وکتاب کو آڈٹ کرنے کے لیے سید حسین صاحب الہ آبادی کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس کارروائی کے بعد پہلی نشست ختم ہو گئی۔

دوسری نشست بعد ظہر شروع ہوئی۔ اس نشست میں سب سے پہلے کارکنانِ جماعت کی کفاف کا مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس کی تعیین کے لیے کیا اصول ہونے چاہئیں۔

امیر جماعت نے اجتماع کی کارروائی شروع ہونے سے دو روز پہلے اس معاملہ میں مشورہ دینے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی تھی جس میں جناب یوسف صدیقی صاحب، شاہ ضیاء الحق صاحب، عبدالحی صاحب اور سید عبدالقادر صاحب شریک تھے، چنانچہ اس کمیٹی کی طے شدہ قراردادیں پڑھ کر سنائی گئیں اور تھوڑے سے ردّ و بدل کے بعد وہ منظور کر لی گئیں۔ اس کارروائی کی خاص قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تعیینِ کفاف کے جو اصول طے کیے گئے اُن کے بموجب ارکانِ شوریٰ کے نزدیک ہر کارکن کو صرف اِتنا کفاف ملے گا جس میں کسی کمی کی کوئی گنجائش نکالی نہیں جا سکتی، لیکن امیر جماعت کے استفسار پر کارکنوں نے جو جوابات دیے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن میں سے کچھ تو اس سے کم پر راضی ہیں اور اکثر پہلے ہی سے اس طے شدہ کفاف کے مطابق کفاف پا رہے ہیں۔

اس کے بعد قیمین اور حلقہ ہائے قیمین پر نظرِ ثانی کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ عام طور سے ان میں کوئی ردّ و بدل نہیں کیا گیا، صرف چند حلقوں میں کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں اور بعض مقامات کے قیمین بدل دیئے گئے ہیں، لیکن چونکہ ابھی ان تبدیلیوں کے سلسلہ میں متعلقہ رفقاء سے گفتگو اور مشورہ کرنا ہے اس لیے ان تبدیلیوں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

متعدد ہمہ وقتی قیمین کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی، لیکن جماعت کی مالی حالت اب تک اس کے لیے سدِّ راہ بنی ہوئی تھی، لیکن اس اجتماع میں یہ محسوس کیا گیا کہ کام کو آگے بڑھانے کے لیے یہ قدم ہر حال میں اُٹھانا ضروری ہے

چنانچہ فی الحال یو۔پی سے اس کی ابتدا کرنا طے ہوا اور اس کے لیے جناب محمد شفیع مونس صاحب کا انتخاب عمل میں آیا، یہ پورے صوبہ یو۔پی میں دورے کریں گے۔

بہار اور جنوبی ہند کے لیے بھی ایک ایک مزید ہمہ وقتی قیمین کا تقرر ضروری معلوم ہوا۔ اُمید ہے جلد ہی اس کا انتظام بھی ہو سکے گا

کلکتہ میں کام کو مستحکم کرنے کیلئے بھی ایک ایک دو دو افراد کو وہاں ایک ایک دو دو ماہ کے لیے بھیجے جانے کی ضرورت محسوس کی گئی، طے کیا گیا کہ مرکز سے کسی کو اس کام کے لیے فارغ کیا جائے اور بہار کے رفقاء میں سے بھی کسی ایسے رفیق کا انتخاب اس کام کے لیے کیا جائے جو بنگلہ یا انگریزی میں گفتگو اور تقریر پر قادر ہوں۔

قیمین کے کام کو تیز کرنے کے سلسلہ میں حسب ذیل تجویزیں منظور کی گئیں۔

(۱) قیمین کو سال میں ایک مرتبہ باہمی ملاقات اور مشوروں کے لیے جمع کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۲) قیمین کے کاموں کی مناسبت سے ان کے لیے تربیت کا ایک علیحدہ پروگرام تیار کیا جائے، جس کے مرتب ہونے کے بعد اندازہ کیا جائے کہ کتنا وقت اس کے لیے درکار ہے اور اس کے مطابق تمام قیمین کو ایک مقررہ وقت پر آنے کی دعوت دی جائے اور اگر کسی معقول عذر کی بنا پر کچھ قیمین شرکت سے معذور ہوں تو ان کو بیک وقت دوبارہ بلانے کی کوشش کی جائے۔

(۳) شوریٰ میں جو قیمین شریک ہیں وہ اپنی روانگی سے پہلے اس تربیت کے پروگرام کے متعلق اپنا نقطۂ نظر لکھ کر دیدیں تاکہ اس کے پیش نظر پروگرام تیار کرنے میں سہولت ہو، نیز جو قیمین موجود نہیں ہیں، ان کو اس پروگرام کے بارے میں اپنے نقطہائے نظر سے آگاہ کرنے کے لیے لکھا جائے۔

(۴) قیمین کو توجہ دلائی جائے کہ ان کا تعلق متأثر بالاقربا ان کے کاموں میں رکاوٹ کا باعث ہے، اس لیے حتی الوسع اس سے علیحدہ ہونے کی کوشش کریں اور منظر ار سے بے جا فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کریں۔

(۵) آیندہ قیمین کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جائے جو کسی غلط نظام سے وابستہ نہ ہوں اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت کام کے لیے فارغ کر سکتے ہوں۔

ایجنڈے کی اسی دفعہ کے تحت امیر جماعت نے حسب ذیل تجویزیں پیش کیں۔

(۱) مرکز میں جماعتوں اور حلقہ ہائے ہمدرداں کی رپورٹوں کے براہِ راست آنے کی ضرورت نہیں ہے ان کو اپنی رپورٹیں، جہاں ضلعی رپورٹر موجود ہوں وہاں ان کے واسطے سے اور جہاں نہ ہوں وہاں براہِ راست قیمین کے پاس بھیجنا چاہئیں۔

یہ رپورٹیں مجوزہ نقشہ کے مطابق جو جماعتوں کو بھیجا جا چکا ہے۔ مرتب ہونی چاہئیں۔

(۲) قیمین کو مقامی جماعتوں کی رپورٹیں، مرکز بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے وہ ان رپورٹوں کو سامنے رکھ کر مجوزہ نقشہ کے مطابق خود اپنی ایک مفصل رپورٹ تیار کریں اور ۲۰ تاریخ تک بغیر کسی مقامی رپورٹ کا انتظار کیے ہوئے مرکز روانہ کر دیں۔

(۳) ہر حلقے میں صرف ایک بیت المال حلقہ ہونا چاہیے اور بیت المال سے مصارف دورہ کے علاوہ حلقہ کی دیگر ضروریات کا جو تنظیم و استحکام کے سلسلہ میں پیش آتی ہیں، انتظام کرنا چاہیے۔

(۴) تمام جماعتیں اپنی جملہ آمدنی بشمول منافع مکتبہ کا ۲۵ فی صد حصہ ہر مہینہ میں صراحت مدات کے ساتھ حلقہ کے بیت المال میں داخل کیا کریں گی، سوا ان رقوں کے جو کسی ضلعی حلقہ وار یا سالانہ اجتماع کے لیے وقتی طور پر جمع ہوئی ہوں اس طرح کی رقمیں ۲۵ فی صد کے اطلاق سے مستثنیٰ ہوں گی۔

(۵) اگر کسی بیت المال کی آمدنی ۲۵ فی صد حصہ نکالنے کے بعد بھی مقامی ضروریات سے زائد ہو تو اسے ہر سہ ماہی پر اپنی زائد رقم حلقہ کے بیت المال میں منتقل کر دینا چاہیے۔

(۶) اگر کسی جماعت کو وقتی طور سے کوئی ایسی ضرورت پیش آجائے جس کے لیے مقامی بیت المال کی باقی ماندہ رقم ناکافی ثابت ہو تو وہ اپنی ضرورت کو قیم حلقہ کے سامنے پیش کر کے اس سے اس کے لیے مزید رقم حاصل کر سکتی ہے۔

(۷) بیت المال حلقہ جات میں جو آمدنی ہوگی اس کا دس فی صد حصہ بصراحت مدات ہر سہ ماہی پر لازمی طور سے مرکز منتقل کر دینا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی قیمین حلقہ کو چاہیے کہ اگر ان کے بیت المال میں مصارف حلقہ سے کچھ زائد رقم بچ رہے تو ہر شش ماہی پر اس کا باقاعدہ حساب کر کے اسے مرکزی بیت المال میں منتقل کر دیں۔

امیر جماعت نے مختصر اً شق نمبر ۱ و ۲ کی افادیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ مرکز میں جماعتوں کی رپورٹیں منگوانے کا شروع شروع میں اس لیے ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ مرکز مقامی حالات سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو سکے اور مرکز اور مقامی حلقوں میں زیادہ گہرا ربط قائم ہو سکے جس کی تنظیم کے بعد زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، لیکن اب یہ ضرورت اس پیمانہ پر باقی نہیں رہ گئی ہے اور جس قدر ضرورت ہے وہ قیمین کی آئندہ مجوزہ ماہانہ رپورٹوں کے ذریعہ بخوبی پوری ہو سکتی ہے۔ اس لیے اب اس اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، علاوہ ازیں ان رپورٹوں سے مرکزی دفتر کا کام اور بحیثیت مجموعی ٹکٹ کے مصارف کا بار بہت زیادہ بڑھ گیا ہے، اس تجویز سے اس بار میں تخفیف ہو جائے گی۔ شق نمبر ۳ و ۴ و ۵ و ۶ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اب تک بیت المال حلقہ جات میں مقامی جماعتوں کی آمدنی کا صرف ۲۵ فی صد حصہ داخل ہوتا ہے جس سے صرف قیمین کے دوروں وغیرہ کے مصارف ادا کیے جاتے ہیں اور ان کو دوروں کے علاوہ کسی اور مصرف پر اس رقم کو صرف کرنے کا اختیار بھی نہیں ہے اس لیے بہت سے قیمین اپنے حلقوں کی دیگر ضروریات مثلاً تربیت، دار المطالعہ وغیرہ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اس ۲۵ فی صد سے زیادہ رقم جماعتوں سے وصول کرنے پر مجبور ہیں، اور یہ جماعتیں اپنی خوشی

سے دے بھی رہی ہیں۔ لیکن یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ایک حلقہ میں دو دو بیت المالوں کے ہونے سے مرکز کو حساب و کتاب کی جانچ و تحقیق میں زحمتیں پیش آتی ہیں۔ اور اس سے دوعملی کی بھی کیفیت نمودار ہوتی ہے۔ اس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر حلقہ میں صرف ایک بیت المال حلقہ قائم کرنے کی اجازت دی جائے اور جہاں جہاں دو بیت المال قائم ہیں ان کو توڑ دیا جائے اور ۲۵ فی صد تناسب کو بڑھا کر ۳۰ فی صد کر دیا جائے، اور ساتھ ہی قیمین کو دورے کے علاوہ دیگر ضروریات تنظیم پر بھی اس فنڈ سے رقم صرف کرنے کی اجازت دی جائے جس کے بعد دوعملی کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور جماعت کے کام ہر جگہ یکسانی کے ساتھ انجام پا سکیں گے۔ اس تناسب کے اضافہ سے ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے اس کے بعد بہت سے حلقوں کے بیت المالوں کی آمدنی اتنی ہونے لگے کہ ہم اس کے اعتماد پر ان حلقوں کے لیے ہمہ وقتی قیمین کی خدمات حاصل کر سکیں۔

شق نمبر ۲ کی تشریح میں فرمایا کہ یہ دس فی صد درحقیقت جماعتوں کی کل آمدنی کا محض چار فی صد حصہ ہے، اور جماعتوں کے بیت المالوں کا اس وقت جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس سے مرکز کو نہایت حقیر رقم وصول ہونے کی توقع ہے تاہم اس سے مرکز کی طرف سے جو ہمہ وقتی قیمین کام کریں گے اس رقم سے ان کے کفاف کا بندوبست ہو سکے گا، اور بوقت ضرورت اس رقم سے مرکز کی دیگر ضروریات بھی پوری کی جا سکتی ہیں۔ جن کے لیے جماعتوں سے کسی اور شکل میں شاذ و نادر ہی کوئی امداد ملتی ہے، اس تشریح کے بعد امیر جماعت نے ارکان سے ان تجاویز کے بارے میں ان کی رائیں طلب کیں، ارکانِ شوریٰ نے شق نمبر ۲ میں یہ تبدیلی چاہی کہ دس فی صد کی بجائے ۲۰ فی صد کر دیا جائے جسے امیر جماعت نے منظور کر لیا، اور بقیہ باتیں بالاتفاق طے ہو گئیں۔ البتہ ایک رکن نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ جماعتوں کی رپورٹیں اگر براہ راست مرکز نہیں آئیں گی اور ان سے واقفیت کا دار و مدار محض قیمین کی رپورٹوں پر ہو گا تو شاید مرکز و جماعتوں کا حال پوری طرح معلوم نہ ہو سکے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ یہ رپورٹیں وقت پر نہ آئیں، اس کے جواب میں امیر جماعت نے فرمایا کہ :-

آئندہ مرکزی دفتر میں اس بات کا خاص اہتمام کیا جائے گا کہ قیمین کی رپورٹیں طے شدہ نقشہ کے مطابق وقت کی پابندی کے ساتھ آیا کریں اور ان ہی رپورٹوں کو سامنے رکھ کر ماہانہ ایک مرکزی رپورٹ تیار ہوا کرے گی جس کے ذریعہ ہر جماعت کا پورا نقشہ ہر ماہ خود میرے علم میں بھی آتا رہے گا، اور اس طرح اس بات کا کم اندیشہ ہے کہ قیمین کی رپورٹیں نہ آسکیں یا ان سے جماعتوں کا بقدر ضرورت حال معلوم نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں رپورٹوں کے علاوہ جماعتوں سے ربط و واقفیت کے اور بھی ذرائع ہیں۔ جو بہر حال باقی رہیں گے، بلکہ امید ہے کہ رپورٹوں کا بار ہلکا ہو جانے کے بعد قیم جماعت اور دوسرے متعلقین دفتر، ان جماعتوں سے براہ راست شخصی روابط پیدا کرنے کے لیے زیادہ وقت نکال سکیں گے۔

اس تشریح کے بعد اس رکن نے بھی اظہار اطمینان کیا۔

تعلیمی مسئلہ

دوسرے دن کی پہلی نشست میں ایجنڈے کی دفعہ ۵۔ سروقت کے جدید تقاضوں اور ان کے مطابق آئندہ کام کے نقشہ پر غور و فکر شروع ہوا۔

یہ بات شروع ہی میں طے پا گئی کہ مسلمانوں کے ضمن کا سب سے اہم تر مسئلہ اس وقت بنیادی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ اور یہی وہ مسئلہ ہے جس کے سلسلہ میں ہم جماعتی طور سے کچھ نہ کچھ کام کر سکتے ہیں، اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ اسی دفعہ کے تحت دفعہ ۱۲ د، پر بھی غور کر لیا جائے جس کا تعلق عام دینی تعلیم کی اشاعت و ترویج اور اس کے سلسلہ میں دوسری جماعتوں کے ساتھ تعاون و اشتراک عمل کرنے سے ہے۔

سب سے پہلے امیر جماعت نے اس غیر رسمی بات چیت کی روداد پیش کی، جو ان کے اور مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ العلماء اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اڈیٹر الفرقان کے درمیان ہوئی تھی،

مجلس شوریٰ نے اس روداد کو سننے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا کہ بحالات موجودہ جبکہ ملک میں کوئی بھی ایسی جماعت موجود نہیں ہے، جو مسلمانوں کے تعلیمی امور کو تنہا احسن طور سے انجام دے سکے، مذہبی تعلیم کے بندوبست و انتظام کی مناسب شکل وہی ہو سکتی تھی جو مذکورہ غیر رسمی بات چیت میں زیر بحث آئی تھی، اور جس پر گفتگو کے ہر سہ ارکان نے اپنی انفرادی حیثیتوں میں اتفاق رائے کیا تھا یعنی یہ کہ:۔

اس مسئلہ (مسلمانوں کے مذہبی تعلیم کے مسئلہ) کی غیر معمولی وسعت اور مسلمانوں کی موجودہ غیر منظم و انتشاری حالات کے پیش نظر خاص اس مقصد کے لیے ایک مستقل مشترکہ بورڈ بنایا جائے جس کے سامنے صرف یہی مہم ہو اور مسلمانوں کی ان مختلف جماعتوں کی کسی مخلصانہ تائید اور دیانت دارانہ تعاون اس کو حاصل ہو، جو اپنی مذہبیت اور فکر دینی کی وجہ سے اس مسئلہ سے خاص دلچسپی رکھتی ہوں اور جن کے اثر و رسوخ کا کوئی معتد بہ حلقہ اور دائرہ ہو۔

لیکن چونکہ جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ منعقدہ ۱۸ و ۱۹ دسمبر ۱۹۵۰ء نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا[1] اور اس کی بجائے

---

[1] جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ کا رزولیوشن درج ذیل ہے۔

ابتدائی مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں جو گفتگو ناظم عمومی جمعیۃ العلماء ہند کی مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی سے ہوئی تھی اس کی روداد پیش کی گئی۔ ان دونوں حضرات کا مشورہ یہ ہے کہ اس اہم مقصد کے لیے ایک مشترک بورڈ قائم کیا جائے۔

اس تجویز کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد محسوس کیا گیا کہ ایسا اشتراکی بورڈ اس اہم مقصد کی ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس سلسلہ میں وہی جماعت کام کر سکتی ہے جس کا نظام عرصے سے قائم ہو، اور ملک میں روشناس ہو چکی ہو۔ اس لیے جمعیۃ العلماء ہی اس کو بحسن وجوہ انجام دے سکتی ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس اہم فرض کی انجام دہی کے لیے زیادہ سے زیادہ جد و جہد کو کام میں لایا جائے۔ اور جو جماعت تعاون کرے اس کے تعاون اور اشتراک عمل کی قدر کی جائے۔

اس نے یہ طے کیا ہے کہ وہ تنہا اپنی ذمہ داری پر یہ کام بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہے اس لیے ارکان شوریٰ کی یہ رائے ہوئی کہ مشترکہ بورڈ کے طریق کار کو نظری حیثیت سے صحیح تسلیم کرتے ہوئے اور آئندہ اگر اس طرح کے کسی مشترک بورڈ کے قیام کے امکانات پیدا ہوسکیں تو اس کے ساتھ اپنے سابقہ مشروط تعاون کی پیش کش کو برقرار رکھتے ہوئے فی الحال ہمیں بنیادی تعلیم کے ضمن میں اپنی ذمہ داریاں اپنے طور سے ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس ضمن میں امیر جماعت نے تجاویز کا ایک مسودہ پیش کیا، جس سے بالکلیۃ اتفاق کیا گیا۔ یہ مسودہ درج ذیل ہے۔

(۱) جماعت اسلامی جس خدا پرستانہ نظریہ حیات کی ترویج و اشاعت کے لیے قائم ہوئی ہے اس کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ وہ غلط تعلیم اور اس کے مضر اثرات کی روک تھام اور صحیح تعلیم اور اس کے صحیح اثرات کی ترویج و اشاعت کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول کرے، بالخصوص ایسی حالت میں کہ حکومت کے زیر اہتمام جو نصاب تعلیم رائج کیا جا رہا ہے وہ نہ صرف یہ کہ صحیح مذہبی اور اخلاقی تصورات سے خالی ہے۔ بلکہ اس کو کچھ اس انداز میں ترتیب دیا جا رہا ہے کہ اس وقت تک مسلم و غیر مسلم بچوں میں ماحول وغیرہ کی بدولت جو تھوڑا بہت مذہبی اور اخلاقی حس پایا جاتا ہے، یہ نصاب تعلیم اس کو بھی ختم کر دینے والا ہے۔

(۲) تعلیم کے ان مضر اثرات کی روک تھام اور اس کے مقابلہ میں صحیح تعلیم کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں ہم جو تھوڑی بہت کوشش عمل میں لاسکتے ہیں اس کی صحیح نوعیت ہمارے مقصد اور طریق کار کے مطابق تو یہ ہونی چاہیے کہ ہم اس مسئلہ کو صرف مسلمانوں کا کوئی مخصوص مسئلہ سمجھ کر کوئی قدم نہ اٹھائیں، بلکہ اس کو ملک کا ایک عمومی مسئلہ سمجھتے ہوئے، جس کا تعلق ہر قوم اور پورے ملک کے مفاد سے ہے، اسے عمومی شکل میں سامنے لاکر اسی حیثیت سے اس پر اپنی کوشش صرف کریں، لیکن چونکہ بدقسمتی سے ملک کی عام حالت اس مسئلہ پر ابھی اس حیثیت سے غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور نہ ہم، اس حیثیت سے اس کو اپنا کر اس سلسلہ میں کوئی خاص مفید خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے سردست اپنے نظریہ تعلیم کے عمومی تبلیغ کے ساتھ ہمیں اس مسئلہ کی عملی کوششوں کو صرف مسلمانوں کے دائرہ تک محدود رکھنا چاہیے۔

(۳) مسلمانوں کے تعلیمی مسائل میں اس وقت اہم تر مسئلہ جس کی طرف بیش از بیش توجہ کی ضرورت ہے اور جس کے سلسلہ میں ہماری کوششیں کچھ کارآمد ثابت ہوسکتی ہیں وہ مسلمانوں کی ابتدائی مذہبی تعلیم کا مسئلہ ہے جس کی طرف ہم پہلے سے بھی کچھ نہ کچھ توجہ دیتے رہے ہیں، لیکن اب حالات اس کی طرف کچھ زیادہ توجہ مبذول کرنے کے داعی ہیں بالخصوص ایسی حالت میں کہ حکومت کے زیر اہتمام ابتدائی تعلیم کا جو نصاب رائج کیا جا رہا ہے وہ اپنی مختلف حیثیتوں میں مسلمان بچوں کی اسلامیت کے لیے انتہائی تباہ کن ہے۔

(۴) ابتدائی تعلیم کی ترویج و اشاعت کے سلسلہ میں ہم ہر اس جماعت کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں جن کا

تعلیم اور طریقہ تعلیم بنیادی طور سے ہمارے مقصد و طریقہ کے خلاف نہ ہو، اس لیے رفقاء کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جن مقامات پر مسلمانوں کی کسی جماعت کی طرف سے ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں کوئی کوشش عمل میں لائی جا رہی ہو اور وہ جماعت اس کے سلسلہ میں اُن کے تعاون و اشتراک کی خواہشمند ہو، تو خواہ اس جماعت کی عمومی دعوت و مسلک سے ہمیں اتفاق ہو یا اختلاف، وہاں ہمارے رفقاء مذکورۂ بالا شرط کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے ساتھ اشتراک عمل کر سکتے ہیں بشرطیکہ کام کی صحیح نوعیت سے آگاہ کر کے مرکز سے پہلے سے اجازت حاصل کر لی جائے۔ البتہ اس سلسلہ میں اپنے عام اصول کے تحت اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ:-

(الف) ہمارا یہ اشتراک و تعاون تعلیم کی حد تک محدود رہے، اور اس میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ ہمارا یہ تعاون اس بات پر محمول نہ کیا جا سکے کہ ہم جس جماعت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اس کی عمومی دعوت و مسلک سے بھی ہمیں لازماً اتفاق ہے

(ب) اس کی کسی انتظامی کمیٹی میں اس وقت تک باقاعدہ شرکت نہ کی جائے، جب تک اس میں ہماری حیثیت یہ نہ ہو کہ ہم اس کو اپنے اصول و مسلک کے خلاف چلنے سے روک سکیں۔

(ج) مالی نظم و انتظام سے اپنے کو علیحدہ رکھا جائے۔

(۵) تعلیمی کام کو اپنے طور سے انجام دینے کے لیے ہمیں حسب ذیل طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

(الف) جماعت کے نظریہ تعلیم کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے مرکز میں جو ابتدائی درس گاہ قائم کی گئی ہے اس کو زیادہ سے زیادہ وسیع اور مضبوط کرنے کے لیے جدوجہد تاکہ اس میں زیادہ سے زیادہ ایسے بچوں کے لیے گنجائش نکل سکے جن کے والدین اپنے بچوں کو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت دلانے کے لیے آمادہ ہیں۔

(ب) جن مقامات پر جماعت کے اِتنے اور ایسے افراد موجود ہوں جو بآسانی مرکزی درس گاہ کے نمونہ پر کوئی ذیلی درسگاہ قائم کر سکیں، اُن کو اس کی طرف متوجہ کرنا اور بشرط گنجائش ان کی مالی مدد کرنا۔

(ج) مرکزی درس گاہ کے نصاب تعلیم کو مسلمانوں کے دوسرے مدارس و مکاتب میں مقبول اور رائج کرنے کے لیے جدوجہد کرنا۔

(د) نصاب تعلیم کے مطابق درسیات کی تیاری اور اس سلسلہ میں جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں یا آئندہ شائع ہوں گی ان کو مدارس و مکاتب کے علاوہ عام مسلمانوں میں پھیلانے کی کوشش کرنا۔

(ہ) مسلمانوں میں عام دینی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کرانا اور اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ اس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلانے کی طرف متوجہ ہوں اور اس کا اپنی طرف سے معقول بندوبست کریں۔

(د) جن مقامات پر رفقاءِ جماعت مرکزی درسگاہ کے نمونہ پر کوئی درس گاہ قائم نہ کر سکیں وہاں کے رفقاء کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ مسلمان بچوں کو مذہبی تعلیم سے قریب کرنے کے لیے فی الحال حسبِ ذیل طریقہ اختیار کریں۔

(الف) سب سے پہلے مسلمانوں میں مذہبی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کیا جائے۔

(ب) جب یہ محسوس ہو کہ ان کے اندر یہ احساس کچھ پائدار حد تک پیدا ہو گیا ہے تو ان کو تعلیم کے عملی انتظام کی طرف توجہ دلائی جائے۔

(ج) حتی الوسع اس کے انتظامی شعبوں بالخصوص مالیات سے اپنے کو الگ رکھا جائے، لیکن اگر لوگوں کا اعتماد مجبور کرے اور اس سے کام میں خوبی پیدا ہونے کی توقع ہو تو شرکت بھی کی جا سکتی ہے۔

(د) مرکزی درس گاہ کے نصاب سے متعارف کیا جائے لیکن اس کے لیے اصرار نہ کیا جائے کہ وہ بعینہٖ کسی درس گاہ میں رائج ہو، اس میں مقامی ضروریات و حالات کے تحت تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ البتہ اس تعلیم کا جو دینی پہلو ہے وہ کسی حال میں نظر انداز نہ ہونے دیا جائے۔

(و) غیر مستطیع طلباء کو فیس طعام وغیرہ سے معاف رکھا جائے، البتہ جو طلباء فیس دے سکتے ہوں ان سے ماہانہ ایک مقررہ فیس جو ان کی مجموعی مالی حالت اور مصارفِ مدرسہ کے پیشِ نظر مقرر کی گئی ہو، وصول کی جا سکتی ہے۔

(ہ) اس طرح کے مکاتب کے لیے بشرطِ گنجائش دعا جائز مرکز، مقامی یا حلقہ کے بیت المالوں سے مالی امداد بھی دی جا سکتی ہے۔

(۶) اساتذہ کی تربیت کا بندوبست مرکزی درسگاہ میں کیا جائے تاکہ مرکزی درسگاہ کی شاخوں اور مکاتب کے لیے لائق اساتذہ فراہم کیے جا سکیں۔ اس تربیت کے لیے ماہرینِ تعلیم کے مشوروں سے ایک علیحدہ پروگرام تیار کیا جائے۔

اس مسودہ سے اتفاقِ رائے کرنے کے بعد اس سوال پر غور کیا گیا کہ ان تجاویز کو عملاً بروئے کار لانے کے لیے فی الحال ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں حسبِ ذیل باتیں طے کی گئیں۔

(۱) درسیات کی تیاری کے لیے افضل حسین صاحب ناظم درس گاہ زیادہ موزوں آدمی ہیں، اس لیے ان کا وقت اس کام کے لیے فارغ کیا جائے اور درسیات کی تیاری کے دوران میں ان کا تعلق درس گاہ سے محض نگرانی اور ہدایت کی حد تک رہے اور ان کے متعلقہ اسباق کے پڑھانے کا کام کسی ایسے رفیق کے سپرد کیا جائے جو اس کام کے لیے موزوں ہو، خواہ وہ موجودہ اساتذہ درس گاہ میں سے کوئی شخص ہو یا اُن لوگوں میں سے جو تعلیم و تدریس کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے یہاں آئیں گے، یا بالمعاوضہ بھی کسی ایسے رفیق کی خدمت حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۲) قیمِ جماعت آئندہ تین ماہ کے اندر اپنے حلقوں کا جائزہ لے کر مطلع کریں کہ تعلیمی تجاویز کے کون کون سے حصے ان کے حلقوں میں بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔

جمعیتوں کو اپنے فرائض میں خاص طور سے یہ بات بھی شامل سمجھنی چاہیے کہ درسیات شائع شدہ مرکز کو تمام مکاتب و مدارس میں اور اس کے ساتھ عام مسلمانوں میں پھیلانے کے لیے عملی جد و جہد عمل میں لائیں اور اپنی ماہانہ رپورٹوں میں اس جد و جہد اور اس کا تذکرہ کریں۔

(۴) مکتبہ کی طرف سے ان کتابوں کے باقاعدہ اعلان کا معقول انتظام کیا جائے۔

(۵) اجتماعات کے ذریعہ مسلمانوں میں مذہبی تعلیم کا احساس پیدا کرایا جائے اور جماعتی اخبارات و رسائل کو بھی اس کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت کی جائے۔

اس کارروائی کے بعد شعبہ تعلیم کے علاوہ دیگر پہلوؤں سے گفتگو شروع ہوئی۔ اس ضمن میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ زیرِ بحث آئیں۔

(۱) مسلم و غیر مسلم عوام سے ربط۔

(۲) کمیونزم کے بڑھتے ہوئے اثرات اور ان کے تدارک کی صورتیں۔

پہلی بات کے سلسلہ میں طے کیا گیا کہ :-

(۱) موجودہ حالات میں یہ ضروری ہے کہ خواص کے ساتھ عوام سے بھی زیادہ سے زیادہ ربط و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ ان کو دین کے قیام کے کام میں حصہ لینے کے لیے تیار کیا جاسکے۔

(۲) اب تک جو تدبیریں مثلاً تعلیم بالغان اور اجراء مکاتب وغیرہ اختیار کی جاتی رہی ہیں، ان کے ماسوا شکل وفود عوام تک پہونچے اور ان سے گہرے شخصی روابط پیدا کرنے کے ذرائع فراہم کیے جائیں۔

(۳) ان سے ذاتی میل و محبت پیدا کی جائے اور ان کی مشکلات میں ان کی عملی ہمدردی کی جائے۔

(۴) دین کی بنیادی باتوں سے انھیں زبانی یا بذریعہ آسان لٹریچر واقف کیا جائے۔

(۵) اسلام کی صحیح تعبیر ان کے سامنے پیش کی جائے جس سے دین و دنیا کی تفریق کا تصور مٹ سکے۔ اور وہ معاملات سے اخلاق کو دین کا جزء سمجھنے لگیں۔

(۶) دوروں کے لیے سب سے پہلے کوئی خاص مقام تجویز کیا جائے اور وہاں اتنے وقت تک قیام کیا جائے یا اتنی دفعہ جایا جائے کہ یا تو مذکورہ بالا مقصد حاصل ہو جائے یا خدانخواستہ اس کی طرف سے بالکلیۃ مایوسی ہو جائے۔

(۷) دوروں میں جزوی اختلافی باتوں سے کسی طرح تعرض نہ کیا جائے اور اگر اس کے مواقع پیش آجائیں تو ان سے حکمت کے ساتھ درگذر کیا جائے۔

غیر مسلم عوام سے ربط کے سلسلہ میں حسب ذیل اصول ملحوظ رکھے جائیں۔

(۱) ان سے میل جول پیدا کیا جائے، اور اپنے اچھے برتاؤ کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی نفرت کو دور

کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۲) ان کے ساتھ بات چیت کرنے میں متانت اور سنجیدگی اور ساتھ ہی دعوت اور داعی وقار دعوت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔

(۳) دعوت پیش کرنے میں حسب ذیل ترتیب ملحوظ رکھنی چاہیے۔

(الف) ابتدائی ملاقاتیں جو محض ربط وضبط قائم کرنے کے لیے ہوں۔

(ب) عام دلچسپی کے مسائل پر بات چیت اور ان کے ضمن میں خدا پرستی کی دعوت۔

(ج) خدا پرستی کے مسلمہ بنیادوں پر متفق کرنے کی کوشش۔

(د) ان مسلمہ بنیادوں کے تقاضوں کی توضیح۔

کمیونزم کے سلسلہ میں طے کیا گیا کہ:

(۱) جماعت کی طرف سے ایسی کتابیں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ جن سے مسلم عوام اس فتنہ کو اچھی طرح سمجھ سکیں خاص طور سے کمیونزم اور اسلام کا مقابلہ کرکے یہ دکھانے کی ضرورت ہے کہ ان دونوں میں باہم کتنا تضاد ہے۔ اور یہ کہ اسلام کس طرح ان مشکلات کو حل کرتا ہے۔ جن کے ازالے کے لیے کمیونزم کا سہارا جلد بڑھا جا رہا ہے' اس طرح کی کتابیں لکھنے کے لیے کچھ اشخاص کے نام تجویز کیے گئے، اور طے کیا گیا کہ ان کو اس سلسلہ میں ہر طرح کی امداد بہم پہونچائی جائے۔

(۲) جماعتوں کو متوجہ کیا جائے کہ اجتماعات وغیرہ کے موقع پر کمیونزم کے سلسلہ میں لوگوں کا ذہن صاف کرنے کی خاص طور سے کوشش کی جائے۔

اس دفعہ کے ذیل میں یہ بھی طے کیا گیا کہ رفقاء کو ہدایت کی جائے کہ وہ ہندستان میں اپنی ان ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کریں، جو کہ اقامت دین کے سلسلہ میں ان پر عائد ہوتی ہیں، اور غیر متعلق امور اور دلچسپیوں سے الگ ہوکر اپنے اصلی فرائض کو اپنی توجہات کا مرکز قرار دیں، اور ملک کے جماعتی اخبارات ورسائل سے اپنا زیادہ سے زیادہ لگاؤ پیدا کریں۔

وقت کے جدید تقاضوں کے ضمن میں یہ بات بھی معرض بحث میں آئی کہ ہندی اخبارات ورسائل میں بسا اوقات ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں جو دین کے صحیح تصورات کے منافی ہوتے ہیں، طے کیا گیا کہ اس طرح کی باتوں پر نگاہ رکھی جاتے اور ان کے ازالہ کی مناسب تدابیر بروئے کار لائی جائیں۔

اس کے بعد ترجمہ قرآن' ہندی کی اشاعت پر غور کیا گیا۔ بعض ارکان کی رائے تھی کہ اس سے زیادہ بعض اور ضروری کام سرمایہ کی کمی کی وجہ سے رُکے پڑے ہیں، اس لیے فی الحال اس کی اشاعت کو موخر کر دیا جائے، لیکن ہندی زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر اس رائے سے اتفاق نہیں کیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ فی الحال کم از کم مقدمہ اور نمونہ کے طور پر کچھ کے شائع کرنے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ ترجمہ کی صحت کی طرف سے پورا اطمینان کرلیا جائے۔

[illegible] حافظ امام الدین صاحب رام نگری، اپنی علالت طبع کے باوجود نظر ثانی کا کام انجام دے رہے ہیں، لیکن قرآن کی عظمت و اہمیت کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ماسوا کسی اور لائق ہندی داں سے بھی اس کی نظر ثانی کرائی جائے، اور ابھی ترجمہ کا کام بھی باقی ہے۔ اس لیے خیال کیا گیا کہ طبع و اشاعت کے کام میں ابھی کافی تاخیر ہوگی۔

اس کے بعد، تامل، ملیالم، اور گجراتی دارالاشاعتوں کی تعاون باہمی کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔

سب سے پہلے ان دارالاشاعتوں کی رپورٹیں پڑھ کر سنائی گئیں۔

ملیالم دارالاشاعت کے حسابات میں یہ سقم نظر آیا کہ تنظیم جماعت کے سلسلہ کے مصارف بھی دارالاشاعت کے حساب میں داخل کر دیے گئے ہیں کیوں کہ ناظم دارالاشاعت اور قیم حلقہ ایک ہی شخص جناب وی پی محمد علی صاحب ہیں، چنانچہ انھیں ہدایت کی گئی کہ آیندہ وہ دونوں سلسلوں کے حسابات الگ الگ رکھا کریں۔

ملیالم دارالاشاعت میں بعض کتابوں کی طباعت کے لیے کچھ روپیوں کی امداد طلب کی گئی، لیکن اس کے لیے مرکزی بیت المال میں گنجائش نہیں نکالی جا سکی، چنانچہ کہا گیا کہ قرض قرض کے ذریعہ فی الحال اس کا انتظام کیا جائے۔

گجراتی دارالاشاعت کے سلسلہ میں طے ہوا کہ فی الحال اس کا کام تقریباً بند سا ہے اس لیے آئندہ انتظام ہونے تک دارالاشاعت کی تمام کتابیں، مقامی جماعت بمبئی کے پاس منتقل کر دی جائیں اور وہاں سے ان کی فروخت وغیرہ کا انتظام کیا جائے اور مناسب حالات پیدا ہونے پر دارالاشاعت کے کام کو دوبارہ شروع کرنے پر غور کیا جائے گا۔

تامل دارالاشاعت کا معاملہ بھی اسی ضمن میں زیر بحث آیا، لیکن چونکہ مولانا عبدالجبار شریف صاحب ناظم دارالاشاعت ایک دوسرے معاملہ کے ضمن میں، اسی دن شام کو مرکز تشریف لے آنے والے تھے، اس لیے طے کیا گیا کہ اس مسئلہ پر ان کی موجودگی میں غور کیا جائے، چنانچہ یہ ملتوی کر دیا گیا۔

جدید لٹریچر

جدید دعوتی لٹریچر تیار کرنے کے سلسلہ میں طے کیا گیا کہ فی الحال چند مہینے کے لیے مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی ترجمہ و تفسیر قرآن کا کام ملتوی کر کے ضروری لٹریچر تیار کرنے کا کام انجام دیں، اور اس دوران میں ایسے اشخاص کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، یا ایسے اشخاص تیار کیے جائیں جو اس کام کو آئندہ انجام دے سکیں۔ یہ خیال کیا گیا کہ مقدمہ قرآن تیار کر لینے کے بعد مولانا صدرالدین صاحب لٹریچر کی تیاری کا کام شروع کریں تو مناسب ہوگا۔

ذیلی مکتبوں کے ضمن میں حافظ عبدالتواب صاحب کی تجاویز پر غور کیا گیا، اور طے کیا گیا کہ مکتبہ کی تنظیم جدید کے وقت ان تجاویز سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے، اسی نشست کے دوران میں عبدالجبار شریف صاحب کا خط آگیا کہ وہ بعض ناگہانی مجبوریوں کی بنا پر وقت مقررہ پر مرکز نہیں آ سکیں گے، اس لیے تامل دارالاشاعت کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا۔

دار الاشاعت اور اس کے جملہ متعلقات پر غور کر لے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ اس کا انتظام عبد الجبار شریف صاحب کی بجائے شیخ عبد اللہ صاحب قیم حلقہ تامل ناڈ کے سپرد کیا جائے۔ تقریباً دو سال پہلے جب امیر جماعت نے کویمبتور کے اجتماع میں شرکت کی تھی تو اسی وقت یہ تجویز زیر بحث آئی تھی اور اکثر ارکان نے دار الاشاعت کے انتظام کے لیے شیخ صاحب کے نام کی سفارش کی تھی، لیکن اس وقت یہ کام ان کے سپرد اس لیے نہیں کیا جا سکا کہ خود شیخ صاحب کی خواہش تھی اور جماعت کے کام کے سلسلہ میں امیر جماعت نے بھی اسے مناسب سمجھا تھا کہ وہ اپنا کچھ وقت تامل زبان کی تحصیل کے لیے فارغ کر سکیں چنانچہ عارضی طور سے یہ دار الاشاعت کا انتظام عبد الجبار شریف صاحب کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ خیال کیا گیا کہ چونکہ تامل ناڈ کے قیم وہی ہیں اور آیندہ ان کو جماعت کے کام لئے لیے بالکلیۃً فارغ کرنے کی بھی تجویز زیر غور ہے اس لیے اس سے قطع نظر کہ انھوں نے اس دوران میں تامل زبان کتنی سیکھی ہے، دار الاشاعت کا کام ان کے متعلق کر دینا چاہیے۔ اس سے ان کو جماعت کے کام کے لیے فارغ کرنے میں بھی سہولت ہو گی، کیوں کہ ان کا کچھ بار دار الاشاعت پر بھی ڈالا جا سکے گا، اور شاید اسی کے ضمن میں وہ اپنی یہ خواہش بادضرورت بھی پوری کر سکیں گے کہ تامل زبان میں ان کو پوری مہارت حاصل کرنی ہے جس کے لیے وہ موجودہ مشغولیتوں میں بمشکل وقت نکال سکتے ہیں۔

اس کے بعد دفعہ ۶ کے تحت اس سوال پر مزید غور ہوا کہ دینی تعلیم کے علاوہ مسلمانوں کے دیگر تمدنی اور تہذیبی مسائل کیا ہیں، اور ان کے ضمن میں ہم اپنے طور سے یا دوسری مسلم جماعتوں کے تعاون کے ساتھ کیا کام کر سکتے ہیں، اور ان جماعتوں کے ساتھ تعاون کے کیا حدود ہو سکتے ہیں، غور و بحث کے بعد یہ طے کیا گیا کہ مسلمانوں کے مسائل کے ضمن میں بحیثیت جماعت ہم اپنی عملی سرگرمیاں صرف دینی تعلیم تک وسیع کر سکتے ہیں، اس کے علاوہ دیگر مسائل میں ہمارے عملی حصہ لینے کی نہ گنجائش ہے اور نہ یہ اصولاً ہمارے لیے مناسب ہے البتہ ہم ان مسائل کے ضمن میں صحیح اسلامی اصولوں کی توضیح کر سکتے ہیں، اور افراد جماعت ان مسائل سے متعلق کسی ایسے مسئلہ میں اپنی انفرادی حیثیت سے حصہ بھی لے سکتے ہیں، جس میں حصہ لینا ان کے اصول کے منافی نہ ہو۔

ثانوی تعلیم

اس بحث سے فارغ ہو لے کے بعد ثانوی تعلیم کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ مرکز میں اس سلسلہ میں جو انتظام کیا گیا ہے، اور یہ کام اس وقت جس طرح اور جس پیمانہ پر ہو رہا ہے پہلے اس کی تفصیل بتائی گئی جس کے سننے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ ثانوی تعلیم کے لیے ایک مزید اچھے استاذ کا تقرر کیا جائے جو دینی علوم میں کافی دستگاہ رکھتا ہو، اور اس کے لیے چند نام بھی زیر غور آئے، لیکن آخری انتخاب امیر جماعت کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔

ثانوی تعلیم سے متعلق مسائل کے بارے میں مشورے دینے کے لیے ایک کمیٹی بھی بنا دی گئی جس کے ارکان حسب

یہ ہیں۔

(۱) شاہ ضیاء الحق صاحب۔ (۳) مولانا صدر الدین صاحب۔ اصلاحی

(۲) افضل حسین صاحب ناظم درس گاہ۔ (۴) مولانا سید حامد علی صاحب۔

تربیت گاہ

تربیت گاہ جو مرکز میں قائم ہوئی ہے، اس کے سلسلہ میں یہ عملی دشواری درپیش ہے کہ ہمارے بہت سے رفقاء اپنی معاشی دقتوں کی وجہ سے اپنے دور دراز علاقوں سے یہاں آنے میں زحمتیں محسوس کرتے ہیں، چنانچہ اس کی بنا پر بعض لوگوں نے تجویز پیش کی تھی، کہ مرکزی تربیت گاہ کو مستقلاً مرکز میں رکھنے کی بجائے اسے گشتی بنا دیا جائے، تاکہ بہت سے رفقاء بسہولت اور زیادہ مصارفِ سفر خرچ برداشت کیے بغیر اس سے فائدہ اٹھا سکیں، لیکن مختلف پہلوؤں سے غور کرلے کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ تربیت گاہ کا حقیقی فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب وہ مرکز میں ہو، کیوں کہ یہاں ماحول کی سازگاری کے علاوہ تربیت کی ایسی سہولتیں بھی حاصل ہیں جو کسی دوسری جگہ میسر نہیں آسکتیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ محسوس کیا گیا کہ رفقاء کی دقتوں کا بھی کچھ نہ کچھ لحاظ کرنا ضروری ہے اور اس کے لحاظ سے طے کیا گیا کہ :۔

(۱) حتی الوسع تربیت میں آنے والوں کی معاشی مشکلات کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے، خصوصیت کے ساتھ جنوبی ہند کے رفقاء کی مشکلات کا زیادہ پاس ولحاظ کیا جائے۔

(۲) رفقاء سے دریافت کرنے کے بعد ایک ایسا نقشہ تیار کیا جائے جس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ کن کن مہینوں میں ان کی زیادہ تعداد شریک تربیت ہوسکتی ہے اور اس کے مطابق ان کو تربیت کے لیے بلایا جائے، اور جن مہینوں میں متوقع شریک ہونے والوں کی تعداد ناکافی معلوم ہو، ان مہینوں میں تربیت کا پروگرام ملتوی کر دیا جائے، تاکہ ناظم تربیت گاہ کو خود اپنی ذاتی علمی ارتقاء یا ذیلی مراکز کی دیکھ بھال یا تربیت کے موضوع پر کسی کتاب کی تصنیف کے لیے کچھ وقت مل سکے، اور ان مہینوں میں آنے والوں کا نام کسی اور مہینے میں آنے والوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔

(۳) قیمین اور ایسے حضرات جو اپنے مقامات پر جاکر تربیت کا کام کر سکیں، ان کو خاص طور سے تربیت میں شرکت کے لیے بلایا جائے اور ان کو مقدم رکھا جائے۔

(۴) قیمین سے ایسے رفقاء کی فہرست طلب کی جائے جن کا تربیت پانا جماعت کے لیے زیادہ مفید ہو اور جو اپنے طور پر بھی تربیت کے کام کو اپنے حلقوں میں سنبھال سکیں۔

گشتی تربیت گاہ

یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ ہر رفیق کا مرکزی تربیت گاہ میں آنا گوناگوں وجوہ سے ازبس دشوار ہے، لیکن

اس بات کے پیش نظر، کہ ہمارے بہت سے رفقاء، اپنی واقعی مجبوریوں کی وجہ سے ابھی عرصہ تک اس قابل نہیں ہوسکیں گے کہ وہ یہاں مرکزی تربیت گاہ میں آسکیں، یہ مناسب سمجھا گیا کہ مرکزی تربیت گاہ کے ساتھ گشتی تربیت گاہ کا بھی انتظام کیا جائے۔ اس کے لیے یہ شکل تجویز کی گئی کہ جن مقامات پر زیادہ سے زیادہ رفقاء جمع ہوسکیں اور مکان وغیرہ کی سہولتیں آسانی سے بہم پہونچ سکیں، وہاں متعینہ تاریخوں میں متعین مدت کے لیے گشتی تربیت گاہ کا انتظام کیا جائے، جس میں مقامی اہل علم کے ساتھ مرکز سے بھی دو ایک رفقاء مع ناظم تربیت گاہ لازمی طور سے شریک ہوں۔

طے پایا کہ اس طرح کی گشتی تربیت گاہ کے انتظام کے لیے قیمین کو لکھا جائے اور ان کے مشوروں کے مطابق اس کا پروگرام بنایا جائے۔

مُقامی تربیت گاہ

یہ محسوس کیا گیا کہ مرکزی تربیت گاہ اور گشتی تربیت گاہ کے بعد بھی، رفقاء کی مستقل تربیت کی ضرورت بہرحال باقی رہ جاتی ہے، اس لیے طے کیا گیا کہ قیمین اور اُمراء کو توجہ دلائی جائے کہ وہ اپنے حلقہ کے رفقاء کی تربیت کا اپنے حلقوں میں خصوصی مستقل انتظام کریں۔

تربیت گاہ کے سلسلہ میں ناظم تربیت گاہ کی رپورٹ کا یہ حصہ تعجب سے سُنا گیا کہ باوجود کئی بار یاد دہانی کے ابھی تک رفقاء کی ایک معتد بہ تعداد نے اب تک یہ اطلاع نہیں دی ہے کہ وہ تربیت کے لیے کب آنا چاہتے ہیں، ممکن ہے ان کو اطلاعی خطوط نہ ملے ہوں، اس لیے طے کیا گیا کہ ان لوگوں کو اس کے متعلق دوبارہ لکھا جائے، کیونکہ تربیت میں آنا ہر رفیق کے لیے ضروری ہے۔ اِلّا یہ کہ اس نے امیر جماعت سے اجازت لے کر اپنے کو مستثنےٰ کرا لیا ہو۔

سالانہ اجتماع

سالانہ اجتماع کے مسئلہ پر دیر تک گفتگو ہوئی اور اس ضمن میں جو خطوط رفقاء جماعت کے آئے ہوئے تھے وہ پڑھ کر سنائے گئے، جماعتوں کی پیشکشوں پر بھی غور ہوا، اور بالآخر امیر جماعت کے اس فیصلہ سے سب نے اتفاق کیا، کہ سالانہ اجتماع مرکز میں ہو، مگر اس میں جنوبی ہند کے صرف نمائندے مدعو کیے جائیں، اور شمالی ہند کے رفقاء کو بھی یہ سہولت دی جائے کہ وہ علاوہ عذر شرعی کے اپنی دیگر قابل لحاظ معاشی وغیر معاشی مشکلات کی بنا پر بھی شرکت سے مستثنےٰ قرار دیئے جاسکتے ہیں، لیکن ان کو اس کے متعلق خط لکھ کر مرکز سے باقاعدہ اجازت حاصل کرنی چاہیے۔

اس کے ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ اس مرکزی اجتماع کے پانچ چھ ماہ بعد جنوبی ہند کا ایک علٰحدہ اجتماع ہونا چاہیے جس میں شمالی ہند کے نمائندے شریک ہوں ــــــ اس اجتماع کے لیے مقام کی تعیین ابھی نہیں کی گئی، اس کا فیصلہ بعد کو جنوبی ہند کے رفقاء کے مشوروں کے بعد کیا جائے گا۔

مرکزی اجتماع کی تاریخ کا اعلان بھی بعد کو کیا جائے گا۔ اُمید ہے مارچ کے آخر یا شروع اپریل کی تاریخوں میں یہ اجتماع منعقد ہو سکے گا۔

اس کارروائی کے بعد، جناب محمد یونس صاحب جو اپنی اہلیہ کو بستر علالت پر چھوڑ کر آئے تھے، باجازت امیر واپس تشریف لے گئے، بعد کی کارروائیاں ان کی عدم موجودگی میں انجام پذیر ہوئیں۔

ریلیف فنڈ

مظلومین حیدرآباد کی امداد کے لیے جماعت اسلامی حیدرآباد کی طرف سے جو ریلیف فنڈ قائم ہوا تھا، اس کا حساب پیش ہوا، معلوم ہوا کہ جس امدادی اسکیم کو جاری کرنے کے لیے یہ رقم فراہم کی گئی تھی وہ اسکیم بعض موانع کی وجہ سے جو ہمارے قابو سے باہر ہیں، بروئے کار نہیں لائی جا سکی اس لیئے اس فنڈ کا بیشتر سرمایہ ابھی تک محفوظ ہے۔ طے کیا گیا کہ اس فنڈ کا باقاعدہ حساب، "الانصاف" اور "حیاتِ نو" وغیرہ میں شائع کر دیا جائے اور جو رقم باقی رہ گئی ہے اس کے بارے میں حضرات معطیان سے استصواب کر لیا جائے، کہ وہ اپنی باقی ماندہ رقم واپس لینا چاہتے ہیں، یا وہ اس کو مظلومین حیدرآباد کی کسی دوسری امداد کے سلسلہ میں، یا ان سے قطع نظر کسی اور معرفِ خیر میں صرف کر دینا پسند کریں گے۔ یہ بھی طے ہوا کہ دو تین بار اعلان کے ایک ماہ بعد جن رقوم کے بارے میں کوئی جواب موصول نہیں ہوگا وہ حتی الوسع حیدرآباد کے مظلومین پر یا دیگر ضروری رفاہی کاموں پر جو مناسب سمجھیں جائیں صرف کر دی جائیں گی۔

مُعاشی اسکیم

اس کے بعد رفقاء کی معاشی پریشانیوں کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ ان کی معاشی پریشانیاں گوناگوں وجوہ سے دعوت کے لیے رکاوٹ ثابت ہو رہی ہیں، اس لیے ان کے ازالہ و تخفیف کی تدابیر اختیار کرنا نفس دعوت کے پہلو سے نیز ان کی اخلاقی امداد کے پہلو سے ضروری ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی محسوس کی گئی کہ اس سلسلہ میں ہم جماعتی طور سے معلومات مہیا کرنے، اطلاعات بہم پہونچانے اور رفقاء کو مناسب مشورہ اور ہدایات دینے کے ماسوا اور کوئی کام فی الحال نہیں کر سکتے ہیں، اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی محسوس کی گئی کہ آئندہ اس سلسلہ میں جو عملی کارروائیاں بھی شروع کی جائیں، اُن میں اس بات کا شدت سے لحاظ کیا جائے کہ ان معاشی تدابیر میں رفقاء کا انہماک یا مشغولیت اس طرح کی نہ ہو، جو کسی پہلو سے تحریک کے لیے مضر ثابت ہو سکے۔

طے کیا گیا کہ ایک معاشی کمیٹی بنا دی جائے جو مذکورہ بالا باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، آئندہ کام کے واضح اور متعین خطوط طے کرے، تاکہ اس کے مطابق یہ کام باقاعدہ شروع کیا جا سکے۔ اس کمیٹی کے داعی جناب شاہ ضیاء الحق صاحب تجویز

لیے گئے اور ارکان میں یوسف صاحب صدیقی، اور سید عبدالقادر صاحب کے علاوہ کچھ ایسے رفقاء کے نام بھی شامل کرلیے گئے جو تجارتی معاملات کا ذاتی عملی تجربہ رکھتے ہیں۔

درس گاہ

اس کے بعد درس گاہ کا معاملہ زیر بحث آیا۔ اس نشست میں جناب افضل حسین صاحب ناظم درس گاہ اور محمد شفیع صاحب مونس، استاد درس گاہ کو بھی خصوصی دعوت پر شریک اجتماع کرلیا گیا۔۔۔ سب سے پہلے درس گاہ کی رپورٹ پڑھی گئی جس میں درس گاہ کی آئندہ ضروریات اور آئندہ سال کے میزانیہ کا بھی ذکر تھا۔ عام طور سے یہ محسوس کیا گیا کہ جن ضروریات کا رپورٹ میں تذکرہ کیا گیا ہے، وہ کم سے کم ضروریات ہیں، جو جماعت کی مرکزی درس گاہ کے لیے فراہم کی جانی چاہئیں، اور میزانیہ بھی حوالی کفایت شعاری کے اصول پر مرتب کیا گیا ہے، لیکن امیر جماعت نے مرکزی درس گاہ کی آمد و خرچ اور متوقع آمدنیوں کا حال تفصیل سے بیان کیا تو معاً یہ محسوس کیا جانے لگا کہ یہ کم سے کم ضروریات بھی کس طرح پوری کی جاسکتی ہیں، اور سالِ آئندہ کے میزانیہ کو برقرار رکھنے کی کیا تدبیر ہوسکتی ہے، لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی، امیر جماعت کے اس سوال نے ارکان کو چونکا سا دیا کہ جب ایک بار پوری طرح غور کرنے کے بعد، اور درس گاہ کی ضرورت پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہوئے یہ قدم اُٹھایا جاچکا ہے تو کیا آگے بڑھنے کے سوا پیچھے قدم اُٹھانے پر بھی غور کیا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب ہر طرف سے نفی میں تھا، امیر جماعت نے فرمایا کہ پھر جو کچھ کرنا ہے اللہ کے بھروسے پر اس کو شروع کیجیے۔ اگر اس کام کی کوئی افادیت اللہ کی نگاہ میں ہے تو وہ ضرور اس کا انتظام فرمائے گا، اور بہرحال درس گاہ کی مالیات ابھی مایوس کن نہیں ہیں۔ اس گفتگو کے بعد ہی ایک رکن شوریٰ نے توقع ظاہر کی کہ وہ واپس جاکر درس گاہ کے سلسلہ میں اپنی طرف سے ایک معقول رقم کا انتظام کرسکیں گے۔ اور یہ توقع بھی ظاہر کی گئی کہ اگر رفقاء جماعت اس طرف متوجہ ہوں تو ایک مرکزی درس گاہ کا چلانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

بہرحال اس طرف سے پُر امید ہوکر درس گاہ کے آیندہ پروگرام کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا، البتہ میزانیہ کی ایسی مدات جو بالکل ناگزیر نہیں ہیں اور جن کو بعد کے کسی مرحلہ کے لیے ملتوی کیا جاسکتا ہے، ان کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو باتیں ناگزیر سمجھ کر طے کی گئیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) آیندہ سال سے سال نوین درجہ کا اضافہ کیا جائے۔

(۲) ایک مزید اُستاد کا اضافہ کیا جائے۔

(۳) دو درجوں کی تعلیم کے لیے درسگاہ سے متصل مکان میں معمولی سامان کے ساتھ دو کمروں کا انتظام کیا جائے جس کے لیے بجٹ میں تین سو روپیہ کی رقم کا اندازہ پیش کیا گیا تھا۔

بچوں کو خیاطی سکھانے کے لیے ایک سینے کی مشین کی ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس کے لیے طے ہوا کہ مشین خریدنے کی ضرورت نہیں ہے، الانصاف میں اشتہار دیدیا جائے، کہ اگر کسی رفیق کے پاس کوئی مشین خالی ہو تو وہ اس کام کے لیے مستعار یا بطور عطیہ پیش کرے۔

مالیات

آخر میں یہ سوال سامنے آیا، کہ جماعت کی ناگزیر ضروریات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے ان کے مقابلہ میں آمدنی کے ذرائع نہایت مختصر اور محدود ہیں۔ اس لیے اس مسئلہ پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ مرکزی بیت المال کی آمدنی میں کس طرح اضافہ ہو، امیر جماعت نے مرکزی بیت المال کی حالت کا نقشہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ بیت المال کی آمدنی کا تمام تر دارومدار مکتبہ اور رفقاء کی مالی اعانت پر ہے، لیکن جہاں تک رفقاء کی اعانت کا تعلق ہے، وہ اکثر مقامات سے بمنزلہ صفر کے ہے، اور دو چار جماعتوں کو چھوڑ کر بہت کم جماعتیں ایسی ہیں، جنہوں نے مرکزی بیت المال کی امداد میں کوئی قابل ذکر حصہ لیا ہو، جس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ہمارے بہت سے رفقاء، مرکزی ضروریات کے مقابلہ میں مقامی ضروریات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں، اور اس کی کچھ وجہ یہ بھی ہے، کہ اکثر رفقاء خود مالی پریشانیوں میں مبتلا ہیں، اس لیے مقامی بیت المالوں کا حال بھی کچھ اچھا نہیں ہے، اور اس کا لحاظ کرتے ہوئے ان سے امداد کے لیے کہنا خود میری طبیعت پر بار گذرتا ہے۔

امیر جماعت کی زبانی یہ بات سن کر بعض ارکان نے تجویز پیش کی کہ ارکان یا جماعتوں کو اس کی ہدایت کی جائے کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ متعین حصہ لازمی طور پر مرکزی بیت المال میں بھیجیں، اور اسی طرح کی کچھ اور تجویزیں بھی پیش ہوئیں، لیکن امیر جماعت نے کہا "کہ جب تک کام چلایا جا سکتا ہے، جماعت کی ضروریات کے ضمن میں بھی ارکان کے سامنے دست سوال پھیلانا طبعاً ان کو پسند نہیں ہے اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ارکان جماعت اس بارے میں کسی تحریک یا اپیل کے محتاج ہوں، انہیں خود جماعت کی ضروریات کا اندازہ اور احساس ہونا چاہیے، لیکن ظاہر ہے یہ بات اسی وقت تک ممکن ہے جب تک کام کسی نہ کسی طرح چل سکتا ہو۔ ورنہ جب ضرورت مجبور کرے گی تو سب کچھ کرنا گوارا کرنا پڑے گا، یہاں تک کہ انہیں مجبوراً یہ بھی کرنا پڑے گا کہ مقامی بیت المالوں کی چھوٹی بڑی کل آمدنی مرکزی بیت المال میں منتقل کر لی جائے۔

ارکان نے اس بات سے اتفاق کیا لیکن وہ اس ضرورت کا بار بار اظہار کرتے رہے کہ ارکان اور جماعتوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس ضمن میں کوئی خاص بات اس کے سوا طے نہیں ہو سکی، کہ مکتبہ کی حالت مستحکم بنانے کی کوشش کی جائے اور رفقاء کو متوجہ کیا جائے کہ وہ جماعتی ضروریات کا زیادہ سے زیادہ پاس و لحاظ کریں۔

اس کے بعد کچھ جزئی معاملات زیر بحث آئے جن سے فارغ ہو کر سب نے مل کر اللہ سے دعا کی کہ جس عظیم فریضہ کو انجام دینے کے لیے جماعت اسلامی قائم ہوئی ہے اس کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ ہماری مدد و نصرت فرمائے اور ہمیں ہمت و استقامت عطا فرمائے۔

اس کارروائی کے بعد اجتماع برخواست ہو گیا۔

Regd. No. A - 688 "ZINDGI" Monthly RAMPUR U. P.

زندگی

جلد (۵)

نمبر (۵)

جمادی الاول سنہ ۱۳۷۰ھ

مارچ سنہ ۱۹۵۱ء

مرتبہ سید حامد علی

فہرست مضامین

دفتر رسالہ زندگی رام پور

چندہ سالانہ (صہ) فی کاپی (۸)

سید حامد علی پرنٹر و پبلشر نے ناظم پریس رام پور سے چھپوا کر دفتر زندگی رامپور سے شائع کیا

اشارات

از مولانا ابواللیث صاحب ندوی

الیکشن سے علیحدگی کا ایک دوسرا زبردست نقصان یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں کوئی ایسی پارٹی برسر اقتدار آجائے گی جو مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ خطرناک ثابت ہو اور اس وقت مسلمانوں کو جو سہولتیں اور آزادیاں حاصل ہیں وہ بھی اس کے تحت ختم ہو جائیں، اس لیے آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کو پوری قوت وہمت کے ساتھ حصہ لینا چاہیے اور ان پارٹیوں میں سے نسبتاً کسی بہتر یا کم خطرناک پارٹی کو منتخب کرکے اس کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

الیکشن کی حمایت میں اس وقت جتنی دلیلیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ان سب میں مذکورہ بالا دلیل اپنے اعتبار سے ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے کہ اس کا مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ پر بہت گہرا اثر پڑ رہا ہے لیکن جہاں تک ہم نے اس دلیل کا تجزیہ کیا ہے ہمارے نزدیک اس دلیل کی اس تاثیر کی وجہ کچھ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہ اس دلیل میں کوئی وزن ہے، وزن تو کیا فی نفسہ یہ کوئی دلیل ہی نہیں ہے جیسا کہ آپ کو آئندہ بتایا جائے گا، البتہ چونکہ یہ دلیل خوف زدہ مسلمانوں کی ذہنیت سے یک گونہ مناسبت رکھتی ہے اس لیے اس طرح کے مسلمانوں پر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے۔

تقسیم کے بعد سے اس وقت تک مسلمان مختلف قسم کی آفات ومصائب کے شکار رہے ہیں اور آئندہ بھی ان کو اپنے لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی پڑ رہا ہے اور ساتھ ہی انھوں نے اپنی کم نگاہی یا بدحواسی کی وجہ سے یہ سمجھ لیا ہے ــــ اور بد قسمتی سے یہی عام طور سے ان کو سمجھایا بھی جاتا ہے کہ ان کو جو کچھ بھی مصیبتیں ہندوستان میں پیش آرہی ہیں وہ محض یہاں کی بعض پارٹیوں کے غلط طرز عمل کا نتیجہ ہیں اور ان کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے کہ وہ انہی پارٹیوں میں سے کسی پارٹی کے دامن عطوفت میں پناہ لیں، اس لیے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ خوف زدہ مسلمان امن وسکون کی تلاش میں ہر اس راستہ کی طرف دوڑ پڑیں جس پر چل کر وہ توقع کر سکیں کہ وہ کسی درجے میں اپنے موجودہ مصائب اور پریشانیوں سے نجات پا سکتے ہیں، لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ کوئی راستہ محض ان کے ظن وگمان کی بنا پر ان کے لیے امن وسکون کا راستہ نہیں بن جائے گا اور نہ ان کی خوش گمانیوں سے اس کی خطرناکیاں ان کے حق میں راحت وسکون کا ذریعہ بن جائیں گی

بلکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی اس سراسیمگی اور سرگشتگی کی حالت میں کسی ایسے راستے کو اپنے لیے راہ نجات فرض کر لیں جس پر عمل کر کے ان کی مصیبت ختم ہونے کی بجائے اور زیادہ سخت اور سنگین ہو جائے اور پھر بعد کو ان کو سوا پچھتانے کے اور کچھ حاصل نہ ہو سکے۔

ہمارے نزدیک اس وقت موجودہ مشکلات کے خاتمہ کے لیے جو تجویز سوچی جا رہی ہے یعنی یہ کہ الیکشن میں حصہ لے کر کسی بہتر پارٹی کو برسر اقتدار لانے کی کوشش کرنی چاہیے اس کی حیثیت یہی ہے یہ ان کی بدحواسی کا سوچا ہوا نسخہ ہے اور اس سے فائدہ کی بجائے ان کو اور زیادہ الٹا نقصان پہونچنے والا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ الیکشن میں حصہ نہ لینا اگر اس پہلو سے خطرناک ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہم کسی خطرناک پارٹی کے زیر اقتدار آجائیں گے اور یہ خطرہ ہمارے لیے بہت سے خطرات کا پیش خیمہ ہے۔ تو ہمارے نزدیک فی نفسہ الیکشن میں حصہ لینے سے جو خطرات پیش آئیں گے وہ ان خطرات سے بدرجہا زیادہ خطرناک ہیں اس لیے اگر آپ خطرات سے اپنا تحفظ کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے آپ الیکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں —— دراں حالیکہ اس کی شرعی اور دینی حیثیت آپ پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ کسی طرح آپ کے لیے جائز نہیں ہے —— تو آپ اس خطرے کے نقطۂ نظر ہی کے تحت فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کے لیے الیکشن میں حصہ لینا زیادہ مفید ہو گا یا اس سے علٰحدہ رہنا۔

الیکشن کے نقصانات پر ہم اس سے پہلے تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں، لیکن یہاں ہم موقع کی مناسبت سے ان نقصانات کا صرف وہ حصہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں جو براہِ راست الیکشن میں حصہ لینے سے پہونچ سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک مسلمانوں کو اس وقت ہندوستان میں جو مصیبتیں پیش ہیں ان کا بڑا اور بنیادی سبب یہ ہو کہ وہ اب بھی ہندوستان میں اس حیثیت کے مالک ہیں کہ ان کے ووٹ الیکشن پر بہت کچھ اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ان کی اس حیثیت کو بہت سے لوگ ان کے لیے فال نیک سمجھتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے حالات میں ایسا ہی ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک ملک کے موجودہ حالات میں ان کی یہ حیثیت ان کے لیے بلائے جان ثابت ہو رہی ہے۔ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے تحت یہ سمجھا جا رہا ہے۔ اور یہ حقیقت سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت، ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں میں سے بعض سے زیادہ قریب اور بعض سے بہت زیادہ دور ہے، اور اسی اعتبار سے یہ سمجھا جا رہا ہے کہ آئندہ الیکشن میں مسلمانوں کی تائید یا مخالفت کا کیا انداز ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو پارٹیاں اپنی جگہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کی تائید و حمایت کسی حال میں حاصل نہیں ہو سکے گی وہ اس بات کے لیے دن رات کوشاں ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ہر ممکن ذریعہ سے تنگ اور پریشان کریں اور اس سے گوناگوں فوائد ان کے پیش نظر ہیں۔

پہلا فائدہ اس کا یہ ہو گا کہ مسلمان پریشان ہو ہو کر ترک وطن کریں گے اور اس طرح ان کے مخالفین کے ووٹ

کم ہو نے رہیں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ جو مسلمان یہاں رہنا ہی چاہیں گے وہ ان سے خوف زدہ ہو کر یا تو ان کا ساتھ دیں گے یا کم از کم ان کے مخالفین کی حمایت نہیں کریں گے اور یہ دونوں صورتیں الیکشن میں ان کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔

اور تیسرا زبردست فائدہ اس سے ان کو یہ پہونچے گا کہ وہ اس کی وجہ سے عام پبلک میں جو بدقسمتی سے سخت فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار ہے "نیک نام" ہوں گے اور اس سے ان کی آیندہ کامیابی کی راہیں ہموار ہوں گی۔

اور چوتھا فائدہ یہ ہے کہ فسادات کی وجہ سے کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کا اعتماد متزلزل ہوگا اور یہ چیز بالواسطہ طور سے ان کے لیے مفید ہوگی۔

چنانچہ ملک کی یہ جماعتیں ان ہی فوائد کے لیے تقسیم سے لے کر اس وقت تک برابر اپنی فتنہ انگیزیوں میں مصروف ہیں اور اس وقت تک جتنے فسادات بھی ہوئے ہیں اُن سب میں ان کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ اور یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ جو لوگ حالات سے ذرا بھی لگاؤ رکھتے ہیں وہ ہم سے زیادہ اس سے آگاہ ہیں، تاہم ہم ذیل میں ایک غیر مسلم اہل قلم کے ایک مضمون کا ایک اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ ہم نے فسادات اور ان کے اسباب کی طرف جو اشارہ کیا ہے اس سے "غیر متعصب" صاحب البیت بھی متفق ہیں۔

اوبنکار ناتھ شاستری نے گذشتہ سال کے فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں جو نیا ہند (الہ آباد) میں شائع ہوا تھا، لکھا تھا:-

"ہندوستان میں سامپردایک (فرقہ وارانہ) دنگے کرانے میں ان جماعتوں (فرقہ پرست جماعتوں) کو کئی فائدے دکھائی دیتے ہیں ہندوستان میں مسلمانوں کی اب بھی کافی تعداد ہے اور ان کے ووٹ چناؤ پر کافی اثر ڈال سکتے ہیں، مہاسبھا جانتی ہے کہ وہ ان کے ووٹ نہ حاصل کر سکے گی، اس لیے اگر مسلمان یہاں سے چلے جائیں تو اس کا کام بن سکتا ہے، مسلمانوں کے نکالنے کے لیے اس نے پہلے تو یہ نعرہ لگایا کہ آبادی کی ادلا بدلی کرلی جائے پھر اس نے جنگ کا نعرہ لگایا اور جب یہ دیکھا کہ ہندوستان اور پاکستان ایسی مورکھتا نہیں کریں گے تو اپنی ساری کوشش اس بات پر لگا دی کہ ہندوستان بھر میں ہندو مسلم دنگے ہو جائیں۔

آبادی کا تبادلہ ہونے پر کروڑوں آدمیوں کو کن کشٹوں کا سامنا کرنا پڑتا اس سے اسے کوئی غرض نہیں اور جنگ میں ہندوستان اور پاکستان میں کتنی تباہی اور بربادی ہوتی اس سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس کا مقصد تو کسی طرح مسلمانوں کو یہاں سے نکال کر ان کے بدلے میں آنے والے ہندوؤں سے یہ کہہ کر ان کے ووٹ حاصل کرنا تھا کہ دیکھو کانگریس تمہارا خیال نہیں کرتی تھی ہم نے تمہیں مسلمانوں کی غلامی سے چھٹکارا دلایا، اس کا آخری حربہ ہندو مسلم دنگے تھے، کیوں کہ یہاں دنگوں میں جو ہندو حصہ لیں گے وہ نہ صرف مسلمانوں کی جان لیتے بلکہ ان کا

مال بھی لوٹتے اگر اس لوٹ میں ان کے ہاتھ کچھ مال آجاتا اور وہ پکڑے جاتے تو مہا سبھا یہ کہتی کہ میرے کارکنوں نے یہ لابھ پہونچا اور اگر سرکار انہیں روکتی یا پکڑتی تو مہا سبھا ہندوؤں کو یہ سمجھاتی کہ کانگریس تمہاری دشمن اور مسلمانوں کی دوست ہے۔ اس طرح جن ہندوؤں کو سرکار گرفتار کرتی مقدمے چلاتی اور سزا دیتی ان کے ہمدردوں (متعلقین) کے دل میں آپ ہی آپ سرکار اور کانگریس کے خلاف نفرت پیدا ہوتی۔ غرض ہر حالت میں مہا سبھا اپنا فائدہ ہی فائدہ سوچتی تھی "

اقتباس بالا کو پیش نظر رکھنے سے اس بات میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ہمیں آئین ہند میں شہریت کا جو یہ حق دیا گیا ہے کہ ہم الیکشن میں مساویانہ حصہ لے سکیں وہ ہمارے خوش ہونے کے لیے تو بہت اچھا ہے لیکن اس کا استعمال ہمارے لیے کتنے خطرات کا سرچشمہ ہے۔ اور اس کے بعد غالباً یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کو اگر ہندوستان میں اپنی عافیت مطلوب ہے تو ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ اپنے اس حق سے خود اپنے ارادہ سے دست بردار ہو جائیں اس سے اور کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم فرقہ پرستوں کی ان چیرہ دستیوں سے جن کا آئے دن ان کو نشانہ ہونا پڑتا ہے ان کو نجات مل سکتی ہے، اور میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو تھوڑا بہت سکون آپ کو نظر آ رہا ہے اس کی وجہ سے آپ کچھ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ان فرقہ پرستوں کی ذہنیتوں میں کوئی فرق واقع ہو گیا ہے، اول تو اس وقت ملک میں روٹی اور کپڑے کے مسائل نے وقتی طور سے اہل ملک کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیا ہے، جس میں فتنہ و فساد کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی فرصت نہ بانیان فساد کو ہے اور نہ عام پبلک کو دوسرے ابھی الیکشن غیر یقینی ہونے کے ساتھ، کچھ دور بھی ہے، اس لیے اس وقت صرف تیاریوں کا زمانہ ہے مناسب وقت آنے پر جد و جہد تیز کرنے کی ضرورت پیش آئے گی اور تیسری بات یہ ہے کہ اس وقت بھی ان کا سلسلہ کچھ بند نہیں ہے کچھ نہ ہونے پر بھی ۸ر دسمبر ۱۹۵۰ء سے ۱۳ر جنوری ۱۹۵۱ء تک یعنی صرف ڈیڑھ ماہ میں، یوپی، سی پی، اور بہار وغیرہ میں سات جگہ فسادات برپا ہو چکے ہیں جن کا سبب آیندہ الیکشن کی تیاریاں ہیں اور یہ بات وزیر اعظم ہند تک کو تسلیم ہے۔

شعیب (حیدرآباد) نے ابھی حال میں لکھا ہے :-

وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کے پورے احساس کے ساتھ اعلان کیا ہے کہ حال ہی میں ہندو مہا سبھا نے فرقہ وارانہ فسادات کرانے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ افواہیں پھیلا کر فسادات کا ایک نیا دور شروع کرانے کی سازش اس لیے کر رہی ہے کہ اصول نظریہ اور عمل کے میدان میں تو وہ کانگریس کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر فرقہ وارانہ فضا بگاڑ کر اگلے انتخاب میں ووٹ ملنے کی امید کر سکتی ہے اور غالباً یہ توقع بھی کر سکتی ہے کہ اگر فسادات پھیلائے جائیں تو مسلم اقلیت بھی کانگریس پر بھروسہ ترک کر کے مہا سبھا کو یا دوسرے حریف عناصر کو ووٹ دے گی اور اس طرح مہا سبھائی امیدوار بالواسطہ فائدہ اٹھائیں گے "

پھر ان فتنہ پرور جماعتوں کی ان فتنہ پردازیوں کے ساتھ یہ بات بھی آپ کو پیش نظر رکھنی چاہیے کہ تقسیم ملک کے بعد ان کے لیے یہاں کی فضا کتنی سازگار ہو گئی ہے اور اب ان کے اثر و اقتدار کا کیا حال ہے۔ عوام میں ان کو جو مقبولیت ہو سکتی ہے، اس کے تو خیر اسباب موجود ہیں لیکن خود حکومت میں ان کے اثر و اقتدار کا حال یہ ہے کہ اوپر وزیر اعظم ہند کی جس تقریر کا حوالہ دیا گیا ہے اس طرح کی تقریریں خود حکومتی محکمہ یعنی ریڈیو کے ذریعہ ملک میں نشر نہیں ہو پاتی ہیں جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود حکومت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نہیں چاہتے کہ ان جماعتوں کے خلاف ملک میں کوئی جذبہ مخالفت کا پیدا ہو اور وہ اس کے لیے وزیر اعظم کی تقریروں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں، ان جماعتوں کی اس حیثیت کو ذہن میں رکھئے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ محض مسلمانوں کا ووٹ اس وقت ان کی کتنی مصیبتوں کا باعث بنا ہوا ہے اور اس پر اس وقت کی حالت کو بھی قیاس کر لیجئے جب انتخابات کی ہماہمی عملاً شروع ہو جائے گی اور مسلمانوں کی حمایت یا مخالفت جو ابھی درجہ احتمال و امکان سے نکل کر قطعیت کی حد میں داخل نہیں ہوئی ہے الیکشن میں حصہ لینے کی صورت میں کھل کر سامنے آ جائے گی، اس وقت اس کا مخالفین پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو شاید اس وقت اُس وقت کی تباہیوں کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے، خدا کرے ہم جن باتوں کا اندیشہ کرتے ہیں اُن میں سے کوئی بات بھی پیش نہ آئے ہماری خوشی یقیناً اس میں ہے کہ اس بارے میں تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوں اور ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ غیب کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے اور کارساز حقیقی کی کارسازیاں ہر قسم کے ظن و تخمین سے بالاتر ہیں، اس لیے ہو سکتا ہے کہ وہ از غیب ایسے اسباب فراہم کر دے جن کی وجہ سے یہ حالات چشم زدن میں یکسر بدل جائیں، لیکن اگر خدانخواستہ مسلمانوں کے طرز عمل میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی جس کا ایک اہم جزو یہ ہے کہ مسلمان اپنی صحیح حیثیت کو پہچانیں اور اس کے تحت الیکشن سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کریں تو اس وقت جو حالات ہیں ان کے بموجب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ مسلمان الیکشن میں اس حیثیت سے شریک ہونے جا رہے ہیں کہ وہ کسی خطرناک پارٹی کے شر و فتنہ سے محفوظ رہنے کے لیے کسی بہتر پارٹی کو برسر اقتدار لائیں گے تو انتہائی پُر امید نقطۂ نظر رکھنے کے باوجود ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مولانا نور الدین صاحب بہاری کے یہ الفاظ ہمارے ذہن و دماغ میں گونجنے لگتے ہیں،

"اگر اس مسئلہ کو اس طرح اُلجھاؤ میں رکھا گیا تو میرا یقین ہے کہ الیکشن کے زمانے میں مسلمانوں کی تباہی اتنی بھیانک ہو گی جس کا تصور بھی آج نہیں کیا جا سکتا،" (لا سمح اللہ)

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا الیکشن میں حصہ لینا اس وقت فرقہ پرست جماعتوں کی دشمنی مول لینے اور ان کو شر و فساد کی دعوت دینے کے مترادف ہے اس لیے مسلمان اگر اپنے

کو خطرات سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کو الیکشن کی آگ میں جھونکیں، بلکہ یہ ہے کہ وہ اس سے پوری طرح علحٰدہ رہنے کی کوشش کریں، لیکن اس ضمن میں دو اور باتیں بھی پیش کی جاتی ہیں جن سے تعرض کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کے جواب میں یہ کہا کرتے ہیں کہ کسی ایک یا متعدد جماعتوں کی چیرہ دستیوں کے اندیشہ سے الیکشن سے علحٰدہ رہنا خوف اور بزدلی کی راہ ہے جو مسلمانوں کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی اور یوں بھی کسی قوم کے زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کو خطرات میں ڈالے کہ یہی اصل زندگی ہے یا اس کے ذریعہ زندگی کی راہیں کھلتی ہیں اور علحٰدگی جمود کا پیش خیمہ ہے جس کی حیثیت قوموں کے لیے موت کی ہے۔

اس کے جواب میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ ان باتوں سے ہمیں سو فی صدی اتفاق ہے، لیکن یہ باتیں بنانے والے شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ الیکشن میں حصّہ لینے کی جو دلیل پیش کر رہے ہیں وہ بھی تو خوف و بزدلی ہی پر مبنی ہے، آپ اگر یہ جانتے ہوئے بھی کہ الیکشن میں حصّہ لینا آپ کے دین اور آپ کی ملی حیثیت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، آپ الیکشن میں حصّہ لینا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ خود آپ کے قول ہی تو ہے کہ آپ کو اندیشہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی ایسی پارٹی برسرِ اقتدار آجائے گی جو آپ کے لیے زیادہ خطرناک ہو، تو پھر آخر الیکشن سے علحٰدہ رہنے کو آپ خوف و بزدلی کے عذر کی بنا پر کیوں کر رد کر سکتے ہیں۔ اگر اس پہلو سے یہ دونوں راہیں یکساں درجہ رکھتی ہیں تو پھر مدارِ بحث صرف یہی بات ہو سکتی ہے کہ ان دونوں راہوں میں کونسی راہ ایسی ہے جس کو اختیار کرنے سے مسلمانوں کو کم از کم خطرہ پیش آسکتا ہے۔ یا جس سے وہ زیادہ سے زیادہ خطرات سے محفوظ ہو سکتے ہیں اور جہاں تک آپ کی تجویز کردہ راہ کا تعلق ہے یہ بات اوپر کی بحث سے بھی یک گونہ واضح ہوگئی ہے اور آیندہ آپ کو اس کے سلسلہ میں مزید معلوم ہوگا کہ وہ نہ کسی پہلو سے ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے اور نہ اس سے کسی خطرہ ہی کا ازالہ ہو سکتا ہے اور اس کے برعکس ہم جس راہ کے داعی ہیں اس کا یہ فائدہ تو بین طور سے ہر حال میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ چاہے اس سے کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن اس سے مختلف مصیبتوں کا سدِ باب ہو جاتا ہے، اور اگر فی الواقع آپ حرکت ہی کی زندگی ہی کے طالب ہیں تو آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ ہم الیکشن سے علحٰدگی کا جو مشورہ دے رہے ہیں وہ بس علحٰدگی پر ختم ہو جائے گا، ہمارے نزدیک تو یہ کام کا ایک منفی پہلو ہے اور حقیقی کام جو ہمارے نزدیک ضروری ہے اس کی ابتدا اس علحٰدگی کے بعد سے شروع ہوتی ہے اور یقیناً وہ کام ایسا ہے جس میں آپ کو اپنی حوصلہ مندیاں دکھانے کا کافی موقع مل سکتا ہے، اس لیے اگر آپ کو ترک و جمود کی زندگی پسند نہیں ہے اور اس بنا پر کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو تھوڑا صبر کر کے پہلے ہمارے پیش نظر کام کا ایک سرسری جائزہ لے لیجیے اگر اس سے آپ کے ذوقِ کار کی تسکین ہو سکے تو ہمارے نزدیک اسی کو اختیار کرنا آپ کے لیے مناسب ہوگا کیونکہ وہ کام دینی حیثیت سے بھی آپ کے کرنے کا ہے اور ہمارے نزدیک آپ کی دنیا بھی اسی سے محفوظ ہو سکتی ہے اور

کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ کوئی کام جس سے نہ دین کا کوئی فائدہ پہونچ سکتا ہو اور نہ دُنیا کا، محض اس لیے کیا جائے کہ آپ کی بے چینی آپ کو کوئی کام کرنے پر مجبور کر رہی ہے، جمود و بے عملی بلاشبہ بہت بُری چیز ہے لیکن ایسی سعی و عمل سے تو وہ بہرحال بہتر ہے جو غلط جگہ اور بے جا طور پر صرف ہو اور جس کا نتیجہ کھُلے طور پر فائدہ کی بجائے سراسر نقصان ہو۔

دوسری بات اس ضمن کی یہ ہے کہ کچھ لوگ فرقہ پرست جماعتوں کی مذکورہ چیرہ دستیوں کا حال سُن کر جن کو ہم نے الیکشن سے علٰحدگی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے، یہ فرماتے ہیں کہ ان ہی چیرہ دستیوں کے اندیشہ سے تو ہم الیکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں کیوں کہ ان کا علاج یہی ہے کہ ہم دوسری پارٹیوں کی حمایت و امداد حاصل کریں اور اس طرح ہم ان سے محفوظ رہ سکتے ہیں،

اس دلیل کا حقیقی جواب تو آگے آئے گا جہاں ہم یہ واضح کریں گے کہ موجودہ پارٹیوں میں کوئی پارٹی بھی ایسی نہیں ہے جس پر ہم یہ اعتماد کر سکیں کہ اس کے جرنوں میں اپنے کو ڈال کر ہم ہندوستان میں اپنی موجودہ اور آیندہ مصیبتوں سے محفوظ یا اپنے دینی و دنیاوی مفاد کے تحفظ کی طرف سے مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ الیکشن میں حصہ لینا بھی اس خطرے سے نجات کا باعث ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں خاص طور سے ہم مخالف پارٹیوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہنے کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے سلسلہ میں آپ کی یہ معتمد علیہ پارٹیاں آپ کے لیے قطعاً بے کار ہیں۔

الیکشن جب قریب آئے گا اور اس میں مسلمان عملاً حصہ لینگے تو اس وقت کیا ہو گا، اس کو ابھی جانے دیجئے کہ یہ آیندہ سے متعلق سوال ہے جس کے بارے میں ہم اور آپ جو کچھ کہیں گے وہ بہرصورت از قبیل ظن و قیاس ہی ہو گا جس میں بحث کی کافی گنجائش ہو سکتی ہے لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بارے میں تو کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے، اس وقت بھی ان پارٹیوں کے بارے میں مسلمانوں کی عام ہمدردی یا مخالفت کا رویہ کچھ ڈھکا چُھپا نہیں ہے، اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مخالف پارٹیوں نے جیسا کہ گذر چکا ہے مسلمانوں کے ساتھ اپنے طرز عمل کی ایک خاص پالیسی بنالی ہے، لیکن کیا یہ بات آپ کے لیے تعجب اور استعجاب کی نہیں ہے کہ وہ پارٹیاں جن کو مسلمانوں کے طرز عمل سے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آیندہ الیکشن میں ان کی اکثریت ان کا ساتھ دے گی اور اس کے ساتھ وہ یہ بھی اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ یہ محض ان کے ساتھ لگاؤ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اس وقت ان کی حریف جماعتوں کے طرح طرح کے مظالم کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی ان کے اندر مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو رہا ہے درآں حالیکہ ان پارٹیوں میں بعض پارٹیاں ایسی ہیں جن کے کندھوں پر اس وقت ملک کے نظم و انصرام کی ذمہ داریاں بھی ہیں جن کا بجائے خود یہ تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ ملک میں امن و امان قایم کریں، اور بلا امتیاز مذہب ملت ہر قوم کو عدل و انصاف کے قوانین سے یکساں طور سے مستفید ہونے کا موقع دیں، یہ کیا واقعہ نہیں ہے کہ آج مسلمان ہندوستان میں طرح طرح کے مظالم کے ہاتھوں اس طرح پریشان ہیں کہ انھیں اپنی بدحواسی کی حالت

(بقیہ صفحہ (۴۵) پر)

(۷)

سورۂ بقرہ از آیت ۴۷ تا آیت ۱۱۰

مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْــــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ

اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت[۵۱] کو یاد کرو جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور (اس طرح) تمہیں تمام اقوام عالم پر فضیلت عطا کی تھی۔ اور اس دن سے ڈرو جب دن کوئی کسی کی کوئی ذمہ داری اپنے سر نہ لے گا، نہ کسی کے متعلق کوئی سفارش قبول کی جائیگی، نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا، (غرض) ان (مجرموں) کو

---

[۵۱] اس "نعمت" کا مطلب یہاں خاص طور سے اقتدار حکومت ہے، جیسا کہ اس کے بعد کے الفاظ سے خود واضح ہو رہا ہے۔ قرآن کی نظر میں دنیوی مال و متاع اور اقتدار کوئی ناپسندیدہ اور قابل ترک اشیاء نہیں ہیں، بلکہ وہ اصلاً بھی خوش نصیبی قرار دیتا ہے۔ اب یہ انسان کا اپنا کام ہے کہ وہ اس خوش نصیبی کو اپنے لیے خوش نصیبی ہی رہنے دے اور ان چیزوں کو مالک کی مرضی کے مطابق استعمال کر کے مزید نعمتوں کا اپنے آپ کو مستحق بنالے، یا ناشکری، بغاوت اور خود سری کی راہ اختیار کر کے اپنے لیے انھیں موجب عذاب بنالے۔

بنی اسرائیل کو خدا نے دونوں ہی قسم کی نعمتیں عطا کی تھیں، یعنی دینی نعمتیں بھی اور دنیوی نعمتیں بھی، جن کا مختصر بیان سورۂ مائدہ کی ۲۰ ویں آیت میں اس طرح کیا گیا ہے" اللہ نے تمہارے اندر کتنے ہی پیغمبر پیدا کیے اور تمہیں حکومت

يُنْصَرُوْنَ ۝ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

کہیں سے بھی کسی طرح کی مدد نہ مل سکے گی۔[51]

(یاد کرو وہ وقت) جب[52] ہم نے تمہیں فرعونیوں[53] سے نجات دلائی تھی، جب کہ وہ تمہیں رُسوا کن عذاب دے رہے تھے[54]، تمہارے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عطا کی، اور جس کا کسی قدر مفصل بیان یہاں اِس موقع پر کیا جا رہا ہے، گویا دونوں قسم کی نعمتوں کی یاد دہانی کرا کے اِن سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ان نعمتوں کی قدر پہچانو، ان کے عطا کرنے والے کا شکر ادا کرو، اور اس کی مکمل اطاعت اور رضا جوئی اپنا مقصدِ حیات بنا لو۔

حواشی صفحہ ہٰذا) [51] یعنی قیامت کے اُس دن سے ڈرو جو ٹھیک انصاف کا دن ہوگا اور جس دن مُجرم کی سزا سے بچنے کے لیے ان تدبیروں میں سے کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہوگی جن کو استعمال کر کے مُجرم آج دُنیا میں بچ جایا کرتے ہیں۔

[52] یہاں سے ان کی قومی تاریخ کے کچھ ایسے واقعات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے غیر معمولی احسانات کی یادگار ہیں، تاکہ ان کے دِل کے کسی گوشے میں بھی اگر انسانیت اور احسان شناسی کا کوئی ذرہ موجود ہو تو وہ اُبھر کر اوپر آجائے۔ پھر اِن واقعات کے ساتھ ساتھ ان یہودیوں کی اس ناشکری، ناخدا ترسی اور سرکشی و بغاوت کی داستان بھی سنائی جا رہی ہے، جس سے انھوں نے اِن غیر معمولی احسانات کا جواب دیا، تاکہ ان کے سامنے اپنی قومی اور مِلّی برتری کے گمانِ باطل کی حقیقت واضح ہو جائے، اور انھیں بتا دیا جائے کہ جس قومی فضیلت کا تمہیں اب تک غرور ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی، تمہارے اپنے ذاتی اوصاف اور خاندانی خصوصیات کا نتیجہ نہ تھی۔ پس خدا نے اگر آج اپنی یہ بخشش کسی دوسری قوم کو عطا کر دی تو تمہیں اس سبب سے فکر یا غصہ کرنے کی ضرورت نہیں، خدا کی مرضی میں تمہارا یا کسی اور کا کیا اختیار؟ اس کے علاوہ تم نے اِن نعمتوں کی جیسی کچھ قدر کی، اِس کے بعد بھی اِن کے لیے تم ہی چُنے جاتے یہ کیسے ممکن تھا! درگذر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے!

[53] فرعونیوں سے مراد "فرعون" اس کا شاہی خاندان، اس کے وزراء اہل دربار، نیز فوجی و غیر فوجی حکام ہیں۔ "فرعون" مصر کی ترقی کے زمانے میں وہاں کے خود مختار بادشاہوں کا خاندانی لقب تھا، جس طرح ایرانی تاجداروں کا لقب "کسریٰ"، اور رومی بادشاہوں کا لقب "قیصر" ہوا کرتا تھا۔ "فرعون" مصر کے اس حاکم کا نام نہیں ہے جس کا یہاں تذکرہ ہے، بلکہ اس کا خاندانی لقب ہے۔

[54] یہ اس وقت کا قصہ ہے جب بنی اسرائیل مصر میں مقیم تھے، جہاں قبطیوں کی حکومت تھی، اور ان لوگوں

(بقیہ حواشی صفحہ آیندہ)

يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ۝ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ۝

لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ[51] چھوڑ رکھتے تھے۔ اس کام میں تمہارے لیے تمہارے رب کی طرف سے ایک آزمائش تھی، بہت بڑی آزمائش۔[52] یاد کرو وہ وقت) جب ہم نے تمہارے سمندر کو پھاڑ دیا اور پھر درمیان سے تمہیں صحیح سلامت گزار دیا تھا، لیکن فرعونیوں کو تمہاری نگاہوں کے سامنے غرق[53] کر دیا۔ (یاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی حیثیت اس حکمراں قوم کے مقابلہ میں سخت ابتر اور انتہائی ذلیل تھی۔ اس ذلت، غلامی اور دردناک مظلومی کی وجہ قومی، نسلی، وطنی، اور مذہبی اختلاف تھا۔ قبطی ایک الگ قومیت اور نسل رکھتے تھے، ان کی قومیت اور نسل دوسری تھی۔ قبطی مصر کے قدیم باشندے تھے، ان کا اصل وطن کنعان (عراق) تھا، اور ابھی چند ہی نسلوں سے یہاں آباد تھے۔ قبطی مشرک اور بُت پرست تھے، یہ اپنے دادا ابراہیم و اسحاق علیہما السّلام کے دین اسلام سے تعلق رکھتے تھے، اگرچہ یہ تعلق صرف نام ہی کا تھا۔ یوں تو یہ لوگ مدت سے قبطی مظالم کی چکی میں پس رہے تھے، مگر جن دنوں حضرت موسیٰ علیہ السّلام پیدا ہوئے یہ مظالم انتہائی بھیانک صورت اختیار کر گئے تھے، جس کی پوری تفصیل توریت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور جس کا ضروری خلاصہ خود قرآن نے بھی یہاں اور اس کے علاوہ دوسرے مختلف مقامات پر بیان فرما دیا ہے۔

حواشی صفحہ ہٰذا) **51** لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر ڈالنے کا حکم عام اس لیے تھا کہ ان کی فوجی طاقت نہ بڑھنے پائے، اور (توریت کے بیان کے مطابق) اس وجہ سے بھی کہ نجومیوں نے فرعون کے سامنے یہ خطرناک پیشین گوئی کی تھی کہ اس سلطنت کا جاہ و جلال ایک اسرائیلی کے ہاتھوں تباہ ہونے والا ہے۔ عورتیں، یعنی بچیاں، اس لیے نہیں قتل کی جاتی تھیں کہ ایک طرف تو ان سے کسی سیاسی انقلاب کا اندیشہ نہ تھا دوسری طرف حکمرانوں کی خدمت اور بیگار کے سلسلہ میں ان کی ضرورت تھی۔

52 "اس" امر کے معنی فرعونی مظالم کی گرفت سے چھٹکارا پالنے کے بھی ہو سکتے ہیں اور خود یہ مظالم بھی، کیوں کہ آزمائش دونوں طرح سے ہوتی ہے، خیر سے بھی اور شر سے بھی۔ کبھی اللہ تعالےٰ افراد اور قوموں کو دولت و اقتدار دیتا ہے تاکہ ان کے جذبۂ شکر کو جانچے کبھی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تاکہ ان کے جذبۂ صبر کو آزمائے، قرینہ سے یہاں پہلا مفہوم زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالےٰ نے ایسے دشمن کے پنجے سے تمہیں نجات دے کر در اصل تمہیں ایک عظیم آزمائش میں ڈالا تھا کہ آیا تم اس کا شکر کس طرح ادا کرتے ہو۔

53 یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب خدا کا حکم آنے پر حضرت موسیٰؑ تمام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے باہر نکل جانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی خاطر شرق کی سمت روانہ ہو گئے، اور سامنے بحرِ احمر کا شمالی حصہ آن حائل ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو فرعون اپنا لشکرِ جرار لیے گرد اڑاتا چلا آ رہا ہے۔ طبعاً پوری قوم پر موت کا اضطراب طاری ہو گیا۔ مگر جس خدا نے یہ طے فرما دیا تھا کہ بنی اسرائیل کی تاریخ غیر معمولی طور پر بدل کر اس کے دن پھیر دیے جائیں گے، اس نے اِس موقع پر، جب کہ کوئی انسانی تدبیر ممکن نظر نہ آتی تھی، اپنے معمولی قوانین کی بجائے غیر معمولی قوانین کو حکم دیا، اور سمندر یکلخت اس طرح پھٹ گیا کہ بیچ میں خشک گذرگاہ نمودار ہو گئی، اور دائیں بائیں پانی کی پہاڑیاں نصب ہو گئیں، حضرت موسیٰؑ مع اپنی پوری قوم کے، خدا کا نام لے کر اس گذرگاہ سے ہوتے ہوئے دوسرے ساحل پر جا پہنچے۔ فرعون نے، جو تعاقب کرتا ہوا اب ساحل پر پہنچ چکا تھا، سمندر کے بیچ سے ایک انسانی گروہ کو گذرتے دیکھ کر خود بھی اپنا گھوڑا ڈال دیا۔ جب پورا لشکر اتر چکا، تو دائیں بائیں کی آبی پہاڑیاں" باہم مل گئیں اور دیکھتے دیکھتے پورا لشکر غائب تھا۔ توریت کا بیان ہے، اور قرآن کے اشارات اس بیان کے حق میں ہیں، کہ جب وقت سمندر کی یہ کیفیت ہوئی، اُس وقت زور کی پُروائی ہوا چلی تھی، جس کے بعد پانی سمٹ گیا اور گذرگاہ پیدا ہو گئی۔ تیز ہواؤں کا چلنا اپنی جگہ مسلّم، مگر اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ یہ کوئی معمولی صورتِ حال نہ تھی، اور نہ محض عادی واقعات کے ماتحت ایسا ہوا۔ بلکہ کھُلے طور پر یہ ایک غیر معمولی اور غیر عادی صورتِ حال تھی، جسے اصطلاح میں "معجزہ" کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی نبی کے ذریعہ کسی واقعہ کا عادی اور عام قوانینِ فطرت کے خلاف ظاہر ہونا، اور اس وجہ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے دوسرے انسانوں کا عاجز رہ جانا۔

اب رہی یہ بات کہ عادی قوانینِ فطرت اور نظامِ عالم کے عام اصول کے خلاف کسی واقعہ کا ظاہر ہونا "عقلِ محدود" کے لیے کچھ ناقابلِ فہم اور ناقابلِ تسلیم سا ہے، تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ "جو عقل" خدا تک کو محض اس لیے ماننے سے انکار کر سکتی ہے کہ وہ اِن مادی آنکھوں سے دکھائی نہیں پڑتا، اس کو قدرتِ خدا کے ان کرشموں پر یقین آنا بھی نہیں چاہیے۔ باقی رہے وہ لوگ جو خدا کو ایک قادرِ مطلق اور حکیم اور مدبر ہستی مانتے ہیں، انھیں یہ بات، کہ فطرت کے عام قوانین اور نظامِ عالم کے عام اصول خدا کے محکوم ہیں اس پر حکومت نہیں کر رہے ہیں، ایسی ہی معقول اور صاف اور سیدھی معلوم دیتی ہے جیسی یہ بات کہ دو اور دو مل کر چار ہوتے ہیں۔ وہ جب آئے دن دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی واقعات عام ضوابط کے خلاف وجود میں آتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ انسانوں اور حیوانوں کی پیدائش تک میں عادی قوانین ٹوٹتے رہتے ہیں، تو پھر اگر وہ خدا، جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، اور جس کے صرف چند ظاہری قوانین و ضوابط ہی سے ہم واقف ہیں، اس عالم کی وسیع مصلحتوں کے پیشِ نظر کوئی بات عام ضوابط کے خلاف ظاہر کر دے تو اس میں کون سا عقلی استحالہ ہے؟ اگر آج کل کے غیر معمولی واقعات اس کارخانۂ عالم کے منظم ہونے پر حرف نہیں لاتے، اور ان کی اس میں سمائی ہو جاتی ہے تو کچھ مزید ندرت رکھنے والے چند واقعات کے ظاہر ہو جانے کو نظمِ کائنات کا مزاج برداشت کرنے سے انکار کیوں کر سکتا ہے؟ یہ بات اس وقت ضرور ناقابلِ فہم تھی جب معجزہ کے معنی یہ ہوتے کہ وہ فطرت کے ان تمام قانونوں کے خلاف ہوتا ہے جو خدا نے مقرر کر رکھے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ)

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝٥١ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٥٢

(یاد کرو وہ وقت) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس دِنوں والا وعدہ کیا تھا، پھر (جب وہ اس وعدے کے مطابق کوہ طور پر حاضر ہوئے تو) تم ان کے پیچھے پیچھے صریح طور پر ظلم کا رویہ اختیار کرتے ہوئے بچھڑے کو اپنا معبود بنا بیٹھے[۱]، لیکن اس پر بھی ہم نے تمہیں (توبہ کر لینے پر) معاف کر دیا اس توقع پر کہ تم (اب تو) شکرگزاری سے کام لوگے۔ (یاد کرو وہ وقت)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہیں، اور جن کا پردۂ غیب کے اس پار اور اُس پار، دونوں طرف دور دورہ ہے، مگر یہاں تو بات صرف اتنی ہے کہ معجزہ صرف اُن قوانین کے خلاف ظاہر ہوتا ہے جو اس عالم کی ظاہری سطح پر موجود ہیں، اور جن سے ہم واقف اور مانوس ہیں، باقی یہ اُن قوانین کے عین مطابق ہوتے ہیں جو اس سطح کے پس پردہ ہیں، اور جن کا عمل اور ظہور کبھی کبھار ہوتا ہے، مدتوں کی خاموشی کے بعد، جب خدا کی حکمت اور مشیت مقتضی ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ تنگ نظر اور تنگ دماغ انسان صفات الٰہی کو اپنے تنگ پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی اس کی ساری جہالتوں کا منبع ہے۔ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے باوجود جب وہ اس کی کائنات کے آثار پر نگاہ ڈالتا ہے تو ظاہر کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی یہ نگاہ غیر ارادی طور پر اسے ایک بے ارادہ، بے حکمت، بے تدبر، بے علم، اور بے تصرف ہستی سے زیادہ کچھ نہیں قرار دیتی، جس کی کوئی آزاد مشیت نہیں، اور جس کی حیثیت اس کائنات کی ایک بے اختیار علت العلل کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن اس خشک اور بے جان تصور خدا کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم نہیں کرتا۔

اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپی سے سُنی جائے گی کہ اب ایسی گیسیں ایجاد ہو رہی ہیں جن سے سمندروں کو پھاڑا جا سکتا ہے۔ یہ خبر کو سن کر شاید لوگوں کو یہ سوچنے کی توفیق ہو کہ عقل انسانی کی قوتوں سے خدا کی قوتیں کم نہیں۔

(حاشیہ صفحہ ھٰذا) [۱] جب تک بنی اسرائیل مصر کی محکومانہ حالت میں تھے، موسیٰ علیہ السلام پر صرف ان ہدایات کی وحی ہوتی رہی جن کا تعلق دین کی بنیادی باتوں سے ہے، مثلاً عقائد ایمانی، اچھے اخلاق اور صبر و نماز وغیرہ۔ مگر جب وہ مصر کی غلامی سے نکل کر آزاد فضا میں آگئے اور اپنی زندگی کا پورا نظم و نسق اُن کے اپنے ہاتھوں میں آیا تب اللہ تعالیٰ نے شریعت، یعنی زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق مفصل احکام و ہدایات نازل فرمائیں۔ اس شریعت یعنی توراۃ کو لینے کے لیے حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر بلایا گیا تھا، اور جب وہ وہاں پہنچے تو چالیس روز تک تمام دُنیا سے منقطع ہو کر اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول رہنے کا حکم دیا گیا، اس کے بعد توریت دی گئی۔ ان کی غیر حاضری میں بنی اسرائیل کی اکثریت نے ایک بچھڑے کی پرستش [illegible]

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى

جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور وہ شے[51] عطا فرمائی تھی جو (حق و باطل کے درمیان) واضح امتیاز کرنے والی تھی، تاکہ تم ہدایت پاؤ (یاد کرو وہ وقت) جب[52] موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "اے میری قوم کے لوگو! تم نے بچھڑے کو اپنا معبود بنا کر یقیناً اپنے اوپر (سخت) ظلم کیا ہے، پس اپنے خالق کے حضور توبہ کرو اور اپنے (اندر کے مجرموں) کو قتل کر[53] ڈالو، اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہاری بھلائی ہے[54]"، چنانچہ (اُس وقت ایسا ہوا تھا کہ تمہاری عفو خواہی پر) اس نے تمہاری توبہ قبول فرمالی۔ بلاشبہ اس کی درگزر اور رحم فرمائی بڑی بے پایاں ہے۔

(یاد کرو وہ وقت) جب[55] تم نے موسیٰ سے کہا تھا کہ "ہم آپ کی بات

---

۵۱ اس "شے" سے مراد کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ توریت ہی کی ایک خاص صفت مراد ہے، یعنی یہ کہ بنی اسرائیل کو توریت کی شکل میں جو کتاب ہدایت دی گئی تھی اس کی خاص اور نمایاں صفت یہ تھی کہ وہ حق و باطل کے درمیان واضح امتیاز کرنے والی تھی، جیسا کہ ہر کتاب الٰہی کا خاصہ رہا ہے۔

۵۲ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب حضرت موسیٰؑ کوہِ طور سے توراۃ لے کر لوٹتے ہیں، اور قوم کی اکثریت کو ایک مصنوعی بچھڑے کی پوجا میں مصروف پاتے ہیں، جو ان کی غیر حاضری میں مختلف دھاتوں کو پگھلا کر ایک خاص انداز سے ڈھالا گیا تھا۔

۵۳ یعنی جن لوگوں نے اس شرک کا ارتکاب کیا ہے انھیں قانونِ شریعت کے مطابق ارتداد کی سزا دی جائے اور قتل کر دیا جائے۔

۵۴ یعنی بظاہر تمہارا اپنے ہی بھائیوں کی گردنیں مارنا کچھ پسندیدہ کام نہیں، اور تمہارے قومی اور برادرانہ جذبات کے لیے ایسا کرنا سخت صبر آزما ہوگا، مگر دین اور خدا پرستی کا مفاد نسل اور قرابت اور برادری سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے، شرک یعنی سب سے بڑے ظلم اور سب سے عظیم گناہ کے بارے میں مداہنت اور نرمی برتنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا پرستی کی جڑ پر کلہاڑا چلا دیا جائے، اور ایک دعوت جس کی بنیاد توحیدِ خالص پر ہے، پروان چڑھنے سے پہلے ہی تباہی کے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ اس لیے دین کا تقاضا ہے کہ اس کام کو انجام دو۔

۵۵ جس وقت حضرت موسیٰ کوہِ طور پر توراۃ لینے گئے تھے، اس وقت حکمِ الٰہی کے مطابق ان کے ہمراہ پوری

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ)

لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ‏ ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ‏٥٢ وَظَلَّلۡنَا عَلَيۡکُمُ

ہرگز نہ مانیں گے، جب تک کہ اللہ کو علانیہ (آپ سے ہم کلام ہوتے) نہ دیکھ لیں" اور (اس گستاخانہ مطالبے پر) تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک زبردست کڑاکے نے تمہیں آلیا تھا۔ پھر اس ہلاکت کے بعد ہم نے تم کو جلا اُٹھایا[۹۱]، شاید کہ (اب آیندہ سے) تم شکر گذاری ختیار کرو۔ اور (سینا[۹۲] کے چٹیل میدان میں) ہم نے تمہارے اوپر بدلیوں[۹۳]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قوم کے ستر منتخب نمایندے بھی تھے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے تورات ان کے سامنے پیش کی، تو اُنہوں نے کہا "یہ ہم کیسے مان لیں کہ خدا آپ سے ہم کلام ہوا، اور اس نے یہ کتاب آپ کو عطا کی ہے، جب تک یہ سارا معاملہ علانیہ اپنی آنکھوں سے ہم نہ دیکھ لیں ہمارا مطمئن ہونا مشکل ہے۔

عقل و بصیرت سے محرومی کی یہ ایک عجیب و غریب مثال ہے، جو بنی اسرائیل کے عوام نے نہیں خواص اور چُنے ہوئے نمایندوں نے پیش کی۔ ایک طرف تو حضرت موسیٰؑ کو نبی بھی تسلیم کر رہے ہیں، دوسری طرف ان کی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں کہ "میں اللہ تعالےٰ سے ہم کلام ہوا، اور اس نے مجھے یہ شریعت عطا فرمائی ہے" مگر ہماری حیرانی کی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس روشنی اور عقلیت کے دور میں بھی ایسے "جاہل عقلاء" کی کمی نہیں جو ایک شخص کو خدا کا پیغمبر بھی مانتے ہیں، مگر ساتھ ہی اس کی کتنی ہی تعلیمات کو غلط، دوراز کار، غیر عملی، غیر منطقی، اور نہ جانے کیا سمجھتے، اور بسا اوقات زبانوں سے کہہ بھی دیتے ہیں۔

حواشی صفحہ ہٰذا) ۹۱ ہو سکتا ہے کہ وہ بجلی گرنے سے بالکل ہی مردہ ہو گئے ہوں، اور اللہ تعالےٰ نے دوبارہ ان میں جان ڈال دی ہو، اور یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کی تاریخ کے غیر معمولی اور غیر عادی واقعات میں سے ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بجلی کے اثر سے صرف بے ہوش ہو کر گر گئے ہوں اور پھر افاقہ ہونے پر اُٹھ کھڑے ہوں، مگر اس شکل میں بھی واقعہ کے اندر ایک قسم کا انوکھاپن صاف جھلک رہا ہے۔

۹۲ فلسطین کے شمال مغرب میں بحر احمر کی طرف جو جزیرہ نما نظر آتا ہے، اُس کو جزیرہ نمائے سینا کہتے ہیں، کوہِ طور، جہاں حضرت موسیٰؑ کو نبوت اور کتاب عطا کی گئی تھی، اسی جزیرہ نما میں ہے۔ اس کا میدانی علاقہ وادی سینا کہلاتا ہے۔ سمندر پار کر کے بنی اسرائیل اسی میدان میں ٹھیرے تھے۔

۹۳ کھلے ہوئے میدان میں دھوپ کی تپش سے بچنے کی کوئی شکل نہ تھی، علاقہ چٹیل تھا، بڑے درخت تک موجود نہ تھے جن کے نیچے پناہ لی جائے۔ اس پر رحمتِ الٰہی کے حکم سے مان سون کا رُخ پھرا اور خلافِ معمول بدلیاں آکر چھا گئیں، جنہوں نے دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے شامیانوں کا کام دیا۔

اَلْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

کا سایہ کیا، منؐ و سلویٰؐ اُتاراؐ، اور (یہ فرمادیا کہ) تمہاری دی ہوئی ستھری روزی کھاؤ"۔۔۔۔۔ مگر (اس پر بھی کفرانِ نعمت کا جو رویہ اختیار کیا گیا وہ) کچھ ہم پر ظلم نہ تھا بلکہ دراصل یہ لوگؐ آپ اپنے ہی اوپر ظلم کر رہے تھے۔

---

۵۱ منّ یعنی ترنجبین، یہ ایک قسم کا میٹھا اور خوش ذائقہ شیرہ تھا جو شبنم کی طرح فضا سے گرتا ہوا گھاس کے پتوں پر آ پڑتا تھا اور پھر جم جاتا تھا۔

۵۲ سلویٰ۔ ایک قسم کا پرندہ، قریب قریب بٹیر جیسا۔

۵۳ "اُتارا" کا لفظ بتاتا ہے کہ ان چیزوں کی فراہمی بھی قدرت کے خاص اہتمام سے ہوئی تھی۔ اصل یہ ہے کہ انسانوں کی پرورش اور دیکھ بھال قدرت بالکل اسی طرح کرتی رہی ہے جس طرح والدین اپنے بچوں کی کیا کرتے ہیں، جب تک بچے اپنے قویٰ کے اعتبار سے ایسے نہیں ہوتے کہ وہ اپنے کام خود انجام دے سکیں، اس وقت تک والدین ان کی ہر طرح کی کفالت کرتے ہیں، حتیٰ کہ لقمے بنا کر ان کے منہ میں ڈالتے، اور انگلیاں پکڑ کر چلاتے ہیں اسی طرح قدرت بھی اپنے بچوں کا اس حد تک خود ہی اہتمام کرتی ہے جس حد تک وہ ان کو بےبس اور بے تدبیر پاتی ہے، اور جس قدر وہ اپنی قوتوں اور تدبیروں سے اپنی حاجت برآری کرنے پر خود قادر ہوتا ہے، اس حد تک وہ اس کو خود اپنے اوپر چھوڑ دیتی ہے۔ پس ہزارہا، ہزار کا گروہ جب ایک بے آب و گیاہ صحرا میں یکایک آن ٹھیرا اور وہ بھی بالکل بے سروسامانی کے عالم میں، تو رہنے سہنے اور کھانے پینے کی ابتدائی اور ناگزیر ضرورتوں کا اہتمام قدرت کو کرنا ہی تھا۔

اس واقعہ پر ایک اور پہلو سے نگاہ ڈالیے تو اس کے اندر سے اللہ ربّ العالمین کے دستورِ کرم کی ایک ایسی نوعیت نمودار ہوگی جس کا احساس دلوں کو زندگی سے معمور کر دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ذاریات میں فرمایا ہے کہ "انسان کا کام میری بندگی کرنا ہے اور اس کی روزی فراہم کرنے کا بار مجھ پر ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی افکار کا مرکز اللہ کی بندگی اور رضا جوئی ہونی چاہیے، نہ کہ معاشی ضروریات و مادّی ذرائع کی فراہمی۔ یہ کام دراصل دُنیا کے پالن ہار کا ہے کہ اپنی چاکری کے کاموں میں مشغول بندوں کو روزی مہیا کرے۔ پس جو شخص یا گروہ خدا کی رضا جوئی میں جس حد تک منہمک ہوگا مخلوق کا پالنے والا روزی کمانے کی ذمہ داریاں اسی حد تک اس پر سے ساقط کر دے گا، یہاں تک کہ اس سلسلے میں روزی حاصل ہونے کے عام اسباب کا پردہ بھی بیچ سے اٹھایا جا سکتا ہے، جس کی واضح مثال یہ منّ و سلویٰ کا نزول ہے۔

۵۴ یہ "لوگ" کے بجائے بظاہر "تم لوگ" کہنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ مخاطب کو غائب کر دیا گیا تا کہ انتہائی نفرت کا اظہار ہو جائے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ

(یاد کرو وہ وقت) جب ہم نے کہا تھا کہ "اس بستی[51] میں (فاتحانہ) داخل ہو جاؤ اور اس (کی نعمتوں میں) سے (جو چاہو اور) جہاں چاہو بفراغت کھاؤ (پیو)، مگر (بستی کے) دروازے میں داخل ہوتے وقت تمہارے سر (اللہ کے سامنے) جھکے[52] ہونے چاہئیں، اور تمہیں یہ کہتے جانا چاہیے کہ "خدایا! ہمارے گناہوں کو معاف فرما" تو ہم (نہ صرف یہ کہ) تمہاری خطاؤں سے درگزر کریں گے، بلکہ (ان ہدایات کو) بحسن و خوبی انجام دینے والوں پر مزید نوازشیں کریں گے"۔ مگر پھر (ہوا یہ کہ) ان ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی، بدل کر کچھ اور ہی کر دیا۔ انجام کار ان ظلم کرنے والوں پر ہم نے آسمان سے عذاب نازل کیا، اس لیے کہ نافرمانی ان کا شیوہ ہو چکی تھی۔

(یاد کرو وہ وقت) جب[53] موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی درخواست کی تھی اور ہم نے کہا تھا کہ "اپنی لٹھیا فلاں چٹان پر مار" چنانچہ

---

[51] یہ واقعہ حضرت موسیٰ کے انتقال کے بعد کا ہے۔ سینا کے میدان سے آگے بڑھ کر بنی اسرائیل مُواب کے سیدانی علاقے میں پہنچے، جو بحرِ مُردار کے مشرق میں واقع ہے۔ پھر وہاں سے انھوں نے اپنے آبائی وطن کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس موقع پر ان کے سامنے شِطّیم وغیرہ شرقِ اردن کی بستیاں تھیں، اور دوسری طرف دریائے اُردن کے مغرب میں اَریحا یا یَریحُو نامی بستی تھی، اِن ہی میں سے کوئی شہر تھا جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ چونکہ قرآن تاریخی واقعات کے صرف اخلاقی پہلو ہی سے بحث کرتا ہے اس لیے ایسی تفصیلات میں نہیں جاتا جس کی حیثیت نِری تاریخی تحقیق کی ہو۔ ویسے جو یہود مخاطب تھے، ان کے لیے اتنے اشارے کافی تھے۔ اس لیے کہ یہ ان کی قومی تاریخ کے نہایت نمایاں اور مشہور واقعات تھے۔

[52] یعنی عام فاتح قوموں کی طرح اکڑتے ہوئے متکبرانہ انداز میں، اخلاقی ضوابط سے آزاد ہو کر نہ داخل ہو، بلکہ شرافت، سنجیدگی اور خاکساری کے پتلے بن کر داخل ہو، مغرورانہ نعروں کی بجائے تمہاری زبان پر شکر اور استغفار کے کلمے ہوں، اور تمہارے دل اللہ کی اس نعمت کے احساسِ قدر میں ڈوبے ہوئے ہوں کہ صدیوں کی غلامی اور پھر برسوں جنگلوں اور میدانوں کی خاک چھاننے کے بعد تمہیں یہ دن نصیب ہو رہے ہیں۔

[53] یہ بھی صحرائے سینا ہی کا واقعہ ہے۔ سایہ اور غذا کی طرح پانی کا بھی وہاں کال تھا۔

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ "

(لٹھیا کا مارنا تھا کہ) اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے[۵۱] اور ہر گروہ کو یہ معلوم (بھی) ہوگیا کہ اس کے پانی لینے کی جگہ کون سی ہے۔ (اس وقت تمہیں فہمایش کر دی گئی تھی کہ) اللہ کی بخشی ہوئی روزی کھاؤ پیو، اور اس کی زمین میں فساد انگیزی سے پرہیز کرو۔"

---

۵۱ یہ اور غذا کی طرح پانی کا بھی غیر معمولی طور سے انتظام کیا گیا۔ بالکل معجزہ کے طور پر چٹان کا سینہ چاک ہوا اور پانی ابل پڑا، اور اس انداز سے ابلا، کہ اگر بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے، تو چشمے بھی بارہ ہی پھوٹے، تاکہ پانی کی یہ تقسیم بھی خدا ہی کی طرف سے ہو جائے۔

سیاحوں کا بیان ہے کہ یہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے اور اس میں شگاف بھی پائے جاتے ہیں۔

یہ قوم اتنی لمبی غلامی کے خراب ماحول سے نکل کر آئی تھی اس نے اس کے اندر بلند نظری، خود داری، ہمت اور یقین کا مشکل ہی کوئی شمہ باقی چھوڑا تھا، اور اب اسے ایک اونچے نصب العین کی خدمت و علم برداری کے لیے منتخب کیا جا رہا تھا، اس لیے اس کو اس نئی زندگی کے ابتدائی ایام میں بالقصد ایسے حالات اور واقعات سے گذارا گیا جن میں وہ اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائیوں اور نصرتوں کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کرلے، تاکہ ایک طرف تو اس کے اندر جذبۂ شکر بیدار ہو، جو ایمان کی اصل ہے، اور دوسری طرف آنے والے زمانوں میں جب کہ خدا پرستی کی راہ میں مشکلیں اور مزاحمتیں پیش آئیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی دستگیریوں پر بھروسہ رکھ سکے۔ ورنہ یہ بات بالکل ممکن تھی کہ اسے مصر سے بچ نکلنے کا کوئی اور راستہ بتایا جاتا، مثلاً ذرا اور شمال کا راستہ، جہاں اب نہر سویز موجود ہے، مگر اس وقت وہاں خشکی تھی۔ (چنانچہ حضرت موسیٰ جب نبی ہونے سے پہلے مصر سے بھاگ کر مدین گئے، اور پھر واپس آئے تھے، تو اسی طرف سے جانا آنا ہوا تھا) اسی طرح وادی سینا میں قیام کرانے کی بجائے انہیں سفر جاری رکھنے کا اور کسی آباد علاقہ میں جا ٹھیرنے کا حکم دیا جاتا، مگر ایسا نہیں ہوا جس کا سبب کوئی اتفاق نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی پہلے سے ایک مقررہ اسکیم کے ماتحت ایسا ہوا۔

تا ایں جا پھر ان حیرت انگیز اور غیر عادی واقعات میں سے بعض کا حضرت موسیٰؑ کے توسط سے ظہور میں آنا، مثلاً ان کی لٹھیا کی ضرب کے بعد سمندر یا چٹان کا پھٹنا، دراصل اسی مصلحت اور اسکیم کا تتمہ تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل کے دل میں خدا کی معرفت و عنایت کا یقین پیدا کرنے کے ساتھ ہی اپنے پیغمبر اور رہنما کی صداقت و عظمت کا احساس بھی زندہ رکھنا منظور تھا، تاکہ وہ ان الٰہی کے احکام کی اطاعت کر سکیں۔

۵۲ یہاں گروہ سے مراد قبیلہ ہے، حضرت یعقوب (اسرائیل) کے بارہ لڑکے تھے، بنی اسرائیل ان ہی کی اولاد تھے اور ہر ایک کی اولاد ایک مستقل قبیلہ بن گئی تھی۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ

اور (یاد کرو وہ وقت) جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰ! ہم برابر ایک ہی طرح[51] کا کھانا کھا کر نہیں رہ سکتے، لہٰذا اپنے رب سے دُعا کیجئے کہ ہمارے لیے زمین کی پیداواریں ——— ترکاری، ککڑی، گیہوں، مسور، پیاز (وغیرہ[52]) ——— مہیا فرما دے"، تو موسیٰ نے جواب دیا تھا کہ "کیا تم ایک بہتر چیز کو ادنیٰ شے سے بدلنا چاہتے ہو؟[53] اچھا، کسی شہر میں جا رہو، تمہیں جو کچھ مطلوب ہے، وہاں مل جائے گا۔" (بالآخر[54] ان کا حشر یہ ہوا کہ) پستی اور بدحالی ان پر مسلط کر دی گئی، اور وہ غضب خداوندی میں گھر کر رہ گئے۔ اس لیے کہ اللہ کی

---

۵۱ یعنی صرف من و سلویٰ، جو مل تو جاتا ہے بلا محنت اور بفراغت، مگر ایک ہی چیز کھاتے کھاتے طبیعت اُکتا گئی اور زبان سیٹھی ہو گئی ہے۔

۵۲ یعنی وہ بہت ساری الگ الگ مزے والی اور علٰحدہ علٰحدہ چٹخارے والی چیزیں، جو ہم مصر (جیسے زرعی ملک) میں کھایا کرتے تھے۔

۵۳ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ من و سلویٰ جیسی مزے دار اور بلا مشقت حاصل ہونے والی چیزوں کو چھوڑ کر ایسی چیزیں مانگ رہے ہو جو کم لذیذ ہیں، یا پسینہ بہانے کے بعد ہی مل سکتی ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی انتظام تمہیں فکرِ معاش سے آزاد کیے ہوئے ہے، ان حالات میں تمہیں اس کا ممنونِ کرم ہوتے ہوئے دُعا کرتے رہنا چاہیے تھا کہ پروردگار! کرم کی یہ نگاہ یوں ہی باقی رہے تاکہ ہم ان مادی ضروریات کی فکر سے آزاد ہو کر اپنی زندگی کے اصل مقصد کے حصول میں پوری طرح مشغول رہیں، اور ہمارا کام اس کے سوا اور کچھ نہ رہ جائے کہ ایک طرف تو تیرے پیغمبر کے فیضِ تربیت سے فائدہ اُٹھا کر اپنا دل پاک کریں، اپنے اخلاق سدھاریں، دینِ اللہ کی معرفت بڑھائیں، اور اچھے اعمال کا نمونہ بن جائیں، دوسری طرف تیرے نورِ ہدایت کو لے کر آگے بڑھیں اور کفر و شرک سے تاریک فضاؤں میں اسے پھیلا دیں ——— پر افسوس ہے تمہاری پست نگاہی پر، کہ بچوں کی طرح زبان کے چٹخاروں پر ریجھے جا رہے ہو۔ لذت پرستی کی ذلیل ذہنیت نے تمہیں زندگی کے پاک اور اصل مقصد سے اس درجہ بیگانہ کر رکھا ہے!

۵۴ یہ جو آگے ان کا انجام بد بیان کیا جا رہا ہے وہ صرف اُس ایک غلط کاری کا نتیجہ نہیں ہے جو متصلاً ابھی اوپر بیان ہوئی، بلکہ اس کا تعلق ان کی اس پوری تاریخ تمرد سے ہے جس کے خاص خاص واقعات کا اجمالی ذکر اوپر کئی آیتوں سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان اور بے نظیر احسانات، اور پھر ان کے مقابل بنی اسرائیل کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ)

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

آیتوں[51] کا انکار، اور اس کے پیغمبروں کا قتل ناحق[52] ان کا وتیرہ سا ہو گیا تھا، اور یہ (طرزِ عمل) نتیجہ[53] تھا ان کے مسلسل نافرمانیاں کرنے اور حد سے آگے بڑھتے رہنے کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) غیر معمولی ناشکری اور بے مثال سرکشی، دونوں چیزیں بالکل ساتھ ساتھ بیان کر دی گئی ہیں تاکہ ان کے دعاوی کے مقابلہ میں ان کی صحیح تصویر سامنے آجائے، اور ان پر واضح ہو جائے کہ تمہاری موجودہ ذلت تو وہ بالکل وہی چیز ہے جس کا تم نے اپنے عمل کی زبان سے مطالبہ کیا تھا تم نے جب خدا کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کی یوں دھجیاں اڑائیں کہ اللہ کی ان بندوں کی بات ٹک لینے سے دریغ نہیں کیا جو تم کو یہ عہد یاد دلانے آئے تھے، تو اس نے بھی اپنے دستور کے مطابق تمہیں غلامی اور بے کسی کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔

(حواشی صفحہ ھذا) [51] اللہ تعالیٰ کی آیات سے انکار کا مطلب زبان کا انکار نہیں بلکہ عمل کا انکار ہے، اس انکار کی مختلف صورتیں تھیں، جو یہ یہودی اختیار کرتے رہے ہیں۔ کبھی تو ان احکام تورات کو جنھیں اپنی خواہشوں کے خلاف پاتے پس پشت ڈال دیتے۔ کبھی الفاظ خداوندی کی حقیقت کو جاننے کے باوجود انھیں توڑ مروڑ کر اپنی دنیوی غرض اور ضرورت کے مطابق ان کی تاویل کر لیتے، کبھی اس غرض کے لیے آیتوں کے الفاظ کی ترتیب بدل دیتے، اور کبھی انھیں کتابِ الٰہی سے نکال ہی دیتے۔

[52] مثلاً حضرت یسعیاہ، حضرت یرمیاہ، حضرت زکریا، اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کو قتل کر ڈالا، اور حضرت عیسیٰ کو بھی شہید کرا دینے کی سازش اور کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، صرف اس جرم کی پاداش میں کہ ان بندگانِ حق نے انھیں صحیح عقائد اور صالح اعمال اختیار کرنے کی تلقین کی تھی اور جس تورات کو وہ اپنی کتاب کہتے تھے، اس کے احکام پر پورا پورا عمل کرنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنی زندگیاں سنوار لینے کی فہمائش کی تھی۔

[53] یہ اشارہ ہے اس قانونِ الٰہی کی طرف کہ ہر نیکی اپنے سے بڑی نیکی، اور ہر برائی اپنے سے بڑی برائی کے لیے انسان کو تیار کرتی ہے، بشرطیکہ انسان کو اس برائی کے بعد تنبیہ ہو اور اپنی اس حرکت پر نفرت کا احساس نہ ہو۔ پھر یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور بتدریج انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ بس برائیوں ہی کا ہو رہتا ہے، نظر مادی، دل تاریک، اور عمل سیاہ اس وقت وہ ہر برائی اور ہر شیطنت انجام دے سکتا ہے، حتیٰ کہ خدا کے انبیا تک کو، انھیں نبی جانتے پہچانتے، خاک و خون میں تڑپا سکتا ہے یہی حقیقت ہے جو اس مشہور حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ "جب انسان ایک برائی کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے، پھر جب دوسری برائی کرتا ہے تو ایک اور نقطہ پڑ جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ بالکل سیاہ ہو جاتا ہے۔" پس ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ جن بزرگوں کو ہم اندھ

صفحہ ۸ کی آخری سطریں: وہ اگر [illegible] اس وقت یہاں [illegible] آ رہا تھا [illegible]

(مقالات)

اساسِ دین کی تعمیر

(۷)

(۳) نماز

مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی

نماز کی اہمیت کے دو خاص پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والی آیتیں گذشتہ صحبت میں ہم نقل کر چکے ہیں اب اُس سلسلہ کی چند مزید آیات پر غور کیجئے۔

(۳) قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا۔ (اعراف۔ ۱۲۸)

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا "مدد لو اللہ سے اور صبر کی راہ اختیار کرو۔"

اس آیت کو آیت ذیل کے ساتھ پڑھیے۔

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ)

اور (اے بنی اسرائیل!) صبر اور نماز کے ذریعہ (اللہ سے) مدد لو۔

صاف معلوم ہوگا کہ ایک ہی بات ہے جو دونوں آیتوں میں کہی گئی ہے، مگر الفاظ کا فرق ہے، اور فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس جگہ "اللہ" کا لفظ ہے، اس جگہ دوسری آیت میں "صلوٰۃ" کا لفظ ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ قرآن محض الفاظ اور اسالیب کے بدلنے سے تغیر کے ذریعے بڑے بڑے اہم نکاتِ حکمت بیان کر جاتا ہے وہ اس اختلافِ الفاظ کو بلا وجہ نہیں قرار دے سکتے، وہ محسوس کریں گے کہ اس اختلاف کے اندر کوئی نہ کوئی حکمت دین ضرور مخفی ہے، اور یہ حکمتِ دین اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ نماز اللہ کی قربت بلکہ معیت کا نام ہے، جبھی ایسا ہوا کہ لفظ "صلوٰۃ" لفظ "اللہ" کا، یا لفظ "اللہ" لفظ "صلوٰۃ" کا قائم مقام بن گیا، اور اختلاف الفاظ کے باوجود بات ایک ہی رہی۔

یہ بات کہ نماز اللہ تعالےٰ کے قرب کا نام ہے، بہت کھلی ہوئی ہے۔ خود لفظ "صلوٰۃ" کا لغوی مفہوم اس

کا شاہد ہے، پھر آیات واحادیث میں اس کی کتنی ہی وضاحتیں موجود ہیں۔ سورہ علق کے آخری الفاظ اس باب میں بالکل حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں:۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ — (اپنے رب کو) سجدہ کر اور اس کے قریب ہوجا۔

پھر کسی ہستی کا قرب اس کی معیت کا پیش خیمہ ہے، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قرب جب اپنے نقطۂ عروج پر جا پہنچتا ہے تو معیت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نماز کے بارے میں حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:۔

فان العبد یناجی ربہ — نماز کے اندر بندہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔

اور پھر یہ کہ:۔

ما یزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی بہ یسمع وبصرہ الذی بہ یبصر ویدہ التی بہا یبطش۔ — بندہ ادائے نوافل کے ذریعہ برابر میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب قرار دے لیتا ہوں اور جب ایسا ہوجاتا ہے تو میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔

یہ الفاظ کسی بھی تفصیل اور تاویل سے بے نیاز ہیں اور نماز کے مقام کی تعیین میں بالکل واضح۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ دوسری حدیث میں نماز کا لفظ نہیں ہے، بلکہ "نوافل" کا لفظ ہے۔ اور نوافل جس طرح نماز کے ہوتے ہیں اسی طرح دوسری عبادات میں بھی ہوتے ہیں، مگر اس حقیقت کے تسلیم شدہ ہونے کے باوجود اس امر میں شاید دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ "نوافل" کا اطلاق اول نوافلِ نماز ہی پر ہوتا ہے، دوسری عبادات کے نوافل پر اس کا اطلاق اگر ہوتا ہے تو ثانوی درجہ ہی میں ہوتا ہے۔

(۴) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ الخ — اے ایمان لانے والو! (راہِ حق میں پیش آنے والی مشکلات کے مقابلہ میں) صبر اور نماز سے مدد لو۔

گویا اِن مصائب و آلام کا مقابلہ جن سے خدا پرستی اور طاعت و اشاعتِ حق کے دلدادوں کا دوچار ہونا سنت الٰہی کے مطابق بہرحال ضروری ہے، صرف صبر اور نماز سے کیا جاسکتا ہے۔ صبر کے متعلق پہلے ہم اجمالاً یہ عرض کرچکے ہیں، اور آگے اس اجمال کی تفصیل بھی آئے گی کہ وہ کوئی مستقل بالذات شے نہیں، بلکہ دراصل وہ نماز ہی کا ثمرہ ہے، اس لیے عملاً استقامت علی الحق کا دارومدار صرف نماز پر آن ٹھیرتا ہے۔ قرآن کے اوراق اس مفہوم کی آیتوں سے بھرے پڑے ہیں اور راہِ حق میں پیش آنے والی ہمت شکن مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اتباع کو حمد و تسبیح اور ذکر و نماز کی تلقین اتنی صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ اس سے زیادہ صراحت ممکن نہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت پر کس طرح عمل کیا، اس کا اندازہ اس مشہور روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ کو کوئی بات غمگین اور متفکر کرتی تو آپ نماز پڑھنے کھڑے ہوجاتے (اذا ھمہٗ امر صلّی) گویا یہ نماز وہ دوائے شفا تھی جو نہ صرف دعوت و تبلیغ کی راہ میں پیش آنے والے افکار کو نابود کر دینے والی تھی، بلکہ دل کی ہر پریشانی کو سکون میں بدل دینے والی تھی۔

یہ طاقت نماز میں کہاں سے اور کیوں کر آتی ہے؟ اگر اوپر کی گذارشیں ذہن میں محفوظ ہوں تو اس سوال کا جواب چنداں دشوار نہیں۔ جب نماز اللہ کی معیت کا نام ہے تو غور کیجئے جس کے ساتھ اللہ ہو اسے زیر کرنے کی راہ افکار و مصائب کہاں سے پا سکتے ہیں۔

کبھی آپ نے برف خانے میں جانے کے بعد گرمی کی شدت محسوس کی ہے؟ اگر نہیں تو خنکیوں کے سرچشمہ پر سوزش آلام کا کیا گذر۔ اللہ کی معیت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ دل سکون و طمانیت کی دولت سے مالا مال ہو، اور خوف و حزن کا دور دور تک نام و نشان نہ ہو۔ غار ثور کے اندر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے طبعی اضطراب کو دیکھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ بات فرمائی تھی کہ "لَا تَحْزَنْ (غمگین نہ ہو)" تو اس کی وجہ یہی فرمائی تھی کہ "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا (اللہ ہمارے ساتھ ہے)" اسی طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حکم ہوا کہ مخالفتوں کے طوفان میں بھی اپنی جگہ سے بال برابر نہ ہٹیں اور مضبوطی سے اپنے مقام پر جمے رہیں تو جہاں یہ الفاظ فرمائے گئے کہ "وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ (اپنے رب کے حکم پر ثابت قدم رہو)" وہیں یہ صدائے جاں نواز بھی آئی کہ "فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا (اس لیے کہ تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو)" اللہ رب العالمین کی نگاہوں میں ہونا اور اس کے قریب ہونا ایک ہی حقیقت کی دو مختلف تعبیریں ہیں۔ پس اس ارشاد خداوندی سے یہ راز منکشف ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں طمانیت ہی طمانیت ہے۔ اور یہ قرب حاصل جس شے سے ہوتا ہے وہ نماز اور صرف نماز ہے، چنانچہ فوراً ہی بعد یہ الفاظ آتے ہیں کہ "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَمِنَ اللَّیْلِ فَسَبِّحْہُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (اور اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی تسبیح کیا کرو اس وقت جب کہ تم اٹھتے ہو اور رات کے اوقات میں بھی اس کی تسبیح کرتے رہو اور ستاروں کے جھک جانے کے بعد۔ (سورہ نجم) گویا اللہ رب العزۃ کی پناہ حاصل کرنے کا ذریعہ اس کی حمد و تسبیح، یا دوسرے لفظوں میں نماز ہے۔

(۵) لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (حج - ۱۰) — تاکہ پیغمبر تم پر (حق کا) گواہ ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے سامنے اس حق کے گواہ بنو، پس نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین حق کی شہادت اور علم برداری کا وہ فرض گراں جس کی ادائگی امت مسلمہ

کا تنہا مقصد وجود ہے، اسی وقت سرانجام پا سکتا ہے جب کہ نماز اور زکوٰۃ کی ٹھیک ٹھیک ادائگی ہوتی رہے، اور اگر اُمت اپنے اس فرض کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دینا اور برقرار رکھنا چاہتی ہے تو جو کام اسے سب سے اول اور سب سے آخر کرنا ہے وہ اقامتِ نماز اور ادائے زکوٰۃ ہے، یہی وہ شاہ راہ ہے جو شہادتِ حق کی منزل مقصود تک پہونچتی ہے، قدم اس صراطِ مستقیم سے اگر ذرا ہٹے، تو دُنیا کے ہر مقصود تک رسائی ہو سکتی ہے مگر جس مقصود کا نام شہادتِ حق ہے اُس تک رسائی ہر امکان سے ناآشنا ہے۔

آیت زیرِ بحث میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، مگر اس سے شہادتِ حق کے باب میں نماز کے مدار ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ ایک تو نماز کے ذکر کو زکوٰۃ پر مقدم رکھا گیا ہے، جو اس کی اولیت اور بنیادی اہمیت پر دلالت کرتا ہے، دوسرے زکوٰۃ اپنی حقیقت کے اعتبار سے دراصل نماز ہی کا فیضان ہے کیونکہ زکوٰۃ کی بنیاد عدل اور احسان پر ہے اور نماز ہی عدل و احسان کا اصل معلم ہے۔ پھر اس کے علاوہ، اوپر سطروں میں یہ رازِ حقیقت بھی واشگاف کیا جا چکا ہے کہ ایک زکوٰۃ ہی پر کیا منحصر ہے، شریعت کے سارے ہی احکام کا سرعنوان، ان کے وجود کا سرچشمہ اور ان کا محافظ صرف نماز ہے، بلکہ دہی پوری شریعت کی قائم مقام ہے۔

(۶) وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۗ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۗ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ .... لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ الخ (مائدہ - ۱۳)

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے (اپنی بندگی کا) عہد لیا تھا اور ہم نے ان میں سے ان کے اندر بارہ نقیب مقرر کیے، اور اللہ نے اعلان فرما دیا تھا تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم رکھوگے .... تو میں تمہاری بُرائیوں کو جھاڑ دونگا اور باغوں میں داخل کروں گا۔ الخ

گذشتہ آیت میں اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا یہ قانون بتایا گیا تھا کہ خدا پرستی، دین کی علمبرداری اور حق کی شہادت کا تمام تر دارو مدار نماز کی اقامت پر ہے تو یہ آیت ایک قدم اور آگے بڑھ کر ہمیں اس تو ام قانون خداوندی سے باخبر کرتی ہے کہ اس کڑی مہم کے سر کرنے میں نصرت غیبی جن چیزوں سے حاصل ہوتی ہے ان میں سرفہرست نماز ہے، پس نماز کی اقامت کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ شہادتِ حق کی بھاری ذمہ داری اُٹھانے کی قوت اور صلاحیت اسی سرچشمہ سے ملتی ہے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ میدانِ جدوجہد میں اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اس عظیم فرض کو انجام دے رہے ہوں۔

یہ ہیں اہمیتِ نماز کے چند بہت نمایاں پہلو جو آیاتِ قرآن کی روشنی میں ہر صاحبِ نظر کو بادنیٰ تامل دکھائی دے سکتے ہیں۔ اگر آپ قرآن کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کر جائیں کہ اس نے نماز کی ضرورت، اہمیت،

افادیت اور تاثیر کے کتنے پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں تو شاید ان کا شمار بھی آپ کے لیے مشکل ہوگا اور اس کی عظمتوں کا اندازہ کرتے ہوئے آپ کا ذہن تھک تھک جائے گا۔ مگر ہم اتنے ہی پہلوؤں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، اس لیے کہ اصولی اور بنیادی طور پر ان کی حیثیت دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے، یعنی باقی دوسرے پہلو قریب قریب سب کے سب ان ہی کی شرح و تفصیل ہیں، اس لیے اہمیت نماز کے اجمالی مگر کلی تعارف کے لیے بھی چند پہلو بڑی حد تک کفایت کرتے ہیں۔

تحریک اسلامی کا انقلابی طریق کار

شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار کی روشنی میں

انور اعظمی

ہر تحریک ان خرابیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے اٹھتی ہے جو سماج کے اندر بگاڑ کا سبب بنتی ہیں۔ انسان چونکہ طبعی طور پر فساد اور بگاڑ سے ہمیشہ متنفر رہا ہے، اس لیے وہ تحریکیں بھی جو خالص مادی کہی جاتی ہیں، اپنے مقصود کے اعتبار سے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی ہیں کہ سماج کے اندر جو فساد گھس آیا ہے اور معاشرے کے افراد جن اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ انھیں حسب توفیق خارج کرنے کی کوشش کی جائے، یہاں تک اشتراکیت بھی جو مادہ پرستانہ رجحان کی خالص شکل سمجھی جاتی ہے، اور جس کا سارا فلسفہ ہی انسان کے حیوانی وجود کے گرد چکر لگاتا ہے، اس کی بھی ساری جد و جہد اس معاشی فساد کو مٹا دینے کے جذبہ پر منحصر ہے، جس نے سماج کو ظالم اور مظلوم دو طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تحریک سر سے لے کر پیر تک مادیت میں ڈوبی ہوئی ہے اور اس کا فلسفہ زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں سے صرف معاشیات ہی سے بحث کرتا ہے۔ یہ کوتاہ نظری صرف اشتراکیت ہی کا حصہ نہیں ہے، بلکہ یورپ کے مفکرین کی یہ مخصوص روش ہی ہے کہ وہ زندگی پر کبھی بحیثیت ایک کل کے بحث ہی نہیں کرتے، بلکہ پہلے زندگی کو کئی حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، اس کے بعد کسی ایسے جز پر اپنے افکار کی بنیاد رکھتے ہیں، جس کو اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے "کل" زندگی سمجھے ہوئے ہوتے ہیں، اس کا انجام ہمیشہ انسانیت کے حق میں بہت خطرناک ثابت ہوا، چنانچہ جس نے انسانی زندگی میں حریت پسندی کے داعیات کو اپنا موضوع فکر بنایا، اس نے انفرادی زندگی کا صور اتنے زور سے پھونکا کہ اجتماعیت کی آواز محض صدائے بلبل بن کر رہ گئی۔ جس نے اجتماعیات پر سارا زور فکر صرف کیا، اس نے انفرادی آزادی کو اتنے سخت اور بے رحم شکنجہ میں کس دیا کہ فردیت کی ہڈی بھی ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئی، غرض جس دماغ نے زندگی

سے جس جزء پر اپنی قابلیت صرف کی اس نے اس کی پوری کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح اس کو کل زندگی کی حیثیت دے کر باقی اور تمام پہلوؤں کو اس کے گرد گھما دیا جائے۔ یہ محض فکری نقطۂ آغاز کی نادرستگی کی وجہ سے ہے ورنہ یورپ کی فکری تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس کو جس چیز نے اس کارِ عظیم پر آمادہ کیا وہ محض سوسائٹی کی اصلاح کا جذبہ تھا۔

اسی وجہ سے مغربی تحریکیں یا ایسی تحریکات جو سماج اور فرد کے تفصیلی مطالعہ پر قابو نہیں پا سکیں، ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں اصلاح سے زیادہ فساد کا سبب بن گئیں، چونکہ ایسی انقلابی تحریکات خام فکر کی پیداوار ہوتی ہیں اور زندگی کے کسی ایک جزء کے بگاڑ کی وجہ سے پوری زندگی کو قابل اصلاح و نشترزنی سمجھ لیتی ہیں اس لیے ان کو اپنا ماحول ایسا دشمن نظر آنے لگتا ہے جس کے اندر شر کے علاوہ خیر کا کوئی پہلو نظر ہی نہیں آتا۔ یہ سماج کے اندر کسی ایسی صفت کا قائل ہی نہیں ہوتی ہیں جس کو سراہا یا باقی رکھا جا سکے۔ ایسی انقلاب پسند جماعتیں ہمیشہ انتقامی جذبات کے چنگل میں بے بس ہوتی ہیں اور جب یہ جمہوری شعور کے ساتھ اٹھتی ہیں تو سوسائٹی کے اندر ایک کہرام مچ جاتا ہے، ایک انبوہ ظلم و ستم ان کے جلو میں چلتا ہے، سفاکی کی مہیب دیوی ان کے آگے آگے "دور باش" چلاتی ہوئی دوڑتی ہے اور صحیح معنوں میں انسانیت کا قافلہ ایک دریائے خون کو پار کر کے اس منزل تک پہونچتا ہے، جہاں تک یہ تحریکیں لے جانا چاہتی ہیں۔

اس خونی انقلاب کے بعد جب انسانیت اپنا سفر نئے راستے پر شروع کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ کا رخ ہی نہیں بدلا ہے، بلکہ قافلہ کی ایک ایک چیز بدل گئی ہے، جو مقتول سماج میں جائز تھا وہ اب ناجائز ہے، جو پہلے خوب تھا اب ناخوب بن گیا ہے، جس سے پہلے لوگ نفرت کرتے تھے اب اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے جاتے ہیں، قبلہ بدل گیا ہے، عبادت گاہوں کی سج دھج بدل گئی ہے، امام و مقتدی تبدیل ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ "لباب طہارت" کا بھی کوئی ایسا حصہ نہیں جس نے تغیر کی لہر نہ محسوس کی ہو،

اس کے برخلاف اسلام نے جب کبھی بھی سماج کے اندر اپنی انقلابی تحریک کو چلایا ہے تو اس کا انداز ہی دوسرا رہا۔ اس نے ہمیشہ انتقام کے بجائے تدبر اور تخریب کے بجائے تعمیر کو انقلابی جدوجہد کے سامنے رکھا ہے۔ اس نے سوسائٹی پر کبھی اس حیثیت سے غور ہی نہیں کیا کہ وہ سرتا پا ظالم ہے، سفاک ہے اور خونی ہے، بلکہ اس نے ہمیشہ سماج کو ایک ضدی یا نادان بیمار کی حیثیت دی، جس کو اپنے نفع و نقصان سے زیادہ بحث نہیں ہوتی، بلکہ اس کا محبوب مشغلہ دواؤں کی تلخی کی شکایت اور طبیبوں کی بے رحمی کے شکوے کا ہوتا ہے۔

اس لیے لازماً دونوں گروہوں کے طریقہ اصلاح و انقلاب میں بعد المشرقین پیدا ہو گیا۔ ایک اگر مریض کی پرچھائیں کو دشمنی پر محمول کر کے اس کی رگ جاں میں نشتر اصلاح کی کشتی تیراتا ہے، تو دوسرا اس کے سرطان کے علاج کے سلسلہ

میں انہیں حصوں پر زخم لگاتا ہے جن پر خود مریض کی حالت نشتر چلانے کا تقاضا کرتی ہے، اس لیے یہاں کبھی انسانیت کو دریائے خون میں غوطہ دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی یہ انقلاب برپا ہوا ہے تو سماج بربریت اور درندگی سے نہیں بلکہ انسانیت اور وسیع محبت سے ہم کنار ہوا ہے،

اسی طرح اسلام نے کسی سماج کے متعلق یہ فیصلہ کبھی نہیں دیا کہ وہ سرے سے لے کر پیر تک نجس ہے اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس لباس کا ایک ایک بخیہ ادھیڑ دیا جائے پھر اس کی نئی کانٹ چھانٹ کے بعد ایک نئے قسم کا لباس تیار کر کے عروسِ انسانیت کو سجایا جائے، چاہے اس ادھیڑ بُن اور کانٹ چھانٹ کے دوران میں عین چوراہے پر دوشیزۂ انسانیت کو عریاں ہی کیوں نہ ہو جانا پڑے۔ بلکہ اس کا نقطۂ فکر یہ ہے کہ سماج کبھی بھی مجسمۂ غلاظت نہیں ہوتا اور اس کی یہ حیثیت نہیں ہوتی کہ وہ زخموں اور پھوڑوں سے سرتاپا چھلنی ہو گیا ہو۔ اور اس کی موت میں بس اتنی ہی کسر رہ گئی ہو کہ نشترِ اصلاح کی نوک لگے اور یہ مریض بسترِ علالت کے بجائے گوشۂ قبر کے قابل ہو جائے۔

نظریۂ معروف و منکر

اس کے اس دعوے کے پیچھے انسانی زندگی کی ہمہ جہتی تاریخ تائید کے لیے میدان میں آتی ہے اور مختلف اقوام کی داستان عروج و زوال سے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان ہمیشہ معاشرہ کی تشکیل معروف پر کرنے کا خواہشمند رہا ہے۔ بد دیانتی کے بجائے دیانت، وعدہ خلافی کے بجائے ایفائے عہد، چھچھورے پن کے بجائے حزم و احتیاط، حرام کاری اور حرام خوری کے بجائے متوازن نظام خاندان اور معتدل ضابطۂ معیشت کا متلاشی رہا ہے، اور کوئی سوسائٹی ایسی نہیں پائی گئی جس میں دیانت، مروت، اولوالعزمی اور ایفائے عہد کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا جاتا رہا ہو کیونکہ جب یہ اخلاقیات، بالکلیہ ختم ہو جائیں گی تو انسانیت مریض نہیں ہوگی، بلکہ مردہ ہو جائے گی اور ایسے موقعہ پر انقلاب و تغیر کی نہیں بلکہ قیامت کے زلزلہ انگیز حادثات کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے انقلاب کا نقطۂ آغاز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ مروجہ سوسائٹی کی کل کے ایک ایک پرزے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا جائے بلکہ اس کا معقول اور دانشمندانہ طریقہ یہ ہے کہ مشین کے جو پرزے زنگ آلود ہوں اُن کو صیقل کر دیا جائے، جو مجموعی نظام سے الگ ہو کر بیکار ہو گیے ہوں، ان کو ان کی مناسب جگہ پر فٹ کر کے حرکت دوڑا دی جائے، جن کے زنگ و روغن اُڑ گئے ہوں، اُن کو آب دے کر پھر چمکا دیا جائے اور اگر کچھ پرزے ایسے ہوں جو قطعاً ناکارہ ہوں تو اُن کو نظام سے الگ بھی کر دیا جائے، اور ان کی جگہ پر موزوں پرزے فٹ کر دیئے جائیں، اور اس بگڑی ہوئی مشین کے جملہ لوازم اس طرح مہیا کر دیئے جائیں کہ ہر پرزہ اپنا وظیفہ اس طرح ادا کرنے لگے کہ اس مشین کا جو مقصود ہے وہ حاصل ہو جائے۔

اس لیے تاریخ شہادت دینے پر مجبور ہے کہ جہاں تک بنیادی انسانی اخلاقیات کا تعلق ہے اس سے کوئی جاندار تحریک خالی نہیں رہی ہے، کیونکہ اگر اس میں یہ اخلاقیات موجود نہ ہوں تو پھر اس تحریک کا مردہ ہو جانا یقینی اور طبعی امر ہے، وہ قیادت اپنی طرف افراد کو نہیں کھینچ سکتی، جس کے اندر دور اندیشی، جرأت مردانہ، عشق مقصد، حزم و احتیاط اور توکل کی نشان نہ پائی جاتی ہو، خواہ وہ قیادت باطل کی ہو یا حق کی، علیٰ ہٰذا القیاس وہ اجتماعیت اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، جس کے اندر عام دلسوزی، ہمدردی اور نفع رسانی کے محرکات کارفرما نہ ہوں، خواہ اس اجتماعیت کی عمارت حق پر اٹھائی جائے یا باطل پر، یہاں تک کہ وہ فرد سماج میں کسی وقعت کا مستحق نہیں ہوتا جس کے اندر ایثار، بلند نظری، وسیع الخیالی، پاکیزگی، سچائی، ہمدردی، ایمان داری اور حقوق کی نگہداری، فرائض کی انجام دہی کے جذبات نہ ہوں، خواہ وہ خدا پرستانہ سماج کا نمائندہ ہو یا طاغوتی معاشرے کا۔

انسانی فطرت کے اس مطالعاتی تفاوت کی وجہ سے اسلام جس راستہ کو اختیار کرتا ہے اُسے لازماً دُنیا کے اور انقلابی راستوں سے ممتاز ہونا ہی چاہیے، چونکہ عام طور پر لوگ اسلام کے طریق انقلاب سے روشناس ہوئے بغیر اس تحریک کے اوپر غور کرنا شروع کر دیتے ہیں اس لیے ان کے افکار کے اندر ایک عجیب قسم کی بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے، جو لوگ اس کے امن پسندانہ رجحانات کو سامنے رکھتے ہیں وہ اس کا رشتہ تبت کے لاماؤں سے جا ملاتے ہیں۔ اور جن کی نظر اس کے بے لچک اور ٹھوس اصولوں کی طرف جاتی ہے وہ اسے تند و تیز انقلابی تحریک کا نام دے دیتے ہیں، حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ اسلام کی تحریک کا مقصد صرف ان کمزوریوں اور غلطیوں کا ازالہ ہوتا ہے جو انسان کی عملی اور اعتقادی زندگی کو گمراہ کر کے سوسائٹی کے اندر فساد کا سبب بن جایا کرتی ہیں، یہ تحریک سائٹی کے تاج محل کو توڑنے سے پہلے اس مسئلہ پر پورا غور کر لیتی ہے کہ اس عمارت کا کون سا حصہ قابل ترمیم و اصلاح ہے اور کون سے حصے ایسے ہیں جن کا توڑ دینا ہی مفید مطلب ہے، یہ تحریک اس نقطۂ نظر کی شدت سے مخالفت کرتی ہے کہ سوسائٹی کے معتقدات کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے اور نئے سرے سے ایسی سوسائٹی مرتب کی جائے جو حرف بحرف پہلی معاشرت سے مختلف ہو۔ یہ طریقہ معقول اور ہمدردانہ طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ بالکل وحشیانہ طریقہ ہے، ان درندوں کے طریق کار کی طرح جن کو اپنے دُشمنوں کو بھنبھوڑنے ہی میں لطف ملتا ہے۔

تاریخی مثال

ہم اگر تفصیلاً اس انقلاب کی کارروائی دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں قبل از اسلام عرب کی حالت کا اس نقطۂ نظر سے جائزہ لینا چاہیے کہ ان میں کیا کیا اقتصادی اور اخلاقی گمراہیاں پھیلی ہوئی تھیں، اور ان خرابیوں کو سوسائٹی کے اندر گھسنے کا موقع کس طرح ملا۔ پھر اسلامی تحریک نے کیا کیا اصلاحات کیں؟

سب سے پہلے ہمیں ان کے معتقدات کو پرکھنا پڑے گا، کیونکہ جس طرح سوسائٹی افراد کے عمل سے متاثر ہوتی ہے اسی طرح عمل آدمی کے افکار سے متاثر ہوتا ہے، سوسائٹی کے بناؤ بگاڑ کا اصل سبب افراد کے کردار نہیں ہوتے

بلکہ ان کے معتقدات ہوتے ہیں اور اس معاملہ میں اسلام کے ظہور کے زمانہ میں عرب کے اندر تین قسم کی صورتیں پیدا ہوگئی تھیں۔

۱۔ کچھ معتقدات ایسے تھے، جو اپنی اصل کے اعتبار سے غلط تھے اور جن کا زہر افراد کو متاثر کرکے سوسائٹی کو مریض بنا رہا تھا۔

۲۔ کچھ ایسے تھے جو اصلاً اگرچہ غلط نہیں تھے لیکن ان کے اردگرد ایسے توہمات کا جال پھیلا دیا گیا تھا جنھوں نے اصل کی شکل کو مسخ کرکے رکھ دیا تھا۔

۳۔ اور تھوڑے بہت ایسے عقیدے بھی تھے جو بالکل اپنی صحیح شکل میں تھے لیکن زندگی کی مشین میں انھیں کارفرما قوت نہیں حاصل تھی۔

اپنے طریق کار کے تحت اسلام نے یہ نہیں کیا سب پر بیک قلم خطِ نسخ کھینچ دیا، بلکہ اس نے پہلے قسم کے معتقدات کو تو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا، کیونکہ ان کی حیثیت جھاڑ جھنکار کی تھی جو افتادہ زمینوں پر صرف اس لیے اُگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ کوئی ہاتھ ان پر اصلاح کی قینچی چلانے والا موجود نہیں ہوتا، دوسری قسم کے معتقدات کے سلسلہ میں اس نے یہ نہیں کیا کہ اندھے مالی کی طرح پودے کی جڑ پر قینچی چلادی، بلکہ اس نے تمام خودرو بیلوں کو کانٹ چھانٹ کر اس طرح الگ کردیا کہ وہ مظلوم پودا جو ان بیلوں سے دبا ہوا بدنما معلوم ہو رہا تھا نکھر کر آنکھوں کو فرحت بخشنے لگا، اسی طرح تیسرے قسم کے معتقدات کو زندگی کی مشین میں ان کی اصل جگہ پر رکھ کر اس طرح کارآمد اور مفید عمل بنایا کہ انھیں اپنے فطری وظائف کی ادائگی میں کوئی دقت ہی نہیں محسوس ہوئی، یہ ایک حکیمانہ طریقہ تھا، جس کی وجہ سے بغیر کسی خون کے سیلاب سے گذرے ہوئے پورا عرب چند سالوں میں امن اور سکھ سے فائدہ اُٹھانے میں کامیاب ہوگیا، اور جو چہرہ اپنی بدنمائی کی وجہ سے دُنیا کی ہر محفل میں گھناؤنا سمجھا جاتا تھا، ہلکی سی قطع و برید کے بعد اتنا دیدہ زیب بن گیا کہ بڑے سے بڑے متمدن حلقوں میں اس کی تقلید کی گئی۔

مثال کے طور پر عقیدۂ توحید، جو انسانی زندگی پر ہمہ جہتی اثرات ڈالتا ہے، اگرچہ ان کے اندر موجود تھا اور وہ پکارتے بھی تھے "لاشریک لک لبیک" لیکن اس عقیدے کے اوپر یہ توہمات اپنا اقتدار جمائے ہوئے تھے کہ اگرچہ خدا کا کوئی شریک نہیں، پھر بھی اتنی وسیع مملکت کے انتظام کے لیے چند ایسے اہل کاروں کی ضرورت ہے جو حقیقی بادشاہ کے دربار میں رُسوخ رکھتے ہوں، اور حسن کارکردگی کی وجہ سے جن کو اہلیت کی سند بھی مل گئی ہو۔ اس کے لیے اُنھوں نے خدا کے برگزیدہ بندوں اور فرشتوں کو منتخب کر رکھا تھا لیکن اس دوسری سے ان کا فائدہ صرف اتنا سا تھا کہ اپنی غلط کاری کے احساسات کی چنگاری پر ان کی شفاعت کے چھینٹے ڈال سکیں۔ اسی طرح ان کے اندر رسالت کے بھی چرچے ہوتے رہتے تھے، لیکن ان کے خیال میں رسول کی شخصیت کوئی مافوق الفطرت ہستی ہوتی

چاہیے تھی یہی وجہ تھی کہ وہ قدم قدم پر معجزات کو طلب کرتے تھے اور ان کے عقل میں یہ بات سماتی ہی نہیں تھی کہ رسول بازاروں میں اپنے کام کے سلسلے میں بھی نکل سکتا ہے اور عام آدمیوں کی طرح کھانے پینے کی ضرورت محسوس کرسکتا ہے، وہ تقدیر کے قائل تھے، وہ قیامت اور حساب و کتاب کی بھی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ ان کے قصائد میں اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقائد ان کے تحت الشعور پر پوری طرح قبضہ جمائے ہوئے تھے، مگر صرف اتنا تھا کہ ان معتقدات کی اثر اندازی ان کی شعوری زندگی پر نہیں تھی۔ چنانچہ اسلام نے اس کی ضرورت نہیں محسوس کی کہ ان کے ان معتقدات کو جو چند توہمات سے ملوث ہوگئے ہیں بالکلیہ اکھیڑ کر پھینک دے، بلکہ اس نے جب حقیقت کی آنچ پر ان کو رکھا تو خود ہی میل کچیل الگ ہوکر بھسم ہوگیا اور اصل جوہر کندن کی طرح چمکنے لگا۔

عبادتوں کے سلسلہ میں بھی ان کے یہاں اکثر عبادتیں ایسی رائج تھیں جن کو اسلام نے تھوڑے سے تغیر کے بعد باقی رکھا، عرب دور جاہلیت میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے پابند تھے۔ اگرچہ اکثر موقعوں پر انھوں نے ان کی شکل مسخ کر دی تھی، لیکن ان کی سوسائٹی ان عبادات کے تصور سے یکسر بیگانہ نہ تھی چنانچہ قریش عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے، حضرت عمرؓ نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی، مجوس، یہود اور حکماء عرب وضو کے خوگر تھے، حضرت ابوذر آنحضور صلعم سے ملنے سے پہلے ہی نماز پڑھا کرتے تھے اسی طرح قس بن ساعدہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ نماز کا پابند تھا۔ اور نفلیاً خدا کے حضور میں سجدہ گذاری کا طریقہ تو عام تھا۔ اسلام نے ان میں جہاں ضرورت محسوس کی، تبدیلی کردی اور جو طریقہ مناسب معلوم ہوا اسے باقی رہنے دیا۔

انسانی اخلاقیات کے سلسلہ میں جب اس جاہلی سماج پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فطری راستہ سے عرب اتنا دور نہیں ہوئے تھے جتنا کہ آج کی متمدن قومیں ہوگئی ہیں، ان کے شعراء اپنے ممدوحین کے اندر جن صفات کو دیکھنا چاہتے تھے وہ یہ نہیں تھیں کہ ملک و دولت کے اعتبار سے وہ کوئی امتیازی شان رکھتے ہیں، لشکر و خرگاہ کے مالک ہیں، اور ان کی سطوت سے گیتی کا جگر شق ہوا جارہا ہے۔ بلکہ ان کی نگاہ میں اگر وقعت تھی تو صلۂ رحم کی، ضیافت کی، ہمدردی اور غم گساری کی۔ ایفائے عہد اور بھائی چارگی کی، اور خود عرب کے سماج کا یہ حال تھا کہ اس کے اندر کوئی ایسا شخص اپنے لیے جگہ نکال ہی نہیں سکتا تھا، جو ان بنیادی انسانی اخلاقیات سے عاری ہو جو ایک معقول انسان ہونے کے لیے ضروری ہیں حتیٰ کہ کوئی سوسائٹی ان اخلاقیات کی غیر موجودگی میں پنپ ہی نہیں سکتی اس لیے اسلام نے ان کو محو کرنے کے بجائے اور زیادہ اُجاگر کردیا۔ پہلے اگر ان کے اندر محدودیت تھی تو وسعت دے دی۔ تاکہ ان کا فیض عام ہوجائے اور اس فطری سیل رحمت کو قومی، نسلی، قبائلی حد بندی روک نہ سکے۔

اسی طرح ان کے تجارتی معاملات، اور نکاح و طلاق، وراثت وغیرہ کے قوانین میں سے جو حصے حذف کے قابل تھے ان کو حذف کرکے باقی کو جوں کا توں رہنے دیا، کیونکہ مقصود اصلاح سے تھا، نہ کہ انقلاب پسندی کے مظاہرے سے

رہ گئے وہ طریقے جو روم و ایران کے پڑوس کی وجہ سے ان کے اندر داخل ہو گئے تھے اور جنھوں نے عربی سماج کو گھن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا تھا، ان کو اسلام نے سختی سے مٹا دیا کیونکہ ان کی حیثیت یہ نہیں تھی کہ وہ سماج کے اصل پرزے تھے اور زمانہ کی الٹ پھیر نے ان کو ناکارہ یا خطرناک بنا دیا تھا، بلکہ ان کی اصل ہی فساد تھی اور ان کا سماج سے ہٹا دیا جانا ہی انسانیت کے لیے مفید تھا۔

یہ تاریخی زبان میں مختصر تفصیل ہے اس انقلاب کی جس کو اسلام نے عرب کی سرزمین پر برپا کیا تھا، اس انقلاب نے محض کانٹ چھانٹ ہی کا فرض نہیں انجام دیا تھا، بلکہ اس نے ریگستانی پودے کے چہرے پر حیات کی سرخی دوڑا دی، یہ سوسائٹی کے متعلق پہلے ہی یہ فیصلہ نہیں دے دیتا کہ اس کے زمین و آسمان بدل دیئے جائیں بلکہ یہ صرف بیماریوں کا علاج کرنا چاہتا ہے جو فی الواقعہ معاشرے کی تباہی کا سبب بنی ہوئی ہوتی ہیں، نشتر لگانے سے پہلے فاسد مادے کے پھیلاؤ کا اندازہ لگاتا ہے، اس کے بعد اتنے ہی حصۂ جسم پر عمل جراحی کرتا ہے جتنے حصہ پر نشتر چلانے کی مریض کی حالت تقاضا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک نے اتنی تیزی کے ساتھ عرب کے اندر اپنے لیے امتیازی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے، تاریخ میں کوئی اور تحریک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ اس نے عرب سوسائٹی کے معتقدات کو نکھار کر سامنے کیا اور عقل کو دعوت دی کہ اگر تمہاری سوسائٹی کا موجودہ نظام درست ہے تو پھر یہ تضاد کیوں نظر آتا ہے؟ اس طرح اس نے خود افراد ہی کے معتقدات سے ان کے اوپر حجت قائم کر دی، قرآن حکیم میں اکثر موقعوں پر اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ چنانچہ جب اہل جاہلیت نے قرآن شریف کے نازل ہونے پر تعجب کا اظہار کیا تو فرمایا گیا کہ: "قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِیْ جَاءَ بِهٖ مُوْسٰى" کیونکہ وہ اس کے قائل تھے کہ رسالت ضروری ہے اور رسولوں پر خدا کی کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں، اس طرح جب یہ شبہ ظاہر کیا گیا "مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ" تو ارشاد ہوا کہ: "مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ" کیونکہ انھیں معلوم ہی تھا کہ رسول بشری ضروریات سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ تھی اسلام کے طریق انقلاب نے تو ان کو اس پر مطمئن ہی کر دیا تھا کہ یہ سوسائٹی کے فلاح کا خواہش مند ہے، ان کو الجھن جو پیش آئی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اتنے دنوں سے جو طور طریقے رائج ہیں آخر وہ غلط کیسے ٹھہرائے جائیں۔ مگر جب خود ان کی زندگی اور ان کے معمولات کے تضاد سے یہ واضح کر دیا گیا کہ یہ الجھنیں محض وسوسہ ہیں تو ان کے ذہن میں حقیقت بہت جلد آ گئی۔

اس کے برخلاف جب وہ خونی راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جس میں یہ کوشش ہوتی ہے کہ سماجی نظام کے ایک ایک پرزے کو توڑ پھوڑ کر ایک نیا نظام معاشرت و تمدن اور نیا ضابطہ حکومت رائج کیا جائے تو اس طریق کار سے سماج بہت جلد جھنجلا جاتا ہے اس طرح جہاں تحریک کے پھیلاؤ میں دقت ہوتی ہے وہیں انقلاب کا محل انسانوں کے دلوں کی زمین پر نہیں، بلکہ خون آلود کھوپڑیوں پر اٹھتا ہے۔ مریض انسانیت آرام پانے کے بجائے کچھ اور زیادہ دکھوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور جب سوسائٹی کے اندر یہ انقلابی عمل ہوتا ہے اس میں اور نئے سماج میں مستقل آویزش کا ابھر پڑتا ہے، جس کی وجہ [illegible]

اخبار و افکار

انور اعظمی

خطرناک تجربہ انتخاب کی آمد نے ہمارے یہاں کی ہر جماعت کو پھر عوام کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے، پہلے کی طرح اب پھر وعدوں اور خوش گمانیوں کی فضا پھیلائی جارہی ہے، عوام کو پھر سبز باغ دکھلائے جارہے ہیں، اور پھر تند و تیز نعروں، شعلہ بار تقریروں اور منفید مطلب بیانات کے ذریعہ آزادی رائے پر طلسمی جال پھینکے جارہے ہیں۔

آزادی سے پہلے کے انتخابات میں بھی ہنگامے ہونے تھے اور ایک دوسرے پر لعن طعن ہوتی تھی، لیکن اس وقت کے انتخابات میں اتنی آسانی ہوتی تھی کہ جب عوام کے سامنے جماعتیں آتی تھیں تو جماعتی کردار کی خامیوں کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ انگریزی اقتدار کے پردہ میں چھپا دیا جاتا تھا، اور رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لیے یہ فقرہ کافی تھا کہ "ہمارے ایسے تمام پروگرام جن سے خدا کی حالت سدھر سکتی تھی، محض بدیشی راج کی وجہ سے ناکارہ ہو کر رہ گئے ہیں" لیکن اب یہ فقرہ کارگر نہیں ہو سکتا کیوں کہ غیر ملکی اقتدار کی نحوست بھارت کی سرزمین سے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر سات سمندر پار چلی گئی ہے، اب اس "عذر معقول" کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی۔ اس لیے اب جماعتوں کو ایسے عذرات لنگ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جنھیں تھوڑی بہت محنت کے بعد "عذر معقول" میں تبدیل کیا جا سکے۔

اس سلسلہ میں جن سنگھ کو کسی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیوں کہ اولاً تو اسے حکومتی وسائل و ذرائع سے کام لینے کا موقع نہیں ملا کہ عوام کے سامنے وہ قانونی نقطۂ نظر سے جواب دہ ہو، دوسرے اس کا پہلے ہی سے یہ نظریہ تھا کہ ملک کی مصیبتوں کا اصل سبب غیر ہندو اقوام کا وجود ہے، اس لیے اس نے تو بڑی صفائی کے ساتھ اپنے کو یہ کہہ کر بچا لیا کہ "ہمارا تو یہ خیال پہلے ہی سے تھا کہ غیر ہندو اقوام کی حکومتی اداروں میں مداخلت ملک کی تباہی کا سبب بن جائے گی" اور چونکہ ابھی بھارت کے عوام کا سواد اعظم اتنا بیدار نہیں ہے کہ وہ کسی جماعت کے اصول و طریقہ کار کو سامنے رکھ کر سود و زیاں کا فیصلہ کر سکیں اس لیے جن سنگھ کی یہ معذرت عوامی حلقوں میں اچھا خاصا وزن رکھتی ہے۔

مہاسبھائی رجحانات کے خلاف کانگرس اور سوشلسٹ پارٹی دو گروپ الگ الگ نیمہ زن ہیں۔ ان میں سے سوشلسٹ پارٹی حکومت کے معاشی پروگرام کو چیلنج کر کے عوام کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کر رہی ہے، اور مہاسبھا کی طرح اس کو بھی ایک "عذر معقول" ہاتھ لگ گیا ہے کہ حکومت نے ہمارا معاشی پروگرام اختیار ہی نہیں کیا، اگر حکومت ہمارے معاشی نقطۂ نظر کو قبول کر لیتی تو وہ تمام دشواریاں نہ پیش آتیں جنھوں نے جنتا کی زندگی کو کٹھن بنا رکھا ہے اور ابھی تک معاشرہ سے بلیک مارکیٹ، نفع اندوزی، دولت کی غلط تقسیم، غیر معقول شرح اجرت کا خاتمہ ہو گیا ہوتا، اس اعتراض کے پیچھے سے خود بخود یہ دعویٰ ابھرتا ہے کہ اگر حکومتی وسائل اس جماعت کے ہاتھ میں آجائیں تو پھر سماجی خرابیاں چن چن کر کے ختم کی جا سکتی ہیں۔

کانگرس ــــ جس نے آزادی کے بعد حکومت کا کاروبار سنبھال رکھا تھا ــــ ان اعتراضات کے جواب پر جواب دے رہی ہے، مگر بات بنتی ہوئی نظر نہیں آتی، کیونکہ جنتا اس جماعت سے جائز مطالبہ کرتی ہے کہ تم نے اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک ہمارے لیے کن آسانیوں کو فراہم کیا کہ ہم آیندہ ووٹ دے کر تم سے اپنے لیے بہتری کی توقع رکھیں، جس راستے پر چلنے کے بعد ایک مرتبہ کھائی میں گر چکے ہیں، اس کو پھر سے آزمانا کوئی عقلمندانہ رویہ تو نہیں ہو سکتا، حال یہ ہے کہ تمہارے دورِ حکومت میں اسبابِ زندگی کی قلت اس سے کہیں زیادہ محسوس کی گئی جتنی کہ بدیشی حکومت میں محسوس کی جاتی تھی، سوسائٹی میں آج بھی دو طبقے ایسے موجود ہیں جن میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ایک طرف جونکوں کا لشکرِ عظیم ہے جو مسلسل خون چوس رہا ہے اور اس کا شکم ہل من مزید کا نعرہ لگاتا ہے دوسری طرف وہ عوام ہیں کہ جن کی رگِ جاں میں بھی قطرۂ لہو باقی نہیں رہ گیا۔ تمہاری عدالتیں آج بھی بیوپار کی منڈیاں ہیں جہاں بڑی آسانی کے ساتھ سنہرے کاغذوں کے بدلے انصاف خریدا جاتا ہے تمہاری پولیس آج بھی چنگیز و ہلاکو سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے ٹیکسوں کا ساون ہے جس کا بادل کھلنے کا نام ہی نہیں لیتا، گرانی کا سمندر ہے جس میں مدّ تو بڑے زور شور کا ہے لیکن جزر کی کیفیت مستقبل بعید تک میں نظر نہیں آتی۔ آخر وہ کون سی اُمید ہے جس کے بل پر ہم تم سے پیمانِ وفا باندھنے کی پھر سے ہمت کریں۔

جنتا کے یہ اعتراضات معقول ہیں۔ لیکن یہ تمام مشکلات جو کانگرسی دور میں پیش آئیں اس کی ملزم صرف کانگرس ہی نہیں ہے بلکہ کانگرس سے زیادہ قصور وار جنتا ہی ہے، کیونکہ جب اس نے اپنی رائے کا استعمال کیا تھا اس وقت اس نے یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی کہ ہم کس قسم کے آدمیوں کو اپنی زندگی کا کرتا دھرتا بنا رہے ہیں، اس نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا کہ ہم جن کے نام کا مختار نامہ لکھ رہے ہیں وہ جیون کی ریاست کا نظم و نسق سنبھال بھی سکتے ہیں یا نہیں؟ اس وقت تو نیتاؤں نے عقیدت کی شراب پلائی اور وہ مدہوش ہو گئی وطن پرستی کا راگ چھیڑا اور وہ رقص کرنے لگی، قومیت کا جھنڈا لہرایا اور وہ چاروں سمت سے سمٹ کر اس کے نیچے جمع ہو گئی یہ خیال ہی نہیں کیا ہم جن لوگوں کو اچھال رہے ہیں وہ سوسائٹی کے کیسے افراد ہیں، ان کی نجی زندگی کیسی ہے، ان کے آپس کے معاملات کا کیا رنگ ہے، ان کی دیانت اور ایمان داری کا کیا حال ہے؟ ان کی زندگی اصولی ہے کہ ہوا کے رُخ پر بدل جاتی ہے، وہ اپنی رائے کی کوئی

سمت سمجھتے ہیں کہ ہر وقت ان کی رایوں کی دوکان پر "بکاؤ مال" کا اشتہار لگا رہتا ہے، وہ ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں کہ محض سٹہ باز ہیں، ظاہر ہے کہ جب آنکھ بند کر کے حکومت کے انجن کو کسی اناڑی کے ہاتھ میں دے دیا گیا اس کا انجام تو یہی ہونا ہی چاہیے تھا کہ زندگی کی گاڑی تباہی کے غار میں گر کر چکنا چور ہو جائے۔

آج پھر اسی غلطی کا اعادہ کیا جا رہا ہے، پھر انھیں نعروں کو وقعت دی جا رہی ہے۔ پھر انھیں تخیلات کو دلوں میں جگہ دی جا رہی ہے، جنھوں نے اپنے ناکارہ اور غیر مفید ہونے کا ثبوت پچھلے تین سالوں میں بار بار دیا ہے، پھر انھیں سبز باغوں میں چہل قدمی کرنے کی ہوس بیدار ہو رہی ہے جن میں سبزی تو ہے مگر ان کی فضا زہر آلود ہے۔ آج پھر کردار کا کوئی سوال نہیں، دیانت اور ایمان داری سے کوئی بحث نہیں، فکر و نظر کی پاکیزگی سے کچھ سروکار نہیں بلکہ پہلے کی طرح جاذب توجہ نعروں کی تلاش ہے، دل خوش کن بیانات کی ویسی ہی مانگ ہے جذبات کی اسی طرح کورانہ تقلید ہے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اتنے اہم مسئلہ کو ابھی تک تجارتی نقطۂ نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور جماعتیں پھر گاہک بنی ہوئی ہیں اور عوام ہیں کہ اپنی رایوں کی اسی طرح قیمت چڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔

لوگ جب اپنی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کانگرس کا ایک بار تجربہ کر چکے اور عقل کا تقاضا ہے کہ دوبارہ اس سانپ کے منھ میں انگلی نہ ڈالیں، لیکن معلوم نہیں یہ کس عقل کا فیصلہ ہے کہ طریقہ وہی استعمال کرتے ہیں جس سے سنپولوں کی پیدائش کے علاوہ اور کسی چیز کی توقع ہی نہیں باندھی جا سکتی، اگر انتخاب کا وہی معیار رہا جو پہلے گذرے ہوئے دنوں میں رہا ہے تو یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ لوگ اوپر آئیں گے جن سے فلاح اور بھلائی کے کام انجام پائیں گے آخر اس سادہ لوحی کی حد ہے کہ وہ لوگ جو کاروبار میں بد دیانت ہوں، معاملات میں بے ایمانی کا رویہ اختیار کریں، وعدہ کریں تو پوری زندگی میں ایک مرتبہ بھی وفا کرنے کا خیال نہ ہو، امانت دی جائے تو خیانت کا کیڑا ذہن میں کلبلانے لگے، ایسے لوگ جب حکومت کا کاروبار سنبھالیں گے تو معاً ان کی سیرتیں بدل جائیں گی بددیانتی کے بجائے دیانت، بے ایمانی کی جگہ ایمان داری، وعدہ خلافی کے بجائے ایفائے عہد اور خیانت کی جگہ امانت لے لے گی، عہدے کوئی معجزہ گاہ تو نہیں ہیں کہ کرسیوں کے ملتے ہی آدمیوں کا طور و طریقہ بدل جائے اس کے فکر و نظر میں انقلاب آ جائے، سوچنے اور سمجھنے کے طریقوں میں تغیر پیدا ہو جائے۔ اس کے لیے تو بڑی جد و جہد اور بڑے ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس لیے انتخاب کے سلسلہ میں اہم مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کون جماعت یا کون فرد برسر اقتدار آتا ہے اور کس نعرے میں اتنی دلکشی ہے کہ اسے عہدوں کی کرسی سونپ دی جائے بلکہ اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ سوسائٹی کے بہتر افراد اقتدار کے تخت پر آئیں۔ رہ گیا یہ سوال کہ معاشرہ ایسے افراد سے خالی ہے اور معقول افراد تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے، بے کار سی بات ہے۔ اولاً تو معاشرہ معقول افراد سے خالی نہیں ہوتا اور اگر بدقسمتی سے بھارت میں

ایسے افراد نہیں ہیں تو یہ کمی ایک خطرناک مستقبل کی پیشین گوئی ہے اور اس کی سخت ضرورت ہے کہ تمام کاروبارِ سیٹ کو صرف معقول افراد تیار کیے جائیں، کیونکہ حکومت کے بناؤ بگاڑ کا تمام تر مدار افراد کے اوپر ہے، سوسائٹی کو بُرا یا اچھا فرد کا کردار بناتا ہے۔ اگر اس اہم کام کی طرف سے پہلے ہی کی طرح سے بے پروائی برتی جاتی، ہی تو بھارت کا حال ہی نہیں بلکہ مستقبل بھی ہلاکت میں مبتلا نظر آتا ہے۔

ذہنی انتشار

حکومت ملنے کے ساتھ ہی سب سے اہم جو حقیقت ظاہر ہوئی وہ یہ تھی کہ کانگرس جو جنگ آزادی کے دوران میں بڑی منظم طاقت سمجھی جاتی تھی، تنظیمی اعتبار سے سخت پھُس پھُسی ہے اور اس کی زندگی کا مدار کسی اصول اور نظریہ پر نہیں تھا بلکہ ہنگامی جوش اور وقتی جذبات پر تھا۔ ابھی تک اس کوتاہی کو چھپانے کی بڑی کوششیں کی جاتی رہیں، مگر حالات کے اُلٹ پھیر نے مجبور کیا کہ اگر کانگرس کو زندہ وجود کی شکل میں باقی رکھنا ہے تو سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلہ پر غور کرنا ہوگا کہ وہ کیا بنیادی خرابیاں ہیں جنھوں نے اس منظم طاقت کے شیرازہ کو منتشر کرکے رکھ دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس کے رہ نما اِس مسئلہ کو اس کی اصل شکل میں سامنے رکھ کر غور کرنا چاہتے ہیں کیونکہ آجکل کے بیانات میں جہاں کانگرس کی گرتی ہوئی حالت پر مرثیہ خوانی کی جاتی ہے وہیں ان اسباب کی نشان دہی بھی کردی جاتی ہے، جن کی وجہ سے کانگرس کے گراں ڈیل جسم کو یہ ضعف لاحق ہوا ہے، چنانچہ شری سمپورنانند نے ایک بیان دیتے ہوئے یہ کہا کہ :-

"ہمیں ایک مشترک نظریہ کی ضرورت ہے جس کی خاطر ایک فرد جنگ کرے اور مرمٹنے کا حوصلہ رکھے،
نظریہ کے فقدان ہی نے لوگوں کو کانگرس سے جدا کر دیا ہے"

کرپلانی جی بھی اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں۔

"ہم اتحاد کے خواہش مند ہیں، لیکن ہمارا کوئی مخصوص اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی منصوبہ نہیں ہے"

اس قسم کے بیانات سے اتنا تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کانگرس جس کا مقصود غیر ملکی اقتدار کے زمانہ میں حصول آزادی تھا، آزادی پا جانے کے بعد بالکل بے مقصد ادارہ بن کر رہ گئی ہے، لیکن یہ فکری انتشار کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، بلکہ کانگرس کی ترکیب ہی اوّل روز سے ان اجزاء سے ہوئی تھی کہ جن کی موجودگی میں انتشار کا نہ پیدا ہو ہی تعجب کی بات تھی، کیونکہ اس جماعت میں شروع ہی سے بقول آچاریہ کرپلانی" وہ لوگ بھی شریک تھے جنھیں لبرل کہا جاتا ہے، وہ بھی تھے جنھیں رجعت پسند کہتے ہیں، وہ بھی تھے جو فرقہ پرست کے نام سے بدنام ہیں اور وہ بھی تھے جن پر تنگ پسندی کا الزام ہے" اور یہ تمام مختلف نقاط نظر کی جماعتیں کانگرس کی محض اس لیے ہمنوائی کر رہی تھیں کہ وہ ہندوستان کی زمین کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر دینا چاہتی تھی۔ اور جب یہ مشترکہ منفی نصب العین ہٹ گیا

اور اس جگہ پر کوئی مثبت پروگرام سامنے نظر نہ آیا تو اپنے اپنے خیال کی پیروی میں تمام جماعتیں کٹ کٹ کر الگ ہوتی گئیں اور وہ بڑے بڑے کانگرسی بھی جن کا یقین استبداد افرنگ متزلزل نہ کر سکا، آزادی پا جانے کے بعد کانگرس سے بدگمان ہو گئے۔

سب سے زیادہ افسوس ناک حقیقت تو یہ ہے کہ یہ غلطی صرف ماضی ہی میں نہیں کی گئی بلکہ آج بھی برابر اس کا اعادہ ہوتا رہتا ہے، آج زندگی کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس میں کانگرسی رہنماؤں کی رایوں میں اختلاف نہ پایا جاتا ہو، معاشی اور سیاسی مسائل سے قطع نظر کہ یہ مسائل آج کی فلسفی دنیا میں گورکھ دھندا بنے ہوئے ہیں خاص سماجی مسئلے بھی، جن پر معقول آدمیوں میں اختلاف رائے کی بہت کم گنجائش رہتی ہے، کانگرسی افراد ان کے سلسلہ میں یک جہتی سے محروم ہیں، مثلاً کچھ دنوں پیشتر صدر جمہوریہ نے ایک بیان دیتے ہوئے عورتوں کو مشورہ دیا تھا کہ "عورتوں کو اندرون خانہ کے مسائل سے دلچسپی لینی چاہیے۔ وہ اپنی اس سلطنت کی ذمہ دار اور جواب دہ ہیں، عورت کی تکمیل تفریح گاہوں اور سینما ہاؤسوں میں نہیں ہوتی بلکہ بچوں کی تربیت اور گھریلو معاملات کے سدھار سے ہوتی ہے" لیکن بھارت کے محبوب رہنما شری جواہر لال نہرو نے احمد آباد میں بالکل اس کے برعکس یہ عقلمندانہ مشورہ دیا کہ "کوئی ملک اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس کے یہاں کی عورتیں چہار دیواری کے اندر بند رہیں گی۔ عورتوں سے متعلق یہ پرانا خیال کہ وہ گھروں کے گوشوں میں رہنے والا جانور ہیں اور انہیں دنیا سے بالکل بے خبر رہنا چاہیے، غلط ثابت ہو چکا ہے، اس لیے ہم کو بھی یہ خیال ختم کر دینا چاہیے، اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو یہ عورتیں خود اس کام کو انجام دیں گی، اس لیے ہمیں عقل مندوں کی طرح خود ہی ضروری تبدیلیاں کرنی چاہییں۔"

اسی ایک مسئلہ تک یہ اختلاف رائے ہوتا تو حالات کے سدھار کی تھوڑی بہت توقع کی جا سکتی تھی لیکن زندگی کا وہ کون سا مسئلہ ہے جس میں موجودہ راہنما منتشر الخیال نہیں ہیں، آزادی کو ملے ہوئے تین سال سے اوپر ہو چکے لیکن ابھی تک اس جماعت کو کوئی مشترک نصب العین مل ہی نہیں سکا، یہی وجہ ہے کہ آج کانگرس بالکل تاریکی میں چل رہی ہے اس مسافر کی طرح جس کو کالا پانی کے ریگستان میں اتار دیا گیا ہو اور وہ ہر سمت میں صرف اس امید پر سفر کرنے لگے کہ شاید راہ نجات اسی طرف کو جاتی ہو۔ کوئی مخصوص نصب العین، کوئی متعین اور غیر متغیر طریق کار آج تک اسے نہیں مل سکا جس کی وجہ سے بسا اوقات اس جماعت کے دانش ور حضرات بھی اس قسم کی باتیں کہہ جاتے ہیں جیسے ایک عام شخص بھی کہتے وقت کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے مثلاً شری نہرو نے احمد آباد کے اجلاس میں جو یہ بات کہہ دی کہ "زمانہ گذشتہ میں ہم جو قرار داد یں منظور کر چکے ہیں وہ اصولی طور پر تو درست ہیں لیکن عملی طور پر کچ درست نہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے آپ کو بدلتے ہوئے زمانہ کے مطابق ڈھال لیں" تو ان جملوں میں درحقیقت اسی فکری انتشار کا عکس ہے جس میں بدقسمتی سے ہمارے ملک کے رہنما گرفتار ہیں کتنی الجھی ہوئی بات ہے کہ ایک طریقہ کار تو اصولی طور پر درست ہو لیکن عملی دنیا میں جب اسے برتا جائے

تو وہی درست بات غلط ثابت ہو جائے۔

پھر کانگرس ہی تک یہ انتشار محدود نہیں ہے بلکہ ملک کی اور جماعتیں بھی کسی نہ کسی شکل میں اسی مرض کی شکار ہیں، کانگرس اس وقت ملک کے نظم و نسق کو سنبھالے ہوئے ہے اور عملی مشکلات سے دوچار ہے اس لیے یہ فکری انتشار قدم قدم پر ظاہر ہو رہا ہے اور اگر ٹھیک اسی طرح کے حالات دوسری جماعتوں کے لیے پیدا ہو جائیں اور انھیں بھی موقع مل جائے کہ وہ ملک کی انتظامی گاڑی کو چلائیں تو لامحالہ وہ بھی اسی مصیبت کا شکار ہو جائیں گی کیوں کہ کوئی ایسا نصب العین جو انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے دائرہ میں لے سکے نہ مہاسبھا کے پاس ہے اور نہ سوشلسٹ پارٹی کے اور ظاہر ہے کہ جب تحریکیں پنڈت نہرو کے مشورہ کے مطابق اپنے کو زمانہ کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنے لگیں گی تو نہیں کہا جا سکتا کہ زمانہ کتنے طریق کار اور نصب العین بنائے اور بگاڑے جائیں گے اور ملک کے عوام نہ جانے کتنے نئے نئے حالات سے دوچار ہونے رہیں گے۔

جب کسی ملک کی جماعتیں روز و شب کی تبدیلی کے ساتھ اپنے نصب العین اور اپنے طریقہ کار کو بدلنے لگتی ہیں تو عوام نہ صرف یہی کہ تحریکوں کی طرف سے غیر مطمئن ہو جاتے ہیں بلکہ بار بار کے تجربے سے خود ان کے قوائے فکر و عمل جواب دینے لگتے ہیں، اور عوامی شعور پر مایوسی کی تاریکی پھیلنے لگتی ہے، اگر موجودہ جماعتوں نے اپنے اس رویہ میں تبدیلی نہیں پیدا کی اور وہ کوئی مستقل نظریہ سامنے لانے میں کامیاب نہیں ہوئیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ ملک کتنی خوفناک صورتِ حال سے دوچار ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔

آخر یہ کیا ہے کہ ملک کے رہنما حکومت کے کاروبار کے متعلق سوچتے ہیں، ممبری کی کرسیوں پر غور و فکر کرتے ہیں، میدانِ انتخاب میں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی زحمت گوارا کر لیتے ہیں، لیکن یہ خوفناک مرض جو ان کی سیرت سے لے کر عوامی کردار تک کو متاثر کر رہا ہے اس کے دفعیہ کے لیے اپنے وقت کا حقیر حصّہ بھی صرف کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے حالانکہ یہی وہ بنیادی خرابی ہے جو بھارت کی قسمت کے جسم میں دق کے جراثیم داخل کر رہی ہے۔

نیا معاہدہ

اسٹرلنگ کی قیمت گرتے ہی ہر وہ ملک جس کی تجارت برطانوی مقبوضات سے ہوتی تھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ اپنے ملک کے سکّہ کی قیمت کو گرائے یا اس کو علی حالہ قائم رہنے دے کھلی ہوئی بات ہے کہ ہر ملک اس بارے میں آزادانہ رویہ اختیار کر سکتا تھا۔ اور اپنے مصالح ملکی کے پیشِ نظر ہر حکومت کا یہ جائز حق تھا کہ وہ چاہے تو ملکی سکّہ کی قیمت گرائے یا نہ گرائے۔

مگر یہ مسئلہ پاکستان اور بھارت کے لیے بہت پیچیدہ بن گیا کیوں کہ یہ دونوں ریاستیں جلد ہی آزاد ہوئی تھیں۔ اور ابھی ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی خود کفیل نہیں بن سکی تھی۔ دونوں کی ایک دوسرے سے اہم معاشی ضروریات وابستہ تھیں۔ اگر یہ دونوں اپنے سکّہ کی قیمت گرا دیتیں یا گرانے کا اعلان نہ کرتیں تب تو تجارتی مسائل استوار رہتے کیونکہ ہندوستان کے اکثر کارخانے روئی اور جوٹ کے لیے پاکستان کے محتاج ہیں اور اسی طرح پاکستان کوئلہ کا۔ مگر

جب بھارت نے دولتِ مشترکہ کے اجلاس کے سلسلے میں اپنے سکہ کی قیمت میں تخفیف کا اعلان کیا تو پاکستان اپنے سکہ کی قیمت گرانے پر رضامند نہ ہوا۔ بہرحال دونوں ملکوں نے اپنی اپنی مصلحتوں کے خیال سے یہ رویہ اختیار کیا تھا لیکن بھارت کو پاکستان کی یہ روش پسند نہ آئی اور اس نے اسی وقت سے اس پر یہ الزام رکھنا شروع کر دیا کہ اس کو مشورہ کے بعد یہ قدم اٹھانا چاہیے تھا حالانکہ جس طرح بھارت کو اس کا حق تھا کہ یہ اپنے سکہ کی قیمت گرائے اسی طرح اس کو بھی یہ حق تھا کہ اپنے سکہ کی قیمت برقرار رکھے۔ رہ گئی یہ بات کہ دونوں ملکوں کے مفاد ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس لیے اس معاملہ میں یکجہتی کی ضرورت تھی تو آج کل کے معاملات میں تو بیوپارانہ ذہنیت کام کرتی ہے اور ملک پرستی اس کی اجازت ہی نہیں دیتی کہ اپنے ملک کا فائدہ ہوتے ہوئے دیکھ کر کسی دوسرے سے مشورہ یا کسی دوسرے ملک کے مفادات پر غور و فکر کیا جائے۔

بہرصورت جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ لیکن اس کا اثر دونوں ملکوں کے تجارتی حلقہ پر بہت برا پڑا۔ اس لیے کہ بھارت نے پاکستان کے سکہ کی وہ قیمت نہیں تسلیم کی جو ملکی سکہ کی قیمت گر جانے کے بعد ہوتی تھی اور پاکستان اس پر رضامند نہ ہوا کہ وہ پرانی قیمت کو تسلیم کر کے تجارتی راستوں کو کھولے رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں پٹ سن اور روئی وغیرہ کی دقت محسوس کی گئی اور پاکستان کو کپڑے اور کوئلے کی کمی کا سامنا کرنا پڑا دونوں طرف سے تجارتی حلقوں میں بڑا اضطراب پیدا ہو گیا اور بہت سے کاروبار مندے پڑ گئے۔

اس کے بعد اس کی کوشش شروع ہو گئی کہ کسی طرح کوئی ذریعہ تجارت کے لیے پیدا کیا جائے اس سلسلہ میں بڑی بڑی مجلسیں منعقد ہوئیں اور بہت سے فارمولے مرتب کیے گیے، بڑا غور و فکر کیا گیا اور پاکستان و بھارت کے بڑے بڑے نباغوں نے مدتوں اس مسئلہ پر اپنی قوت صرف کی لیکن کوئی مفید مطلب ذریعہ برآمد نہیں ہوا، بجز ایک صورت کے کہ بھارت پاکستان کے سکہ کی موجودہ قیمت کو تسلیم کرے۔

دونوں ملکوں کے تجارتی حلقوں اور عوامی اداروں کا دباؤ تھا جس نے اپنی اپنی حکومتوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اس معاملہ پر سنجیدگی سے غور کریں۔ چنانچہ دونوں ملکوں نے اپنے فرض کو پہچانا اور پچھلے دنوں اس کا اعلان کر دیا کہ پھر دونوں ملک آپس میں تجارت کریں گے اور سکہ کے سلسلہ میں فی الحال یہ طے کیا گیا ہر ملک ایک دوسرے کی موجودہ قیمت کو تسلیم کرے گا۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ بھارت کے بہت سے ذہنوں میں اس اعلان نے قیامت برپا کر دی اور وہ اپنے پرانے طریقوں سے اس نئے مسئلہ پر غور کرنے لگے۔ اور اس سلسلہ میں پھر قیاس آرائیاں اور فلسفیانہ نکات کی بارش شروع ہو گئی کچھ لوگوں کا خیال ہے اس سے بھارت کے قومی وقار کا قطب مینار ڈھ گیا۔ ایک حلقہ حلق پھاڑ پھاڑ کر خود چلا رہا ہے کہ بھارتیو! تمہارے نسلی غرور کا ہمالہ بحر عرب میں غرق کر دیا گیا تیسری طرف سے فلسفیانہ آواز آتی ہے کہ اس کا عوامی اخلاق پر بہت برا اثر پڑے گا، کیونکہ غیر محسوس طور پر یہاں کے ذہن میں یہ بات گھس جائے گی کہ پاکستان جو چاہتا ہے منوا لیتا ہے اور بھارت میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے مطالبوں کو رد کر سکے، ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے بھارت کا تجارتی توازن

تنزل ہو جائے گا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام دماغی قابلیت جو اب تک محض اسی کیسے جمع کی گئی تھی بے دریغ خرچ کی جا رہی ہے اور ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے نکتے پیدا کیے جا رہے ہیں کہ اگر معقولیت کی خوردبین سے دیکھا جائے تو بھی ان کا نام ونشان نہیں ملتا۔ یہ تو کوئی نہیں سوچتا کہ یہاں کے عوام کی مشکلات کس حد تک رفع ہوئیں، چیزوں کے ملنے میں کتنی آسانی پیدا ہوئی اور کتنے عوامی اداروں میں پھر سے جان پڑ گئی۔ مگر ان کی طرف تو اسی وقت خیال جاتا جب کہ ملک پرستی اور قوم پرستی کا بھوت ذہنوں پر سوار نہ ہوتا، اور یہ خیال عام ہوتا کہ روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان ایک ماں باپ کی نسل سے ہیں اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک کا فائدہ نوعِ انسانی کا فائدہ اور ایک کا نقصان پوری انسانیت کا نقصان ہے، دیکھیں انسانوں کے سر سے ملک پرستی، قوم پرستی، طبقہ پرستی کا منحوس سایہ کب ہٹتا ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتاب الجنائز مصنفہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری صفحات ۱۱۲ طبع دوم۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب (مرحوم) سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ آپ جامع ترمذی کے شارح اور اس دور کے وسیع النظر محدث اور محقق عالم تھے، تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی کی چار ضخیم جلدوں کے علاوہ آپ نے اور بھی کئی کتابیں مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے لیے چھوڑی ہیں ان ہی میں سے مذکورہ بالا کتاب بھی ہے، یہ کتاب اردو میں ہے، اس میں مولانا نے میت سے متعلق ان تمام ضروری احکام و مسائل کو جمع فرما دیا ہے جو احادیث سے ثابت ہیں۔ مصنف نے موضوع سے متعلق تمام صحیح احادیث کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر ان احادیث سے مسائل کا استخراج و استنباط کیا ہے، اس ضمن میں ائمۂ فقہا کے اختلافات کو بھی ذکر کیا ہے اور مجملاً ان کے دلائل بیان کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے موصوف کے تبحر علمی اور وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے۔

کتاب عام مسلمانوں کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ میت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے کیا ثابت ہے۔ یہ مقصد اس کتاب سے باحسن و خوبی پورا ہوتا ہے نیز اہل علم بھی اس کی علمی تحقیقات سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

زبان سلیس و عام فہم ہے۔ طباعت و کتابت عمدہ ہے۔ کاغذ بہتر ہے، قیمت عمر ہے۔ کتاب حکیم عبدالسمیع صاحب ناظم دواخانہ مفید عام ڈاک خانہ مبارک پور، صوفی پورہ، ضلع اعظم گڑھ سے طلب کی جا سکتی ہے۔

تجدید تصوف و سلوک مرتبہ مولانا عبدالباری صاحب ندوی صفحات [illegible]، قیمت فی کتاب مجلد پانچ روپے۔

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مرحوم ان اکابر علماء میں سے تھے جنہوں نے دین کی بہت سی اہم خدمات انجام دی ہیں [illegible] تصوف [illegible] علوم و فنون [illegible] تصانیف [illegible] ہیں۔ مولانا عبدالباری صاحب ندوی [illegible] مولانا کے [illegible] تصوف کے متعلق ایک سلسلۂ تصانیف شروع فرمایا ہے

ان میں انہیں ایک کامل و مکمل ہستی، دورِ حاضر کے واحد اخلاقی مصلح، صدی کے مجدد بلکہ جامع مجدد دین کی حیثیت سے پیش فرمانے کی کوشش کی ہے، مذکورہ بالا کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مولانا تھانوی نے "تصوف و سلوک" میں کیا کیا تجدیدات فرمائی ہیں اور ان کی کیا اہمیت و افادیت ہے۔

کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ مولانا تھانوی نے تصوف کے سرچشمہ کو پاک صاف کرنے اور اسے شریعت کے ماتحت اور اس کی روح کے مطابق بنانے کی بہت کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ ایک حد تک کامیاب رہے ہیں لیکن اس سے آگے بڑھ کر ان کے ہر قول کو قولِ فیصل قرار دینا اور ہر عمل کو "اسوہ" کی حیثیت سے پیش کرنا اور انہیں کامل و مکمل تصور کرنا غلو ہے جس کے نتائج خطرناک ہیں۔

فاضل مرتب نے سرورق پر کتاب کا تعارف جن الفاظ میں کرایا ہے وہ یہ ہیں۔

"تجدید تصوف و سلوک جس میں تصوف کے متعلق ہر قسم کی علمی و عملی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر کے بتلایا گیا ہے کہ حقیقی تصوف در اصل کمال اسلام اور کمال ایمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور بے صوفی بنے اسلام کی دنیوی و اخروی، انفرادی اور اجتماعی برکات و ثمرات کا حاصل ہونا عملاً ناممکن ہے"

ظاہر ہے کہ کون مومن کمالِ اسلام و کمالِ ایمان کا طلب گار نہ ہوگا لیکن پورے خلوص اور کافی غور و خوض سے مطالعہ کرنے کے بعد بھی کتاب سے اس دعوی کا ثبوت نہ مل سکا کہ حقیقی تصوف کمالِ اسلام و کمالِ ایمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ قلب کی اصلاح اہم ہے یا نہیں اور اللہ سے محبت و عشق اور خشوع مطلوب و مقصود ہے یا نہیں، یہ مسئلہ مختلف فیہ نہیں ہے کیونکہ کتاب و سنت پر نظر رکھنے والے اس میں دو رائیں نہیں رکھ سکتے اور نہ ان امور کی اہمیت تسلیم کر لینا تصوف سے کلی اتفاق کے مترادف ہے۔ اصل قابلِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ اس مقصود کو حاصل کرنے کے مشروع طریقے کیا ہیں، ظاہر و باطن کے تزکیہ کے لیے کتاب و سنت میں کیا ہدایات دی گئی ہیں اور مزکیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح لاکھوں انسانوں کا تزکیہ فرمایا تھا اور بعد کے آنے والوں کے لیے آپ نے اصلاحِ باطن کے سلسلے میں کن طریقوں کی رہنمائی فرمائی تھی۔ یہ امور پوری وضاحت سے دلائل و شواہد کے ساتھ سامنے آنا چاہیے تھے تاکہ جو شخص بھی کمالِ اسلام و کمالِ ایمان کی راہ پر چلنا چاہتا، پوری طمانیت قلب کے ساتھ اس راہ کو اختیار کر لیتا لیکن افسوس ہے کہ یہی بات جو اصل الاصول اور سب سے اہم تھی کھل کر سامنے نہ آئی اور سارا زور اعتراضات کے جوابات، صوفیائے کرام کے طریقوں کی تاویل و توجیہ اور بہت سے ضمنی مسائل پر صرف ہو گیا۔

جو لوگ مرتب کے ہم خیال نہیں ہیں ان کا اختلاف کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ خشوع قلب یا تزکیۂ باطن کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ وہ ان طریقوں کے قائل نہیں ہیں جو یہ حضرات عموماً اختیار کرتے ہیں اور جن کا کوئی ثبوت کتاب و سنت اور خیر القرون سے نہیں ملتا۔ حالانکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے کرنے کا اولین اور اہم ترین مقصود تزکیہ ہی ہوتا ہے اور وہ پوری وضاحت کے ساتھ علمی اور عملی طور پر ان طریقوں کی نشان دہی کرتے ہیں جن کے ذریعہ انسان کے ظاہر و باطن کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

فاضل مرتب خود ہی غور فرمائیں کہ ان طریقوں کی موجودگی میں کچھ مزید طریقے اختراع کرنا یا دوسرے مسالک سے کچھ چیزیں مستعار لینا کہاں تک صحیح ہے اور یہ کہ یہ چیز تکمیل دین اور کمال انبیاء سے کہاں تک مطابقت رکھتی ہے!

علاوہ ازیں ان طریقوں سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں جن میں سے کچھ کی طرف اس کتاب میں اشارے موجود ہیں اور جن کی اصلاح کی یہ حضرات کوشش فرماتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ مفاسد ان طریقوں کا لازمی نتیجہ ہیں اور ان کا ازالہ کلیۃً اور عموماً اسی وقت ممکن ہے جب ان غیر منصوص اور مستحدث طریقوں کو ترک کر دیا جائے اور منصوص طریقوں ہی کو کامل یکسوئی کے ساتھ اختیار کر لیا جائے۔

کتاب بحیثیت مجموعی تصوف کا نئے اور اچھے انداز سے تعارف کراتی ہے اور اس لحاظ سے یہ مطالعہ اور استفادہ کے لائق ہے۔ ذوق رکھنے والے اصحاب مولوی سعید الباری صاحب شبستان، قدم رسول ہارڈنگ روڈ لکھنؤ سے طلب فرما سکتے ہیں۔

اصول دعوت اسلام

مصنفہ مولانا محمد طیب صاحب صفحات ۹۶ قیمت مجلد ایک روپیہ دو آنے (عہ) ادارہ دعوت الحق، غریب خانہ، گوشہ محل روڈ حیدر آباد دکن۔

مصنف ملک کے مشہور عالم دین ہیں، اس تصنیف میں انہوں نے اسلام کی دعوت کے اصول بیان فرمائے ہیں اور سورۂ نحل کی ایک آیت اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ الآیہ کی تشریح ذرا پھیلا کر کی ہے اور پھر اس آیت کے ہر ہر جزء کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف اس تشریح و استنباط میں کامیاب رہے ہیں، زیادہ اچھا تھا اگر دعوت کے سلسلے میں جو دوسری بہت سی آیات قرآن پاک میں موجود ہیں ان سب کو بھی ملحوظ رکھا جاتا، اس صورت میں اصول زیادہ صحیح، زیادہ جامع اور زیادہ عمدگی کے ساتھ مستنبط ہو سکتے تھے، بصورت موجودہ بعض جگہ تکلف و تعمق محسوس ہوتا ہے اور بعض باتیں ضرورت سے زائد معلوم ہوتی ہیں اور بعض اصطلاحات و اصول کی تشریح نظر ثانی کی محتاج نظر آتی ہے اس طرح بعض امور کا انطباق زیادہ صحیح نہ ہو سکا ہے۔ فاضل مصنف نے دعوت کے سلسلے میں دوسرے مذاہب کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی دعوت دی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس مقابلہ کی ضرورت نہیں تھی اور اگر مقابلہ کرنا ناگزیر تھا ہی تو مذاہب کے ساتھ ساتھ موجودہ نظریات اور نظام ہائے زندگی کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔

کتاب میں ایک کمی اور بھی محسوس ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مصنف نے اس کی وضاحت کما حقہ نہیں فرمائی کہ دعوت کس چیز کی دی جائے۔ حالانکہ جس آیت کو مصنف نے تشریح کے لیے منتخب فرمایا ہے اس میں اُدْعُ کے بعد ہی سَبِیْلِ رَبِّکَ کے الفاظ موجود ہیں اور اس دور میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ "سبیل رب" کی توضیح کی جائے کیونکہ بہت سے [illegible] مسلمانوں کے ذہن اس سلسلے میں صاف نہیں ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مصنف نظر ثانی

...امید خیال رکھیں گے۔
بحیثیت مجموعی کتاب مفید ہے اور اس میں بہت سی کام کی باتیں ملتی ہیں۔ دین کا کام کرنے والے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

(ح ج)

...اور اس کے معتقدات عبدالکریم عابد ایک ہونہار اسلامی فن کار ہے اور اس نے بالکل صحیح عنوان پر قلم اٹھایا ہے۔ کمیونزم پر مخالفت اور موافقت میں بڑی سے بڑی کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں اور اس تحریک کے ہر گوشے اور ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن عبدالکریم عابد نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ مارکس کی شخصیت کا تجزیہ کرے اور اس روشنی میں اس کے معتقدات کو سمجھنے کی کوشش کرے،

یہ کتاب تین ابواب پر منقسم ہے۔

(۱) مارکس کا نفسیاتی تجزیہ۔

(۲) کمیونزم کا تاریخی تجزیہ۔

(۳) کمیونزم کا عملی تجزیہ۔

پہلے حصہ میں بہت کامیاب طریقہ سے مارکس کی شخصیت زیر بحث لائی گئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مارکس کی ناکام زندگی نے اس کے مزاج کے اندر چڑچڑا پن پیدا کر دیا تھا اس کا اثر اس کے افکار کی دنیا میں سرمایہ دار طبقہ سے انتقام پیدا پالیسی میں ہوا جس نے انسانیت کے ایک طبقہ کو اپنی آگ کی تلوار کے گھاٹ اتار دینے کی تلقین کی۔ ایک جگہ تو۔

" جو گروہ اپنے آپ کو عملی تبدیلی کے لیے تیار نہ کرے وہ ہمیشہ اپنی کمزوریوں کا الزام خارجی دنیا اور دوسرے گروہوں کے سر تھوپنے کی فکر کرتا رہتا ہے" لکھ کر اس جوان فن کار نے ایک عام لیکن اٹل حقیقت کی طرف ذہن کو متوجہ کیا ہے۔ دوسرا حصہ ان حالات کا سراغ لگانے پر مشتمل ہے جن کے رد عمل کے طور پر ایک غیر انسانی اور غیر علمی تحریک کو فروغ حاصل ہوا۔ لیکن یہ حصہ جتنی تفصیل کا محتاج تھا مصنف نے اتنا وقت دینے کی زحمت نہیں گوارا فرمائی، پھر بھی بہت سے اشارے ایسے ملتے ہیں جو اس تحریک کے پس منظر کو سمجھنے میں کافی مدد دیتے ہیں۔

تیسرا حصہ ایک ہمہ گیر بحث کا عنوان ہے مگر یہاں فن کار اپنے عنوان پر پوری طرح قابو نہ پا سکا، اگر دوسرے ایڈیشن میں اس کوتاہی کی تلافی کر دی جائے تو یہ کتاب بہت مفید اور اہم کام انجام دے گی۔

البتہ زبان و محاورہ کی غلطیاں تکلیف دہ حد تک ہیں امید ہے کہ آئندہ اشاعت میں مصنف اس طرف پوری توجہ رکھیں گے۔ کاغذ بہت معمولی ہے کتابت کا معیار بھی کچھ اونچا نہیں ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ یہ کتاب ذیل کے پتوں سے مل سکتی ہے
"مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد دکن" "دفتر حیات نو ہفتہ وار۔ حیدرآباد دکن"

میں اپنے لیے کوئی راہ نجات بھی سوجھائی نہیں دیتی ہے، سوا اس کے کہ وہ ہنسی خوشی اپنے کو موت کی آغوش میں ڈال دیں اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ان کے ہمدردوں کی ہمدردی جنبش میں نہیں آتی ہے تو اس حالت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ آیندہ آپ کو ان کی ہمدردیاں حاصل ہو سکیں گی اور آپ اس کی وجہ سے بےفکر بخت ہو جائیں گے! اصل یہ ہے کہ مسلمان جن پارٹیوں کو اپنے سہارے کے لیے اُمید کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں، ان میں خود ایسے لوگ گھسے ہوئے ہیں بلکہ اُن کے بہت سے ذمہ دارانہ عہدوں پر قائم ہیں جن کی طبعی خواہش یہی ہے کہ مسلمان اگر ان کے ہاتھوں نہیں، کیوں یہ ان کی یا ان کی پارٹی کی بدنامی کا باعث ہوگا ـــــ تو دوسروں کے ہاتھوں ستائے اور دبائے جائیں تاکہ مسلمانوں کو ذلیل و خوار دیکھ کر خود ان کے دل کو تسکین ہو یا مسلمانوں میں احساس عجز و بےچارگی پیدا ہو تاکہ وہ ان کو اپنے پارٹی کے مقاصد کے تحت جس رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں اس کے لیے راستہ ہموار ہو جائے۔

اور ان پارٹیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو مسلمانوں کا اس طرح تختۂ مشق بننا دل سے تو پسند نہیں ہے لیکن وہ اس پر اس لیے خاموش ہیں کہ ان مظلومین کی حمایت کے جرم میں وہ یا ان کی جماعت پبلک میں بدنام نہ ہو جائے جس کے ووٹوں ہی پر ان کی آیندہ کامیابی و کامرانی کا دار و مدار ہے۔

اور ایک تیسری وجہ ان کی خاموشی اور تحمل کی یہ بھی ہے کہ ان پارٹیوں کے ذمہ دار لوگوں کو بہر صورت یہ اطمینان ہے کہ مسلمانوں کا ووٹ ان کے سوا اور کسی کو نہیں مل سکے گا، بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مسلمان دوسری پارٹیوں کی طرف سے جتنا زیادہ ستائے جائیں گے اُتنا ہی زیادہ وہ ان کے قریب ہونگے کیوں کہ وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مسلمان اس وقت اس حالت میں پہونچ گئے ہیں کہ ان کو ان کے سوا اور کوئی دوسرا سہارا نظر نہیں آتا ہے اس لیے وہ ہر طرف سے پریشان ہو کر اور زیادہ شدت کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہونگے۔

ان باتوں کو سامنے رکھ کر آپ خود غور فرمائیں کہ آپ اپنی محبوب پارٹیوں کی حمایت و امداد کی توقع پر اپنے مخالفین کو اور زیادہ برگشتہ کرنے کا جو کھیل کھیلنا چاہتے ہیں وہ کہاں تک آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ سہارا نہایت بودا سہارا ہے اور اس کے اعتماد پر الیکشن میں حصہ لینا، انتہائی خطرناک بات ہے، اس لیے ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ مسلمانوں کو اس اعتماد پر کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہیے خطرات مصائب سے نجات اس ذریعہ سے ممکن نہیں ہے، اس کے لیے کوئی دوسری ہی راہ اختیار کرنی ہوگی جس کا پہلا قدم الیکشن سے علٰحدگی ہے جو انشاء اللہ اس خطرے کے پہلو سے بھی مفید ثابت ہوگا، کیوں کہ اس سے ایک طرف مخالف پارٹیوں کا جذبہ عناد کچھ نہ کچھ کم ہوگا یا کم از کم اس میں شدت پیدا نہیں ہو سکے گی اور دوسری طرف

ایسے ان کے دوستوں کا جذبۂ ہمدردی بھی شاید کوئی عملی شکل اختیار کرسکے کیونکہ ان سے ان کا یہ اعتماد یقینی طور سے متاثر ہوگا کہ مسلمان ہر حال میں ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہیں اور اس کے بعد یہ توقع ہوسکتی ہے کہ وہ از سر نو مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ فائدہ آپ کے نقطۂ نظر سے آپ کے لیے بہت قیمتی ہوسکتا ہے اور ان دونوں فائدوں کے علاوہ اس سے ایک اور زبردست فائدہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں عام پبلک کا غصہ کچھ فرو ہوسکتا ہے جو خواہ مخواہ مسلمانوں کو ان کے حقوق میں کش مکش کرتے ہوئے دیکھ کر برہم ہوتی ہے اور بظاہر بات ہے کہ ان کی یہ برہمی ہمارے لیے دوگونہ مصیبت کا باعث ہے، مخالفین اس کو ہماری مخالفت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور موافقین اس کی موجودگی میں ہمارے ساتھ مناسب برتاؤ کرنے سے ہچکچاتے ہیں بلکہ اکثر حالتوں میں ان کے جذبات میں ان کا عملاً ساتھ دیتے ہیں، کیونکہ ان کو چھوڑ کر کوئی پارٹی نہ اقتدار حاصل کرسکتی ہے اور نہ اقتدار پر تا دیر متمکن رہ سکتی ہے۔

(باقی آئندہ)

جماعتِ اسلامی (ہند) کا پہلا کل ہند اجتماع

۲۰، ۲۱، ۲۲، اپریل ۱۹۵۱ء مطابق ۱۳، ۱۴، ۱۵، رجب ۱۳۷۰ھ بروز یکشنبہ دوشنبہ رام پور (یو۔پی) میں منعقد ہو رہا ہے۔ مقام اجتماع کوٹھی سعادت یار خاں صاحب تھانہ پاکھڑ ہے، اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل امور خصوصیت سے قابل توجہ ہیں۔

(۱) اپنے اپنے مقام کے سنجیدہ اصحاب کو اس اجتماع میں آنے کے لیے خاص طور سے دعوت دیجئے۔

(۲) شرکاء کی صحیح تعداد کی اطلاع اگر اس میں کوئی کمی بیشی ہو گئی ہو تو اس طرح دیجئے کہ وہ لازماً ۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء تک مرکز موصول ہو جائے۔

(۳) (الف) اگر کچھ غیر مسلم اصحاب شریک اجتماع ہونا چاہتے ہوں تو اُن کی تعداد علیحدہ بیان فرمائیے تاکہ انتظام میں سہولت ہو۔

(ب) اجتماع میں خواتین ارکان جماعت کی شرکت لازمی نہیں ہے لیکن جو مستورات شریک اجتماع ہونا چاہتی ہیں وہ فوراً ناظم اجتماع۔ جناب محمد یوسف صاحب صدیقی کو مطلع کر دیں۔ مستورات کے لیے معقول انتظام بہر حال ہو گا۔

(۴) اگر آپ کچھ تجاویز یا مشورے رکھتے ہوں یا کچھ شبہات ہوں جنہیں دور فرمانا چاہتے ہوں تو ایسی تمام باتوں کو مرتب کر کے مرکز بھیج دیجئے جو ۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء تک لازماً مرکز پہنچ جانی چاہییں خصوصیت سے ارکان جماعت اس طرف زیادہ متوجہ ہوں کیوں کہ دوران اجتماع میں انہیں شبہات کے پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔

(۵) کوشش کی جائے گی کہ اجتماع کا پروگرام تین دن ہی میں ختم ہو جائے۔ تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دن اور لگ جائے اس لیے چار دن قیام کا بندوبست کر کے تشریف لائیے۔

(۶) راشننگ کی دقتوں کے پیش نظر تمام شرکاء ۲ ½ سیر آٹا یا چاول اور آدھ سیر شکر فی کس اپنے ہمراہ لائیں جن مقامات سے ان چیزوں کے لانے میں دقت ہو یا محکمہ راشننگ کی طرف سے کوئی پابندیاں یا قانونی دقتیں ہوں وہ اس سلسلہ میں تفصیلات سے ہمیں اطلاع کر دیں اور مرکز کو ۱۰ اپریل ۱۹۵۱ء تک مطلع کر دیں نیز اپنے ہمراہ راشن کارڈ لا سکتے ہوں لیتے آئیں۔

(۷) اگر کچھ رفقاء مالی مشکلات کی وجہ سے شرکت اجتماع میں کچھ دقتیں محسوس کرتے ہوں تو دیگر رفقاء کا

اخلاقی فرض ہے کہ وہ اُن کی مدد کریں۔

(۸) آپ کا یہ سفر دینی خدمت اور اسلامی جذبہ کے تحت ہوگا اس لیے راستہ میں تمام رفقاء کو خالص اسلامی طریقوں کی پابندی اختیار کرنی چاہیے، مثلاً جگہ کے لیے کشمکش کے موقع پر ایثار سے کام لینا، دوسروں کے آرام کی خاطر خود تکلیف اُٹھانا ناخوش گوار باتوں کو صبر کے ساتھ انگیز کرنا، خدمت اور موعظہ حسنہ کے مناسب مواقع کا پورا لحاظ رکھنا، اور جہاں تک ممکن ہو سفر میں بھی نماز باجماعت کا التزام رکھنا نیز فضول باتوں میں مصروف ہونے کے بجائے ذکر و فکر میں مشغول رہنا وغیرہ۔

نوٹ

تاریخیں مقرر کرنے میں ہم نے حتی الوسع شرکاء کی سہولتوں کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کی ہے لیکن یہ ظاہر بات ہے کہ سب کی سہولتیں بیک وقت ملحوظ نہیں رکھی جا سکتیں۔

محمد یوسف ناظم جماعت

رام پور۔

Regd. No. A - 688 "ZINDGI" Monthly RAMPUR U. P

DELHI ART PRESS RAMPUR U P

- 8 MAY 1951
زندگی

جلد (۵ و ۶)
نمبر (۶ و ۱)
جمادی الآخر و رجب ۱۳۷۰ھ
اپریل و مئی ۱۹۵۱ء

مرتبہ سید حامد علی

فہرست مضامین

چندہ سالانہ (۵) روپے۔ فی کاپی (۸)

سید حامد علی پرنٹر و پبلشر نے ناظم پریس رامپور سے چھپوا کر دفتر زندگی رام پور سے شائع کیا۔

اشارات

بعض لوگ الیکشن سے علیحدگی کا ایک دوسرا نقصان یہ بتاتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں کوئی خطرناک پارٹی برسر اقتدار آجائے گی جو مسلمانوں کے لیے مختلف مصیبتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی، اس لیے مسلمانوں کو بہرحال الیکشن میں حصہ لینا چاہیے اور کسی نسبتاً بہتر یا کم خطرناک پارٹی کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس اپیل کے بارے میں ہماری معروضات کی پہلی قسط گذشتہ اشاعت میں پیش کی جا چکی ہے ذیل میں اس کا حصہ ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اگر بالفرض ایسا ہو بھی کہ ہمارے موجود خطرات و مصائب کا علاج یہی ہو کہ ہم موجودہ پارٹیوں میں سے کسی ایک کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کریں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سی پارٹی ایسی ہو سکتی ہے جس کو ہم اس حیثیت سے منتخب کریں؟ یہ ظاہر بات ہے کہ اس وقت ہم عام ملکی مصالح و مفاد کے پیش نظر ان پارٹیوں کے فرق و امتیاز پر غور نہیں کر رہے ہیں، اگر ایسا ہوتا تو ہم خود بڑی آسانی کے ساتھ کسی ایک پارٹی کے حق میں اپنی رائے ظاہر کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ واقعہ ہے کہ اس حیثیت سے ان میں باہم فرق و امتیاز پایا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ مختلف اعتبارات کے سامنے رکھنے کی وجہ سے لوگ اس بارے میں مختلف الرائے ہوں، جیسا کہ اس وقت ہے —— ہم تو ان پارٹیوں پر اس وقت اس حیثیت سے نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ ان میں سے کون سی پارٹی مسلمانوں کے لیے ان کے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت قابلِ ترجیح ہو سکتی ہے اور اس نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بعد کم از کم ہمارے لیے ان میں فرق و امتیاز کرنا بہت دشوار ہے، اس بارے میں ہم اپنے اس نقطۂ نظر کی توجیہ اس سے پہلے کسی موقع پر بیان کر چکے ہیں اس لیے یہاں اس کو دہرانے کی بجائے ہم یہاں آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس بحث کو یہاں دوبارہ ملاحظہ فرمالیں اور پھر فیصلہ کریں کہ یہ پارٹیاں آپ کے لیے کہاں تک قابلِ قبول ہیں اور خود یہ پارٹیاں آپ کی ملی حیثیت میں آپ کے ساتھ کہاں تک رعایت کر سکتی ہیں۔ یہ سوال اس صورت میں ہے جب یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ پارٹیاں واقعی جن اصولوں کا نام لے رہی ہیں، ان میں وہ مخلص ہیں، لیکن اگر ایسا نہ ہو بلکہ اصولوں کا نام محض دکھاوے کے لیے لیا جا رہا ہو، یا کسی اصولی پارٹی کے لیے اپنے مقاصد و نظریات کے سبب وجہ کی [illegible]

اور شیفتگی مطلوب ہے، اس کے لحاظ سے وہ فرقہ پرور ہوں تو معاملہ اور زیادہ نازک اور مایوس کن ہوجاتا ہے، کیونکہ اس کا مطلب پھر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ جن پارٹیوں کو آپ بظاہر اپنا ہمدرد سمجھ رہے ہوں، وہ بھی اپنی اصل حیثیت میں آپ کی مخالف جماعتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوں۔ کیوں کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں اگر کوئی پارٹی اپنے اصول و مقاصد سے ہٹ سکتی ہے تو یقیناً ہندو مسلم مسائل کے ضمن میں اس کا رجحان فرقہ پرستی ہی کی طرف ہو سکتا ہے اور یہ بات اس حقیقت سے بھی نمایاں ہے کہ تقسیم سے پہلے جو جماعتیں اس حیثیت سے بدنام تھیں کہ وہ مسلم نواز ہیں، خود ایسی پارٹیوں کا حال اب یہ ہو چکا ہے کہ خود ان پارٹیوں کے مخلصین عام ممبروں کی فرقہ وارانہ ذہنیت کے شاکی ہیں، اور اس کا تجربہ یقیناً آپ کو بھی مختلف حیثیتوں میں بار ہا ہو چکا ہوگا، اور اس طرح کے چند مخلصین بھی اب چراغ سحری ہیں اور وہ شاید اس سے مایوس بھی ہو چکے ہیں کہ وہ اپنی تھکی ہوئی ہمتوں اور اپنے بوڑھے دست و بازو کے ذریعے فرقہ پرستی کے عام سیلاب کو روکنے میں کامیاب ہو سکیں گے، اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں اگرچہ ایک جمہوری نظام آئین نافذ ہے جو اپنی ظاہری ہیئت میں بہت شاندار اور یہاں کی اقلیتوں کے لیے بہت اطمینان بخش نظر آتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عوام اپنے مزاج و ذہنیت کے اعتبار سے ابھی جمہوریت سے کوسوں دور ہیں، اور یہ پارٹیاں ایسے ہی جمہور کا مرکب یا اس کی نمائندہ ہیں، اس لیے وہ ابھی تک عوامی جذبات سے بالاتر نہیں ہو سکی ہیں۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ عوام کے اس مزاج و ذہنیت کی تبدیلی کا اس وقت کوئی سامان بھی نہیں ہے، حتی کہ جن لوگوں کو اس ذہنیت سے خاص طور سے نقصان پہونچ رہا ہے، وہ بھی اس کی اصلاح میں اپنا حصہ رسدی ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس وہ اس میں تبدیلی کرنے کی بجائے اپنے لیے زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کو علی حالہ چھوڑ کر اس سے تحفظ کے لیے اپنی تدابیر اختیار کریں، خواہ یہ تدابیر ایسی ہی کیوں نہ ہوں جو ایسی ذہنیت کو اور زیادہ ہوا دینے والی ثابت ہوں۔ یہی غلطی مسلمان ایک عرصہ سے کرتے چلے آرہے ہیں اور اب اس کا تلخ خمیازہ بھگتنے کے بعد بھی وہ اصل مرض کا علاج سوچنے کی بجائے ایسی ہی تدابیر اختیار کرنے پر مصر ہیں۔

بہر حال یہ الگ بحث ہے، اس وقت کہنا یہ ہے کہ جب ہندوستان کی موجودہ پارٹیوں کی اصل حیثیت یہ ہے کہ ہم ان میں سے کسی سے بھی اپنی پریشانیوں میں کسی خاص امداد کی توقع نہیں کر سکتے، تو پھر ہمارے لیے یہ سوال کیا اہمیت رکھتا ہے کہ آئندہ الکشن میں ان میں سے کون سی پارٹی برسر اقتدار آتی ہے۔ جو پارٹی بھی کامیاب ہو ہمیں یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ ہمارے لیے یکساں مفید یا یکساں مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر ان میں اس وقت بظاہر کوئی فرق ہو بھی تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ فرق اس بات کا نتیجہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ پارٹیاں ایسی ہیں جو فی الحال اقتدار کی مالک ہیں اور ان کے کندھوں پر ملک کے نظام و انصرام کی ذمہ داریاں ہیں، اور دوسری پارٹیاں جو اقتدار سے محروم ہیں اور اس کے لیے دو کوشاں ہیں، یہ فرق خود ان میں مختلف حیثیتوں سے فرق کا موجب ہے، اس لیے یہ ناممکن نہیں ہے کہ اگر آئندہ الکشن میں برسر اقتدار پارٹیاں اقتدار سے محروم اور محروم پارٹیاں برسر اقتدار آجائیں تو اس تبدیلی کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ضمن

میں ان کا موجودہ رجحان و رویہ بھی بدل جائے، ایسی حالت میں کسی پارٹی کے ساتھ ہر طرح کی امیدیں وابستہ کرلینا اور دوسری سے بالکلیہ مایوس ہوجانا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

---

(۳) تیسری بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ان پارٹیوں میں ہماری ہمدردی یا مخالفت کے اعتبار سے باہم فرق مراتب پایا جاتا ہے، اور یہ ہمارے لیے بہت زیادہ قابل لحاظ ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آیندہ الکشن میں کسی پارٹی کی کامیابی یا ناکامی محض آپ کی تائید یا مخالفت پر منحصر ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً آپ الکشن میں حصہ لے کر بہت کچھ دنیاوی فائدے حاصل کرسکتے تھے، لیکن ظاہر بات ہے کہ ایسا نہیں ہے مسلمانوں کی تعداد بلاشبہ ہندوستان میں اب بھی بہت زیادہ ہے، لیکن یہ تعداد کہیں اکٹھی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے طول و عرض میں اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ اگر وہ سب مل کر بھی چاہیں کہ کسی ایک امیدوار کو الکشن میں کامیاب بنادیں تو اس میں کامیاب نہیں ہوسکتے ہیں، کیونکہ ہندوستان کا آئندہ الکشن مخلوط بنیاد پر ہوگا اور ہندوستان میں شاید ہی کوئی نشست ایسی ہو جہاں مسلم ووٹروں کی تعداد کوئی فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہو، غیرمسلم ووٹروں کی ہر جگہ اکثریت ہے اور یہی فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس صورت میں تو ان کی یہ حیثیت اور زیادہ بڑھ جائے گی۔ جب مسلمان بحیثیت جماعت کسی امیدوار کی تائید کر رہے ہوں، کیونکہ اس حالت میں صرف ان کی حمایت ہی اس امیدوار کی نالائقی کی سب سے بڑی دلیل سمجھی جائے گی اور اس کی مخالفت پر پوری غیرمسلم اکثریت متفق ہوجائیگی، گویا اس طرح الیکشن میں حصہ لے کر مسلمان اپنے کو بھی نقصان پہونچائیں گے اور اس پارٹی کو بھی جس کو وہ کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

"ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو"

پھر مصیبت تنہا یہی نہیں ہے کہ مسلمان اس طرح ظاہری طور سے بکھرے ہوئے ہیں بلکہ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان میں کسی طرح کی فکری ہم آہنگی اور یکجہتی موجود نہیں ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ظاہری طور سے منتشر ہونے ہوئے بھی اپنی معتدبہ تعداد کے ذریعہ الیکشن پر بہت کچھ اثر انداز ہوسکتے تھے، لیکن اس وقت حالت یہ ہے کہ وہ کسی ایک نقطہ پر نہ مجتمع ہیں اور نہ مجتمع ہوسکتے ہیں، حبل اللہ المتین کو چھوڑ کر وہ مختلف احزاب میں تقسیم ہوگئے ہیں، ہندوستان کی کون سی ایسی پارٹی ہے جس میں مسلمان شریک نہ ہوں، حد یہ ہے کہ ہندو مہاسبھا کے جنرل سکرٹری کے بیان کے مطابق بہت سے مسلمان مہاسبھا میں بھی شریک ہو رہے ہیں تاکہ آئندہ الکشن میں اس کو کامیاب بنائیں، گویا مسلمانوں کی حیثیت ہی اس وقت یہ ہوگئی ہے کہ نہ ان کا خود اپنا کوئی وجود ہے اور نہ اس کا کوئی مخصوص مطمح نظر، وہ ہر اس پارٹی کا ممبر ہوسکتا ہے جس کی ممبری اس کے سامنے پیش کی جائے اور جس کے ذریعہ اس کے خیال کے مطابق کوئی چھوٹے سے چھوٹا دنیاوی فائدہ پہونچ سکے، پس جب حالت یہ ہو تو آپ کے پاس آخر وہ کون سا آلہ ہے جس کو استعمال کرنے کے بعد آپ یہ توقع رکھ سکتے

ہوں کہ تمام مسلمان آئندہ الکشن میں صرف اس پارٹی کا ساتھ دیں گے جس کو آپ نے مسلمانوں کے حق میں بہتر یا کم خطرناک سمجھ کر اپنی تائید کے لیے منتخب کیا ہو؟ اور اگر آپ کا منشا یہ ہو کہ چاہے مسلمان متفق ہوں یا نہ ہوں، جو لوگ کسی پارٹی کو اس نقطۂ نظر سے بہتر سمجھتے ہوں، انھیں اپنی حد تک اس کی تائید کرنی چاہیے تو بلاشبہ آپ کو اس کا حق حاصل ہے اور ہم خود اس اصول کے قائل ہیں کہ ہمیں اپنے عمل کی بنیاد خود اپنے ذاتی فکر و عقیدہ پر رکھنی چاہیے اور اس کے بارے میں اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے کہ اس میں ہمارا ساتھ دینے والے کتنے ہیں، لیکن اس کے بعد آپ کو یہ دلیل پیش کرنے کا کوئی حق باقی نہیں رہ جاتا کہ آپ کا یہ پسند کیا ہوا یہ طریقہ مسلمانوں کے لیے خطرات کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے مفید بھی ہے کیونکہ یہاں جس فائدہ پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان سب کے سب یا ان کی اکثریت اس پر متفق ہو، صرف اس صورت میں آپ کسی بہتر پارٹی کو کامیاب بنانے میں کچھ مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور اسی صورت میں آپ اس کو کسی درجہ میں اپنا ممنون کر کے اس کی اعانت و ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، اگر ایسا نہ ہو تو پھر الکشن میں مسلمانوں کی شرکت سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ ان کی قوتیں رائگاں جائیں، ان کا انتشار اور زیادہ بڑھے اور نمایاں ہو، مخالفین کا جوش مخالفت اور زیادہ ترقی کرے، اور کوئی ایک پارٹی بھی ان سے زیادہ خوش نہ ہو سکے، اور اگر آپ مسلمانوں کی اس انتشار کی کیفیت کے باوجود اس اعتماد پر الکشن میں حصہ لینا چاہتے ہیں کہ یہ پارٹیاں تحسبھم جمیعا وقلوبھم شتی کی مصداق ہیں اور ایسی حالت میں مسلمانوں کی تھوڑی سی جمعیت بھی الکشن کے نتیجہ کو ان کے حق میں موڑ سکتی ہے تو یہ بات صحیح ہو سکتی تھی لیکن ایسا اس وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان بھی ان ہی کی طرح منتشر اور پراگندہ نہ ہوتے، بلکہ جیسا کہ ان کو ہونا چاہیے، ان کی حیثیت "بنیان مرصوص" یا "جسد واحد" کی ہوتی اور وہ سب مل کر کسی پارٹی کی حمایت یا مخالفت کرتے ہوتے۔ موجودہ حالت میں جب کہ یہ ان سے بھی زیادہ انتشار میں خود مبتلا ہیں اور اس کے ساتھ ہی بدحواسی نے ان کو تدبیر و حکمت سے بھی کوسوں دور پھینک دیا ہے، یہ توقع رکھنا، انتہائی سادہ لوحی کی بات ہے۔ پھر اسی کے ساتھ اس ضمن میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ ان پارٹیوں کی یہ باہمی چپقلش ان کے لیے کتنی ہی مضر کیوں نہ ہو، اس سے آپ کو کوئی فائدہ پہونچنے والا نہیں ہے، اول تو وہ آپس میں کتنا ہی لڑیں بھڑیں، وہ آپ کو اپنے قریب آنے دینے کی روادار نہیں ہیں بشرطیکہ آپ فی الواقع اپنے کو مٹا کر ان کے جسم کا جزء نہ بن جائیں اور اگر آپ قریب جانے کا کوئی موقع نکال بھی لیں تو یہ لڑائی بھڑائی آپ کے لیے اس حیثیت سے بالکل بے معنی ہے کہ اس میں جو پارٹی بھی کامیاب ہوگی وہ کوئی آپ کی پارٹی نہیں ہو سکتی، وہ انھیں پارٹیوں میں سے کوئی پارٹی ہوگی اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی آپ کے دکھ کا مداوا نہیں ہے۔

الکشن سے علٰحدہ رہنے کے جو نقصانات عام طور سے بیان کیے جاتے ہیں ان میں ہمارے نزدیک قابل بحث صرف یہی دو نقصانات ہیں جن کا ہم نے اوپر اور اس سے پہلے کی اشاعت میں تذکرہ کیا ہے، لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے

یہ نقصان سرے سے کوئی نقصان نہیں ہیں اور اگر کسی پہلو سے ہیں بھی تو وہ اس درجہ کے نقصان نہیں ہیں کہ ان کی خاطر ہم ان تمام نقصانات کو گوارا کر سکیں جو الکشن میں حصہ لینے سے قطعی طور سے پہونچنے والے ہیں، اور نہ ان نقصانات کی اتنی اہمیت ہے کہ ان سے بچنے کے لیے ہم ان فوائد سے دست کش ہونا گوارا کر سکیں جو اس علٰحدگی سے پہونچیں گے۔

ان دو نقصانات کے علاوہ بعض لوگ کچھ اور نقصانات کا نام بھی لیا کرتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ نقصانات لائق توجہ یا قابل بحث نہیں ہیں، اس لیے ہم ان پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے، البتہ ان کا سرسری تذکرہ یہاں اس لیے کرنا چاہتے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ مسلمان اس وقت کس ذہنی ابتری اور انتشار کے شکار ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ الکشن سے مسلمانوں کی علٰحدگی ان پارٹیوں کی ناخوشی کا موجب ہوگی جن کا مسلمان اب تک ساتھ دیتے آئے ہیں، اس لیے چاہے ان کا ساتھ دینے سے مسلمانوں کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ان کی مروت کے منافی بات ہے کہ وہ الکشن جیسے نازک موقع پر ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

یہ دلیل پیش کرنے والے تھوڑے لوگ ہیں لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ تحت الشعور میں ہمارے بہت سے بزرگ اسی دلیل کو اپنے لیے رہ نما بنائے ہوئے ہیں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس دلیل پر اپنی انتہائی نفرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتے، الکشن میں حصہ لینے سے اگر ہمیں نقصان پہونچ رہا ہو تو یہ مروت نہیں ہے کہ ہم اس نقصان کو کسی کی خوشی یا ناخوشی کے لیے گوارا کر لیں۔ بلکہ یہ انتہائی حماقت کی بات ہے، مروت کے اظہار کے مواقع ہوتے ہیں اور پھر شخصی اور قومی مروت میں بھی بڑا فرق ہے، جہاں مروت برتنے سے صرف شخصی نقصان پہونچ رہا ہو وہاں یہ چیز جائز ہو سکتی ہے بلکہ بہت سی صورتوں میں صفت محمود بھی بن سکتی ہے لیکن اگر اس سے پوری قوم و ملت کو نقصان پہونچ رہا ہو تو ایسی مروت ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے اور اس کو وہی شخص گوارا کر سکتا ہے جو اپنے شخصی فوائد و مصالح کو قومی و ملی فوائد و مصالح پر ترجیح دے رہا ہو، پھر یہ بات بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ مسلمانوں کا الکشن میں حصہ نہ لینا کسی پارٹی کے لیے ناخوشی کا موجب کیوں ہوگا، سوا اس کے کہ اس سے خود اس کو کوئی نقصان پہونچنے والا ہو، ہمدردی کا جذبہ تو بہرحال ناخوشی کا محرک نہیں ہو سکتا بالخصوص ایسی حالت میں کہ کوئی قوم اپنا فائدہ علٰحدگی ہی میں سمجھ رہی ہو۔ الکشن میں حصہ لینے یا نہ لینے کی ہر قوم مجاز ہے وہ اپنے مصالح کے تحت ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت کو بھی اختیار کر سکتی ہے پھر اس پر کوئی دوسرا جز بز کیوں ہو؟ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اگر مسلمان علٰحدگی کا یہ فیصلہ احتجاجاً کر رہے ہوں تو قدرتی طور پر بعض لوگوں پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے، وہ اس کو اپنے خلاف اظہار ناخوشی سمجھ سکتے ہیں اور اس سے وہ ناراض بھی ہو سکتے ہیں لیکن اول تو ہمارے نزدیک یہ علٰحدگی کسی احتجاج یا شکایت کے جذبہ کے تحت ہونی نہیں چاہیے، بلکہ اس کا اصل محرک ہمارا اپنا دینی احساس و شعور ہونا چاہیے، اور اس طرح علٰحدگی بھی بس محض علٰحدگی کے لیے نہیں ہونی چاہیے بلکہ کسی بہتر کام کے لیے جس کا فائدہ پورے ملک کو پہونچ سکتا ہو۔ اور یہی بات تمام لوگوں پر واضح بھی کر دینی چاہیے، اور دوسرے اگر یہ

کسی درجہ میں احتجاج ہی سمجھا جائے تو ان پارٹیوں کو اس پر خفا ہونے کی بجائے اس پر اس حیثیت سے غور کرنا چاہیے کہ مسلمان یہ قدم اٹھانے پر کیوں مجبور ہو رہے ہیں، اور پھر اسی حیثیت سے انھیں اپنا رویہ بھی متعین کرنا چاہیے، بہرحال اس کے لیے ان کو صرف مسلمانوں کو مطعون کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، اس کے ساتھ جن لوگوں کو اس ناخوشی کی بڑی اہمیت محسوس ہوتی ہو وہ ان کا غصہ یوں بھی دور کر سکتے ہیں کہ ان پر یہ واضح کر دیا جائے کہ ہماری یہ علیحدگی خود ان کے حق میں مفید ہو سکتی ہے کیونکہ ہمارے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ خود مفت میں بدنام ہو رہے ہیں اور اس بدنامی کا براہ راست اثر الکشن کی کامیابی یا ناکامی پر پڑتا ہے۔

کچھ لوگ اس دلیل کو اس سے زیادہ وسعت کے ساتھ پیش کرتے ہیں، ان کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کی علیحدگی کسی خاص پارٹی ہی کی ناخوشی کا موجب نہیں ہوگی، بلکہ بحیثیت مجموعی تمام پارٹیاں اس سے ناراض ہو جائیں گی اور یہ چیز مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہو سکتی، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ خیال صداقت پر مبنی نہیں ہے، ہندوستان کی کتنی ہی پارٹیاں ہیں جو مسلمانوں کی علیحدگی کو اپنے لیے مفید سمجھیں گی اور اس بنا پر وہ نہ صرف یہ کہ ناراض نہیں ہوں گی بلکہ خوش ہوں گی اور ان کی خوشی یا ناخوشی، سے قطع نظر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے ہمیں اپنے رویہ کی بنیاد اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہیں رکھنی چاہیے۔ ہمیں بحیثیت مجموعی اپنے مفاد و مصلحت کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس کے مطابق اپنے طرز عمل کا فیصلہ کرنا چاہیے، خواہ اس سے کسی کو کتنا ہی دکھ کیوں نہ پہونچے اور اس کی وجہ سے کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیدا ہوں، کوئی قوم دوسروں کی خوشی یا ناخوشی کے ساتھ اپنی موت و زیست کو وابستہ نہیں کر سکتی اور اگر کوئی قوم ایسا کرے تو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

کچھ لوگ الکشن سے علیحدگی کا یہ نقصان بتاتے ہیں کہ الکشن نے ہمارے لیے یہ موقع فراہم کیا ہے کہ ہم ان پارٹیوں میں گھس کر ان کو ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں کر سکیں۔ اس لیے ہمیں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے، یہ دلیل ہمارے نزدیک انتہائی سفاہت پر مبنی ہے۔ اگر یہ چیز ممکن ہو بھی تو یہ کسی طرح ہمارے شایان شان نہیں ہے، پہلی بات یہ ہے دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کی بدبختی پر اپنا مستقبل تعمیر نہیں کر سکتی، اس کے لیے ٹھوس بنیادیں درکار ہیں۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں یہاں کی عام خوش بختی اور بدبختی سے الگ ہو کر اپنے لیے کسی خوش بختی کی توقع نہیں کر سکتے، جو چیز یہاں کی عام آبادی پر مضر اثر ڈال سکتی ہے اس کے اثرات سے ہم اپنے کو بھی محفوظ نہیں کر سکتے ہیں، اس لیے جو لوگ اس انداز سے سوچتے ہیں وہ ملک ہی کے دشمن نہیں ہیں بلکہ خود اپنی قوم اور خود اپنے بھی دشمن ہیں بعض لوگوں کی زبانی اس طرح کی دلیلیں سن کر ہمیں مسلمانوں کی حالت پر انتہائی قلق ہوتا ہے۔ ان کے نادان لوگ اپنے غم و غصہ کی شدت میں عقل و ہوش کی تمام حدود کو نظر انداز کر جاتے ہیں، اور یہ حالت انتہائی تباہ کن ہے، بہرحال یہ اور اسی طرح کی دلیلیں اس وقت الکشن سے علیحدگی کے نقصانات کے ضمن میں پیش کی جاتی ہیں، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ نے گذشتہ تفصیلات سے

(بقیہ بر صفحہ ۳۲ پر)

تیسیر القرآن

(۸)

سورۂ بقرہ از آیت (۶۲) تا آیت (۷۴)

مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ؀	یقین جانو، خواہ ان لوگوں کی جماعت ہو جو (قرآن پر) ایمان لائے خواہ یہودیوں کی، عیسائیوں کا گروہ ہو خواہ صابیوں کا، جو بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا، اور صالح اعمال کرتا رہا، وہ اپنا اجر اپنے رب کے ہاں (ضرور) پائے گا۔[۵] جہاں اس کے پاس نہ کسی طرح کا کوئی خوف پھٹکے گا نہ کوئی غم۔

[۵] سینتالیسویں آیت سے جو فقرہ شروع ہوا تھا وہ گذشتہ آیت (۶۱) پر آکر ختم ہو گیا جیسا کہ ابھی اوپر کی تشریح میں گذر چکا۔ اب اس آیت سے یہود کے ایک ایسے نظریے کی تردید کی جا رہی ہے جو اوپر گذرنے والے نقطہ ہائے نظر کا قدرتی نتیجہ اور ان کے غلط افکار اور برے اعمال کا سرچشمہ تھا، جس نے ان کی دینی زندگی کی پوری عمارت کج بنا رکھی تھی، اور بدی، شرارت، سرکشی اور باغیانہ عبارت کے دروازے ان پر چوپٹ کھول دیے تھے۔ ان کا گمان تھا کہ ہم پیدائشی جنتی ہیں اور ہمارے سوا جنت میں کوئی نہیں جائے گا، قطع نظر اس سے کہ ہمارے اعمال و عقائد کیا ہیں،

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸) اور دوسروں کے ایمان و عمل کا کیا عالم ہے؟ مطلب یہ ہوا کہ ان کے خیال کے مطابق نجات اور بخشش صرف ان کے گروہ کے لیے مخصوص تھی اور جو کوئی یہودیت سے گروہی انتساب نہیں رکھتا وہ بہرحال جہنمی ہے۔ یہ بات کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں کہ اس احمقانہ خوش گمانی کے بعد انسان کا بالکل چھوٹ، اور بندۂ نفس ہو جانا ایک یقینی امر ہے، چنانچہ یہود کی پوری تاریخ دراصل اسی المناک حقیقت کی ایک طولانی شرح ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ اُن کے اسی مہلک اور خود ساختہ نظریہ کی بیخ کنی فرما رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شفیق باپ کی نگاہ میں اس کے مختلف بچے ممکن ہے، کچھ فرق رکھتے ہوں، مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ میں اپنے پیدا کیے ہوئے اور اپنے پالے ہوئے عام انسانوں میں کوئی تفریق کروں؟ ایک کو پیدائشی جنتی، اور دوسرے کو پیدائشی دوزخی بنا دوں؟ یہ تو میرے عدل کی قطعی نفی ہے، میری حکمت کے بالکل خلاف ہے، اور میری رحمانیت کا صریح ضد ہے، میں انسان پر بحیثیت انسان نظر ڈالتا ہوں، نہ کہ بہ حیثیت قومیت، وطنیت، نسلیت اور ملیت میری نگاہ میں قدر صرف ایمان اور عمل صالح کی ہے، یہ پونجی جب کسی کے پاس ہو گی، اس کی قیمت لگے گی اور میرے یہاں پورے کا پورا اجر پائے گا، خواہ اس کا تعلق کسی قوم اور کسی نسل سے ہو۔ بدعقیدہ و بدعمل اگر نبی زادہ ہی کیوں نہ ہو، بلاشبہ اُس کا مقام جہنم ہے، اور تمہاری طبقاتی، نسلی اور سماجی تقسیم کی رو سے اگر ایک شخص دُنیا کا پست سے پست انسان ہو، مگر ہو ایمان و عمل کی زینتوں سے آراستہ، تو اس کا مقام نعمتوں بھری جنت میں ہوگا، انبیاء اور اولیاء کے پاس۔ اس عام ضابطہ سے نہ تم مستثنیٰ ہو، نہ نصاریٰ، نہ صابئین (یعنی ملائکہ پرست اور ستارہ پرست لوگ) حتیٰ کہ یہ گروہ بھی جو قرآن پر ایمان لانے والا ہے۔

اس آیت میں "ان لوگوں کی جماعت جو قرآن پر ایمان لائے" کے الفاظ سے مراد مومنوں کا صفاتی تصور نہیں ہے جیسا کہ بالعموم ہوا کرتا ہے، بلکہ ان کا گروہی اور ملّی تصور مراد ہے۔ یعنی یہ الفاظ یہاں اسم صفت کے طور پر نہیں استعمال کیے گئے ہیں، بلکہ مسلمانوں کی جماعت کے لیے علم یا اسم ذات کی حیثیت سے لائے گئے ہیں، اور اس سے لازماً یہ مراد نہیں کہ "وہ لوگ جو صحیح معنوں میں قرآن کے پیرو ہیں" بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ "وہ لوگ جو اپنے کو مسلم جماعت کا فرد کہتے اور سمجھتے ہیں"۔

اس جگہ یہ نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی نجات و بخشش کے باب میں اپنا ضابطہ عدل بیان کرتے وقت سب سے پہلے خود مسلمانوں کا نام لیا ہے، حالانکہ گفتگو یہود سے ہو رہی تھی۔ یہ صرف اس لیے کہ یہود پر اس ضابطۂ الٰہی کے عام ہمہ گیر اور یکساں ہونے کا نفسیاتی طور پر گہرا اثر ہو، اور وہ محسوس کریں کہ قرآن اس اصول کا اطلاق خود اپنا نام لینے والوں پر بھی کرتا ہے اور سب سے پہلے کرتا ہے۔ نیز اس لیے تاکہ خود مسلمان بھی کبھی اس اُمّ الامراض کا شکار نہ ہو جائیں، اور وہ بھی یہ نعرہ لگا کر دینِ حق کی اطاعت سے کنارہ کشی نہ اختیار کر لیں کہ ہم فلاں ابن فلاں ہیں۔

اس آیت کے سیاق و سباق، اس کے پس منظر اور اس کے اصل مفہوم کی اس توضیح کے بعد اس خیالِ خام کا کوئی امکان

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) نہیں باقی رہنا چاہیے کہ نجات کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری نہیں اس لیے اس آیت میں نجات کا مدار صرف توحید اور قیامت کے یقین، اور عمل صالح کو قرار دیا گیا ہے، اور نبوت کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہٰذا کسی خاص نبی یا پورے سلسلۂ انبیاء کا انکار کر کے بھی انسان مغفرت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کو اپنے ذاتی نظریے، یا کسی اور کے نظریے کی حیثیت سے ایسی باتیں کہنے کا تو ہر حال میں حق دیا جا سکتا ہے مگر نہ تو قرآن پر صحیح معنوں میں ایمان لانے والے کے لیے ایسا تصور کرنا ممکن ہے، نہ ہی اس آیت کے پیش نظر قرآن کی طرف اس بے بنیاد نظریہ کو منسوب کرنا درست ہے، اس لیے کہ:-

(ا) یہ موقع ایمانیات اور اعمال صالحہ کی تفصیل بیان کرنے کا نہیں ہے، بلکہ سردست ایک ایسے گروہ کے خیال کی تردید مدنظر ہے جو نجات کی بنیاد بجائے ایمان و عمل کے نسلیت اور تلبیت پر رکھتا تھا۔ یہ کوئی غیر متعارف اصول نہیں کہ جب کسی کی تردید کی جاتی ہے تو ذکر میں صرف وہ باتیں آتی ہیں جو بر وقت اختلاف کی بنیاد ہوں اس لیے یہاں اعمال صالحہ کا ذکر تو بالکل مجمل طور سے کر دیا گیا، اور ایمان کے ذکر میں تھوڑی سی تفصیل سے بھی نہ کہ پوری تفصیل سے، کام لیا گیا ہے۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ درحقیقت دین کی بنیاد دو ہی چیزوں پر ہے، ایک تو اللہ واحد پر ایمان، دوسری آخرت پر ایمان۔ رہی نبوت، تو اس پر ایمان بالذات ضروری نہیں ہے بلکہ بالغیر ضروری ہے۔ چونکہ نبی ہی ذریعہ بنتا ہے خدا کی ذات وصفات کی معرفت کا، قیامت سے باخبر ہونے کا، رب العٰلمین کے ان احکام و مرضیات کے علم کا، جن پر عمل صالح کا تمام تر انحصار ہے، اس لیے نبی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے اس آیت میں، اور اسی طرح بہت سی اور آیتوں میں بھی نبی پر ایمان لانے کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

(ب) قرآن مجید میں کئی مقامات پر یہ بات بالکل عیاں کر دی گئی ہے کہ قرآن کے سوا سچی ہدایت کہیں بھی اپنی صحیح اور مکمل شکل میں موجود نہیں، اور وہ شخص جو کسی نبی کو، خصوصاً نبی آخر الزماں کو تسلیم نہیں کرتا، حالانکہ اس کے سامنے آں حضرت کی بعثت و دعوت مناسب انداز میں پیش بھی کی جا چکی ہو، وہ چاہے توحید پر، قیامت پر، فرشتوں پر، جنت اور دوزخ پر، باقی سارے انبیاء پر، بقیہ تمام کتابوں پر ایمان لانے کا کیسا ہی بلند بانگ دعویٰ کیوں نہ کرے، اور اپنی دانست میں کتنا ہی نیک رو کیوں نہ ہو، ہرگز نہ بخشا جائے گا، اور حقیقت یہی کہ وہ پکا کافر ہے۔ جیسا کہ سورۂ نساء آیت ۱۵۰ میں واضح اعلان موجود ہے۔

(ج) خود اس آیت کے اندر شرائطِ نجات میں اعمال صالحہ کو بھی داخل قرار دیا گیا ہے، اور ہم کہیں گذشتہ بحثوں میں اس اصطلاح قرآنی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ کسی عمل کا صالح ہونا منحصر ہے تین شرطوں پر، خدا ہی کی رضا کے لیے ہونا اس کی صفات پر صحیح طور سے ایمان رکھتے ہوئے کیا جانا اس کے

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ

(یاد کرو وہ وقت) جب[1] ہم نے تمہارے اوپر طور (کی چوٹیاں) بلند[2] کرتے ہوئے تم سے پختہ عہد لیا تھا (اور ہدایت کر دی تھی کہ) جو کچھ میں تمہیں اس وقت دے رہا ہوں اسے مضبوطی سے تھامنا، اور جو (احکام و ہدایات) اس کے اندر ہیں انہیں یاد رکھنا،[3] تاکہ تم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اُن احکام و ہدایات کے مطابق ہونا جو اُس دور کے لیے اُس نے انسانوں کے واسطے مقرر فرمائی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر عمل صالح کا وجود ہی ممکن نہیں۔

(د) اس آیت میں جن مذہبی گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں صابیوں کا گروہ بھی ہے۔ پس اگر یہاں کسی اس طرح کی "رواداری" کا بیان مقصود ہو تاکہ "قرآن تم یہود یا نصاریٰ سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ اپنی ملت چھوڑ کر میرے حلقہ میں آجاؤ، بلکہ صرف یہ کہتا ہے کہ تم شوق سے یہودی یا نصرانی بنے رہو مگر اتنا ضرور کرو کہ اپنے اندر توحید اور قیامت کا یقین پختہ کر لو، اور اچھے عمل کرو" تو یہود اور نصاریٰ کے ساتھ صابیوں کا ذکر کسی طرح موزوں نہ تھا۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔ یہ کھلا ہوا مشرک گروہ تھا۔ اب اگر آیت کا وہ انداز بیان مانا جائے جس کا ذکر ابھی ہوا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا قرآن یہود و نصاریٰ کی طرح صابیوں کو بھی دعوتِ مصالحت دے رہا ہے، اور ان سے بھی یہی کہتا ہے کہ میں تم سے صابیت چھوڑ کر اپنے اوپر ایمان لانے کا ہرگز کوئی مطالبہ نہیں کرتا، بلکہ صرف یہ کہتا ہوں کہ تم شوق سے صابی بنے رہو، مگر اتنا ضرور کرو کہ توحید باری پر اور قیامت پر یقین رکھو اور اچھے عمل کرتے رہو۔ بس اتنی سی بات تمہاری نجات کے لیے کافی ہے۔ غور فرمائیے، بات کتنی غیر معقول اور متعارض ہو جاتی ہے۔ مگر مذکورہ بالا انداز بیان مان لینے کے بعد اس غیر معقول بات کے مانے بغیر چارہ نہیں۔

فی الواقع یہ بڑی عجیب بات ہوگی کہ جس سورہ کا عمود ہی نبوتِ محمدی کا اثبات ہو، جس میں یہودیوں کو اسی بنیاد پر ملزم گردانا گیا اور ابلیس کے مشابہ ٹھیرایا گیا ہو کہ وہ محمد صلعم پر ایمان نہیں لاتے، جس میں گفتگو ہی یہیں سے شروع ہوئی ہو کہ کسی آدمی کا متقی اور خدا پرست ہونا دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ اس نبوت کے تسلیم کرنے پر بھی موقوف ہے، اسی سورہ کی ایک آیت سے کرید کر یہ مفہوم نکالنے کی کوشش کی جائے کہ نجات کے لیے نبوتِ محمدی پر ایمان لانا بہر حال ضروری نہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] یہ واقعہ بھی اُسی وقت کا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قوم کے ستر نمائندوں کے ہمراہ

(بقیہ حواشی بر صفحہ آئندہ)

تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا

تقویٰ کی روش اختیار کر سکو؛ مگر اس کے باوجود تم اپنے عہد سے پھر گئے[۵۱] سو اس وقت اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی تو تم صریح نامرادی (اور تباہی) کی نذر ہو چکے ہوتے چنانچہ تمہیں اپنی قوم کے اُن لوگوں کا قصہ بخوبی معلوم ہے، جنھوں نے سبت[۵۲] کے معاملہ میں سرکشی[۵۳] اختیار کر لی تھی، اور ہم نے (بطور عذاب) ان سے

(بقیہ حواشی صفحہ گذشتہ) کو طور پر توریت لینے کے لیے بلایا گیا تھا۔

۵۲ جس وقت توریت عطا فرمائی گئی، اس وقت صورتِ حالات کچھ اس طرح کی تھی کہ حضرت موسیٰ اور اسرائیلی نمایندے دو اونچی چوٹیوں کے درمیان درّے میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کتاب دیتے وقت ان چوٹیوں کو ان کے سَر کے اوپر نمایاں طور سے جھکا دیا، جس کا مقصد ان پر صرف ایک نفسیاتی اثر ڈالنا اور انھیں متنبہ کرنا تھا، یعنی یہ کہ کتاب ہاتھوں میں لیتے وقت جلالِ الٰہی کا ایسا اثر انگیز اور پُرہیبت سماں پیدا کر دیا جائے جس کی یاد اُن کے دلوں سے نکلنے نہ پائے، تاکہ یہ یاد ان کے لیے احکام الٰہی کے اتباع کے سلسلہ میں ایک زبردست محرک کا کام دیتی رہے، اور ان کی خلاف ورزی کی جسارت سے انھیں باز رکھے۔

۵۳ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ جب تمہاری ملّیت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی، اُس وقت تم سے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ جب تک تم اپنے کو یہودی کہتے رہو گے، اور اپنا گروہی تعلق یہودیت سے منقطع نہ کرو گے، خدا کی نگاہ میں محبوب و مقرب رہو گے، اور جنّت کے اصل اجارہ دار، خواہ تمہارے ایمان و عمل کی حالت کچھ ہی کیوں نہ ہو بخلاف اس کے تم سے تو یہ کہا گیا تھا کہ "نجات و فلاح کا دار و مدار اس ہدایت کے مطابق عمل کرنے پر ہے جو توریت کی شکل میں تمھیں دی جا رہی ہے، پس یہ شریعت لو، پورے عزم کے ساتھ لو، کامل ذمّہ داری کے احساس کے ساتھ لو، اس لیے لو کہ اپنی پوری زندگی اس کے سانچے میں ڈھال دو گے، اور اس کے ایک ایک حکم پر عمل کرو گے" پھر تم نے اپنے پیغمبر کے توسط سے اس ذمّہ داری کو قبول کیا، اور اس دربار سے اطاعت و عمل کا عہد کر کے لوٹے۔ اب تم خود سوچو کہ خدا پرستی اور نجات کے اس اکیلے ایک دروازے کو چھوڑ کر منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے تم یہودی گروہ بندی کے جس چور دروازے میں گھسے جا رہے ہو وہ کس "ذاتِ شریف" کا ایجاد کردہ ہے!

(حواشی صفحہ ھذا) **۵۱** عہد اطاعت کے ذکر کے بعد اس کے توڑنے اور مسلسل توڑتے رہنے کا جو بیان آگے آ رہا ہے وہ اسی حقیقت کو واضح تر اور مدلّل کرنے کے لیے ہے کہ تم نے اپنے فرض کو تو بھلا دیا اور ذمّہ داریوں کو بالائے طاق رکھ

(بقیہ حواشی صفحہ آیندہ)

لَّهُمۡ كُونُوۡا قِرَدَةً خٰسِئِيۡنَ ۝ فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۝

فرما دیا تھا کہ "بن جاؤ بندر! ذلیل اور دُھتکارے ہوئے[۵۴] اسی طرح ہم نے انہیں اس وقت کے لوگوں کے لیے بھی، اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے بھی، سامانِ عبرت، اور خوفِ خدا رکھنے والوں کے لیے سامانِ نصیحت بنا کر رکھ دیا۔

(بقیہ حواشی صفحہ گذشتہ) دیا ہے مگر حقوق سے چمٹے رہنا چاہتے ہو۔ حالانکہ خدا کا قانونِ عدل اپنی بخشش کے حقوق صرف ان ہی کو دیتا ہے جو اس کی ڈالی ہوئی ذمہ داریوں کو اُٹھائیں۔

پہلے تو یہاں ان کی عہد شکنی کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے، پھر اس کے بعد اس کی واقعات کی روشنی میں کچھ تفصیل آ رہی ہے۔

۵۲ "سَبْت" سنیچر کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن یہودی شریعت میں برکت اور تقدس کا دن تھا، جس میں انھیں خدا کی بیش از بیش عبادت کرنے کا حکم تھا، اور دنیوی مشاغل خصوصاً شکار کی قطعی ممانعت تھی۔

۵۳ اس اجمال کی کچھ تفصیل سورۂ اعراف میں آئی ہے۔ اگر دوسری روایتوں کو بھی سامنے رکھ لیا جائے تو واقعہ کی شکل کچھ اس طرح کی بنتی ہے:۔

یہ لوگ جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، سمندر کے کنارے رہا کرتے تھے، اور ماہی گیری ان کا ذریعہ معاش تھی۔ قدرت کی ستم ظریفی نے ان کے لیے ایک عجیب صبر آزما حالت پیدا کر رکھی تھی۔ سنیچر کے دن سمندر کی مچھلیاں حوض کی مچھلیوں کی طرح بالکل اوپر آ کر سر اٹھائے تیرا کرتیں، اور باقی دنوں میں معمول کے مطابق پانی کے اندر ہی چھپی رہتیں۔ اب ایک طرف شکار کی حرمت کا حکم، دوسری طرف شکار کی یہ نفسیاتی ترغیب، آخر دنیا کی حرص ایمان کے جذبہ پر غالب آئی اور انھوں نے ایک حیلہ ایجاد کیا یعنی سمندر کے کنارے سے چند قدم ہٹ کر ایک بڑا سا گڑھا کھودا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب سمندر میں مد آتا تو پانی ساحل سے اوپر چڑھ کر گڑھے میں جا بھرتا، اور چونکہ مچھلیاں اس دن پانی کی سطح ہی پر ہوتیں اس لیے پانی کے ساتھ ساتھ وہ بھی گڑھے میں آ جاتیں۔ مگر چونکہ دن سنیچر کا ہوتا، اس لیے اُس گڑھے میں بھی جال نہ ڈالا جاتا، مبادا کہ اس "مقدس اور محترم" دن کے دامنِ حرمت پر کوئی داغ آ جائے۔ لہذا انہوں نے "صبر و احتیاط" کے ساتھ دوسری صبح کے طلوع ہونے کا انتظار کیا جاتا، اور جب اتوار کا دن آتا تب جا کر اس گڑھے کی مچھلیاں پکڑی جاتیں۔

ظاہر ہے کہ یہ شریعت کا احترام نہ تھا، بلکہ اس کے ساتھ مذاق تھا جیلہ بازیوں کے ذریعہ احکامِ شریعت کی بندشوں سے نکل بھاگنے کی ایسی کوشش کہ آئینی طور پر قانون شکنی کا الزام بھی عائد نہ ہو سکے، علانیہ قانون شکنی سے بھی کہیں زیادہ بُرا اور گھناؤنا کام ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ قرآن کی اس تنبیہ سے اس کے ماننے والوں نے بھی پورا پورا فائدہ اُٹھایا ہے۔

(حواشی صفحہ ۱۱۱) ۵۴ ہو سکتا ہے کہ ان کی صورتیں نہ بدلی ہوں، صرف باطن مسخ ہو کر بندروں جیسا ہو گیا ہو، ما صرف ایک -

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا	پھر (یاد کرو وہ وقت) جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا "اللہ تعالےٰ کا حکم ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو"[۱۵] تو اُنھوں نے جواب دیا "کیا آپ

(بقیہ حواشی صفحہ ۱۳۰) مجازی تعبیر ہو ان کے ذلیل وخوار ہو جانے کی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ظاہراً و باطناً دونوں حیثیتوں سے مسخ کر کے بالکل بندر بنا دیے گئے ہوں۔ اور یہ بھی قرین قیاس ہے کہ دماغ تو انسانوں ہی جیسا رہنے دیا گیا ہو، مگر صورتیں مسخ کر دی گئی ہوں۔ یہی آخری شکل زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس شکل میں خود ان کو بھی اپنے ذہن میں یہ محسوس کرتے رہنے کا موقع تھا کہ یہ سب کچھ ہماری نافرمانیوں کا نتیجہ ہے۔

یہ واقعہ بنی اسرائیل کے عہد شکنی کی پہلی شہادت ہے اس کے علاوہ یہ ان کے اس بے بنیاد گمان کی تردید بھی ہے کہ ان کے لیے فلاح اور نجات بہرحال مقدر ہے، اور خدا کا قانونِ سزا ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

(حواشی صفحہ ھٰذا) [۱۵] اس امر کی کوئی توضیح قرآن میں نہیں ملتی کہ یہ گائے ذبح کرنے کا حکم کس موقع پر اور کس معاملہ کے سلسلہ میں دیا گیا تھا، کیونکہ اس قسم کی جزئی اور نری تاریخی تفصیلات کا بیان اس کے اصول بحث سے قطعاً خارج ہے۔ اب اندازے اور قرینے سے دو ہی باتیں قیاس کے مطابق معلوم ہوتی ہیں، یا تو یہ کوئی اجتماعی قربانی کا موقع تھا (چنانچہ توراۃ کے سفر عدد، باب ۱۹ میں اس طرح کی ایک قربانی کا ذکر بھی موجود ہے۔) اس لیے کہ اسرائیلی شریعت میں قربانی کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور کم و بیش ہر مذہبی رسم کے ساتھ اس کا حکم ملحق تھا، یا پھر ایک بڑے اہم حادثۂ قتل کے سلسلے میں یہ حکم ہوا تھا جس کا ذکر ابھی آگے آتا ہے۔

بہرحال موقع جو بھی رہا ہو، ذبح یا قربانی کے لیے دوسرے جانوروں کو چھوڑ کر گائے کا انتخاب ایک خاص دینی مصلحت سے کیا گیا تھا۔ یہ بات تو معلوم ہے کہ یہ لوگ ابھی ابھی جس سرزمین (مصر) سے نکل کر آئے تھے وہاں گائے کی تقدیس معبودیت کی حد تک پہنچی ہوئی تھی، اور قبطی قوم، جو یہاں کی حاکم قوم تھی، اس کی پوجا کرتی تھی۔ بنی اسرائیل کی غلامی صرف جسم ہی کی غلامی نہ تھی، بلکہ روح اور دماغ کی غلامی بھی تھی۔ حاکم قوم کے افکار و عقاید ان کے ذہنوں پر بُری طرح اثر انداز ہو چکے تھے، اور وہ بھی آہستہ آہستہ اس جانور کی بابت عقیدۂ تقدس کے جراثیم اپنے دلوں میں اُتار چکے تھے۔ چنانچہ یاد ہو گا کہ جب حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں بہکانے والے نے بنی اسرائیل کو شرک کی ضلالت میں مبتلا کرنا چاہا، تو ان کے ذہن کی اسی افتاد کو دیکھتے ہوئے اس نے جو معبود بنایا تھا وہ گائے کے بچھڑے ہی کا ہیکل تھا۔ پس گائے کے ذبح یا قربان کرنے میں ایک خاص مصلحت یہ مدنظر تھی کہ ان کے دلوں سے اس کی معبودیت کا وہم باطل نکل جائے، اور انھیں محسوس ہو کہ ایک مخلوق، اور وہ بھی ایسی کم حیثیت مخلوق، جو چند لمحوں میں کاٹ کر رکھ دی جا سکتی ہے ہو، بھلا خدا کیسے ہو سکتی ہے۔

أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۝ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا

ہم سے مذاق[1] کر رہے ہیں" موسیٰ نے کہا "جہالت کی روش اختیار کرنے سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں" تب بولے "اچھا اپنے رب سے درخواست کیجیے کہ اس گائے کی صفات واضح طور پر ہمیں بتا دے۔" موسیٰؑ نے کہا " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ گائے ایسی ہونی چاہیے جو نہ بالکل بوڑھی ہو نہ بالکل نوجوان، بس اوسط عمر کی ہو۔ سو اب کر ڈالو[2] وہ کام جس کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔" (مگر انھوں نے پھر) کہا "اپنے رب سے (مزید) درخواست کیجیے کہ وہ اس کے رنگ کی (بھی) صراحت کر دے۔" موسیٰؑ نے جواب دیا "وہ ارشاد فرماتا ہے کہ گائے زرد رنگ کی ہونی چاہیے، گہرے زرد رنگ کی ایسی کہ دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جائے۔" پھر بولے "اپنے رب سے گذارش کیجیے کہ اس کی (صفات کی کچھ اور) وضاحت کر دے، (اس لیے کہ اب بھی) ہمیں گایوں کے اندر امتیاز نہیں ہو رہا ہے، اور اب (اس کے بعد) انشاءاللہ ہم اس کی تعیین میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔" موسیٰؑ نے کہا "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ گائے ایسی ہو جس سے خدمت نہ لی جاتی ہو، نہ زمین جوتتی ہو نہ پانی کھینچتی ہو، بالکل بے عیب، اور داغ دھبے سے یکسر پاک ہو۔" (تب جاکر) اُنھوں نے کہا "اب آپ نے واضح بات فرمائی" پھر اُنھوں نے اسے ذبح کیا، ورنہ[3] ما گرچہ وہ ایسا

---

[1] یہ ایک ایسے گروہ کے منہ سے نکلا ہوا فقرہ ہے جو مخاطب (حضرت موسیٰ) کو خدا کا رسول تسلیم کر رہا تھا۔ گویا ان حضرات کے نزدیک یہ بات عملی طور پر بالکل ممکن تھی کہ ایک شخص خدا کا سچا نبی ہوتے ہوئے بھی اس کے نام سے غلط باتیں منسوب کر سکتا ہے۔ جس ملت کے بزرگوں اور صحابیوں کا حال یہ رہا ہو وہ اپنے دورِ زوال میں خدا کے پیغاموں اور پیغام بروں کے ساتھ جو کچھ کر گذرے اُسے تھوڑا ہی سمجھنا چاہیے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ سیدھے سادے اور فرماں بردار لوگوں کا طریقہ اختیار کرو۔ سچے ایمان اور حقیقی بندگی کے ساتھ یہ کٹ حجتی، کج بحثی، سوال بازی اور کھود کرید زیب نہیں دیتی۔ تمہیں ایک نہایت سیدھا سا حکم دیا گیا ہے، جس میں ایک اطاعت شعار ذہن کے لیے کوئی ابہام نہیں، بس چاہیے کہ خواہ مخواہ کی کھود کرید کرنے کے بجائے اس پر عمل کر ڈالو۔

تَدّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا ... يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ

کرتے نظر نہ آتے تھے۔[۱]

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا اور تم میں سے ہر ایک (اپنے سر سے الزام) ہٹا رہا تھا۔[۲] پر اللہ نے طے کر لیا تھا کہ تم جو کچھ چھپا رہے ہو اس کو بہر حال آشکارا کر کے رہے گا۔ (چنانچہ ایسا ہی ہوا) اور ہم نے حکم دیا کہ "اس کو اس

(بقیہ حواشی صفحہ گذشتہ) ہی اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے کہ جس قوم نے آج ہر ہدایت سے بے نیازی اختیار کر رکھی ہے، اور جو اپنے نسب و خاندان کو مدار نجات قرار دے کر ایمان اور حسن عمل کی ضرورت سے بے پروا ہو چکی ہے، اس کی یہ صفت کوئی تازہ وارد صفت نہیں ہے، بلکہ اس نے اس ذہنیت کی اصل اور بنیاد اپنے اسلاف سے وراثت میں پائی ہے، جس کو ترقی دے کر آج انھوں نے اس نقطۂ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ان کے اسلاف کو حکم ملا تھا کہ ایک گائے ذبح کرو، اس فرض سے سبک دوش ہونے کے لیے بس اتنا کافی تھا کہ کسی بھی گائے کو لاتے اور ذبح کر دیتے، مگر ایسا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ان کے دماغوں میں وہ جوہر ہوتا، جو ایک سچے خدا پرست اور طاعت گذار انسان کے دماغ میں ہوتا ہے۔ چونکہ یہ چیز ان کے پاس موجود نہ تھی اس لیے ایک ایسے حکم کے بارے میں، جس کے اندر عقل عام کے لیے کوئی بات بھی وضاحت طلب نہ تھی، انھوں نے سوالات کرنا اور بال کی کھال نکالنا شروع کر دیا۔ یہ اس بات کی ایک صریح علامت ہے کہ ان کا دل اطاعت کی روح سے خالی، اور امر الٰہی کی عظمت سے بے پروا تھا۔ مگر قدرت نے بھی ان کے استفسارات کے مقابلہ میں بڑا معنی خیز رویہ اختیار کیا، یعنی انھیں اس پر کوئی توبیخ نہیں کی، بلکہ نہایت متانت سے ایک ایک سوال کا جواب دیتی رہی، اور جب ساری توضیحات اُس سے وہ مکمل کرا چکے تو نتیجہ ان کے سامنے یہ تھا کہ اب کسی طرح کی بھی ایک گائے کا ذبح کر دیا جانا کافی نہ رہا، بلکہ ضروری ہو گیا کہ اسی خاص قسم کی سُنہری رنگت والی قیمتی اور خوبصورت گائے ذبح ہو جو مصر میں پرستش کے لیے مخصوص سمجھی جاتی تھی، اور اس لیے اس کی تقدیس کا ان کے ذہنوں پر خاصا اثر تھا۔

(حواشی صفحہ ھٰذا) [۱] یا تو اس لیے کہ گائے کی عظمت و تقدیس سے متاثر تھے، یا پھر اس لیے کہ وہ اس واقعۂ قتل کو چھپانا چاہتے تھے جس کے سلسلہ میں یہ گائے ذبح کرائی جا رہی تھی، اور جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

[۲] شریعت کے احکام و مصالح سے ان کی بے پروائی، یعنی ان کے نقض عہد کی یہ تیسری شہادت ہے

(بقیہ حواشی صفحۂ آئندہ)

اِضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

کے ایک حصہ سے ضرب لگاؤ۔[۵۱] (دیکھو) یوں اللہ تعالیٰ مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے، اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا رہتا ہے تاکہ تم سمجھو۔

غرض یوں ہی بُرائیاں اور نافرمانیاں کرتے کرتے بالآخر تمہارے دِل سخت پڑ گئے، بالکل پتھر جیسے سخت، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ــــ جب کہ بعضے پتھر تو ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں، بعضے ایسے ہوتے ہیں، جو پھٹ جاتے ہیں اور ان کے اندر سے پانی نکلتا ہے، اور بعضے ایسے بھی جو خوفِ الٰہی کی تاب نہ لا کر گر پڑتے ہیں[۵۲] ــــ (پر یاد رکھو) اللہ تمہارے کرتوتوں سے غافل نہیں ہے۔

(بقیہ حواشی صفحہ گذشتہ) کسی معاشرہ میں سب سے زیادہ قابلِ احترام اور قیمتی شے انسانی جان ہوا کرتی ہے۔ ایک بے گناہ شخص کا قاتل دراصل پوری انسانیت کا قاتل، اور نظامِ تمدن کی جڑ پر کلہاڑا چلانے والا ہے۔ پھر وہ شخص بھی، جو ایسے بدترین دشمنِ انسانیت کو وابستہ سزا سے بچانے کی سعی کرتا ہے کوئی معمولی مجرم نہیں، اس کی حیثیت بھی اس شخص کی سی ہے، جو خود چاہے خونِ ناحق نہ کرتا ہو، مگر ایک خونی کے ہاتھ میں تلوار دے دیتا ہو، تاکہ کسی بے گناہ پر چلا دے۔ ظاہر ہے کہ یہ شخص بھی نظامِ تمدن و سیاست کا دشمن اور احترامِ انسانیت کا منکر ہی ہو۔ وہ نہیں جانتا یا جانتا ہے مگر ماننے کے لیے تیار نہیں، کہ انصاف ہی بقائے تمدن، بقائے امن، بقائے نظم کی اساس ہے۔ ناحق خون کرنے اور پھر اُس کو چھپانے کی بھی غیر معمولی خطرناکی ہے جس کے پیشِ نظر تاریخ بنی اسرائیل کے ایک جزئی واقعہ کو یہاں اتنی اہمیت سے بیان کیا جا رہا ہے جس کے ذریعہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ لوگ انصاف اور اظہارِ حق کی صفت سے کتنے بے بہرہ تھے کہ نبی کی موجودگی ہی میں اتنے بڑے پاپ کو ہضم کر جانے پر آمادہ ہو گئے، حالانکہ ابھی عہد کر کے آئے تھے کہ ہم نہ کسی کی جان ماریں گے اور نہ حق کی شہادت دینے سے گریز کریں گے۔

(حواشی صفحہ ھٰذا) ۵۱ اس مجمل جملہ کی تفصیل [illegible] دشوار مسئلہ ہے، اس لیے کہ قرآن میں اس واقعہ کی بابت کوئی اور ذکر کسی دوسری جگہ نہیں آیا ہے، چونکہ مخاطب اس کی پوری تفصیل سے واقف تھا، اس لیے صرف

(بقیہ حواشی صفحہ آئندہ)

(یعنی الٰہی صفت گئو شنہ) اشارہ کر دینے ہی پر قرآن نے اکتفا کر لیا ہے۔ البتہ اس کے اندر جو اخلاقی پہلو قابل بحث تھا، اپنے اصولِ بیان کے مطابق اس نے اس کو بہرحال اُجاگر کر دیا ہے۔ اب اکثر مفسرین نے جو وضاحت اس مُبہم جملہ کی کی ہے، وہ یہ ہے :-

وہ گائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اسی حادثہ کے سلسلہ میں ذبح کرائی گئی تھی، اور جب وہ ذبح کی جاچکی تو نبی کے توسط سے اللہ نے حکم دیا کہ اس گائے کا کوئی ٹکڑا لے کر مقتول کی لاش سے چھواؤ۔ جب ایسا کیا گیا، تو قدرتِ الٰہی سے وہ مقتول تھوڑی دیر کے لیے زندہ ہوگیا، اور اس نے اپنے قاتل کا نام بتا دیا۔"

اگرچہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں، موجود ہے کہ وہ مقتول دوبارہ زندہ کر دیا گیا تھا، مگر بعد کے الفاظ سے ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مقتول کا دوبارہ جی اُٹھنا بڑی غیر معمولی اور غیر عادی بات ہے، مگر بنی اسرائیل کی ابتدائی تاریخ تو اس طرح کے نہ جانے کتنے ہی نادر واقعات سے بھری پڑی ہے البتہ یہاں ایک دوسرا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے جس کا جواب ذرا سوچ میں ڈال دیتا ہے، اور وہ یہ کہ مقتول کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے گائے کے جسم کے کسی ٹکڑے سے ضرب لگانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ یہ بات تو اس کے بغیر بھی ہوسکتی تھی، اس لیے کہ اس کا جی اُٹھنا تو محض حکم الٰہی سے ہوا تھا، اس میں گائے کے ٹکڑے سے ضرب لگنے کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس سوال کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح قدرتِ الٰہی کا ایک نشان اور کرشمہ دکھانے کے ساتھ ساتھ ضمناً گائے کی معبودانہ عظمت و تقدیس پر کاری ضرب لگا دینا بھی مقصود تھا۔ اور وہ اس پہلو سے کہ اگر اس نام نہاد معبود کے پاس کچھ بھی طاقت ہوتی تو اس کو ذبح کرنے سے ایک آفت بپا ہو جانی چاہیے تھی، کجا کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا اس طرح مفید ثابت ہوا۔

دوسری تاویل اس مبہم جملہ کی یہ کی جاتی ہے :-

حکم یہ ہوا تھا کہ مقتول کی لاش کو اُن لوگوں سے چھواؤ جن پر قاتل ہونے کا شبہ ہے، چنانچہ جب ایسا کیا گیا تو اصل قاتل کا پتہ لگ گیا، اور وہ اس طرح پر کہ جب اس کی باری آئی تو اوروں کے بخلاف لاش سے مس ہوتے ہی اس پر خاص قسم کی انفعالی کیفیات کا ظہور ہوگیا۔ گویا یہ ایک نفسیاتی طریق تفتیش تھا۔ اسی طرح کی بعض تاویلیں اور بھی کی جاتی ہیں، مگر بعد کے الفاظ سے ان کا کوئی دل لگتا جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۵۲ پتھروں کی جن صفات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان کی حیثیت نری فرضی یا امکانی نہیں ہے بلکہ وہ حقیقتیں ہیں جو خود بنی اسرائیل کی ابتدائی تاریخ میں بشکل واقعات ظاہر ہو چکی ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ایک چٹان پر اپنی لٹھیا ماری اور بحکم خدا وہ پھٹ گئی اور اس میں سے پانی کے دھارے بہ پڑے۔ اسی طرح کہ جب موسیٰؑ نے اللہ تعالےٰ کا دیدار کرنا چاہا اور اس کے لیے انھوں نے درخواست کی تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے۔ اس کا اندازہ تم یوں کرسکتے ہو کہ میں اس پہاڑ کے فلاں حصہ پر اپنی تجلیات کا پرتو ڈالتا ہوں، اگر ... بھی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

یہ آیت کے الفاظ میں بڑی لطیف تلمیحات ہیں۔

اساسِ دین کی تعمیر

(۸)

۳۔ نماز

مولانا صدرالدین صاحب (اصلاحی)

نماز کی اس حقیقت اور اس کی اس اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے جو گذشتہ صحبت میں بیان کی جا چکی، اور پھر اس سوال پر غور فرمائیے کہ اساس دین کی تعمیر میں نماز کو بنیادی حیثیت کیوں حاصل ہے؟ بشرطیکہ اب بھی یہ سوال سوال ہو اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہو۔ جو شئے احکامِ دین کا سرعنوان ہے، جو شریعت کے پورے مجموعے کا سرچشمۂ وجود اور جوہرِ حیات ہو، جو سارے احکام و شرائع کے لیے حصن حصین ہو، جو قلبِ انسانی کو نور اور سکینت سے بھر دینے والی ہو، جو محبوبِ حقیقی سے قرب اور ہم کلامی کا اعزاز بخشنے والی ہو، جو حق پرستی کی صبر آزما ابتلاؤں میں دلوں کو مضبوط اور قدموں کو استوار رکھنے والی ہو، جس پر شہادتِ حق کی ادائگی کا انحصار ہو، جس پر ملی خوش بختیوں اور سربلندیوں کا دارومدار ہو اور سب سے آخر میں یہ کہ جس کے وجود و قیام پر پورے دین کا وجود و قیام موقوف ہو اور جس کے ڈھ جانے پر دین کا پورا ایوان زمین بوس ہو جاتا ہو ـــــ ایسی شئے کے بارے میں اس سوال کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اساس دین کی تعمیر میں خشتِ اوّل کی حیثیت کیوں رکھتی ہے؟ کھلی بات یہ ہے کہ دینِ حق کی اطاعت و اقامت منحصر ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت پر، اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات کی انسان کو جتنی ہی زیادہ گہری معرفت ہوگی اور آخرت کی جواب دہی کا جتنا ہی پختہ یقین اور زندہ احساس ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ احکامِ الٰہی کے اتباع میں سرگرم، اور شہادتِ حق ـــــ اقامتِ دین ـــــ کے ادائے فرض میں کوشاں ہوگا۔ یہ ایمان بلا شبہ سمع و بصر اور فواد کے صحیح استعمال ہی سے پیدا ہوتا ہے، اور آفاق و انفس کے دلائل اور آیاتِ کائنات کے بصائر اس میں بڑی گہرائی، بڑی پختگی اور بڑی توانائی پیدا کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ پہلے ہم بیان بھی کر چکے ہیں، مگر

غرض یہ ہے کہ جو چیز اس ایمان کو "ایمان" بناتی ہے وہ یہی ذکر و نماز ہے۔ عقل کی جستجو میں، فطرت کی شہادتیں، کائنات کی دلیلیں، آفاق کی گواہیاں اور انفس کی صدائیں جب ایمان کو پیدا کرتی ہیں اس کی حیثیت بس ایک اچھے بیج کی سی ہے، آپ جتنا ہی زیادہ غور و تدبر سے کام لیں گے اور زمین و آسمان میں بکھری ہوئی نشانیوں پر نگہ لگا کر جائیں گے اتنا ہی زیادہ یہ "بیج" تندرست اور صالح ہوگا، لیکن کسی بیج کا تندرست اور صالح ہونا اس بات کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ وہ آج ایک شاداب و ہونہار پودے، اور کل ایک تناور اور بارآور درخت کو بھی جنم دے دے گا، بلکہ اس کے لیے اچھی اور موزوں آبیاشی کی بھی لازمی ضرورت ہے۔ تخم ایمان کے سیراب کیے جانے کے لیے حق تعالیٰ نے جس "ماءِ مبارک" کو نازل فرمایا ہے اس کا نام نماز ہے۔ یہ نماز ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو اسی طرح پروان چڑھاتی اور انھیں ثمر بار بناتی ہے جس طرح پانی نباتات کو۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت، دونوں کو مضبوط اور زندگی کی توانائیوں سے معمور بنانے کی تدابیر میں ذکر و نماز کو ایک خاص اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

اس حقیقت کی سب سے بڑی شہادت خود وہ ہدایات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جناب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے بعثت میں دی گئی تھیں، ارشاد ہوا کہ :-

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ	اے کمبل لپیٹنے والے! کچھ حصہ کے سوا باقی رات بھر
إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ	نماز میں کھڑے رہا کرو، (یعنی نصف شب تک) یا اس میں
مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ	کچھ کم کر دو یا کچھ زیادہ (اور اس میں) قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر
الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ	کر پڑھو، اس لیے کہ ہم تم پر ایک بھاری بات (کی ذمہ
قَوْلًا ثَقِيلًا إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ	داری) ڈالنے والے ہی ہیں۔ بلاشبہ رات کا اٹھنا
هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلًا (مزمل)	"قدموں کے جماؤ کے لحاظ سے بھی خوب تر ہے اور (منہ سے

نکلنے والی) باتوں کی درستگی کے لحاظ سے بھی۔

ظاہر ہے کہ اس "بھاری بات" سے مراد تبلیغ دین اور تبلیغ دین سے بڑھ کر اقامت دین کی ذمہ داری ہے اس بار گراں کے اٹھانے کے لیے نبی کو تیار ہونے کا ذریعہ جہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ رات کا زیادہ سے زیادہ حصہ تہجد کی نماز میں گذاریں، وہیں اس امر کی بھی تلقین کی جا رہی ہے کہ اس نماز میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ یہ "ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا" ایک بڑی ہی عظیم الشان حقیقت دین کا حامل ہے، اور اسی پر ذرا ٹھہر کر غور کرنے والا وہ پر حکمت طریقہ معلوم کر سکتا ہے جو قرآن نے ایمان کی تقویت اور قلب کے تزکیہ کے لیے ٹھہرایا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا مدعا اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا ل یک سوئی کے عالم میں انسان آیات قرآنیہ

پر گہرا تدبر کرے، ان آیاتِ قرآنیہ پر جن کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور روزِ جزا پر اطمینان بخش دلائل موجود ہیں
جو رحمتِ الٰہی کے دل آویز اور سپاس انگیز تذکروں سے لبریز ہیں، جو حمد و تقدیس کے جذبات، اور بندگی کے احساسات
کے لیے پیامِ بیداری ہیں یہ تدبر انسان کے دل میں ایمانی کیفیت کو جس طرح تیز تر کر سکتا ہے اس کا فکر و نظر کو کیا اندازہ!
بلاشبہ نماز سے باہر بھی قرآن کو پڑھنا چاہیے اور وہ پڑھا بھی جاتا ہے، مگر بھولنا نہ چاہیے کہ اس وقت بندہ نہ تو
بندگی کی ہیئت میں ہوتا ہے، نہ اپنے رب سے سرگرمِ مناجات ہوتا ہے، اس لیے اس تلاوت کا، جو نماز میں
ہوتی ہے، اُس تلاوت سے، جو دوسرے اوقات میں ہوتی ہے، کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ نماز کے اندر
قرآن کی اثر انگیزی اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی اشارات کے مطابق تلاوتِ قرآن کا صحیح اور
اصلی موقع صرف نماز ہے، بالخصوص نمازِ تہجد اور نمازِ فجر۔ اس لیے کہ یہ وقت ہی کچھ ایسا ہوتا ہے جس میں ذہن
میں سکون، دل میں یکسوئی، اور روح میں ایک خاص کیفیتِ انجذاب ہوتی ہے، جیسا کہ اس آیت کا آخری ٹکڑا بتا رہا
ہے اور ہر تجربہ رکھنے والے کا تجربہ گواہی دیتا ہے۔

نماز کا معیارِ مطلوب

نماز کی ان پرعظمت اہمیتوں نے اس کا یہ استحقاق پوری طرح ثابت کر دیا کہ وہ
اساسِ دین کی تعمیر میں خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس جگہ پہنچ کر یہ سوال
پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی نماز ہے جس کی یہ اہمیت اور یہ عظمت ہے؟ یہ سوال اس لیے اور بھی پیدا ہوتا
ہے کہ نماز کی جو حقیقت، اہمیت اور عظمت بیان کی گئی ہے، وہ اگرچہ نظری طور پر ناقابلِ انکار ہے، مگر عملی اور
واقعاتی دنیا کا جائزہ اس نظری جائزے کی ہمنوائی کرنے پر کھل کر تیار نہیں ہوتا۔ جو بے نمازی ہیں اُنھیں تو
چھوڑیے، جو نمازیں پڑھنے والے ہیں ان کی زندگیاں بھی اس امر کی شہادت دیتی نظر نہیں آتیں کہ نماز کی
ادائگی سارے احکامِ دین کی ادائگی کے ہم معنی ہے۔ اس لیے کہ وہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور ساتھ ہی
ان کے ایوانِ شریعت کے اکثر و بیشتر حصے مسمار بھی پڑے ہیں، اور یہ "نمازیں" ان حصوں کی تعمیر کا ان سے
کوئی مطالبہ نہیں کرتیں۔ اسی طرح وہ نمازیں تو پڑھتے ہیں مگر ان کے خیال اور ان کے تجربے میں یہ نمازیں ان کے
لیے طمانیتِ قلب اور پاکیزگیٔ نفس کا کوئی کامیاب ذریعہ نہیں ہیں، اور انھیں اس غرض کے لیے روحانی اشغال
کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ مجبور ہوتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی کے کچھ دوسرے زود اثر طریقے تلاش اور اختیار کریں۔
اس لیے ضرورت ہے کہ اس نماز کا عام معیارِ مطلوب معلوم کر لیا جائے جو دین کا ستون اور سنگِ اساس ہے
اور جو ذکرِ کامل ہونے کی حیثیت سے طمانیتِ قلب کا تنہا وسیلہ ہے۔

نماز کی اقامت و محافظت

سب سے پہلے اس سلسلہ میں یہ بنیادی بات جان لینی چاہیے کہ قرآن
نے نماز کی محافظت کرنے اور اس کے قائم کرنے کا حکم دیا ہے، صرف

پڑھنے کا نہیں۔ نماز قایم کرنا اور چیز ہے اور نماز پڑھنا اور شئے۔ کپڑے کو کسی عمدہ صابون سے اچھی طرح دھونا اور بات ہے اور اس کو جیسے تیسے پانی میں محض ڈبو کر نچوڑ لینا دوسری بات ہے۔ نماز کا پڑھنا تو یہ ہے کہ وقت، جماعت، تعدیل ارکان، حضورِ قلب، خشوع باطن اور تدبر قرآن کی قیود سے بے نیاز ہو کر پڑھ لی جائے لیکن محافظت و اقامت نماز کے اندر ان چیزوں کا وجود لازماً شامل ہے۔

چنانچہ نماز کے متعلق جہاں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ "وہ وقت کی پابندی کے ساتھ مومنوں پر فرض ہے (اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا)" وہیں اس سے پہلے یہ بھی کہا گیا ہے کہ:۔ (فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ) (نماز قایم کرو)۔ کلام کا یہ نظم اور سیاق بتاتا ہے کہ وقت کی پابندی منجملہ شرائط اقامت کے ہے، اور اس سے تغافل اضاعت نماز کے ہم معنی۔

پھر اگر آپ اس پورے فقرے کو غور کے ساتھ پڑھیں جس کا یہ جملہ ایک ٹکڑا ہے، تو آپ کو قیام جماعت کی بھی شرعی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا اس فقرے میں میدان جنگ کی نماز کا طریقہ بتایا گیا ہے، اور بات یوں شروع ہوتی ہے کہ "جب تم سفر میں نکلو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنی نمازوں کو کم کر دو، اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ کفار تمہیں مصیبت میں ڈال دیں گے (وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا)" پھر آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ "اے نبی! اگر تم بہ نفس خود ان میں موجود ہو اور انھیں نماز پڑھاؤ تو چاہیے کہ ان میں کا ایک گروہ تمہارے پیچھے اپنے اسلحے لیے ہوئے نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابل رہے جب پہلا گروہ ایک رکعت پوری کر لے تو دوسرے کی جگہ دشمن کے سامنے جا کھڑا ہو اور دوسرا گروہ آ کر تمہارے پیچھے نماز میں کھڑا ہو جائے" اس سے نہ صرف نماز ہی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے بلکہ التزام جماعت کی شدت ضرورت بھی روشنی میں آتی ہے۔ اس کے بعد جب ہماری نظر ان الفاظ پر پڑتی ہے کہ "(فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ)" (جب تمہاری یہ حالت خوف باقی نہ رہے تو نماز قائم کرو) تو جماعت کی پابندی صرف ایک شدید ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی بلکہ وہ واضح طور پر اقامت نماز کے شرائط میں داخل ہو جاتی ہے۔

تعدیل ارکان اور سکون قلب نماز کی اقامت اور محافظت کا کس طرح ضروری جزو ہے، اس کے لیے سورۂ بقرہ کی آیت "(حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ)" (محافظت کرو اپنی نمازوں کی، اور بہترین نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے لیے ادب و نیاز میں ڈوبے ہوئے۔) ایسی کھلی وضاحت فراہم کرتی ہے جس پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔

اسی خشوع باطن کا شرائط اقامت میں ہونا بھی معروف و مسلم حقیقت ہے۔ سورہ المومنون کی ابتدائی آیات

اور سورہ بقرہ کی آیت (۴۶) کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے، ان آیات میں خشوع اور انابت کو نماز کی بنیاد اور اس کا حاصل ٹھیرایا گیا ہے۔ رہ گیا تدبّرِ قرآن کا اقامتِ نماز کے لوازم میں سے ہونا، تو اس کے ثبوت کے لیے سورہ مزمّل کی ان آیتوں پر پھر ایک بار نظر ڈال لیجیے جن کے الفاظ ابھی ابھی ہم نے آپ کے سامنے رکھے ہیں، اور جن کا انداز صاف کہتا ہے کہ اگر قرآن کو پڑھنا ہو تو بس نماز میں پڑھو۔ قرآن کے بعد اگر آپ احادیث اور اسوۂ رسول کی طرف متوجہ ہوں تو آپ کو ان حقائق کی سیر حاصل تفصیلات ملیں گی، جنھیں ہم بخوفِ طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

پس یہ چیزیں اگر نماز میں موجود نہ ہوں اور ان سب سے یا ان میں سے ایک دو سے خالی ہو تو یہ نماز کا قائم کرنا اور ان کی محافظت کرنا نہ ہوگا بلکہ اس کا ضائع کرنا ہوگا۔ ایسی نماز نہ تو دین کی بنیاد ہوگی نہ اس سے آپ ان ثمرات کی کبھی توقع کرسکتے ہیں جو قائم کی جانے والی نماز کے ثمرات ہیں۔ یہ نماز اعمالِ خیر کا سرچشمہ تو کیا بنے گی یہ تو شیطانِ نفس کے ایک حملے کی بھی تاب نہیں لاسکتی۔ بنی اسرائیل کی تاریخِ عبرت ہمارے سامنے ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ انھوں نے چونکہ نماز ضائع کردی تھی اس لیے ان کی زمامِ فکر و عمل شہواتِ نفس کے ہاتھوں میں جا پڑی (اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوٰتِ) اور یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ نفس کی پیروی اور دین کے انہدام میں دوری بہت تھوڑی ہے۔

کارکردنی اب ہمیں بحث و نظر کی بیرونی سرحدوں سے ہٹ کر خود اپنے قریب آجانا چاہیے۔ ہر وہ مسلمان جو اپنے دین کی بنیادوں کو صحیح طرز پر تعمیر کرنا چاہتا ہے، ان تفصیلات کے بعد ایک سنجیدہ فکر میں ڈوب جائے گا اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی نہ ڈوب جائیں اور اپنے آپ سے خود یہ نہ پوچھیں کہ ہماری نمازیں کیسی ہوتی ہیں؟ آیا وہ محض پڑھی جاتی ہیں یا قایم بھی کی جاتی ہیں؟ ہوسکتا ہے کہ اس سوال کا جواب کچھ ناپسندیدہ سا ہو، مگر اس کے باوجود اسے ہونا چاہیے تاکہ ہم اپنے آپ کو پہچان تو جائیں کہ یہی خود آگاہی دراصل کامیابی کی شاہ کلید ہے۔ ہمارے سامنے ایک طرف تو نماز کی یہ حقیقت اور اہمیت ہے، دوسری طرف اس کی یہ خصوصیات ہیں، تیسری طرف اس کے بہت سے لازمی ثمرات و نتائج ہیں (مثلاً یہ کہ وہ پیرویِ نفس سے باز رکھتی اور فحشاء و منکر سے روکتی ہے، دل کو اطمینان کی ٹھنڈک بخشتی ہے، مشکلات میں تحمل اور استقلال کی قوت بہم پہنچاتی ہے، اور سب سے آخر میں یہ کہ انسان کو نیکوکار اور پابندِ شرع بناتی ہے) جو نہ صرف نماز کے لازمی ثمرات و نتائج ہی ہیں بلکہ اس کی صحت کی ایک کھلی ہوئی کسوٹی بھی ہیں —— پھر ان تینوں باتوں کے ساتھ ساتھ چوتھی طرف ایک پہاڑ سے بھاری حقیقت اور بھی ہے اور وہ یہ کہ نبی کے لیے بھی فرائضِ نبوت کے بارِ گراں کا تحمل اس کے بغیر ممکن نہ ہوا کہ وہ نماز سے کسبِ توانائی کریں اور نہ صرف عام فرض نمازوں ہی سے، بلکہ آخرِ شب کی تہجد اور فجر کی طویل نمازوں سے بھی یہ ساری باتیں ہم سے کچھ مطالبہ کرتی اور ہمارے لیے

ایک راہِ عمل متعین کرتی ہیں، اور وہ یہ کہ ہم اپنی پہلی فرصت میں اپنی نمازوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ کہاں تک نماز ہیں۔ پھر ان میں جس پہلو سے جو خامیاں نظر آئیں ان کی اصلاح کی فکر کریں اور یہ جائزہ اور فکرِ اصلاح مسلسل ہو۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جو کام ـــ طاعتِ حق اور اقامتِ دین کا کام ـــ نبی اور اصحابِ نبی کی بھی رات کی میٹھی نیندوں کو قربان کیے بغیر نہ ہو سکا وہ ہم اور آپ صرف نپے تلے وقتہ نمازوں کو بس قانونی انداز میں ادا کر کے قیامت تک نہ کر سکیں گے۔ آپ اپنی نمازوں کا ایک ذرا گہری نگاہ سے جائزہ لیجیے، آپ بڑی آسانی سے اس بات کا اندازہ لگا لیں گے کہ یہ نمازیں کہاں تک آپ کے دین کی بنیاد مضبوط بنا رہی اور آپ کو اقامتِ دین کے ادائے فرض سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت بہم پہنچا رہی ہیں۔ یہ اندازہ آپ کو یوں ہوگا کہ جس حد تک آپ ان نمازوں میں خشوع پائیں وقت اور جماعت کا اہتمام دیکھیں، رکوع و سجود میں قرار و سکون کا مشاہدہ کریں، قرأتِ قرآن میں طول، اور آیاتِ قرآن میں تدبّر و تفکّر محسوس کریں، بس قیاس کر لیجیے کہ اسی حد تک یہ نمازیں آپ کو ایمان کی طاقت دے رہی ہیں، اور اسی حد تک آپ پیرویِ دین کے ادعا کو نبھانے کے قابل بن رہے ہیں۔

نمازِ تہجد اس موقع پر نمازِ تہجد کی مخصوص اہمیت ہماری مخصوص توجہ کی سزاوار ہے۔ گو یہ نماز امت پر فرض نہیں ہے، مگر اس کی یہ نوعیت صرف قانون کی حد تک ہے خصوصاً ان لوگوں کے حق میں جو عوام میں سے نہیں اور جو شہادتِ حق اور اقامتِ دین کا علم تھامے ہوں، جن کی راہِ عمل رخصت کی نہیں بلکہ عزیمت کی ہو۔ یہ نماز عامِ امت پر اگر فرض نہیں کی گئی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ ایک غیر معمولی مشقت کی موجب تھی، اس لیے اس کی تمام تر افزائشوں کے باوجود شارعِ رحمان و رحیم نے اس کو فرض نہیں قرار دیا، جیسا کہ اس کا اصولِ تشریع چاہتا تھا، مگر اس کے باوجود اس کے کلام میں اس نماز کی جیسی کچھ ترغیب دی گئی ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں۔ مثالی مومنوں کی جب وہ صفات گناتا ہے تو بات پوری نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اس طرح کے الفاظ نہیں کہہ لیتا:

"تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ"	ان کے پہلو راتوں کو بستروں سے دور ہوتے ہیں۔
"قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ"	وہ راتوں میں بہت کم سوتے ہیں۔
"اَلَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا"	جو اپنی راتیں اپنے رب کے حضور سجدہ و قیام میں گزار دیتے ہیں۔

بس یہ صحیح ہے کہ یہ نماز فرض نہیں، مگر یہ بھی غلط نہیں کہ یہ الفاظ جو مثالی ایمان کے نمایاں خط و خال کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ بھی کچھ معنی رکھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس معنی پر غور کیا جائے اور اسے سمجھنے کی کوشش

کی جائے۔ پھر یہ بات تو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ تبلیغ دین کی مہم سر کرنے کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح عام نمازوں کی اقامت کا حکم دیا گیا اسی طرح قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا کی ہدایت بھی فرمائی گئی، اور پھر اس قیام لیل (یعنی نماز تہجد) کی اہمیت و تاثیر پر یہ کہہ کر مہر تصدیق ثبت کر دی گئی کہ "إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا" (ہم تم پر ایک بھاری بات کا بوجھ ڈالنے والے ہیں) جب کہ پورے قرآن میں کہیں کسی نماز کے ذکر کے ساتھ بھی ایسا نہیں فرمایا گیا۔ کیا یہ اس حقیقت کا اعلان نہیں کہ "قول ثقیل" کی گرانباریوں کی قوت برداشت خصوصیت کے ساتھ نماز تہجد ہی سے پیدا ہوتی ہے؟

عام اذکار عام نمازوں کے سوا جس طرح نماز تہجد کو ارتقائے باطن کے باب میں خاص دخل ہے، اور شریعت نے اس کی ترغیب دینے میں کوئی پہلو نظر انداز ہونے نہیں دیا ہے، اسی طرح کچھ خاص دعائیں اور چند خاص اذکار بھی ہیں جن کے پڑھتے رہنے کی اس نے زبردست سفارش کی ہے۔ تزکیۂ باطن اور تقویت ایمان کے سلسلہ میں ان اذکار و اوراد ماثورہ کا حال تہجد ہی سا ہے، یعنی قانون کی زبان سے تو ان کو فرض اور واجب نہیں کیا گیا ہے، لیکن افادۂ ایمانی کی زبان سے ان کو ایسا ہی کچھ بتایا گیا ہے۔ قرآن نے جس طرح بندگان حق کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ میٹھی نیند کے مزے چھوڑ کر راتوں کا کتنا ہی حصہ رکوع و سجود میں گذار دیتے ہیں اسی طرح ان کا ایک عام وصف یہ بھی بتایا ہے کہ اگرچہ بزبان حال و بزبان قلب تو اللہ کی یاد ان کا دوامی وظیفہ زندگی ہے ہی مگر بزبان قال بھی ان کے شب و روز کے مختلف اوقات اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح ہی میں گذرتے ہیں (وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے لو لگائے اور محاسبۂ اعمال کے خوف سے لرزتے ہوئے اس سے دعائیں اور التجائیں کرتے رہتے ہیں۔ (يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا) رات کی خوابیدہ ساعتوں میں اگر وہ محو نماز رہتے ہیں تو سپیدۂ صبح کی نمود ان کو توبہ و استغفار میں مشغول پاتی ہے (وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ) معلوم ہوا کہ یہ حمد و تسبیح، یہ دعا و التجا، اور یہ توبہ و استغفار بھی مومن صادق کی ایک ضروری علامت اور نمایاں پہچان ہے۔ قرآن نے جس بات کا ان لفظوں میں اجمالی ذکر کیا ہے اسی کی تفصیلات ہیں جو آپ کو احادیث کے اندر ملتی ہیں اور جن سے نبی اور اصحاب نبی کی مثالی زندگی مرتب نظر آتی ہے۔

ان اذکار کی حقیقی نوعیت یہ اذکار اپنی روح کے اعتبار سے نماز سے کچھ الگ اور مغایر چیزیں نہیں ہیں بلکہ نماز سے ان کا گہرا تعلق ہے، اتنا گہرا تعلق کہ اگر ظاہری شکل و صورت کو بیچ سے ہٹا دیا جائے اور نظر صرف اصلی جوہر پر رکھی جائے تو دونوں کو دو کہنا ممکن ہی نہیں۔ نماز آخر کیا ہے؟ صرف اللہ کی یاد اور اس کی صفات اور لوازم صفات کا تذکرہ جیسا کہ پچھلی بحثوں

میں دلائل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے۔ پھر نماز اور عام اذکار میں کیا فرق رہا۔ سوائے اس کے کہ ایک کے ساتھ کچھ خاص حرکتیں اور ہیئتیں بھی وابستہ ہیں، دوسرے میں نہیں، نماز اپنا ایک موزوں لباس بھی رکھتی ہے، ذکر اس لباس سے عاری ہوتا ہے۔ گویا دونوں میں صرف یہ فرق ہے کہ نماز ذکر الٰہی کی مکمل ترین، موزوں ترین اور مؤثر ترین شکل ہے جب کہ دوسرے اذکار میں یہ تکمیل شان نہیں ہے، اور یہی وجہ ہے کہ نماز اصل ذکر ہے اور اذکار غیر کی حیثیت فرع اور تتمے کی ہے۔ یہ اذکار در اصل نماز ہی کے معاون اور اسی کے مقصد کے خادم ہیں۔ اگر نماز امراضِ قلب کا اصلی اور بنیادی نسخۂ شفا ہے تو ان اذکار کو اس کی امدادی خوراکیں سمجھنا چاہیے۔

نماز کا مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے احساسِ بندگی پر غفلت کے پردے نہ پڑنے دے، اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھے۔ اسی ہمہ وقتی یاد کی خاطر طلوعِ فجر سے لے کر، جب کہ انسان بیدار ہوتا ہے، ابتدائے شب تک، جب کہ وہ نظامِ قدرت کے مطابق سو جانے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، بیداری اور حرکت و عمل کی ساری گھڑیوں کو نمازوں سے گھیر دیا گیا ہے، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کو کاروبارِ دنیا سے الگ ہو کر مسجد میں آجانے اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو جانے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ بار بار اس کے منصبِ عبودیت کی یاد دہانی ہوتی رہے۔ اب جو اس کے ساتھ یہ تلقین بھی فرما دی گئی کہ فرض ہر نماز کے بعد اتنی نفلیں اور ادا کیا کرو، اتنی تسبیحیں، اتنی تحمیدیں، اتنی تکبیریں بھی پڑھا کرو، مسجد میں داخل ہو تو اپنے لیے فتح بابِ رحمت کی، اور اس سے نکلو تو حصولِ فضل کی دعائیں مانگو، پھر جو کام بھی شروع کرو اللہ کا پاک نام لے کر شروع کرو، ہر بھلائی پر کلمۂ شکر اور ہر مصیبت پر کلمۂ صبر کہو، پانی پینے کے بعد، کھانے سے فارغ ہو کر، چھینک آنے پر، سوتے وقت، بیدار ہو کر، حتیٰ کہ بیت الخلا میں جاتے ہوئے اور وہاں سے نکلتے ہوئے اس اس طرح اللہ کا نام لیا کرو، یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے مواقع پر جن دعاؤں اور تسبیحوں کے پڑھنے کی زبانِ رسالت نے ہدایت فرمائی ہے ان کا مقصد صرف یہی ہے کہ نماز کی پیدا کی ہوئی یادِ خدا دم بدم تازہ ہوتی رہے، مبادا کہ مشاغلِ دنیوی کے ہنگاموں میں وہ ماند پڑ جائے۔ لیکن اس غیر معمولی اہتمام کے بعد بھی اگر غفلت اپنے تاریک سائے صفحۂ قلب پر ڈال دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اس کے ازالے کے لیے رات کی خاموش ساعتوں اور اشکِ ندامت کے گرم دھاروں سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان ساعتوں میں صرف یہی خصوصیت نہیں کہ وہ خاموش ہوتی ہیں، سکون پرور اور اثر آفریں ہوتی ہیں، بلکہ ان میں رحمتِ الٰہی خود اپنی مغفرت کے تحفے بخشنے کے لیے گنہگاروں کو پکار رہی ہوتی ہے۔ عقل باور نہیں کرتی کہ ذکر الٰہی کے دوام کا کوئی اس سے زیادہ فطری اور مؤثر طریقہ اور بھی ہو سکتا ہے، اور اس فطری اور کلی نسخہ کے صحیح استعمال کے بعد بھی روحِ انسانی غفلت زدہ باقی رہ سکتی ہے۔

پھر اسی طرح یہ بات بھی ناقابلِ تصور ہے کہ اس کلّی نسخہ کے کلّی استعمال کے بغیر بھی اساسِ دین کی صحیح، متوازن، اطمینان بخش اور ٹھوس تعمیر ہو سکتی ہے۔

ذکر میں فکر لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ کسی نسخے کو اگر اس کے ضروری آداب اور بنیادی شرائط سے تہی دامن کر دیا جائے تو چاہے اس کا نام نہ بدل سکے، مگر اس نسخے کے کوئی فوائد و اثرات کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ ایک جاندار کے جسم کا رشتہ جب تک روح سے باقی ہے، اس کے ہاتھ پاؤں سے آپ ہر اس حرکت اور عمل کی امید کر سکتے ہیں جس کا اس قسم کے جاندار سے بالعموم ظہور ہوا کرتا ہے، مگر کیا اس رشتے کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی ایسی کوئی امید کی جا سکتی ہے۔؟ ٹھیک یہی حال اذکار، اوراد اور تسبیحات کا ہے۔ احادیث میں ان کے فضائل پڑھ کر انسان ایک مرعوب کن حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ ایک ایک کلمۂ تسبیح کی بابت مخبرِ صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے خبر دی ہے کہ اس کے انوار و برکات سے فضائے آسمانی معمور ہو جاتی ہے، لیکن کیا گردشِ زبان سے ادا کیا ہوا، اور دانۂ تسبیح پڑھا ہوا ہر کلمہ اس تاثیر کا حامل ہو سکتا ہے؟ سوال نری عقیدت سے نہیں، بلکہ حقیقت کا ہے۔ ظاہر ہے یہ پاک کلمات ہر آئینہ ان فیوض روحانی کا سرچشمہ نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کا یہ اثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ دل کی گہرائیوں سے اس حال میں نکلے ہوں کہ شعور پر ان کے معانی چھائے ہوئے ہوں۔ اس لیے اگر ان اذکار کا مقصود حاصل کرنا ہو تو ضروری ہے کہ جس وقت زبان سبحان اللہ کہے، اس وقت چشمِ تصور کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ شان پاکی و کبریائی مجسّم ہو جو اس کلمہ کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس وقت ذہن میں نہ صرف اس کلمے کا ایک سادہ مطلب ہی پھر جائے بلکہ اس کی حقیقت، اور اس حقیقت کے دور رس تقاضوں کی صدا سے بھی وہ گونج اٹھے۔ اس طرح ذکر سے ادا ہونے والے ایک ایک کلمۂ تسبیح سے اگر فضائے عالم معمور تجلّی ہو جائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں! اور اس طرح کے ایک ایک کلمۂ پُرسوز کو لینے کے لیے اگر ملائکہ باہم مسابقت کریں[1] تو انھیں ایسا کرنا ہی چاہیے۔ لیکن اگر یہ طرزِ ذکر نہ اختیار کیا جائے، اور فکر و تاثرِ معنوی سے بے نیاز ہو کر بس سبحہ گردانی ہی پر اکتفا کر لیا جائے تو اس سے آپ اس فائدے کی توقع ہرگز نہ کریں، اور اگر کریں گے تو دراصل اپنے آپ کو فریب دیں گے۔ پس ذکر میں بھی فکر اور تدبّر کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ نماز میں ہے، بالخصوص قرأت کے وقت آیاتِ قرآن پر۔ بغیر فکر و تدبّر کے ذکر اور نماز کی مثال اس کارتوس کی سی ہے جسے ہاتھ سے

---

[1] یہ اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک صحابی نے رکوع سے اٹھتے ہوئے بآوازِ بلند ربنا لک الحمد حمدا طیبا مبارکا فیہ پڑھا۔ نماز ختم ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کے لینے کے لیے ملائکہ نے باہم مسابقت کی۔"

پھینکا جائے۔ ظاہر ہے کہ کارتوس کی اصلی صلاحیتیں اور تاثیریں عملاً اسی وقت ظہور میں آتی ہیں جب انہیں بندوق کی نال میں رکھ کر چلایا جائے۔ اور اگر کوئی نادان اس کا غلط استعمال کر کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کرتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہے، کارتوس کا نہیں، اور اسے اپنے طرزِ استعمال کی اصلاح کر لینی چاہیے، نہ کہ کارتوس کی صلاحیتِ کار پر بدگمانی۔ یہی حال ذکرِ الٰہی کا بھی ہے۔ اس ذکر کے الفاظ سے نہیں، بلکہ ان کے الفاظ معانی سے وہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں جو مقصود ہیں، یہ معانی جس حد تک اپنا عکس قلب پر ڈالیں گے اسی حد تک اس میں ایمانی زندگی پیدا ہوگی، اور اس انعکاس کا تمام تر انحصار ذہن کی یکسوئی، دل کی توجہ، فکر اور تدبر پر ہے۔ جن لوگوں کی نظر قرآن پر ہوگی، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اصل ذکر زبان کا ذکر نہیں بلکہ دل کا ذکر ہے۔ حقیقی ذاکر وہ ہے جو ہر وقت اللہ کو اپنے سامنے، یا کم از کم یہ کہ اپنے کو اللہ کے سامنے موجود اور حاضر محسوس کرتا رہے۔ اس کے اعضائے جسم دُنیا کے دھندوں میں مشغول ہوں، مگر دل کسی اور ہی کی یاد میں اٹکا ہوا ہو، اور اس کی چشمِ رضا کے اشاروں سے غافل نہ ہو۔ سورہ جمعہ کی مشہور آیت ہے:

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَانْتَشِرُوْا — جب تم نماز پوری کر چکو تو زمین میں پھیل جاؤ
فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ — اور اللہ کے فضل (یعنی رزق) میں سے (اپنا حصہ) تلاش کرو اور
وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ — اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ کامیاب ہو۔

یہ آیت حقیقی ذکرِ الٰہی کی سب سے بڑی شارح ہے۔ اس کا یہ فرمانا کہ تلاشِ رزق، ذکرِ الٰہی کے ساتھ ہم رشتہ رہے، اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ اصلی ذکر نام ہے کاروبارِ دُنیا انجام دیتے ہوئے خدا سے، اس کے احکام سے، اس کی حدود سے اور اس کے محاسبے سے بے فکر نہ ہونے کا، خود نماز کا، جو ذکر کی کامل ترین صورت ہے، یہی مدعا ہے اور ایک مومن کی شان بھی یہی ہے کہ وہ کسی حال اور کسی وقت میں بھی خدا سے غافل نہیں ہوتا (يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ)۔ نماز اور دوسرے اذکار در اصل اسی حقیقی ذکر کے وجود اور بقا کا ذریعہ ہیں۔ اس ذریعہ کی ضرورت میں ہرگز کوئی کلام نہیں، جس طرح کوئی روح جسم کے بغیر حرکت و عمل سے قاصر ہوتی ہے، اور اس سے کسی کارنامے کے وجود میں آنے کے لیے جسم کا وجود شرط ہے، ٹھیک اسی طرح انسان کے دل کا ذکر بغیر نماز اور اس کے بعد دوسرے مسنون اذکار پر بہر نوع موقوف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس امرِ واقعی میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ذریعہ کبھی اصل مقصود کا قائم مقام نہیں بنتا، اس لیے اگر ذکر اور نماز کی صورت اپنی اصل روح سے خالی ہو تو وہ ہرگز بھرنے کی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اصلی ذکر یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اسی کی یاد بالکل فطری طور پر پیوست ہو جائے، بلکہ اس کی فطرت بن جائے، اور خواہ اس کی زبان خاموش ہو، بلکہ کچھ اور ہی باتیں کر رہی ہو،

گراس کے دل میں یادِ الٰہی کی صدائیں گونج رہی ہوں۔ انسان کا اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے اس کا ذکر وہ شاذ و نادر ہی کرتا ہے، مگر اس کا دل اس ذکر سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی یاد کو اسی طرح اپنی فطری یادداشت کا جزو بنا لیا جائے، ایسا جزو جو جزوِ اکبر ہو۔ اور ذکرِ الٰہی کی یہ نوعیت اس وقت تک حاصل ہونی محال ہے جب تک نماز میں تدبر اور ذکر میں تفکر سے کام نہ لیا جائے۔

اس حقیقت کو ذہن میں یہاں ایک بار پھر تازہ کر لیجیے کہ اصل شے نماز ہے اور وہی ذکر اللہ کا اصل طریقہ اور تزکیۂ باطن کا بنیادی وسیلہ ہے۔ دوسرے اذکار کی حیثیت بالکل ضمنی ہے، اور عملِ نماز کی محض مددگار تدابیر کی سی۔

اس لیے مددگار اور ضمنی تدابیر نہ تو اصل تدبیر کی کسی طرح قائم مقام ہو سکتی ہیں نہ اس کی کسی بڑی ہی کا بدل ہو سکتی ہیں، اور ان کا مطلوبہ فائدہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب نماز کو اس کے ضروری آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا جا رہا ہو، جسے قرآن کی بولی میں اقامتِ صلوٰۃ یا محافظتِ صلوٰۃ کہتے ہیں اس حقیقت کو بار بار نمایاں کرنے کی ضرورت یوں پیش آئی ہے کہ لوگوں کا رویّہ اس باب میں بہت غلط ہو گیا ہے اور ذکرِ اساسی (نماز) اور اذکارِ ضمنی میں مراتب شناسی کا فقدان سا نظر آتا ہے۔

اعمال و اذکارِ غیر مسنونہ } غالباً یہ اسی مراتب شناسی کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے کہ اذکارِ مسنونہ ہی کو کافی نہیں سمجھا گیا اور بکثرت ایسے ذکر، اور ذکر کے مخصوص طریقے ایجاد اور اختیار کر لینے کی ضرورت محسوس کی گئی، جن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ یہ صحیح ہے کہ محتاط زبانوں نے ان چیزوں کو پاسِ شریعت میں جزوِ شریعت اور شرطِ تزکیہ نہیں کہا لیکن ایسا کہنا دشوار ہے کہ زبانِ عمل سے بھی ان کو ایسا ہی کہا جاتا ہے، اور ذوقِ دینی پر ان کے زورِ عقیدت کی گرفت اتنی مضبوط نہیں ہے جتنی کہ مسنون اذکار و اعمال کی۔ اندازہ تو یہ کہتا ہے کہ تزکیۂ نفس کو — جس کی ابتدائی اور بنیادی تدبیروں کو ہم اساسِ دین کی تعمیر کہتے ہیں — ان ہی چیزوں پر منحصر باور کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو زبانِ رسالت خاموش نہ رہتی جس کا کار منصبی اگر کچھ تھا تو یہی تعلیمِ کتاب و حکمت اور یہی تزکیۂ نفس تھا، اور جس کے لیے حرام تھا کہ شارعِ حقیقی کی طرف سے آیا ہوا ایک لفظ کیا معنیٰ ایک اشارہ بھی چھپا رکھے (وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ) اور پھر لفظاً اور اشارۃً بھی ایسا جس کے اوپر تزکیۂ نفس کا دار و مدار ہو، یا کم از کم یہ کہ اس کے باب میں شرطِ تکمیل ہو۔ انکار اس بات کا نہیں کہ ان اذکار و اعمال میں تاثیر ہے، بلاشبہ

نافع ہے، اور بڑی دلنواز تا ثیر ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کی گرویدگیوں کا یہ عالم کیوں ہوتا؟ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہر وہ شئے جو دلوں پر اثر ڈالنے والی ہو، وہ بہرحال اختیار بھی کی جاسکتی ہے؟ کتنی ہی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے فوائد بہت جلد سامنے آجاتے ہیں، لیکن بعد میں چل کر ان کے مضرات ان فوائد سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ کتنے ہی مشاغل افراد کی انفرادی مصلحتوں کے حق میں ہوتے ہیں اور انھیں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں، لیکن دین وملت کی مجموعی مصلحتوں کو ان سے نقصان ہی پہنچتا ہے اس لیے کسی بات کا فی نفسہ پر تاثیر اور مفید مطلب ثابت ہونا اس امر کی کافی وجہ جواز نہیں کہ اسے قبول کرلیا جائے، اور قبول بھی اس طرز پر کہ عملاً دین کے خاکے میں اس کا رنگ سب سے زیادہ گہرا اور ابھرا ہوا ہو۔ نصاریٰ نے رہبانیت اختیار کرلی تھی اور اُسے خدا پرستی اور خدا رسیدگی کا نقطۂ کمال قرار دے رکھا تھا، اگرچہ قرآن نے نفس رہبانیت کی ہرگز مذمت نہیں کی، مگر رہبانیت اختیار کرنے والوں کو اس نے مذموم ٹھیرایا۔ ایک طرف تو وہ رہبانیت کو انابت، باطنی پاکیزگی اور خشیت الٰہی کا موجب بھی تسلیم کرتا اور سچے راہبوں کا مداحانہ انداز میں تذکرہ بھی کرتا ہے۔

(وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ الخ) مومنوں سے محبت کرنے میں سب سے آگے تم اُن لوگوں کو پاؤگے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں، اور اس لیے کہ ان میں کبر خود پرستی نہیں ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ اس کلام کو سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا ہے، تو تم دیکھتے ہو کہ حق کی معرفت سے ان کی آنکھیں اشک ریز ہوجاتی ہیں، مگر ساتھ ہی دوسری طرف ان پر یہ الزام بھی دھرتا ہے:-

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا	اور وہ رہبانیت جسے انھوں نے از خود گھڑ رکھا ہے،
عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ	ہم نے ان پر اسے عائد نہیں کیا تھا ـــ ان پر جو کچھ ہم نے
فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (سورہ حدید)	عائد کیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ اللہ کی رضا چاہیں۔ لیکن

انجام کار وہ اس رہبانیت کا حق نہ ادا کرسکے۔

غور کیجیے اعتراض نفس رہبانیت پر نہیں بلکہ اس کے اختیار کرلینے پر ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قرآن رہبانیت کو بذات خود مذموم اور باطل نہیں ٹھیراتا، مگر "نیک نیت" نصاریٰ کی اس حرکت کو ضرور مذموم اور ایک غلط حرکت قرار دیتا ہے کہ اُنھوں نے علائق دنیوی سے اجتناب میں غلو اور تشدد کرکے ترک علائق کو ہی دینداری سمجھ لیا، اور پھر اس غلو اور تشدد کے بھاری تقاضوں کو اگر دو چار نے پورا کیا تو ہزاروں نے ان کی مٹی پلید کرکے رکھ دی، اس طرح بحیثیت مجموعی ملت کا دینی مزاج ابتر، غیر متوازن اور غیر فطری ہوکر رہ گیا۔

مسئلہ رہبانیت کے یہ دو گونہ رُخ ہمارے سامنے ہیں اور ہمیں یہ حقیقت سمجھا دینے کے لیے بالکل کافی کہ دین و شریعت کے باب میں کسی شئے کا محض بذاتِ خود پُر تاثیر ہونا اس کے قابل قبول ہونے کے لیے ہرگز کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے اللہ اور اُس کے رسول کی تشخیص و تائید بھی ضروری ہے۔ اسی لیے ایسے اذکار و اعمال سے سخت احتیاط کی ضرورت ہے جن کے ذکر سے رسولؐ کی تعلیمات خاموش ہیں۔

فی الواقع ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اللہ کے آخری نبی، آخری معلم اور آخری مزکی کے آجانے کے بعد بھی ذکر و تعبد کے کچھ گوشے مخفی رہ گئے ہوں اور وہ ہمارے تجربات اور اجتہادات کے محتاج ہوں۔ فقہی اجتہادات پر اس کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ فقہی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ مسائل و معاملات زندگی بھی نت نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس لیے ان میں نصوصِ کتاب و سنّت کی بنیادوں پر قیاس کر کے اجتہاد کیے بغیر چارہ نہیں، چنانچہ اسی ناگزیر ضرورت کے پیشِ نظر خود آثارِ صحابہ میں اس کی واضح ہدایت موجود ہے، مگر قلب و روح کے تزکیہ کا معاملہ بالکل جُداگانہ ہے، انسانی قلوب کے بنیادی حقائق رفتارِ زمانہ کے ساتھ بدلنے والے نہیں، وہ جیسے کل تھے ویسے ہی آج بھی ہیں اور سو برس بعد بھی ویسے ہی رہیں گے۔ انسان کی باطنی بیماریوں میں ماضی، حال اور مستقبل کا فرق کوئی جوہری فرق اور حذف و اضافہ نہیں کیا کرتا، جو بیماریاں زمانۂ رسالت میں دلوں کو بیمار بنایا کرتی تھیں وہی آج بھی لاحق ہوا کرتی ہیں۔ پس اگر تزکیۂ نفس کا مدعا یہی ہے کہ نفسِ انسانی کو کفر، شرک، نفاق، دُنیا پرستی، مادّیت، غفلت، آخرت فراموشی اور اتباعِ خواہش کے روگوں سے پاک کر کے اللہ کا سچا پرستار اور مخلص طاعت گزار بنا دیا جائے تو یقین کرنا چاہیے کہ عہدِ رسالت میں بھی یہ روگ اسی طرح دلوں کو لاگو ہوا کرتے تھے جس طرح کہ آج، اور جب ایسا ہے تو دوسرا یقین یہ کرنا چاہیے کہ ان روگوں کے استیصال کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے جو نسخہ تجویز فرما دیا ہے اسی میں شفا ہے، ایسی شفا جو شفائے کُلّی ہے اور جو قلب و روح کو ان کی فطری تندرستی اور توانائی بخشنے والی ہے۔ اس نسخہ میں کسی قسم کے تغیّر کی واقعی ضرورت محسوس کرنا اللہ اور اُس کے رسول کی محتاط اور کامل تشخیص کے باب میں نادانستہ سوئے ظن، یا کم از کم یہ کہ سوئے ادب ہے۔

پھر ان اذکار و اعمال میں سے ان اذکار و اعمال کو تو کسی حال میں گوارا بھی کیا جا سکتا ہے، جن کا مزاج دین کے مزاج سے ہم آہنگ ہو، بشرطیکہ آدمی ان کو وہ اہمیت نہ دے جو اللہ اور اُس کے رسول کے ارشادات کی ہوتی ہے، اور نہ ان کی اس طرح تبلیغ و تلقین کرتا پھرے جیسی کہ مسنون اعمال و اذکار کی ہونی چاہیے۔ لیکن اُن اذکار و اعمال کو تو ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا جن کا مزاج مزاجِ شرع سے میل نہ کھاتا ہو۔

اسامی دین کی تعبیر

یہ مسئلہ گوناگوں حیثیتوں سے بڑا اہم بھی ہے اور بڑا نازک بھی، لیکن اس وقت وہ ہماری اصل بحث کا موضوع نہیں، اس لیے تفصیلی گفتگو کو کسی اور فرصت کے لیے اٹھا چھوڑتے ہیں۔
بحث نماز کے بعض اہم پہلو ابھی اور رہ جاتے ہیں مگر چونکہ ان کا تعلق صبر سے بھی ہے، اس لیے اُن پر گفتگو اسی کے ساتھ مناسب ہوگی۔ (باقی)

(بقیہ اشارات صلحہ) اچھی طرح اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ ہمارے لیے کہاں تک قابل قبول یا لائق اعتنا ہو سکتی ہیں۔
اس بحث سے فارغ ہو کر اب انشاء اللہ اگلی صحبت میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ علیحدگی سے کیا فوائد پہونچ سکتے ہیں۔ اور اس علیحدگی کے بعد ہمارے کرنے کا حقیقی کام کیا ہے؟

تبلیغی کردار کے دو (۲) تاریخی نمونے

مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی

ذیل میں مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہٗ کا ایک گراں قدر مضمون شائع کیا جارہا ہے، جو مولانا نے اپنی عنایت خاص سے، خاص طور پر " زندگی " کے لیے تحریر فرمایا ہے۔ جو لوگ مولانا موصوف سے واقفیت کا شرف رکھتے ہیں، اُن کو معلوم ہے کہ مولانا کے دل میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کتنا گہرا جذبہ موجزن ہے چنانچہ مولانا کا یہ مضمون بھی ان کے اسی جذبہ کا آئینہ دار ہے۔ مولانا نے اس مضمون کے ساتھ جو خط مولانا ابواللیث صاحب کے نام ارسال فرمایا ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں :-

" تازہ زندگی " میں اسلامی اجتماع کی روداد میں ایک جزء دعوت و تبلیغ پر نظر پڑی۔ یہ میرے دل کی بات تھی۔ قلم اُٹھا لیا اور گو فرصت بالکل نہ تھی لیکن لشتم پشتم جو کچھ قلم سے نکل گیا، اس کو بھیج رہا ہوں "

مولانا نے اس مضمون میں تبلیغ کے سلسلہ میں بہت سی کارآمد باتیں تحریر فرمائی ہیں خاص طور سے دین کی تبلیغ کی اہمیت و ضرورت اور اس کی طرف سے مسلمانوں کی عام غفلت و بے پروائی کے ضمن میں مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اور اس کے سلسلے میں زبانی دعوت و تبلیغ کے ساتھ اپنے اندر انبیاء کرام کی سیرت و کردار کی خصوصیات کو اپنانے کی طرف توجہ دلائی ہے وہ تمام مسلمانوں کے لیے بالعموم اور دینی کام

تبلیغی کردار کے دو تاریخی نمونے

کرنے والوں کے لیے بالخصوص لائق توجہ ہے۔

"ادارہ"

مسلمانوں کو تاجر بنانے، کسان بنانے، صناع بنانے، حتیٰ کہ حکمران تک بنانے کی جد وجہد میں جو مشغول ہیں، اُن ہی کے سوچنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ تاجروں، کسانوں، صناعوں، اور حکمرانوں تک اسلام کی دعوت پہونچا کر انسانیت کے ان مختلف طبقات کو اگر مسلمان بنالیا جائے۔ تو بالآخر نتیجۃً حاصل دونوں کا ایک ہی تو ہوگا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ پچھلی کوشش جد وجہد کی پہلی قسم سے شاید زیادہ ضروری ہے، دُنیا کے لحاظ سے بھی مگر دینی منافع کا جو آرزو مند ہے، چاہئے تو یہی کہ وہی خود بھی یہی سمجھے، اور دوسروں کو بھی یہی سمجھائے۔ خیر مذہب و دین کی تاریخ میں جہاں موسیٰ علیہ السلام کی یہ مثال ملتی ہے کہ مصریوں کی غلامی سے نجات دلا کر بنی اسرائیل کو ارض فلسطین کی حکمرانی کے اقتدار تک انھوں نے پہونچا دیا، تو اسرائیلی پیغمبروں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نمونہ بھی ہمارے سامنے موجود ہے، جنھوں نے اسرائیلیوں کے گھرانے میں آنکھیں اپنی ان تاریک دنوں میں کھولی تھیں جب اسرائیلیوں کے گلے میں رومیوں کی غلامی کا طوق پڑا ہوا تھا، پھر مسیح علیہ السلام کی بدولت یہی نہیں کہ صرف روم والے ہی عیسائی بن گئے بلکہ ان کے ساتھ بہ تدریج دیکھا گیا کہ یورپ کا سارا بت پرست ملک بھی اسرائیلی دین، اور موسوی شریعت کو قبول کرتے ہوئے اس زمانہ تک پہونچ

لے بیان کیا جاتا ہے کہ عیسائی ہونے سے پہلے برطانیہ والے وڈن اپالو، منروا نامی دیوتاؤں کو پوجتے تھے، بیماریوں میں اپالو کی طرف، معاشی فراغ بالی کے لیے منروا کی طرف متوجہ ہوتے تھے، ستاروں میں عطارد اور مریخ کی پوجا کرتے تھے، ڈرواڈ نامی ان کے دھرم کی بنیاد قائم تھی، یہ ڈرواڈ زکے لفظ سے بنایا گیا ہے جو انگریزی بھگت ہوتے تھے جن پر دیوتا۔ بھوا کرتا تھا، ان ہی سے غیب کی باتیں پوچھی جاتی تھیں، لکھا ہو کہ ان ہی انگریزی اوجھا طبقہ کے لوگوں کے حکم سے بسا اوقات انسانی قربانیاں بھی دیوتاؤں پر چڑھائی جاتی تھیں کرتے یہ تھے کہ پتلی شاخوں کو جوڑ کر مورتی کی شکل کا ایک خول بنایا جاتا تھا، اور قربانی کے لیے جس آدمی کو چڑھانا مقصود ہوتا، وہ لکڑی کی اس مورتی میں داخل کر دیا جاتا تھا اور مورتی میں اس کے بعد آگ لگا دی جاتی تھی، یوں جل کر زندہ آدمی بھسم ہو جاتا تھا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں دس بارہ مردوں میں چند عورتیں مشترک ہوتی تھیں، مرد اپنے بدن کو نیلے رنگ سے گدواتے تھے، اور بال بھی نہیں کٹواتے تھے، فرانس کی گال نامی قوموں کی مدد کے لیے رومیوں کے مقابلہ میں برطانیہ کے بھی لوگ اپنے بالوں کو سینگ کی شکل بنا کر جب شریک ہوتے تو ان ہی کو دیکھ کر غالباً دنیا میں وہ خیالات پھیلے جو دیووں کی طرف منسوب ہیں، یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں برطانیہ والے تناسخ کے بھی قائل تھے، یعنی مرنے کے ساتھ دوسرے قالب میں روح جنم لیتی ہے تعجب ہوتا ہے کہ جادو جب پاپی اور گنہگار انسانوں کے مرنے کے بعد قالب تناسخ کی بنیاد پر سمجھے جائیں، تو پھر ان ہی پاپی گنہگار انسانوں جو جانوروں کی شکل میں ان لوگوں کے نزدیک سزا بھگت رہے ہیں، [illegible] پایوں

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

گیا کہ براعظم یورپ بلکہ امریکہ تک میں عیسائیوں کے سوا اب کوئی دوسرا نہیں ملتا، یا گنے چنے لوگ ملتے بھی ہیں تو وہ ان ہی عیسائیوں کی محکوم قوموں سے تعلق رکھتے ہیں، اور غلامی کے اسی رشتہ نے کسی نہ کسی ضرورت سے اپنے عیسائی آقاؤں کے ملک تک ان کو پہونچا دیا ہے، جن میں کچھ لوگ وہیں رہ پڑے ہیں۔ اور گو اپنے حاکم بت پرست رومیوں کو عیسائی بنا لینے کی مہم میں حضرت مسیح علیہ السلام کے نام لیواؤں کو زہرہ گداز روح فرسا مصائب سے گذرنا پڑا، لیکن بالآخر ان کی قربانیوں، جان فروشیوں نے ظالم رومی حکمرانوں کو مظلوموں کے مذہب کے قبول کرنے پر مجبور ہی کر دیا۔

اور یہ تو دو مختلف پیغمبروں کے دو مختلف نمونے تھے، اور انسانیت کی قدیم فرسودہ تاریخ سے ان کا تعلق ہے، لیکن یہ تو تازہ تاریخ کا ترو تازہ سامنے کا واقعہ ہے ایک ہی پیغمبر کی ایک ہی اُمت کو اس کا بھی تجربہ کرایا گیا کہ مسلمان بن کر عرب صدیوں کے لیے کرۂ زمین کی سب سے بڑی حکمراں قوت بن گئے اور جب تاتاریوں کے سیلاب نے حاکموں کو محکومیت کی مصیبت میں مبتلا کیا، تو اسی اسلام نے یہ تماشا بھی دکھایا کہ تاتار کی حکمراں قوم اپنے محکوموں کا مذہب قبول کر کے مسلمان بنی کھڑی ہوئی ہے، اور مسلمانوں کے جن جھنڈوں کو اتارتی پھرتی تھی، فخر و مباہات کے ساتھ ان ہی کو لہرا رہی ہے، کہتے ہیں کہ داؤد علیہ السلام کی طرف پرانے عہد نامہ میں جو کتاب زبور کے نام سے منسوب ہے، اس میں بھی، اور نئے عہد نامہ (انجیل) میں — متی وغیرہ کی مدونہ کتابوں میں یہ فقرہ جو پایا جاتا ہے، یعنی مسیح علیہ السّلام نے ہیکل کے یہودی علماء اور بزرگوں کو خطاب کر کے کتاب مقدس زبور کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کیے کہ :-

"جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا، یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے"

اور اس کے بعد فرمایا کہ :-

"اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی، اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے گی دے دی جائے گی"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کو تناسخ والے آخر پوجنے کیسے لگے، مصر والے بھی آواگون کے قائل تھے، لیکن اسی کے ساتھ بلی، مگر مچھ، سانڈ اور سب سے زیادہ آپیس (مقدس سانڈ) وغیرہ جانوروں کو بھی یہ پوجتے تھے، حتیٰ کہ اس سلسلہ میں گبریلا کیڑا بھی ان کا معبود تھا، مصر کے مختلف علاقوں کے باشندوں کے معبود مختلف تھے، مثلاً کسی علاقے میں بلی کی، کسی میں کُتے کی پرستش ہوتی تھی، تماشا اس وقت ہوتا تھا، جب دو مختلف معبودوں کے پوجنے والوں میں لڑائی چھڑ جاتی تھی، ہوتا یہ تھا کہ بلی کے پوجنے والے کتوں کو قتل کرتے تھے اور کتوں کے پوجنے والوں کی طرف سے بلیوں پر آفت ٹوٹ پڑتی تھی۔ ۱۲

پھر کونے کے سرے کے اسی پتھر کے متعلق جسے معماروں نے رد کیا تھا، لیکن " انا تلک اللبنة "[1] یعنی جس کے لیے مقدر ہو چکا تھا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ :۔

" جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، مگر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا"

(متی ۲۱ - ۴۴)

بہرحال ہزارہا سال سے پُرانے اور نئے عہد ناموں میں یہ پیشین گوئی نسلاً بعد نسل سے منتقل ہوتی چلی آرہی تھی، اور اسی پیش گوئی کے ظہور کی وہ شکلیں ہیں، جن کا " اسلام " کی تاریخ میں مشاہدہ کرایا جارہا ہے،

اگر کونے کے سرے کا پتھر وہی " اللبنہ " اور آخری اینٹ ہے جس کا مصداق داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی ذات مبارک کو قرار دیتے تھے تو ہم دیکھتے ہیں کہ " اس پتھر پر جو گرے گا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا " اس فقرے کو پیشین گوئی میں پہلے بیان کیا گیا ہے، اور جس پر وہ گرے گا وہ بھی چکنا چور ہو گا، اس واقعہ کا اظہار بعد کو کیا گیا ہے، اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ پہلی صورت پہلے پیش آنے والی تھی، اور دوسرا واقعہ اس کے بعد ظاہر ہونے والا تھا، اس لحاظ سے جب ہم سوچتے ہیں تو کچھ واقعہ کی صورت بھی کچھ یہی نظر آتی ہے۔ آخر کون نہیں جانتا کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تنہا اُٹھے تھے جب عرب کو دعوت دینے کے لیے آپ کو کھڑا کیا گیا تھا، اور تیرہ سال تک مکہ کی زندگی میں آپ کے ماننے والوں اور آپ کی دعوت کے قبول کرنے والوں کی تعداد سَو سے بھی آگے بڑھنے نہ پائی تھی، اور اس ایک قرن سے زیادہ مدت میں سارا عرب پیغمبر کو پیغمبر کی دعوت و تعلیم کو اس دعوت تعلیم کے قبول کرنے والوں کو مسلسل دھمکاتا رہا، آخر ان ہی دھمکیوں نے پیغمبر اور پیغمبر کے ساتھیوں کو اس فیصلہ پر مجبور کیا کہ اپنے محبوب وطن کو جو خالق کائنات کا بھی محبوب ترین خطہ کرۂ زمین پر تھا چھوڑ دیں،

بہرحال اس کو چھوڑ کر چند سو مسلمانوں کے ساتھ اللہ کے رسول علیہ السلام جب مدینہ منورہ میں پناہ گزیں تھے تو تاریخ کی اطلاع ہے کہ سارے عرب نے :۔

رمتھم بقوس واحد ۔ ایک کمان بن کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔

---

[1] یہ اُس مشہور حدیث کے الفاظ ہیں جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رسالت و نبوات کے نظام کو ایک مکان سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ صرف ایک اینٹ (اللبنہ) کی جگہ اس میں باقی تھی اور میں ہی وہ اینٹ یعنی اللبنہ ہوں، آدریں ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اسماعیل علیہ السلام کو فلسطین سے الگ کرکے عرب کے بیابان میں، اپنی والدہ ہاجرہ علیہا الصلوٰۃ کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تھا، ان ہی اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے وہ کونے کے سرے کا پتھر پیدا ہوا، صلی اللہ علیہ وسلم ۱۲

تبلیغی کردار کے دو تاریخی نمونے

عرب کی ساری آبادی جس میں اصل باشندوں کے ساتھ، خیبر، بنی قریظہ و بنی نضیر وغیرہ کے قلعے اور گڑھیوں والے یہودی ساہوکار بھی شریک تھے۔ ایک کمان بن کران چند سو مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، جن کے مٹ جانے کے بعد اسلام کا نام ہی صحیفۂ ہستی سے (خدانخواستہ) ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا۔

غرض عرب کو، گو اسلام نے اُٹھایا تھا، لیکن خود عرب ہی نے تو اسلام کو ختم کرنے میں کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا، عرب کے بعد ایران کا کسریٰ اور روم کے قیصر اسلام پر گرے، ایران تو ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ... اور چکنا چور ہونے میں روم بھی ایران سے پیچھے نہ رہا، پھر ترک اُٹھے اور اُٹھ کر اسلام پر گرے، دیکھا گیا کہ خود ہی چکنا چور ہو کر گرے ہوئے ہیں، ترک ہونے کی حیثیت سے گرے ہوئے ہیں، لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے اتنا اونچے اور اونچے ہوئے کہ ترکوں کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر پہلے سے موجود نہ تھی۔ لطف تو یہ ہوا کہ بعض ملکوں میں تو مسلمانوں کا نام ہی ترک ہو گیا، پس واقعہ یہ ہے کہ کونے کے سرے کے اس پتھر پر گرنے والوں اور چکنا چور ہی ہونے والوں کو تقدم بھی حاصل ہے، اور اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ میں اگر گنا جائے تو اسلام پر گرنے والوں کی تعداد ان قوموں سے زیادہ بہت زیادہ نظر آئے گی، جن پر خود اسلام گرا، اور ان کی قومیت کو پیس کر انسانیت کی عام برادری کے وسیع سمندر میں ان کو شریک کر دیا۔

"پیسنے" کے لفظ کو "اسلام" کی طرف منسوب کرنے کا یہ مطلب کہ جس قوم پر وہ گرے گا، اُسے فنا کر دے گا، نہ یہ واقعہ ہی پیش آیا اور نہ اس کا یہ صحیح مطلب ہو سکتا ہے،

کسی قوم اور نسل کی فنا سے اپنی بقاء کی ضمانت پیدا کرنا، یا دوسروں کی موت سے اپنی زندگی کی توانائیوں کو برآمد کرنا، اس نصب العین کی گنجائش تو ان ہی لوگوں میں پیدا ہو سکتی ہے، جو وہمی اور فرضی حدود سے گھرے ہوئے کسی زمین کے کسی خاص خطہ میں رہنے والوں کے سوا ان حدود کے باہر زندگی گذارنے والوں سے کسی قوم کا رشتہ نہیں رکھنا چاہتے، بلکہ بسا اوقات یہ سمجھتے ہیں کہ ان بے چاروں کی زندگی زندگی ہی نہیں ہے اور پیدا ہونے کے باوجود پیدائش کے حقوق سے وہ محروم ہیں، یا اپنی قومیت میں شریک کرنے کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں کہ دل کی باتوں کو سمجھانے کے لیے ان کے باپ دادوں نے جو الفاظ فرض کر لیے، مثلاً پانی کا لفظ یہ سمجھانے کے لیے فرض کر لیا گیا ہے کہ فارسی میں آب اور جسے عربی میں ماء، انگریزی میں واٹر کہتے ہیں ہماری یہ اصطلاح ہے کہ اس کو ہم پانی یا جل کہیں گے، غرض باپ دادوں کی ان گڑھی ہوئی اصطلاحوں اور تعبیروں پر اُنہوں نے ذاتی محبت و عداوت کی بنیاد کھڑی کر رکھی ہے، اسی طرح چہروں کی کھال اور کھوڑے کے رنگ ڈھنگ سے وہ پہچانتے ہیں کہ یہ ہمارا آدمی ہے، یا خیال کرتے ہیں کہ چند پشت اوپر کسی شخص کے نطفے سے جن کی ولادت کا رشتہ مل جاتا ہے۔ وہی ان کے اپنے ہیں، لیکن جس پشت کو فرض کر کے اس کے تخم پر اپنی قومیت کی بنیاد وہ قائم

کرتے ہیں، جو اس پشت سے نہیں نکلا ہے، خواہ اس کے سگے بھائی ہی کی پشت سے کیوں نہ نکلے ہوں، وہ ان کی قومی دائرے سے خارج ہیں۔ بہرحال، وطن زبان، رنگ نسل وغیرہ قیود میں جو جکڑے ہوئے ہیں، ان کی سمجھ میں اگر یہ آتا ہے کہ ان کے وطن ان کی زبان ان کے رنگ ان کی نسل سے جو تعلق نہیں رکھتے، ان کو مٹا کر جب تک اپنی قوم کے لیے زمین خالی نہ کرائی جائے گی، ہماری قوم زندہ نہیں رہ سکتی، تو جس "منطق کج" پر قومیت کی یہ ٹیڑھی دیواریں کھڑی کی گئی ہیں؛ ان کا یہ تو لازمی اقتضا ہے۔

لیکن صرف فکری، اور ذہنی تبدیلی پر جس قومیت کی بنیاد رکھی گئی ہو، اور جس میں یہ باور کرایا گیا ہو کہ اسی فکر اور ذہنیت کے رکھنے والوں کی تعداد جتنی زیادہ بڑھے گی، اسی حد تک تم بڑھو گے، بڑھتے چلے جاؤ گے ایسی قوم کیا ایک لمحہ کے لیے بھی یہ سوچ سکتی ہے کہ جن سے اس کی قوم کی تعداد میں اضافہ ہوگا، ان ہی کو ختم کر دیا جائے، مار ڈالا جائے، فنا کر دیا جائے، قومیت کی اس فکری و ذہنی بنیاد کے نسلوں کی بربادی کرنے اور قوموں کے تباہ کرنے کے ان ناپاک اور نجس ارادوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی کیا یہ قوم برداشت کر سکتی ہے۔

کونے کے سرے کا یہ "پتھر" جس پر گرے گا، اسے پیس دے گا، اسے پیس دینے کا میں نے جو مطلب بیان کیا، آپ خود سوچئے کہ "اسلام" جو نہ چہروں کی کھال کے رنگ کو بدلتا ہے، نہ نسلوں کو بدلتا ہے نہ زبانوں کو بدلتا ہے، نہ وطنوں کو بدلتا ہے، بلکہ غلط خیالات و افکار کی جگہ صرف صحیح عقائد و تصورات کا وہ منادی ہے اور ان ہی صادق افکار، سچے خیالات کی بنیاد پر عملی زندگی کی تنظیم کرتا ہے، اسی "اسلام" کو ان گندے اندیشوں، چھچھوری باتوں سے کیا سروکار جنہیں زبردستی اپنے اوپر قیاس کر کر کے قومیں اس کی طرف منسوب کرنے کی عادی ہو گئی ہیں۔

جس اسلام پر عرب گرا، ایران گرا، شام و مصر کی رومی حکومت گری، ترک گرے، تاتار گرے اسی اسلام پر ظلم کیا گیا، اور کہا گیا کہ وہی گردنوں پر تلواروں کو گرا کر مجبور کرتا رہا کہ لوگ اس کو قبول کریں۔ حالانکہ قوموں اور اُمتوں کو چھوڑ دیجئے کاش! میرے اسی "چیلنج" کو قبول کر لیا جاتا کہ تلوار دکھا کر کسی ایک آدمی کو بھی کبھی مسلمان کیا گیا ہے، مسلمانوں کے سلاطین اور حکمران.... اس میں شک نہیں کہ بہت سی ناکردنیوں، اور ناگفتنیوں میں لت پت نظر آتے ہیں، ان میں کثیر تعداد ایسوں کی بھی گذری ہے جنہوں نے وہ سب کچھ کیا، جو ایک فاسق و فاجر بدکار مسلمان کرتا ہے یا کر سکتا ہے۔

لیکن داستان امیر حمزہ کی ہوش ربا داستانوں کے بیان کرنے والے چنڈو خانوں میں جو بیان کرتے رہے ہیں کہ خنجر بکف سینے پر سوار ہو کر پوچھا جاتا تھا کہ :-

"اکنوں در قبول کردن اسلام چہ می گوئی"

تبلیغی کردار کے دو تاریخی نمونے

کیا مسلمانوں کی تاریخوں میں بھی اس کی کوئی عملی نظیر مل سکتی ہے؟ لیکن بھنگڑوں کی گپوں اور افیونیوں کی بکواسوں کو واقعہ قرار دیا گیا، اور جو واقعات کے راوی تھے، ان کی بیان کردہ روئدادوں سے گریز کیا گیا اور اب تک گریز و فرار کے اسی جنون میں دنیا کی بڑی اکثریت مبتلا ہے۔

بہرحال سینوں پر چڑھ کر خنجر کی نوک کو بھونکتے ہوئے اسلام قبول کرنے پر کسی کو کسی زمانے میں کبھی مجبور کیا گیا ہو، کم از کم صحیح تاریخوں میں اس قسم کا کوئی واقعہ میری نظروں سے تو نہیں گذرا ہے، اگرچہ اسی کے ساتھ مجھے اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کو حکمران بنانے کی نیت سے اُٹھنے والوں کی طرف سے ایسی زیادتیاں ضرور ہوئی ہیں، جن کی جواب دہی ان زیادتی کرنے والوں کو خود اسلام، اسلام کے خدا اور اسلام کے رسول (علیہ السلام) کے سامنے کرنی پڑے گی۔

اس نصب العین کے تحت کام کرنے والوں نے پہلے بھی اسلام کے مقررہ حدود کو توڑا ہے، اور آج بھی اسی نصب العین کے زیر اثر کام کرنے والوں کو دیکھا جا رہا ہے کہ وہ جھوٹ بھی بول رہے ہیں۔ افترا پردازیوں سے بھی کام لے رہے ہیں، دھوکے بھی دے رہے ہیں، فریب کی راہوں پر بھی چل رہے ہیں، اور اغراق و غلو مبالغہ سے تو ان میں شاید ہی کوئی محفوظ ہو، ان میں بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ شیطانوں کو فرشتے اور فرشتوں کو شیطان ٹھہرانے سے بھی لوگ باک نہیں کرتے، اپنی آنکھوں کی شہتیر کو تنکا، اور دوسروں کی آنکھوں کے تنکے کو وہ شہتیر مشہور کرنے سے بھی نہیں جھجکتے۔

پس حکمرانوں کی راہ ہو، یا تجارت کی صنعت کی ہو، یا حرفت کی زراعت کی ہو، یا تعلیم و حکمت کی، ان راہوں پر مسلمانوں کو چلانے کی کوشش کرنے والے اگر اسلامی حدود میں رہ کر چلانے کا کام کریں تو یقیناً دنیا میں بھی مدح و ستائش اور آخرت میں بھی اجر و ثواب کے انشاء اللہ مستحق ہوں گے۔

لیکن گلہ اس کا ہے کہ حکومت و تجارت، صنعت و حرفت علم و حکمت میں ترقی کرنے والی قوموں کو مسلمان بنانے کی راہ جو کھولی گئی تھی، وہ کیوں بند کر دی گئی اور ایسا بند کہ نہ چلانے والے ہی اس راہ کے نظر آتے ہیں، اور نہ چلنے والے۔ حالانکہ اس راہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ نہ کسی کی زمین چھینی جاتی ہے، نہ دکانوں پر ان کے للچائی ہوئی نظریں ڈالی جاتی ہیں، نہ ان کے بینکوں اور خزانوں کو تاکا جاتا ہے۔ بلکہ جو چیز جس کی ہے سب کچھ تو اسی کے ساتھ اسی کے لیے محفوظ کرتے ہوئے خیال، صرف خیال، فکر فقط فکر کے بدلنے تک کوشش محدود ہوتی ہے۔ جو سچ ہے، اسی کو سچ اور جو واقعہ ہے اس کو واقعہ مان لو، مان لینے کے اس معمولی ذہنی عمل کے سوا آپ ہی بتائیے کہ اور کیا کہا جاتا ہے یا اور کیا کیا جاتا ہے۔ فکر ہی تو انسانی نفسیات کی ایک تغیر پذیر کیفیت ہے۔ ہر لمحہ آدمی کے اندر ذہنی تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن غلطی سے

غلطیوں ہی کی طرف منتقل ہونے کی جگہ اسلام کا مبلغ غلطی سے صحیح باتوں کی طرف خیالات کو منتقل کرنے کے سوا اور کیا کرتا ہے، ہاں! یہ سچ ہے کہ جو بلائے جاتے ہیں ان کو نہیں مگر بلانے والوں کو کچھ ضرور کرنا پڑتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے، کہ اس زمانے میں اتنا کرنے کی بھی صلاحیت بلانے والوں میں چونکہ باقی نہیں رہی ہے، اسی لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلانے اور دعوت دینے کی تکلیف ہی ان پر اسلام اور اسلام کے خدا کی طرف شاید کبھی عائد ہی نہیں کی گئی تھی، اس راہ سے دیکھا جاتا ہے کہ لوگ بہرے بھی بنے ہوئے ہیں، اور گونگے بھی، ..... ن ...... مگر بندر کی موندی ہوئی آنکھیں سانپ کے وجود کو ختم نہیں کرسکتیں، اور برداشت سے زیادہ جب کا قانون ہے کوئی مطالبہ کسی پر وہ عائد نہیں کرتا بڑی نادانی ہوگی اگر سمجھا جائے کہ مالا یطاق کا مکلف ان کو بنا دیا ہے، جن پر بلانے اور دعوت دینے کی تکلیف عائد کی گئی ہے۔

گو یہ راہ جیسا کہ عرض کیا گیا صدیوں سے سونی پڑی ہے، لیکن اسی سناٹے میں کبھی کبھی کوئی پتہ بھی کھڑک اٹھتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہلچل پیدا کرنے والے اگر ہلچل پیدا کرنے کا ارادہ کرلیں تو اس راہ کی گہما گہمی بھی دوسری راہوں سے کسی طرح کم نہ دکھائی دے گی،

گئے گذرے بھولے بسرے پرانے دنوں کی بات نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی کا نام تو لوگوں نے سنا ہوگا، اور ان کے خانوادے کی ممتاز ہستیاں حضرت شاہ عبدالعزیز شاہ عبدالقادر وغیرہم حضرات سے شاید ہی ہندوستان کا کوئی مسلمان ناواقف ہوگا، انگریزوں کی عمل داری قائم ہو چکی تھی، برائے نام دلی کے لال قلعہ میں ایک بادشاہ بہادر شاہ کے نام سے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا، اور دلی میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے[1] مسند الہند حضرت شاہ مولانا اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ درس حدیث کا حلقہ قائم کرکے عام مردنی کے ان ہی دنوں میں زندگی کا آب حیات تقسیم فرما رہے تھے۔ یہی شاہ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ

---

[1] حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے

جو ہنگامہ غدر کے بعد ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے، اور وہیں آسودہ ہوئے، غرض سو برس سے

زیادہ کی بات نہیں ہے، اس قصے کو وہی خود بیان کرتے تھے کہ ان کے نانا شاہ عبدالعزیز کی دوستی دلی کے ایک پنڈت سے تھی، دوستی لڑکپن ہی سے تھی، اسی لیے پنڈت جی کی آمد و رفت شاہ صاحب کے یہاں بکثرت ہوتی تھی، شاہ اسحاق فرماتے تھے کہ نانا کے دوست ہونے کی وجہ سے پنڈت جی کو میں بھی نانا ہی کہا کرتا تھا،

نانا صاحب کی وفات کے بعد پنڈت جی نے راہ و رسم باقی رکھی، ان کا دستور شاہ عبدالعزیز کے زمانہ سے یہ تھا کہ صبح ہوتے ہی شاہ صاحب کے مدرسہ کے کنویں پر پہنچ کر اشنان کرتے اور اپنے مذہب کے دستور کے مطابق

سورج پر جل چڑھاتے، اپنے اس پرانے دستور کو شاہ اسحاق صاحب کے زمانہ میں بھی پنڈت جی نے جاری رکھا، کہتے تھے کہ ایک دن اپنی عادت کے مطابق لٹیا میں پانی لیے پنڈت جی جواب کافی بوڑھے ہو چکے تھے اس ارادے سے کھڑے تھے کہ سورج کے آگے جل ڈھالیں، میں بھی پہونچ گیا۔ ادھر جیسا کہ میرا قاعدہ تھا سلام کر کے مزاج پوچھا، پنڈت جی نے مجھے آشیر باد دی، اور اس کے بعد آج خلاف دستور مجھے اپنے قریب بلایا۔ بلا کر کہنے لگے تمہارے نانا سے میری بچپن کی دوستی ہے، اور وہ دوستی ان کے انتقال کے وقت تک قائم رہی، لیکن اس پوری مدت میں انھوں نے اپنی زبان سے مسلمان ہونے کی ترغیب مجھے نہیں دی، اور نہ خود مجھے کبھی اس کا خیال ہوا، لیکن آج آپ ہی آپ میرا دل بے چین ہے، اور بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں، پھر پنڈت جی اپنے نئے احساسات کا اظہار ان الفاظ میں کرنے لگے، کہ :۔

"گو میں سورج ہی کو پوجتا رہا ہوں، لیکن آج مجھے خیال آیا کہ ہم جب چاہتے ہیں چلتے ہیں، جب چاہتے ہیں آرام کرتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں جاتے ہیں، اور جہاں چاہتے ہیں نہیں جاتے، مگر سورج ہے کہ رات دن مارا مارا پھرتا ہے، نہ وہ ایک دم کے لیے ٹھہر سکتا ہے اور نہ اپنی معینہ چال کے خلاف چل سکتا ہے"

اس کے بعد پنڈت جی نے کہا کہ :۔

"معلوم ہوا کہ وہ (سورج) تو ہم سے بھی زیادہ مجبور اور زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور ہرگز قابل پرستش نہیں۔"

اسی کے نتیجے ہی زبان کے سلسل جب اسلام کی دعوت پنڈت جی کو شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسحاق کی عملی زندگی دے رہی تھی، برگ و بار کے لانے میں آج کامیاب ہوئی، صاف لفظوں میں پنڈت جی نے یہ کہتے ہوئے کہ :۔

یہ ثابت ہوا کہ دین اسلام ہی حق ہے ؟

اپنی خواہش شاہ اسحاق کی خدمت میں بایں الفاظ پیش کی کہ :۔

"بس بیٹا! تم مجھے مسلمان کر لو"

اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ :۔

"گو میں اسلام کی باتیں جانتا ہوں مگر چاہتا ہوں کہ تمہارے ہاتھ پر اسلام لاؤں تاکہ تم میرے اسلام کے گواہ رہو"

اور سورج کے سامنے سے اپنا رخ پھیر کر سورج کے پیدا کرنے والے خالق کے آگے پنڈت جی نے اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ کچھ ہی دن بعد ان کا انتقال ہو گیا، اور شاہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تجہیز و تکفین کی۔

تبلیغی کردار کے دو تاریخی نمونے

یہ قصہ "ارواحِ ثلاثہ" نامی کتاب میں خاندان ولی اللہی کے حالات ایک ثقہ راوی امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ سے درج کیا گیا ہے، نیز اسی کتاب میں ان ہی شاہ اسحاق صاحب کے ایک تلمیذ رشید مولانا مظفر حسین کا بھی یہ تجربہ اسی سلسلہ میں امیر شاہ خاں مرحوم ہی کے حوالہ سے قلم بند کیا گیا ہے۔

یہ مولانا مظفر حسین رحمۃ اللہ علیہ ضلع سہارن پور کے مشہور علماء خیز و فقراء ریز قصبہ کاندھلہ کے رہنے والے تھے، حدیث حضرت شاہ اسحاق صاحب سے پڑھی تھی، بجائے مولویانہ درس و تدریس کے قرآن کا سادہ ترجمہ ...... عورتوں کو پڑھایا کرتے تھے، سات حج پیادہ پا کیے، ۵ رمئی ۱۸۶۶ء میں بمقام مدینہ منورہ آپ کی وفات ہوئی، بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے تقوے میں اپنی آپ نظیر تھے۔

ان کی زندگی کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ عوام کے لباس میں رہنے اور قصباتی بولی بولنے کی وجہ سے اس قسم کے قصے بکثرت پیش آئے، شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مولانا مظفر حسین ایک دن پیدل کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک غریب بڈھے پر ان کی نظر پڑی جس کے سر پر بوجھ اس کی برداشت کی قوت سے زیادہ تھا، چلنے میں دشواری تھی، مولانا مظفر حسین صاحب نے بڈھے سے کہا کہ لا بھائی! تیرا بوجھ میں اٹھائے لوں، اس نے اتار کر دیا۔ سر پر مولانا بوجھ اٹھائے اس کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ باتوں باتوں میں اسی بڈھے نے پوچھا کہ میاں تم کہاں رہو ہو، بولے بھائی میں تو کاندھلہ رہوں، اس نے کہا ارے وہاں مولانا مظفر حسین بڑے اللہ کے آدمی ہیں، ان کو جانتے ہو، پھر ان کی بڈھا دیر تک تعریفیں کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ مولانا نے اس سے کہا کہ مظفر حسین میں اور تو کوئی بات نہیں، ہاں نماز تو پڑھتے ہیں۔ بڈھا بولا کہ واہ میاں تم ایسے بزرگ کو اچھا کہو، دونوں میں دیر تک اسی مسئلہ میں گرم گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک تیسرا آدمی جو مولانا کو جانتا تھا، کہیں سے آ نکلا، اور بات کھل گئی کہ یہ خود مولانا مظفر حسین ہیں، بڈھا یہ سننے کے ساتھ مولانا سے لپٹ کر رونے لگا، مولانا بھی اس کے ساتھ رو رہے تھے ۔ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۱۱)

کئی دفعہ اسی عامیانہ طرز و وضع کی وجہ سے بے چارے مصیبت میں مبتلا ہوئے، کسی گاؤں میں سرائے کی مسجد میں ایک دفعہ شب باش ہوئے اور کچھ رات رہتے ہی روانہ ہو گئے، صبح کو معلوم ہوا کہ سرائے میں چوری ہوئی، لوگ پیچھے سے تعاقب کرتے ہوئے پہنچے اور دھر لیا، کہا ہو نہ ہو تو ہی نے رات سرائے میں چوری کی ہے، تھانہ پکڑ کر لے گئے تھانہ دار اتفاقاً حضرت کے عقیدت مندوں میں تھا اس حال میں حضرت کو دیکھ کر وہ کچھ مبہوت سا ہو گیا۔ اور لانے والے کی طرف جھپٹا، آپ نے اس سے کہا کہ جلد بھاگ جا، وہ بھاگ گیا۔ اور تھانہ دار سے آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو، وہ مجھے جانتا نہیں تھا۔

ارواحِ ثلثہ نامی کتاب، اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ کے ملفوظات قصص الاکابر میں بھی مولانا مظفر حسین کی عجیب و غریب سیرت و کردار کے متعلق عبرت آموز قصے درج ہیں۔

تبلیغی کردار کے دو تاریخی نمونے

اس وقت ان ہی مولانا مظہر حسین صاحب کے خاموش لیکن کامیاب تبلیغ کا ایک نمونہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اور ارواح ثلاثہ میں ہے کہ مولانا مظہر حسین عموماً پیدل چلنے کے عادی تھے سامان میں ان کے پاس ایک لوٹا، ایک لنگی کلہاڑی، خشکیزہ کے سوا اور کچھ نہ ہوتا ایک دفعہ سفر کرتے ہوئے شام کو ایک گاؤں میں پہونچے جہاں صرف ہندوؤں کی آبادی تھی، کوئی مسلمان نہ تھا، ان ہی ہندوؤں سے کہا کہ رات تمہارے گاؤں میں گذاروں گا، پڑ رہنے کی کوئی جگہ بتا دو، گاؤں کے باہر جہاں کولہو چلتا تھا۔ وہیں کسی نے لے جاکر آپ کو ٹھہرا دیا۔ رات جب بھیگ گئی، تو کولہو والی جگہ میں کوئی نہ رہا، صرف مولانا پڑے رہے پچھلی رات کو حسب معمول اٹھے، ایک خاص لے میں تہجد کی نماز پڑھتے ہوئے قرآن تلاوت کر رہے تھے۔ جس نے کولہو میں آپ کو ٹھیرایا تھا۔ کسی ضرورت سے اسی وقت پچھلی رات میں وہاں پہونچا، قرآن خوانی سے وہ بے چارا غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔ صبح ہوئی، تو حاضر ہوکر اس نے عرض کیا کہ رات جو کچھ تم پڑھ رہے تھے۔ وہ مجھے بھی پڑھا دے۔ پھر آپ کو اپنے گھر لے گیا، اور اپنے اسی غیر معمولی تاثر کے تحت جیسا کہ اسی کتاب میں لکھا ہے۔

وہ، اور اس کے بیوی بچے سب مسلمان ہو گئے صفحہ ۱۵

تبلیغی کردار کے یہ دو نمونے ہیں، ان نمونوں کو غور کیجیے۔ اور یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ زبان اور قلم سے سچائی دلوں میں اتاری جاتی ہے۔ یا اس کے لیے دوسرے سازو سامان کی بھی ضرورت ہے،

زبان اور قلم کی حد تک تو حضرات انبیاء علیہم السلام کے جن تبلیغی خطبوں کو قرآن نے ریکارڈ کر دیا ہے، میرے نزدیک سچائی کے پھیلانے کے لیے دنیا کا سب سے بڑا قیمتی ذخیرہ تو وہی ہے۔ اگرچہ اس نقطۂ نظر سے ان قرآنی محفوظات اور ان کے مشتملات پر غور و فکر کی زحمت گوارا ہی نہیں کی گئی۔ یا کی گئی ہے تو بہت سرسری۔ تاہم ان پیغمبرانہ خطبوں کی اثر اندازی کے لیے پیغمبرانہ سیرت کو جذب کرنے کی ضرورت بہر حال باقی ہی رہتی ہے۔ ھذا والسلام علی من اتبع الھدیٰ۔

تحریک اور تعمیرِ افراد

انور اعظمی

مادی تحریکوں کے اندر لائحہ عمل کے سلسلے میں ایک اصول مشترک طور پر پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ یہ تحریکیں خالص
ی ہونے کی وجہ سے کسی جائز و ناجائز اور پاک و ناپاک وسیلۂ کار کی قائل نہیں ہوتیں، بلکہ ان کے سامنے
ف اپنے نصب العین تک پہونچنا ہوتا ہے، خواہ اس عمل میں انھیں اخلاقیات سے دست بردار ہونا پڑے
رہنر، دل موقع پر انسانیت کے گلے پر کند چھری رکھ دینا پڑے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے
یہ مادی تحریکیں کسی ضابطہ اخلاق کی پابند نہیں ہوتی ہیں اور جو تھوڑی بہت اخلاقیات نظم جماعت کے سلسلہ
ہوتی بھی ہیں تو ان کی حیثیت محض اضافی ہوتی ہے، آج تک کوئی ایسی مادی تحریک نہیں وجود میں آئی
نے کہ اخلاقیات کو بطور اصول لازمی کے اختیار کیا ہو۔ اس کمزوری کی وجہ سے یہ اکثر مواقع پر ان جرائم
کا ارتکاب کر بیٹھتی ہیں جن کے جواز کا فتویٰ آج تک کسی سوسائٹی کے قانون نے نہیں دیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ تحریکیں افراد کی تعمیر سیرت کی طرف سے مطلق بے پروا ہوتی ہیں، ایک
یا فرد بھی جو سائٹی کے اندر طاعون کے جرثومہ کی حیثیت رکھتا ہو اور اس کی نجی زندگی بد اخلاقیوں کا مکمل مرقع
ش اس وجہ سے ایک مادی تحریک کا رکن بن جاتا ہے کہ وہ ان مقاصد کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے جنھیں
تحریک اپنی جدوجہد کا مرکز بنائے ہوئے ہوتی ہے، اگر کسی وطن پرستانہ تحریک کا اس لحاظ سے مطالعہ کیا جائے
صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پرچم تلے جمع ہونے والے افراد رنگا رنگ سیرت و کردار کے حامل ہیں، ان میں
بھی ہیں جو سوسائٹی کے افراد کا خون چوسنے میں جونک کو بھی شکست دے چکے ہیں، وہ بھی ہیں جو محض الفاظ کی
ٹ پھیر سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھانے کا حیرت انگیز کمال رکھتے ہیں، ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی تو در کنار
نے خاندانی رشتوں کی بھی گردن پر ظلم و بد دیانتی کی کند چھری پھیر دینے میں مشاقانہ چابکدستی دکھا سکتے ہیں۔

اور چند ایک ایسے بھی ہیں جو فطرتاً تھوڑی بہت اخلاقیات کے بھی قائل ہیں، اور ان تمام مختلف المزاج اجزاء کو محض وطنی عصبیت کا رشتہ جوڑے ہوئے ہوتا ہے ایک قوم پرستانہ تحریک بھی اخلاقی اعتبار سے انھیں تمام مفاسد کا شکار ہوتی ہے، اس کے یہاں بھی بھانت بھانت کے کردار ملتے ہیں، طرح طرح کے رجحانات سامنے آتے ہیں، قسم قسم کی مخلوق نظر آتی ہے، یہ اس لیے کہ یہاں بھی اصل اجتماعی محرک کوئی اخلاقی اصول اور کوئی اصلاحی ضابطہ نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز وہ جذبۂ قوم پرستی ہوتا ہے جس کی تسکین کے لیے ہر جائز و ناجائز طریق کار اختیار کیے جاسکتے ہیں، یہاں تک کہ کوئی مادی اصولی تحریک بھی ایسی نہیں جو ان خرابیوں کے آگے بند باندھ کر ان کو اپنے اندر گھسنے نہ دے موجودہ دور کی خالص اصولی تحریکیں بھی اس مرض کی، قومی، وطنی اور نسلی تحریکوں کی طرح شکار ہیں، جمہوریت جس کے پرستاروں کے بھجن سے آج سمورۂ ارضی گونج رہا ہے اپنے افراد کی سیرت کی طرف سے اتنی ہی بے پرواہ ہے جتنی کہ نازی اور فسطائی تحریکیں اسی لیے وقتاً فوقتاً ایسی اطلاعات آتی رہتی ہیں کہ جمہوریت کے علم برداروں نے انسانیت کے ساتھ اتنا دردناک مذاق کیا ہے کہ درندوں اور وحشیوں کی گردن بھی شرم سے جھک گئی ہے۔ امریکہ ـــــ جس کی طرف جمہوری ریاستیں رُخ کرکے اپنی سیاسی عبادتیں ادا کیا کرتی ہیں، وہاں بھی آج حبشیوں کے اوپر وہ مظالم توڑے جارہے ہیں، جن کو سن کر بدن کانپ جاتا ہے، ان حبشیوں کے معمولی معمولی جرموں پر اتنی وحشیانہ سزائیں دی جاتی ہیں کہ انسانیت کی پیشانی سے پسینہ ٹپکنے لگتا ہے، مجرموں کو زندہ بھون ڈالنا، درخت سے باندھ کر ان کے سینہ پر نشانہ لگانا، بچوں کو نوک شمشیر سے چھید ڈالنا تو ایک ایسا کام ہے جس کے لیے امریکیوں کو سوچنے سمجھنے کی مطلق ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ یہ تو قومی عصبیت کی حشر انگیزی ہے، خود امریکیوں کے اندر بھی بے شمار معاشی و معاشرتی جرائم گھناؤنی شکل میں پھیلنے میں اسی وجہ سے کامیاب ہوگئے کہ وہاں کی جمہوری تحریک کے چلانے والوں کی توجہ افراد کی تعمیر سیرت کی طرف کبھی گئی ہی نہیں وہاں کے رہنماؤں کے سامنے پہلا مسئلہ غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنا تھا، اس کے لیے انھوں نے ہر قسم کے افراد کو ایک پرچم تلے جمع کیا اور آزادی وطن کی جنگ چھیڑ دی، کامیابی کے بعد دوسرا اہم مسئلہ ریاست کے نظم و نسق کا تھا، اور اس مرحلہ پر بھی الحادی جمہوریت کی مرعوبیت کی وجہ سے ہر قسم کے افراد کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ ریاست کے کاروبار کو سنبھالنے میں حصہ لیں، چنانچہ وہاں کی فوج میں ایسے افراد در آئے جن کی فطرت مسخ ہو کر انسانیت سے زیادہ حیوانیت سے قریب تھی، انسانوں کو زندہ آگ میں جلا دینا، دشمن ملکوں کی عام آبادی کو تاخت و تاراج کر دینا۔ غنیم کی کھلی آبادی پر ہلاکت کے بم برسا دینا اور بچوں اور عورتوں کو دردناک طریقہ سے ذبح کر ڈالنا ان کے نزدیک کوئی معیوب بات نہیں، بلکہ جب اس طریقہ کار سے ملک و قوم کی سربلندی ہوتی ہو تو ان کے رہنماؤں کے نقطۂ نظر سے تو یہ بڑا مستحسن اقدام تھا۔

فرانس ـــــ جس کی گود میں بیٹھ کر روسو نے انفرادی آزادی کا راگ چھیڑا تھا اور جس ملک کے انقلاب نے پہلی بار مسیحی یورپ کو آزادی کا تصور دیا، وہاں جب شہنشاہی دور حکومت ختم ہو گیا اور حکومتی اداروں میں جمہوریت کا دور دورہ ہوا تو وہاں کے باشندوں کی اخلاقی حالت کس درجہ پست تھی، یہ اس ملک کی کتاب آزادی کا بہت زیادہ دردناک باب ہے، تحریک آزادی کے فوجیوں نے اپنے دشمنوں کے ساتھ جتنا وحشیانہ برتاؤ کیا ہے وہ اس برتاؤ سے قطعاً مختلف نہیں ہے جیسا برتاؤ کہ تاتاری فوجوں نے ترکی کے سلطان کے ساتھ کیا تھا۔ پھر اس ملک کی فوجوں نے غیر ممالک کے فتح کے سلسلے میں جن مظالم کا اعادہ کیا ہے ان کے تذکرے تاریخ کے صفحات پر مستقل بدنما دھبے ہیں، جن کی موجودگی اس جمہوریت پرست ملک کی فوجیوں کو ہمیشہ غارت گران تہذیب و تمدن کی صف میں کھڑا ہونے پر مجبور کرتی رہے گی، اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری حصہ سے لے کر آج تک اس ملک نے مصر، مراکش، جزائر اور ٹیونس میں جس وحشیانہ کردار کا مظاہرہ کیا ہے اس پر خود اس ملک کے معقولیت پسند مصنفین نے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ جن دنوں میں اس ملک کی فوجیں جزائر میں مشق بہیمیت کر رہی تھیں تو ان کی سفاکی پر خود اس ملک کے اخبارات لعنت بھیج رہے تھے۔ ایک جریدہ کے نامہ نگار نے ان الفاظ میں اصل صورت حال سے نقاب اٹھایا ہے کہ "ایک جگہ تو ایک دس سالہ بچہ کو درخت سے باندھ دیا گیا اور پھر اس پر بھڑکتے ہوئے شعلے پھینکے گئے۔" برلن کے نامہ نگار نے اطلاع دی کہ "پانچ دن سے راستوں کے ادھر ادھر لاشیں پڑی ہوئی سڑ رہی ہیں، حکم دے دیا گیا ہے کہ ان کی تجہیز و تکفین نہ کی جائے، تاکہ عوام الناس پر اس کے ذریعہ رعب ڈالا جا سکے" لیکن نامہ نگار کہتا ہے کہ "اس رویہ نے دشمنوں کو خوف زدہ اور مرعوب کرنے کے بجائے ہم سے بہت زیادہ متنفر کر دیا ہے، اور ان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکا دی ہے" آگے چل کر لکھتا ہے کہ "بڑا دردناک منظر تو وہ تھا کہ ایک شیر خوار بچہ اپنی ماں کی چھاتی سے لگا ہوا ہمک رہا تھا اور ماں کی گردن اس کے جسم سے الگ دور پڑی ہوئی تھی"، یہ وحشیانہ کردار کوئی اتفاقی نتیجہ نہیں تھے کہ دشمنوں کی سخت جوابی کارروائیوں نے ان کے غصہ کی آگ کو بھڑکا دیا تھا، بلکہ اس کی وجہ صرف وہ بنیادی کمزوری تھی جس کی طرف اس ملک کے انقلاب پسندوں نے کبھی توجہ ہی نہیں دی۔

یورپ کا کوئی ایسا ملک نہیں ہے کہ جہاں جمہوریت کے نعرے لگائے گئے ہوں اور انسانیت کانپ کر نہ رہ گئی ہو، انگلینڈ کے فوجی جس کردار کے حامل تھے اس سے ہم سے زیادہ کون واقف ہو سکتا ہے اور اٹھارہویں صدی کے وسط کی ہندوستانی تاریخ کی موجودگی میں مزید کسی اور شہادت کی اور کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے ان کے کردار کو سمجھنے کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ جو فوج معاہدہ کرنے کے بعد بھی خود ساختہ جرموں کی آڑ لے کر بنگال اور اودھ کی ریاستوں کو ہڑپ کر جائے اور شہریوں پر زندگی کے راستہ کو بند کر دینے میں کوئی قباحت نہ

محسوس کرے، تو جب یہ کسی دوسری قوم سے برسرِ جنگ ہوگی تو کیا کیا مظالم نہ ڈھائے گی، چنانچہ یہی ہوا بھی، ہندوستان کا وہ طبقہ جو اس سفید طاقت کے سامنے جھک گیا تھا اگرچہ اس نے اس طبقہ کو بھی چین کا سانس نہ لینے دیا، لیکن اس کے مقابل میں جو طاقتیں آئیں اُن پر فتح پانے کے بعد تو اس سفید فام فوج کی درندگی بالکل ننگی ہو کر سامنے آگئی،

یورپ کی یہ جمہوری تحریکیں تو خیر مادیت میں غرقاب ہونے کی وجہ سے مجبور تھیں کہ اخلاقیات کو محض اضافی حیثیت سے اختیار کریں، لیکن ہندوستان میں ابھی چند دنوں پہلے دو بڑی تحریکیں منظرِ عام پر اپنے پورے جوش و خروش کے ساتھ آئی ہیں اور جن کے نزدیک اخلاقیات کا باب زندگی کی کتاب میں کوئی ناخوش گوار اضافہ نہیں تھا بلکہ مستقل حیثیت کا مالک تھا، وہ بھی ان مادی تحریکوں سے متاثر ہونے کی وجہ سے اخلاقیات کے لحاظ سے بالکل دیوالیہ ثابت ہوئیں، ان دردناک واقعات کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں جو پچھلے سالوں میں انسانیت کے لیے کلنک کا ٹیکہ ثابت ہو چکے ہیں، کیوں کہ ان کی یاد ہی نجانے کتنے زخموں کو پھر سے چھیل جاتی ہے۔ ان خونیں واقعات کے بعد بھی بے شمار ایسے مناظر آنکھوں کے سامنے آئے ہیں جن کو سامنے رکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب تک اخلاقیات کو بطور لازمۂ تحریک کے اختیار نہ کیا جائے گا اس وحشت و درندگی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا جو محض الحادی اور مادی تحریکوں کی کوتاہی کی وجہ سے جماعتی نظام میں گھس آنے میں کامیاب ہو جایا کرتی ہیں۔

اب تک تو سوسائٹی کے اس طبقہ کا ہلکا سا جائزہ لیا گیا ہے جو تحریک کا ہراول دستہ ہوتا ہے، جن کی اُمنگوں کے بل پر قومی اور وطنی عزائم کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ طبقے جو سوسائٹی کی تعمیر میں دوسری حیثیتوں سے حصہ لیتے ہیں وہ بھی مادیت کے زہر کو قبول کرنے کے بعد اگر حیوان نہیں بن جاتے تو انسان بھی کہلانے کا استحقاق کھو دیتے ہیں، کیوں کہ مادی جمہوریت کا شیطان سوسائٹی کے متمول اور زردار طبقہ کے کانوں میں یہ افسوں پھونک دیتا ہے کہ تم اپنی دماغی اور ذہنی قابلیت سے روزی کے دسترخوان پر جتنا بھی ہاتھ پھیلا سکو وہ تمام کل کا کل تمہارا ہے، پھر چونکہ اخلاق کی حیثیت محض تفریحی ہوتی ہے اس لیے یہ طبقہ ہر وہ ذریعہ استعمال کرنے پر اتر آتا ہے جس کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ روپیوں کو تجوری کی طرف منتقل کیا جا سکے۔ خواہ اس سلسلے میں اخلاقیات کا خزانہ ہی کیوں نہ خالی ہو جائے یہ افسوں جب فرد یا مجموعۂ افراد پر چل جاتا ہے، وہ اپنے ہی بھائی کی جیب تیغ اندوزی کی قینچی سے اس طرح تراش دیتا ہے کہ اس قبیح جرم کے بعد بھی سوسائٹی اسے عزت کا مستحق سمجھتی رہتی ہے، وہ خوراک کی بوریوں پر بوریاں جما کر محض اس لیے روک رکھتا ہے کہ بازار میں قیمت چڑھا کر ضرورت مندوں سے زیادہ سکے اینٹھے جا سکیں۔ وہ منڈیوں میں ایسے مال لے آتا ہے جن کی ضرورت تو بڑے فصیح و بلیغ لکچر کے بعد لوگوں کی سمجھ میں آتی ہے لیکن رقم بغیر کسی تمہیدی جملہ کے بھی ساہوکار کی تجوری کا رخ

کر لیتی ہے، وہ سٹہ بازی کرتا ہے، جوا کھیلتا ہے، سود کی نلکی سے سوسائٹی کا خون چوستا ہے، راتوں میں چھپ کر نہیں بلکہ دن میں علی الاعلان انسانیت کی شہ رگ پر چھری رکھ دیتا ہے مگر اس کا ہاتھ پکڑا نہیں جاتا، کیوں کہ انفرادی آزادی مادی جمہوریت کا سنہرا اصول ہے جس کو کسی صورت سے قربان نہیں کیا جا سکتا۔

سوسائٹی کا وہ گروہ جس کے افکار و معتقدات پر سوسائٹی کا ذہنی محل تعمیر کیا جاتا ہے، اس زہر کو قبول کر کے انسانی ذہنوں کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے، یہ گروہ علی الاعلان ڈاکہ زنی، عصمت دری، بے حیائی، عریانی، فحاشی کی تبلیغ اپنے مقالوں و افسانوں اور نظموں کے ذریعہ کرتا ہے اور اس کے اوپر بھی کوئی پابندی محض اس وجہ سے نہیں لگائی جا سکتی کہ اس طرح حریت فکر و ضمیر اور اظہار رائے کی آزادی کے زجاج کے شکست کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے، یہ گروہ شعبۂ نشر و اشاعت سے کام لے کر ملک کے ایک شریف شہری کو خبیث کردار کا درس دے گا، دشمن ملکوں پر تہمتوں اور بہتانوں کی غلاظت پھینکے گا۔ اپنے مخالف کیمپ پر الزامات اور جھوٹے جرموں کے اشتہارات چپکائے گا، مگر جب اس کے اوپر کوئی قید لگائی جائے گی تو فوراً آزادی رائے کے پرستاروں کی گردنوں کی رگیں پھول جائیں گی۔ آنکھوں میں خون اتر آئے گا اور ایسے اقدام پر ہر طرف سے لعنت بھیجی جائے گی۔

اس بے روک ٹوک آزاد فلسفہ معاشرت و معیشت سے جس قسم کی سوسائٹی تعمیر ہوتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے افراد جب بیوپار کریں تو سرمایہ کو سمیٹ کر اس پر سانپ بن کر بیٹھ جائیں۔ ایسے سماج کی عدالتیں انصاف کی کرسی کو بیوپار کی منڈی میں تبدیل کر دیں، اس کے رہنما جب عوام کے سامنے آئیں تو ان کی ہمدردی کا لیبل چپاں کر لیں اور جب اپنی نجی معاملات کی دنیا میں قدم رکھیں تو ہر پاک و ناپاک کی تمیز اٹھا دیں۔ اس کے عوام دن کے مجمعوں میں تو اپنے رہنماؤں کے نعرے لگائیں، لیکن رات کے سناٹے میں انھیں کی قبر کھودیں۔

مادہ پرستانہ جمہوریت کے سماج میں جو ایک عام بے چینی اور بداعتمادی پائی جاتی ہے، اس کی سب سے اہم وجہ یہ ہوتی ہے اس تحریک کے اندر کوئی شعبۂ تعمیر سیرت کا نہیں ہوتا اس لیے ذاتی نفع پرستی کا جذبہ جس شکل میں چاہتا ہے نمودار ہوتا رہتا ہے، ایک دوسرے سے تعاون کے بجائے آپس میں مسابقت کا جذبہ پرورش پانے لگتا ہے، دل سوزی اور ہمدردی کے بجائے عام توجہ اس طرف مڑ جاتی ہے کہ جتنا زیادہ دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اٹھا لیا جائے۔ امیر طبقہ نادار کو کسی شکل میں پنپنے کا موقع نہیں دیتا رہنماؤں کا گروہ کبھی بھی عوامی شعور کو بیدار ہونے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر صرف چند اصطلاحات کا پردہ اٹھا دیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ شاہ و سلطان کی جگہ بڑے بڑے مہاجن اور ساہوکار، پروہتوں، پیروں اور پادریوں کی جگہ خوش بیان اور جوشیلے لیڈر اور گرجوں، مندروں اور مسجدوں کی جگہ نیتاؤں اور رہنماؤں اور سرکاری عہدہ داروں کے مکانات کو حاصل ہے اس طرح جو شومئی قسمت سے یا آسمانی حادثہ

کی وجہ سے گرتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے، اس کے پڑوسی، اس کے خاندان اور اس کے حلقہ احباب و متعارفین کو بھی کی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اس کے ہاتھ کو تھام کر سہارا دے دیں اسی طرح جسے خوبی تقدیر سے اچھلنے کا موقع مل جاتا ہے تو وہ مسلسل اونچا ہی اٹھتا جاتا ہے چاہے اس کے پیر کی ٹھوکر سے شیشۂ تہذیب و تمدن ہی کیوں نہ چکنا چور ہو جائے۔ یہاں تک کہ "طاقت حق ہے" کا فلسفہ وجود میں آتا ہے اور دنیا کے سمندر کی ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگلنا شروع کر دیتی ہے۔

اس بے قید فلسفہ کی بطن سے جب دوسرے فلسفہ حیات نے جنم لیا ہے، چونکہ اس کی بنیاد بھی مادیت ہی کی ناپاک زمین پر رکھی گئی ہے اس لیے اس نے اتنا تو کر دیا کہ حد سے زیادہ آزاد انسان کو حد سے زیادہ مقید کر دیا، لیکن یہ تحریک کسی اخلاقی انقلاب کو فرد اور معاشرہ میں نہیں لا سکی۔ اس کی وجہ یہی ہے جو تحریک اپنے افکار و معتقدات کے اعتبار سے خالص مادی ہو گی اور زندگی کے معاملات پر محض فائدہ پرستانہ نقطہ نظر سے غور کرے گی وہ کبھی اخلاق کو وہ اہمیت دے گی ہی نہیں جو اہمیت کہ فی الواقع اسے انسانی زندگی میں حاصل ہے۔ چنانچہ اس تحریک نے زر اور وسیلۂ زر پر پابندی لگانے کے علاوہ اور کوئی انقلاب انگیز قدم نہیں اٹھایا، اس تحریک کے کارکن بھی مادی جمہوری تحریک کے کارکن سے کوئی بلند معیار اخلاق نہیں پیش کر سکے بلکہ اکثر موقعوں پر تو ان سے بھی زیادہ نیچے گر جاتے ہیں۔ چونکہ اس تحریک میں اخلاق اضافی حیثیت بھی نہیں رکھتا بلکہ اخلاقیات محض انسانی ارادہ و عمل کے قصور کا نتیجہ ہیں، اس لیے اس تحریک نے جی کھول کر اپنی خباثتوں کا انسانی معاشرہ کو ننگا بنایا۔

مادی جمہوری تحریک کے فوجیوں کا جو ہلکا سا جائزہ اوپر کی سطروں میں پیش کیا گیا ہے، اس کے آئینہ میں بھی جب اس اتحادی تحریک کے فوجی اخلاق کا چہرہ دیکھا جاتا ہے تو حد درجہ مکروہ نظر آتا ہے۔ ہم فوجیوں کے اخلاق سے اس لیے زیادہ تعرض کر رہے ہیں کہ ایک عام شہری معمولی حالات میں سوسائٹی اور ماحول کے دباؤ سے اپنی بہت سی خباثتوں کو چھپا لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن جب وہی شہری انسان کسی میدان جنگ میں پہونچتا ہے تو تھوڑی سی رخصت بھی اس کے چھپے ہوئے رجحانات پر تازیانہ کا کام دیتی ہے، اور وہ اپنی اصل شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس تحریک کے لیے خون بہانے والے فوجیوں نے ـــــ جنھوں نے کہ اپنے لیے عوامی نجات دہندہ فوج کا "مقدس" نام منتخب کر رکھا ہے ـــــ اپنے دشمنوں پر قابو پا جانے کے بعد جن وحشیانہ جرائم کا ارتکاب کیا ہے اس کی مثال دور دور تک تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس تحریک کے روح رواں جب روس کے اندر زار شاہی کے اوپر بہت [illegible] حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو اس خاندان کے ایک معصوم کو بھی محض اس وہم کی بنا پر زندہ نہیں چھوڑتے کہ یہ سانپ کے بچے آگے چل کر پھر اپنے زہر سے ماحول کو متاثر کر دیں گے تا۔ الزار کے قریبی خاندان کا جس بے رحمی سے قتل ہوا ہے وہ درندگی کے منفرد مثال ہے۔ پھر اس کے فوجی جب

اپنے ملک سے باہر ملکوں میں فاتحانہ داخل ہوئے ہیں تو اس مفتوح زمین کا ہر ایک ذرہ وحشت و بربریت کے بوجھ تلے کچل کر رہ گیا، سمرقند و بخارا کی داستان اب بہت پرانی ہو چکی ہے پچھلی جنگ عظیم کے بعد جب یہ نجات دہندہ فوجیں پولینڈ اور جرمنی کے اندر گھسی ہیں تو انہوں نے جس ظلم و سفاکی، وحشت اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی تھوڑی بہت تفصیل اس وقت کے اخبارات میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اس کا تذکرہ محض طوالت کا باعث ہی ہوگا۔ لیکن مثال کے طور پر چند ایک واقعات کا نگاہ کے سامنے آجانا بھی مفید بحث ہو سکتا ہے۔

"پیٹر کو ٹف" جو بلغاری پارلیمان کا ممبر اور کاشت کار پارٹی کا معزز لیڈر تھا اسے اچانک گرفتار کر لیا جاتا ہے اور اس کے خلاف محض خود ساختہ الزامات کی ایک لمبی فہرست مرتب کر لی جاتی ہے اور وہ فہرست بھی کچھ دنوں کے بعد اپنی اصلیت کے اعتبار سے محض کھوکلی ثابت ہوتی ہے اور پیٹر کو تین مہینہ کے بعد رہائی مل جاتی ہے، مگر ایک ایسے لیڈر کو جو اسٹالن کی آمریت کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہو، اس کی اجازت نہیں کہ وہ بے روک ٹوک اپنی زندگی کے دن پورے کرے چنانچہ چند مہینوں کے بعد پھر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اور اب کے بار اس کو ایسی وحشیانہ سزائیں دی گئیں کہ اس کا دماغ کام کرنے سے معذور ہو گیا اور اس "خود فراموشی" کے عالم میں اس سے ان جرموں کی تصدیق کرائی گئی جن کو سن کر وہ بار بار احتجاج کر چکا تھا۔

اس سے زیادہ دردناک واقعہ ہنگری کی زمین پر ظہور میں آیا جب کہ بڈاپسٹ کی عدالت میں کیتھولک چرچ کے پادری جوزف کارڈینل پر دہشت پسندی اور بغاوت کا الزام قائم کیا گیا۔ جوزف کارڈینل کو اس جرم کا اقرار کرنے کے سلسلے میں جس دہشت ناک رویہ کو اختیار کیا گیا اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

"دسمبر ۱۹۴۸ء میں ان کو اس کی رہائش گاہ ایسٹرگوم سے گرفتار کیا گیا اور اسے فوراً ہی قید خانہ میں ڈھکیل دیا گیا چند دن کے بعد اس سے چند ذاتی سوالات کیے گئے جن میں سے ہر ایک کا اس نے اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد اسے کاغذ اور قلم دیا گیا کہ وہ اپنی زندگی کے حالات مختصر طور پر لکھ دے"

"ابھی وہ اپنی روداد حیات مرتب نہیں کر پایا تھا کہ باہر یہ شور مچا دیا گیا کہ کارڈینل نے اپنے جرموں کا اقرار کر لیا ہے اور اس نے اپنے جرموں کی فہرست پر دستخط بھی کر دیا ہے۔

"اس غلط اعلان کے دوسرے دن اس پادری کو کمرۂ امتحان میں لے جایا گیا اور اس کو ایک سفید دیوار کے مقابل کھڑا کر دیا گیا جس پر تیز روشنی ڈالی جا رہی تھی، اس کے بعد اس کی لکھی ہوئی روداد کو پڑھ کر اسے سنایا گیا اور زور زور سے کہہ کر بار بار کہا گیا کہ یہ روداد محض جھوٹ ہے اور تم نے بالکل غلط بیانی سے کام لیا ہے لیکن کارڈینل برابر یہ جواب دیتا رہا کہ ایک پادری جھوٹ نہیں بول سکتا" اس کے اس بار بار جواب کے بعد سوالات کا رخ پھیر دیا گیا اور اس پر مسلسل مختلف قسم کے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی، یہاں تک کہ وہ مسلسل ۹۶ گھنٹے تک اس

جان لیوا عذاب کا شکار رہا اور سفید دیوار پر آنکھیں جمائے ہوئے کھڑا رہا۔ آخر میں اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا "مجھے جان سے مار دو میں مرنے کے تیار ہوں" مگر اس کا جواب اسے یہ ملا کہ چند سوالوں کا تشفی بخش جواب دے دو تو تمہیں نجات مل جائے گی۔ آخر اس دردناک عذاب نے اس کے ہوش و حواس کو منتشر کر کے رکھ دیا اور وہ تھک کر فرش پر گر پڑا اور مسلسل سترہ گھنٹے ساکت و بے ہوش پڑا رہا۔ ایسے موقع پر ایک ٹائپ کیے ہوئے اقرار نامے پر اس کی دستخط لے لی گئی۔

مگر جب کارڈینل کو ہوش آیا اور اس کے سامنے اس اقرار نامہ کو پڑھا گیا تو اس نے چلا کر کہا "یہ غلط ہے! میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا" اب اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اقرار نامے کی ضرورت تھی چنانچہ اس کو پھر اسی پہلے عذاب میں گرفتار کر دیا گیا، اب کے بار تیرہ گھنٹے کے مسلسل عذاب کے بعد یہ "عوامی نجات دہندہ" اس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اقرار نامے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ کارڈینل "انسدادی مجرم ہے"۔

جس وقت یہ فوج جرمنی کے اندر داخل ہوئی ہے اس وقت مال و جائداد پر جو دست ظلم دراز کیا گیا وہ تو ایک عام اور معمولی کارنامہ ہے اس فوج نے اپنی دنارت کا کتنا گھناؤنا نمونہ پیش کیا ہے اس کی طرف مسٹر ہیوجیبا نے اپنی کتاب "وہ مہذب روسی" میں اشارہ کیا ہے کہ جب برلن کا سقوط ہوا تو روسی فوجیوں نے جرمن عورتوں سے زنا بالجبر کرنا چاہا جس پر ان عورتوں کے بچوں نے گڑگڑا کر کہا کہ "ایسا نہ کیجئے" اور یہ حرکتیں اتنی شدید تھی کہ فوجی نظام میں خلل پڑ جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا اور روسی کمانڈر متعین برلن کو باقاعدہ اعلان کرنا پڑا کہ اگر روسی سپاہی جرمن عورتوں سے بدتمیزی کریں تو وہ ان کے اوپر روشنائی کی بوتل انڈیل دیں، اس طرح ان کے یونیفارم نشان زدہ ہو جائیں گے اور وہ پریڈ کے وقت پکڑ لیے جائیں گے۔

یہ تو بیرون ملک کے حالات کا ہلکا سا تذکرہ تھا خود اس ملک میں جو سماجی اور معاشی خرابیاں رونما ہوئی ہیں اور بلند بانگ دعوے کے باوجود ایک طبقہ جس طرح دوسرے طبقہ کو نگلنے پر تلا ہوا ہے، اس کا تذکرہ بجائے خود بہت افسوسناک ہے۔ اب تو آہستہ آہستہ وہ تمام خواب بے تعبیر ہوتے جا رہے ہیں جن کو یہاں کے مزدوروں نے ۱۹۱۷ء سے پہلے دیکھا تھا کیونکہ اخلاقیات کے فقدان نے بہت جلد زر پرستوں کی ٹولی کو ایسے ذرائع ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب کر دیا جن سے بڑی آسانی کے ساتھ وہ عوامی انقلاب اور مزدور راج کا منہ چڑا سکتے ہیں، آج بھی روس میں معاشی امتیاز اسی طرح عوامی تحریک کا مذاق اڑا رہا ہے جس طرح بادشاہی دور میں انسانیت کا مذاق اڑاتا تھا چنانچہ ایک فرانسیسی کمیونسٹ لی کامر یڈ یان نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ روس کے اندر طبقہ واریت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، یہاں امرا بھی ہیں اور غربا بھی، غالب بھی اور مغلوب بھی۔ ان کے معیار زندگی میں نمایاں تفاوت ہے

دلیسے میں مختلف درجوں کا وجود ہونا اس طبقہ داریت کی دلیل ہے، کچھ لوگ صحت افزا مقامات پر محلات میں ہر طرح کی آسائش و آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور کچھ لوگ سر چھپانے کے لیے جھونپڑوں تک سے محروم ہیں، غریب اور امیر کا امتیاز ہوٹلوں، تھیٹروں اور دکانوں غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے، سرمایہ داری کی جگہ اب بڑے بڑے حکام نے لے لی ہے، غریب مزدوروں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑا نہیں بلکہ بدلا ہے اور یہ نئی زنجیریں پہلی زنجیروں سے کہیں زیادہ مضبوط اور وزنی ہیں۔" (اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں)

ایک طرف تو حکام کا گروہ ہے جو ہر طرح کی آسانیوں اور اونچی تنخواہوں کے سہارے عیاشانہ زندگی بسر کر رہا ہے دوسری طرف مزدور طبقہ کی آمدنی ۵۰۰ اور ۶۰۰ روبل سے زیادہ نہیں ہونے پاتی اور پھر ان کو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جانکاہ محنت و مشقت کو برداشت کرنا پڑتا ہے اس کی تھوڑی سی تفصیل ۵-۶ ماہ پیشتر فرانس سے امریکہ کے مائیکل گورڈے نے پیش کی ہے اُنھوں نے لکھا ہے کہ "ایک انڈے کی قیمت کو حاصل کرنے کے لیے سوویٹ مزدور کو ۱۲ سے لے کر ۱۸ منٹ تک کام کرنا پڑتا ہے۔ آگے چل کر وہ اعداد و شمار کے ذریعہ حسب ذیل اشیاء کی قیمت محنت لکھتے ہیں۔

مکھن (اکلو) ۲ء۲ پونڈ ۵ تا ۱۰ گھنٹے۔
شکر (اکلو) دو گھنٹے
آلو (اکلو) ۱۰ منٹ
چاء (اکلو) ۳۷ گھنٹے ۳۰ منٹ
سوتی لباس ۲۱ گھنٹے ۲۵ منٹ
مردانہ جوتے ۱۴ گھنٹے ۴۰ منٹ
موزے ۴۶ منٹ
مردانہ سوٹ ۱۳۳ سے ۱۵۰ گھنٹے

آج کل ان قیمتوں میں اگرچہ کچھ فی صدی کی کمی ہو گئی ہے، پھر بھی ان اشیاء کی جو قیمت موجودہ شرح میں ہے اس کے لحاظ سے بھی ایک مزدور کو اپنی قوت محنت کا کثیر حصہ خرچ کرنا پڑتا ہے، اور اس مختصر سے خاکے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ عوامی تحریک اپنے کارکنوں کے اندر ان جذبات کو نہیں ابھار سکی جن کی موجودگی ہی میں ایک امیر اپنے غریب بھائی کا حاجت روا بن جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، ایک دوسرے کو سنبھالنے کی روح معاشرے کے اندر بیدار ہوتی ہے اس روح کے مردہ ہو جانے کی وجہ سے مساوات کا جو نشہ چڑھایا گیا تھا حقائق کی بارش سے گھل کر اس مجسمہ سے الگ ہو گیا اور مجسمہ کا پتھریلا پہلو پوری طرح بے نقاب ہو گیا۔

اس مادی تحریک نے جتنے زور شور کے ساتھ مساوات اور معاشی یکسانی کا صور پھونکا تھا، اس کا انجام کتنا ہولناک ہوا اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ آج روس میں تنخواہوں کے ضمن میں عظیم الشان تفاوت پیدا ہو گیا ہے، چند دنوں پہلے ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ اس ملک میں ایک مدرس کی تنخواہ اگر ۵۰۰ یا ۶۰۰ روبل ہے تو تھیٹر کا ایک مسخرہ ۹۰۰ روبل تک حاصل کر لیتا ہے، اسی طرح فوجی اور اعلیٰ حکام کی تنخواہ ہزار روبلز اور سات ہزار روبلز کے درمیان بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور ایسے اشخاص بھی موجود ہیں جن کی ماہانہ یافت دس ہزار روبلز سے بھی زیادہ ہے یہاں تک بعض اہل قلم ۳ لاکھ روبلز سالانہ رائلٹی اپنی کتابوں پر حاصل کر رہے ہیں، خود میکسیم گورگی جس کی موت پر روس پسند مصنفین نے ہر جگہ ماتمی مجلس قائم کی اور جس کے حالات زندگی پر متعدد ماہناموں نے اپنے خاص نمبر شائع کیے تھے اپنی ایک کتاب پر چھ ہزار روبل حاصل کرتا رہا، یہاں نہ صرف یہ کہ زردار و نادار کا امتیاز پوری شدت سے قائم ہے بلکہ ایسے مواقع فراہم کر دیے گئے ہیں کہ ایک شخص اپنی دولت کو منافع پر لگا سکتا ہے، چنانچہ "پیپل کمیسار آف فائننس" کے ماتحت اسٹیٹ سیونگ بینک قائم ہے جس کی بیس ہزار شاخیں ملک کے اندر پھیلی ہوئی ہیں، ۱۹۲۴ء میں لوگوں نے ان بینکوں میں ایک سو کروڑ روبلز جمع کیے اور ۸ فی صدی سود دیا گیا، ان جمع شدہ رقوم کو انکم ٹیکس، وراثت ٹیکس اور مختلف دوسری اسٹمپ ڈیوٹیوں سے مستثنیٰ رکھا گیا۔"

بات یہیں تک ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس تحریک نے جس قسم کے افراد کو تیار کیا ہے چونکہ ان کے اندر بھائی چارگی، ہمدردی اور ایک دوسرے کو سنبھالنے کی اسپرٹ نہیں ہے اس لیے جو زندگی کی دوڑ میں تھک کر گر گئے انہیں اس کا موقع نہیں فراہم کیا جاتا کہ وہ پھر سے اپنی زندگی کی مہم کو سنبھال سکیں، بلکہ اوپر کے بیان کے مطابق جس طرح ایک طبقہ کے سرمایہ کو ڈیوٹیوں اور ٹیکسوں سے بری قرار دیا گیا ہے اس کے برعکس وہاں کے مزدوروں کو اپنی کم تنخواہوں کو ٹیکس اور ڈیوٹی کے حلق کا لقمہ بنا دینا پڑتا ہے چنانچہ ایک مزدور جس کی آمدنی ۱۵۰ روبلز یا اس سے زیادہ ہے اس کی تنخواہ سے جو رقم وصول کی جاتی ہے اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:-

(۱) آمدنی پر ٹیکس ۵٫۶۷ سے ۳٫۳ فی صدی۔

(۲) کلچرل ٹیکس تھیٹرز، سینماؤں اور لائبریریوں کے قیام کے لیے

(۳) ٹریڈ یونین کا ماہانہ چندہ، کل آمدنی کا دو فی صدی۔

(۴) ریاست کو قرضہ، تنخواہ کا دس فی صدی، یہ قرضہ برائے نام رضاکارانہ ہے، درحقیقت یہ ہر ملازم کو دینا پڑتا ہے۔

(۵) دوسری انجمنوں کے لیے چندہ ایک فی صدی۔

اگر ان تمام رقوم کو جمع کیا جائے تو یہ آمدنی کا ۱۲ فی صدی بن جاتی ہیں اور یہ وہ رقم ہے جو ہر شخص کی

[illegible]زاء سے وضع کی جاتی ہے :

اس سلسلہ کی آخری کڑی بھی ملاحظہ کرتے چلئے۔ بمبئی کے ایک اشتراکی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ "ویپلز آرمی ڈے کی تیسویں سالگرہ کے موقع پر چینی کمانڈران چیف جنرل چو نے پیکنگ میں نہایت وسیع پیمانہ پر ایک عظیم الشان کاک ٹیل پارٹی کا انتظام کیا۔ اس دعوت میں چھ سو سے زائد مہمان شریک ہوئے، ان مہمانوں میں سوویٹ یونین کے ڈپلومیٹک ارکان، مشرقی یورپ کی عوامی جمہوریتوں کے نمایندے چینی انقلابی فوجی کونسل کے ارکان چین کی بحری، بری اور فضائی فوج کے اعلیٰ افسر اور چین کی مرکزی عوامی حکومت کے ذمہ دار ارکان بھی شامل تھے۔" ور انڈو سوویٹ ۱۸ مارچ ۱۹۵۰ء۔

اور یہ لال پری اس وقت رقص میں لائی گئی جب کہ اخبارات کے بیان کے مطابق اسی چین میں کم از کم چار کروڑ چینی بھوک اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھے، اور قحط نے ان کی زندگی کے مستقبل کو تاریک بنا رکھا تھا۔ ابھی تک تو زیادہ روس اور اشتراکیت زدہ خطہ زمین کے سیاسی اور معاشی حالات سے نقاب اٹھایا گیا ہے، جس میں محض یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اور مادی تحریکوں کی طرح اس تحریک کا انجام بھی "اخلاقیات کے فقدان" کی وجہ سے انسانیت کے لیے معاشی حیثیت سے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس تحریک کے اعلانات، اس کے لیڈروں کے بیانات سے جو توقع باندھی گئی تھی وہ محض نقش بر آب ثابت ہوئی۔ اور سوسائٹی جس طرح پہلے معاشی عدم توازن کا شکار تھی اسی طرح اس تحریک کے زیر اقتدار آنے کے بعد بھی رہی، اور وہ صبح ہنوز دور ہی ہے جس کا راگ ادیبوں نے گایا۔ جس کے قصیدے مصنفین نے تصنیف کیے اور جس کا ڈھنڈورا لیڈروں اور رہنماؤں نے اتنے زور سے پیٹا کہ انسانیت سمٹ سمٹ کر ان کے گرد جمع ہو گئی۔

اب تھوڑی سی گفتگو عام اخلاقیات کے بارے میں بھی مفید بحث معلوم ہوتی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس تحریک نے جس سوسائٹی کی تعمیر کی اس کے خد و خال کیا ہیں؟ کیوں کہ کوئی بھی جان دار اور عملی تحریک صرف اپنے افراد اور کارکن ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ گرد و پیش پر بھی اپنے رنگ کے نقوش ثبت کرتی ہے۔ جب ہم اس حیثیت سے اس تحریک کے عملی نتائج کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی عوامل کے فقدان کی وجہ سے اس تحریک نے زندگی کے ہر گوشہ کو مسموم بنا کر رکھ دیا ہے، چوری اور ڈکیتی کے جرائم کے اعداد و شمار حد درجہ ہولناک ہیں، پچھلے سالوں میں شخصی جرائم ۱۰۰ فی صدی سے ۱۲۸ فی صدی تک پہونچ گئے، جسمانی تکلیف پہونچانے کی تعداد ۱۲۵ فی صدی پہونچنے کے بعد اب ۷۶۴۴ فی صدی ہے، چوری ۱۵۱ فی صدی تک پہونچنے کے بعد ۱۰۰ فی صدی تک پہونچ گئی تھی مگر پھر ۱۴۱ فی صدی تک پہونچ گئی۔ ماسکو میں ۲۴۸ قتل ہوئے ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں ۶۲۹ قتل ہوئے۔ سوویٹ ادارہ تحقیقات جرائم (   ) نے جو اعداد و شائع کیے تھے اُسے اُسی جرائم پر

کے الفاظ میں سنیے :۔

"پروفیسر مائیکل ساجیو کے بیان کے مطابق ۱۹۱،۲۱۴ مرد اور ۹۰۳۵۰ عورتیں اس وقت سزا کاٹ رہی ہیں، ان میں سے ۵۴۰، ۲۳۹ مرد اور ۲۴۲۳۵۳ عورتیں پرائیوٹ طور پر چوری کرنے کے الزام میں قیدی ہیں اور بقیہ دفتر میں ذمہ داری میں خیانت اور اسٹیٹ کی دولت کو ذاتی استعمال میں لانے کے جرم میں ماخوذ ہیں، اور کچھ بدمعاش، آوارہ گردی اور زنا بالجبر کے مجرم ہیں۔" جرائم کی اس خطرناک حد تک بڑھتی ہوئی رفتار نے وہاں کے ارباب حل وعقد کو بوکھلا دیا اور بجائے اس کے کہ وہ اس کے اصل سبب پر غور کریں، پھر پولس کی غیر فطری طاقت سے کام لے کر اس بد اخلاقی کے طوفان کو دبانا چاہتے ہیں، چنانچہ جب ماسکو میں قتل کی وارداتیں زیادہ ہونے لگیں تو وہاں کی پولس کی دوڑ دھوپ کو اس سلسلے میں بہت زیادہ تیز کر دیا گیا اور کارخانوں میں ایسی عدالتیں قائم کی گئیں جو چھوٹے جرموں پر ۱۰ روبل تک جرمانہ کرنے جسمانی مشقت دینے اور زیادہ سے زیادہ ٹریڈ یونین سے نکال دینے کا اختیار رکھتی ہیں، لیکن جس کو سوسائٹی کے بناؤ بگاڑ اور اس کے اسباب وعوامل سے تھوڑی سی بھی واقفیت ہے اس پر یہ بات کوئی راز نہیں کہ جب تک انسان کو اندر سے نہ تبدیل کر دیا جائے، اس کے نقطۂ نظر میں انقلاب نہ برپا کر دیا جائے اس کے ذہن وشعور کی سمت نہ بدل دی جائے اس وقت تک خارجی دباؤ خواہ وہ کتنا ہی سخت اور بے رحم کیوں نہ ہو مطلق مفید نہیں ہوتا۔ اس لیے روس میں اس دباؤ کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا، کیونکہ جہاں کے مصنف یہ زہر پھیلاتے ہوں کہ "شراب خواری اور زناکاری کوئی قابل شرم چیز نہیں، محبت کرنا اور خوب پینا اور عورتوں کا تعاقب کرنا خاصہ مردانگی ہے یہ ایک فطری جذبہ ہے اور جو فطری چیز ہو وہ گناہ کیسے ہو سکتی ہے،" جہاں کے رہ نماؤں کے یہ خیالات ہوں کہ "جس طبقہ کو آج لوٹا جا رہا ہے، وہ جب اپنے دشمنوں کے خلاف جدوجہد کرے گا تو ایسی جدوجہد میں جھوٹ اور مکر وفریب کے ہتھیاروں کا استعمال ناگزیر ہوگا (لینن) جہاں کے اخبارات یہ زہریلے اصول پھیلائیں کہ "محبت کے معاملے میں ہمارے نوجوان چند خاص اصول رکھتے ہیں، اور ان سب اصولوں کی تہ میں یہ اصول کارفرما ہے کہ جس قدر زیادہ تم حد کو پہونچنے میں کامیاب ہو گے یا بالفاظ دیگر جس قدر زیادہ حیوانیت سے قریب ہو گے اسی قدر زیادہ اشتراکی ہو گے، لیبر فیکلٹی کا ہر ممبر، ہر طالب علم خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس کے اصول متعارفہ میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہر لڑکی جب لیبر فیکلٹی میں داخل ہو تو اس پر لازم ہے کہ جب اس کے نوجوان ساتھیوں میں کسی کی نظر انتخاب اس پر پڑے تو وہ بلا حیل وحجت اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دے" (پرودا) جہاں کے اہل قلم حضرات کے اخلاقی معیار کی حالت یہ ہو کہ جب ان سے کسی اجنبی عورت کے بارے میں پوچھا جائے تو یہ جواب دینے میں انھیں کوئی باک نہ ہو کہ "یہ بیوی نہیں میری دوست ہے! اور ایک دوست سے جنسی تعلق رکھنے میں آخر حرج کیا ہے" (گورکی) ظاہر ہے جب فضا کے اندر یہ خیالات پرورش پائیں، نگاہوں کے سامنے ایسے نمونے متحرک نظر آئیں تو پھر اخلاق ودیانت، شرافت و

پاکیزگیٔ نفس کی جو دُرگت بنے گی اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

سوسائٹی فی نفسہٖ بری یا بھلی نہیں ہوتی، بلکہ افراد کے کردار اور افکار سے اس کی ہئیت وجود میں آتی ہے اور افراد کے اوپر جو چیز سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے، وہ تحریک ہے، تحریک ہی ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز متعین کرتی ہے، ان کے سامنے حسن و قبح کا معیار رکھتی ہے ان کو زندگی کے مسائل پر غور کرنے کے لیے مخصوص نقطۂ نظر دیتی ہے، ان کے فکر و عمل کو ایسے سانچے ڈھالتی ہے۔ اس لیے تحریک کی بنیاد جتنی ہی پاکیزہ ہوگی سوسائٹی اتنی ہی پاک و صاف ہوگی اور اگر تحریک کی بنیادیں فساد کی اینٹوں اور بے حیائی اور بداخلاقی کے چونے گارے سے استوار کی جائیں گی تو لامحالہ جو تحریک کے زیر اثر جو سماج وجود میں آئے گا، اس کے اندر بھی وہی خرابیاں رینگتی ہوئی نظر آئیں گی، انجیل میں ہے "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے،" اگر ببول کا بیج زمین میں ڈال کر گلاب کے پھول کی توقع نہیں کی جاسکتی تو تحریک کے مزاج ہی میں فساد اور منفی انتشار کے زہر کو پیوست کرکے اس کی امید محض حماقت ہے کہ اس کے کارکنوں میں عفت نظر اور پاکیزگی کردار کا ظہور ہوگا۔ اس کے سرفروشوں میں رحم دلی، وسعت خیال، اصلاح معاشرہ اور عفو درگذر کے جذبات کی جھلک نظر آئے گی۔ یورپ کی مادی تحریکوں کے اندر بھی بنیادی نقص ہے کہ وہ تحریک کے اس ضروری عنصر کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتیں،

اوپر کی طویل گفتگو اور واقعات کی زبان سے بیان کیے ہوئے نتائج یہ بتلانے کے لیے کافی ہیں کہ جب تک اخلاقیات کو تحریک کا ضروری عنصر نہیں بنایا جاتا اس وقت تک سماج کی بھلائی کا تصور بھی جہل مرکب ہے، کیونکہ افراد کی سیرت اگر پختہ اور پاکیزہ اصولوں پر تعمیر نہیں کی جاتی تو لازماً وہی نتائج پیدا ہوں گے، جو ان مادی تحریکوں کے بطن سے نمودار ہوئے، تحریک کا مقصد صرف یہی نہیں ہونا چاہیے کہ کسی قوم کسی ملک یا کسی طبقہ کے منتشر افراد کو کسی نصب العین پر جمع کردیا جائے، کیونکہ یہ ایک منفی لائحہ عمل ہوتا ہے۔ اس طریق کار سے یہ تو ہوسکتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں زیادہ زور آور ہو جائے، ایک ملک دوسرے ملک سے جہد للبقا کی دوڑ میں زیادہ آگے نکل جائے اور ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر اپنی سیادت اور حکمرانی کا تخت بچھانے میں نمایاں کامیابی حاصل کرلے۔ یہ سب کچھ ہوسکتا ہے اور قریب کی تاریخ کی بھی شہادت یہی ہے کہ قومی غرور وطنی عصبیت اور طبقاتی نفرت سے متاثر ہوکر جو تحریکیں اٹھتی ہیں انھوں نے اس حیثیت سے تو بہت زیادہ کامیابی حاصل کی ہے، لیکن اس منفی پروگرام کے آگے ان کے سامنے کوئی مثبت پروگرام نہیں رہتا، یہی وجہ ہے کہ ان تحریکوں سے متاثر افراد جہاں قوم، وطن، طبقہ کے لیے ایثار و قربانی میں پیش پیش رہتے ہیں، وہیں نفس کے ہلکے سے جھونکے، غیظ و غضب کی خفیف سی لہر کے سہ سکنے کی تاب نہیں رکھتے، اور قدم قدم پر بداخلاقی اور وحشت و بربریت کے بوجھ میں لت پت ہوجاتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

اقامتِ دین اور خلافت فی الارض

(۱)

مولوی نظام الدین صاحب اصلاحی

اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقامت دین اسلام کے اہم ترین فرائض میں سے ہے اور قرآن نے اقامت دین کا لفظ جہاں کہیں استعمال کیا ہے اور اس کا جہاں جہاں بھی ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر جگہوں پر صیغہ امر کے ذریعہ تعبیر فرمایا ہے اور قرآن کی چھان بین کرنے والے سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ اقامت دین کا مطالبہ امت محمدیہ سے اتنے ہی زور دار انداز میں کیا ہے غالباً کہ انبیاء سابقین سے کبھی کیا گیا ہوگا۔ امت مسلمہ تمام امم سابقہ سے اس حیثیت میں بہت اونچی ہے کہ اس کو دنیا میں امت وسطا اور امت خیر کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ جب تک یہ امت اقامت دین کا اہم فریضہ انجام نہ دے گی اور اس کے لیے کمر ہمت باندھ کر اٹھ نہ کھڑی ہوگی اس وقت تک اس کو یہ لقب زیب نہیں دے سکتا کیونکہ اس لقب سے قرآن نے جن مقامات پر اس امت کو یاد فرمایا ہے وہاں اسی اقامت دین کے اہم کام پر آمادہ ہونے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیداً

(بقرہ)

اور اسی طرح ہم نے تم کو درمیانی گروہ بنایا تاکہ تم لوگوں کے سامنے (حق کے) شاہد بنو اور رسول تمہارے سامنے حق کے شاہد بنیں۔

دوسری جگہ فرمایا:-

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ۔

تم بہترین گروہ ہو جسے سب انسانوں کے لیے مقرر کیا گیا ہے تم معروف کا حکم کرتے ہو منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ (آل عمران)

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحاً	تمہارے لیے اللہ نے وہی دین مقرر فرمایا ہے جس کی تاکید
والذی اوحینا الیک وما اوحینا	اس نے نوح کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے آپ کو کی ہے
بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان	اور جس کی تلقین ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی
اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ۔ (شوریٰ)	کہ دین قائم کرو اور اس میں تفرق و انتشار سے بچو۔

اقامت دین کی لغوی تحقیق

اقامت دین کا لفظ قرآن میں بار بار مذکور ہونے کے باوجود اس کے مفہوم و مطلب سے لوگ غافل ہی ہیں اس پر مفصل گفتگو کرنے سے پہلے آیئے اس کی لغوی تشریح سے بھی گذرتے چلیں تاکہ اس کا صحیح مدعا سمجھنے میں کوئی زحمت باقی نہ رہے سب سے پہلے ہم کو کلام عرب کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ شعرائے دین کو کس کس معنی کے لیے استعمال کیا ہے۔ پھر اس سے قرآن کا مفہوم حل کیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ قرآن نے اس مفہوم میں کتنی وسعت پیدا کر دی ہے۔

دین کلام عرب میں

یہ لفظ زمانہ جاہلیت میں بھی عام طور سے بولا اور سمجھا جاتا تھا اس کے مختلف معانی ملتے ہیں۔ (۱) جزاء (۲) اطاعت کرنا۔ (۳) ذلیل و منقاد بنا لینا۔ (۴) عادت (طریقہ) ضابطہ، قانون پہلے معنی میں کعب بن جعیل نے استعمال کیا ہے۔

اذا ما رمونا رمینا ھم	جب انھوں نے ہم پر تیر اندازی کی تو ہم نے بھی
ودناھم مثل ما یقرضونا	ان کو تیر کا نشانہ بنایا اور ان کو ویسا ہی بدلہ چکھایا

جیسا وہ ہمارے ساتھ کرتے تھے۔

وقولہ دناھم مثل ما یقرضونا	اور دناھم کا مطلب ہے ہم نے ان کو بدلہ دیا،
یقول جزیناھم وقال المفسرون	اور مفسرین نے مالک یوم الدین کے سلسلے میں کہا کہ
فی قولہ عزوجل مالک یوم الدین	یوم الدین سے مراد یوم الجزاء اور یوم الحساب ہے
قالوا یوم الجزاء ویوم الحساب	اور عربی کی ضرب المثل ہے کما تدین تدان، جیسا
ومن امثال العرب کما تدین تدان۔	کرو گے بدلہ پاؤ گے اور ابو عبید نے یزید بن صعق کے
وانشد ابو عبید الشعر لیزید	سلسلے میں یہ شعر پڑھا۔
بن الصعق۔	
واعلم وایقن ان ملکک زائل	جان لو کہ تمہاری حکومت ختم ہو کر رہے گی اور
واعلم بانک ما تدین تدان	جیسا تم کرو گے اس کا بدلہ پاؤ گے۔ کامل مبرد۔ ۵ ص۱۹۳

اس معنی میں فند الزمانی نے بھی استعمال کیا ہے مشہور جنگ بسوس کے بارے میں اس نے جو قصیدہ کہا

اس کا ایک شعر یہ ہے۔

لم یبق سوی العدوان	زیادتی کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی۔
دناھم کما دانوا	اور ان کے کیے کا بدلہ ہم نے ان کو دیا۔

۲۔ دوسرے معنی اطاعت بندگی اور خدمت کے ہیں اور کسی سے مغلوب ہو کر اسکے سامنے ذلت قبول کر لینا۔

ورقہ بن نوفل کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس نے اس معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔

لم تغن عن ھرمز یوماً خزائنہ	ھرمز کو اس کا خزانہ کچھ فائدہ نہ دے سکا۔
والخلد قد حاولت عاد فما خلدوا	اور قوم عاد نے دنیا میں ہمیشہ رہنا چاہا لیکن وہ رہ سکی۔
ولا سلیمان اذا ان الشعوب لہ	اور نہ سلیمان ہی کو کوئی فائدہ حاصل ہوا کہ تمام قومیں انکی مطیع تھیں
والجن والانس یجری بینہا البرد	اور جن وانس کے درمیان سلسلہ مراسلات جاری تھا۔

چنانچہ کہتے ہیں:۔

دنتھم فدانوا یعنی قہرتھم	یعنی میں نے آدمی کی عصمت کی میں نے انہیں مغلوب
واذللتھم فاطاعونی اور دنت	کیا تو انہوں نے میری اطاعت قبول کی۔

الرجل خدمتہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

یمرقون من الدین مروق السھم من الرمیۃ۔ یہاں دین سے مراد اطاعت امام ہے کیوں کہ جب۔

حضرت علی سے اس بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا وہ کافر ہیں تو آپ نے فرمایا کہ نہیں کفر ہی سے تو وہ بھاگے ہیں تو پھر کہا گیا کہ کیا وہ منافق ہیں تو آپ نے فرمایا کہ منافقین تو خدا کو برائے نام یاد کر لیا کرتے ہیں اور یہ لوگ تو صبح وشام ہمیشہ ذکر میں مشغول رہتے ہیں تو پھر سوال کیا گیا کہ تب وہ کیا ہیں تو جواب دیا کہ وہ زبردست فتنہ کے شکار ہو گئے ہیں اس لیے وہ اندھے بہرے ہو گئے ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ دین کے معنی اطاعت امیر کے ہیں۔

خطابی نے مذکورہ بالا حدیث کے بارے میں یہی کہا ہے۔

کعب بن جعیل ہی کا شعر ہے۔

وقالوا ترى ان ندينوا لہ ۔ فقلنا الا لا نرى ان ندينا

لوگوں نے کہا ہم تمہارے لیے یہی مناسب سمجھتے ہیں کہ اس کی اطاعت قبول کرلو تو ہم نے جواب دیا:۔
اطاعت ہم قبول نہیں کر سکتے ۔

قولہ صلعم یمرقون من الدین اراد بالدین الطاعۃ ای انھم یخرجون من
طاعۃ الامام المفترض الطاعۃ وینسلخون منہا ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
"یمرقون من الدین" میں "دین" سے مراد اطاعت مراد لی ہے یعنی وہ اس امام کی اطاعت سے نکل جائیں گے
جس کی اطاعت فرض ہوگی ۔

تیسرے معنی ذلیل کرلینا تابع فرمان بنانا محکوم و مغلوب کر لینا اور حکومت کرنا چنانچہ اعشیٰ مشہور شاعر اس معنی میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے ۔

ھو دان الرباب اذ کرھوا الدین   دراکاً بغزوۃ وصیال

مسلسل جنگ کے ذریعہ اس نے رباب کو ذلیل و منقاد بنا لیا جب کہ وہ انقیاد کو ناپسند کر رہے تھے ۔

ثم دانت بعد الرباب وکانت   کعذاب عقوبۃ الاقوال

پھر رباب نے اطاعت قبول کرلی اور اس کا عذاب یعنی بادشاہوں کی سزا کی طرح سے تھا ۔

پہلے شعر میں پہلا دان ذلیل و منقاد بنانے کے لیے آیا ہے اور لفظ دین طاعت و ذلت کے معنی
میں استعمال ہوا ہے ۔

صاحب لسان العرب نے لکھا ہے کہ دوسرے شعر کا ثم دانت ذلیل و منقاد ہونے کے لیے استعمال
ہوا ہے اور اللہ تعالےٰ کے لیے بھی دین کا جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ اصل میں اس خشیۂ ذلت اطاعت سے ماخوذ
ہے یعنی جب انسان الٰہی دین کو قلب و ضمیر کی گہرائی سے قبول کرلے تو اس کو اسی ذات و پاک کے سامنے ذلیل و
پامال برداروا طاعت کیش اور تابع بن کر زندگی گذارنی چاہیے، پھر اس کے لیے ایک منٹ کے لیے بھی یہ جائز نہ
ہوگا کہ اس مولیٰ و آقا کے مقابلہ میں اپنی خواہشات کو اور اس ذات بے مثل کے سامنے دوسرے دُنیاوی ہستیوں
کو سہارا گردان سکے ۔

(۴) دین ضابطہ، طریقہ، رسم و عادات اور خصلت کے معنی میں مستعمل ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں مازال ہذا دینی
دائی و دیدنی یہ میرا طریقہ اور میری عادت رہی ہے ثقب العبدی نے بعینہٖ اسی معنی میں استعمال کیا ہے

تقول اذا درأت لہا وضینی   اھذا دینہ ابداً ودینی

جب میں نے اس کے لیے اپنا بستر بچھایا تو وہ کہنے لگی کہ کیا یہ اس کا اور میرا ہمیشہ کا دستور ہے ۔

اس تشریح کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ دین اپنے ان چار معنوں میں کلام عرب کے اندر مستعمل

لہ لسان العرب تحت لفظ دین ۔

ہوتا رہا ہے

دین بمعنی اطاعت

لہ ما فی السموٰت وما فی الارض ولہ الدین واصبا افغیر اللہ تتقون ۔

آسمان و زمین کی تمام چیزیں اسی کی ملک ہیں اور اسی کی اطاعت مسلسل ہو رہی ہے تو کیا تم (اس کو چھوڑ کر) دوسروں سے ڈرتے ہو۔

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السموٰت ومن فی الارض طوعًا وکرھًا والیہ یرجعون ۔

کیا اللہ کی اطاعت کے سوا وہ کسی اور کی اطاعت چاہتے ہیں حالانکہ آسمانوں میں اور زمین میں جو بھی ہے وہ چار و ناچار اللہ کی اطاعت کر رہے ہیں اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ۔

وما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاء ۔

انھیں صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے یکسو ہو کر ۔

اللہ الذی جعل لکم الارض قرارًا والسماء بناء وصورکم فاحسن صورکم ورزقکم من الطیبات ذالکم اللہ ربکم فتبارک اللہ رب العالمین ھو الحی لا الہ الا ھو فادعوہ مخلصین لہ الدین الحمد للہ رب العالمین (مومن)

وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کو تمہارے ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور آسمان کو چھت اور تمہیں صورت بخشی تو بہت اچھی صورت بخشی اور تمہیں پاکیزہ روزی بخشی، یہی اللہ تمہارا رب ہے تو برکت و وسعت والا ہے وہ اللہ جو کائنات کا رب ہے وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی الہ نہیں اسی کو پکارو اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے شکر اللہ کے لیے ہے جو کائنات کا رب ہے ۔

اس مفہوم میں دین کا لفظ قرآن مجید کے اندر کثرت سے استعمال ہوا ہے یعنی جب اقتدار اور حاکمیت کو تسلیم کیا جائے اس کی پوری پوری اطاعت ہونی چاہیے ۔

دین قانون کے معنی میں } قرآن میں دین کو قانون ضابطہ قاعدہ اور طریقہ کے معنی میں بھی کثرت سے استعمال کیا گیا ہے ۔ جیسے :-

الزانیہ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ ولا تاخذکم بھما رأفۃ فی دین اللہ (نور)

زانیہ اور زانی میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور اللہ کے دین کے معاملہ میں ان دونوں سے کوئی محبت و شفقت تمہاری دامن گیر نہ ہوجائے۔

کذلک کدنا لیوسف ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک (یوسف)

ہم نے یوسف کے لیے یوں ہی تدبیر کی، ان کا یہ کام نہ تھا کہ اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون میں پکڑتا۔

کذلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاءھم لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم (انعام)

اسی طرح بہت سے مشرکین کی نگاہ میں ان کی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ وہ انھیں ہلاک کردیں اور تاکہ ان کے دین ان کے لیے مشتبہ بنا دیں۔

لکم دینکم ولی دین (کافرون)

تمہارے لیے تمہارا طریقۂ زندگی اور میرے لیے میرا

دین بمعنی جزا فیصلہ

مالک یوم الدین (فاتحہ)

جزا کے دن کا مالک۔

وما ادراک ما یوم الدین ثم ما ادراک ما یوم الدین یوم لا تملک نفس لنفس شیئا والامر یومئذ للہ۔

اور تمہیں کیا معلوم کہ روز جزا کیا ہے پھر تم کو کیا معلوم کہ روز جزا کیا ہے، یہ وہ دن ہے جب کوئی متنفس کسی متنفس کے لیے کچھ نہ کرسکے گا اور معاملات سارے کے سارے اس دن اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے۔

دین ایک جامع اصطلاح

یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انھیں مفہومات میں استعمال کرتا ہے جن میں یہ اہل عرب کی بول چال میں مستعمل تھا لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ "دین" کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے اور اس سے ایک ایسا نظام زندگی مراد لیتا ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرکے اس کی اطاعت و فرماں برداری قبول کرے اس کے حدود و ضوابط اور قوانین کے تحت زندگی بسر کرے اس کی فرماں برداری پر عزت ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن ابھی اس کو دین کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے حسب ذیل آیات میں دین اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ

اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے جنگ کرو جو

ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔ (توبہ)

اللہ پر اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور اللہ اور رسول نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے انھیں وہ حرام نہیں کرتے اور دین حق کو قبول نہیں کرتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے پست ہو کر جزیہ دیں۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے کل دین پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔

قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ (انفال)

ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے

اب ان آیتوں سے دین کا مفہوم کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ قرآن نے لفظ دین کے اندر جو وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر دی ہے وہ کہاں تک کے مطالب کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔

اقامت کے معنی اقمت الشئ فقام کے معنی آتے ہیں قومہ وجعلہ مستقیماً یعنی کسی چیز کو اس طرح سے کھڑا کر دینا کہ وہ بالکل سیدھی اور درست ہو جائے جب تک اس چیز کے اندر کچھ بھی کجی باقی رہے گی اس وقت تک اس کے لیے اقامت کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں ہو گا۔

اب ظاہر ہے کہ اقامت دین سے اس کے سوا اور کیا مراد ہو سکتا ہے کہ دین کو مکمل دستور حیات اور مسجد سے متعلق مسائل سے لیکر حکومت وسیاست تک کے تمام امور ولوازم کے ساتھ دنیا کے اندر اس طرح سے قائم کر دیا جائے کہ اس کے اندر کہیں سے کجی کہیں سے ٹیڑھ اور کہیں سے کوئی نقص نظر نہ آئے اگر اس دین کے قائم کرنے میں مداہنت سے کام لیا گیا دوسرے لوگوں کے تعلقات کچھ لوگوں کی ہیبت اور خوف یا اپنے نفس کی خواہشات سے مجبور ہو کر اس میں کوئی کونا ہی کی گئی تو اس کو اقامت دین کہنا کسی طرح سے صحیح نہیں ہو گا، دین جب تک اپنے پورے لوازم زندگی کے ساتھ قائم اور جاری وساری اور دنیا میں نافذ نہ ہو جائے اس وقت تک قرآن کا مطالبہ اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ پورا نہیں ہو سکتا۔

جس طرح سے اللہ تعالے نے اس عالم فانی کو انسان جیسی مخلوق سے زینت وحسن بخشا ہے اسی طرح سے اس کے انسانی قلوب کو اپنی ہدایتوں اپنے احکام اور روحانی تعلیمات کے ذریعہ زینت بخشی ہے اور اپنی وحی واحکام کا مہبط مقرر کیا ہے اس لیے جس دن سے اس عالم کا آغاز ہوتا ہے اسی دن سے الہی پیغام

کے نزول کا بھی وقت شروع ہوتا ہے بلکہ اس دنیا کی ابتدا ہی ایک نبی کے ذریعہ سے کی جاتی ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ جس نے انسانی کل پرزوں کو ایک سائنٹفک طریقہ سے فٹ کیا ہے وہ اس کی ضروریات اس کی فطری کمزوریوں اور اس کے رجحانات سے بخوبی واقف تھا وہ یہ جانتا تھا کہ اگر اس ناقص مخلوق کو ہدایت الٰہی سے سرفراز نہ کیا گیا اس کو مہبط وحی و احکام نہ بنایا گیا اور انبیاء و رسل کا ایک لامتناہی سلسلہ اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نہ بھیجا گیا تو یہ انسان اپنے ہاتھوں اپنی روحوں کو شر و فساد میں مبتلا کر دے گا، دنیا کو دارالامن کے بجائے ایک دار الفساد بنا دے گا اور ہر طرف گندگی و بے حیائی کا بازار گرم کر دے گا اس لیے اس نے یہ سلسلہ قائم کرنا ضروری سمجھا شروع سے انبیائے اس دعوت کو مخلوق کے سامنے پیش کیا اور انھیں فطرت کے صحیح راستہ سے روشناس کیا، بگڑی ہوئی طبیعتوں کو درست کیا اور توحید کا بجنہٖ عقیدہ معاد کا صحیح تصور اور اللہ کی بندگی کی سچی تعلیم سے انہیں روشناس کیا اور انہیں برائیوں سے روک کر بھلائیوں کے راستوں پر گامزن کیا، دین کو انھوں نے اس کی اصلی صورت میں قائم کیا اور اس کے ماننے والوں اور اس مشن پر لبیک کہنے والوں کی ایک خالص اور راسخ العقیدۃ جماعت پیدا کر دی، جس نے بھی حق المقدور اس کام کو انجام دیا، ابتدا زمانہ میں جب انسانی عقل زیادہ ترقی نہ کر سکی تھی اللہ تعالیٰ نے جو تعلیمات اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بھیجیں، ان میں سے زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق زیادہ تفصیلی احکام نہ تھے کیوں کہ اس وقت کی انسانی عقل نہ اس بار کی متحمل ہو سکتی تھی اور نہ انسانی مسائل اتنے پیچیدہ اور اتنے وسیع ہوئے تھے،

لیکن جوں جوں انسانی عقل ترقی کی راہ میں آگے قدم بڑھاتی رہی اسی قدر رب العالمین نے ان کے سامنے اس دین کو پھیلا کر بیان کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکومت بخشی اور اس حکومت کا نظام چلانے کے لیے ایک قانون جو اس زمانے کی ضروریات کے مطابق ہو سکتا تھا بھیجا اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ جس طریقہ سے تمہارے جسم و قلب میں دین قائم اور جاری و ساری ہے، جس طرح تمہارے گھروں اور عبادت گاہوں میں حکم الٰہی نافذ ہے اور جس طرح تمہارے انفرادی معاملات میں احکام الٰہی اثر انداز ہیں اسی طرح سے یہ بھی ضروری ہے کہ سیاست و معیشت اور اجتماعیات میں بھی اسی کا حکم جاری ہو جس طرح سے منفرد اشخاص اور قلوب میں دین قائم ہے اسی طرح انسانی عدالتوں اور پنچایتوں میں بھی دین قائم اور نافذ ہو، چنانچہ قرآن اس بارے میں کھلے اشارات کر دیتا ہے کہ کس طرح سے ان کے فیصلوں کو احکام الٰہی کے تابع رکھنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

کتبنا علیھم فیھا ان النفس بالنفس	ہم نے ان پر قصاص کے معاملے میں اس (قانون) کو لازم کر دیا
والعین بالعین والانف بالانف	تھا کہ جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ،

والاذن بالاذن والسن بالسن و الجروح قصاص، فمن تصدق به فهو کفارۃ لہ، ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون O (مائدہ۔۴۵)	ناک کے بدلے ناک کان کے بدلے کان دانت کے بدلے دانت اور زخموں کا برابر بدلہ اور جو کوئی معاف کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ ظلم کرنے والے ہیں۔

دیکھیے کہ جس طرح سے لوگوں نے اپنے دلوں اور نفوس کو احکام الٰہی سے مزین و مرصع کر رکھا تھا اسی طرح حکم ہوا کہ سیاست بھی اس کے احکام کی تابع ہو، عدالتیں اور پنچایتیں اس کے نور سے روشن ہوں۔ اور اگر اس میں کسی وجہ سے انحراف کیا گیا خواہشات کو فیصلہ کا دار مدار بنا یا گیا یا کسی سردار اور امیر کی قدر و منزلت اس معاملے میں حائل ہوئی تو یقیناً یہ راہ حق سے راہ ظلم کی طرف مائل ہونا ہوگا اور پھر ظلم و فساد کا بدنما دھبہ ان کی پیشانیوں پر لگ جائے گا۔ اس لیے صاف فرمایا کہ الٰہی احکام سے الگ ہو کر فیصلہ کرنا ظلم کا ارتکاب ہے ذرا اس آیت پر غور کیجیے کہ کیا اس سے یہ بات کھل کر سامنے نہیں آجاتی کہ غیر اللہ کے قانون کو جاری کرنا غیر اللہ کے رعب و دبدبہ کی بنا پر حق میں مداہنت برتنا، دوسروں کے تعلقات دوستیوں کی وجہ سے فیصلہ میں بے انصافی برتنا یہ سب کا سب ظلم و عدوان ہے جو خدا کو کسی طرح پسند نہیں ہے خدا یہ نہیں چاہتا کہ جب انسان اپنی ضروریات سے مجبور ہو تو اس کے سامنے دست حاجت دراز کرے اس کو پریشانی لاحق ہو تو اس سے مدد طلب کرے گھریلو معاملات میں کٹھن گھڑی پیش آئے تو اس کی طرف متوجہ ہو لیکن جب اس کو اقتدار کی باگ ڈور ملے تو اپنا قانون نافذ کرے اپنے نفس کی خواہشات چلائے کسی سردار قبیلہ یا حاکم کے احکام جاری کرے خدا کو تو صرف یہی پسند ہے کہ جس طرح سے اس کا قانون تکوینی دنیا میں نافذ ہے اور اس سے کوئی مخلوق یک سرمو تجاوز و انحراف نہیں کر سکتی اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ دنیا میں اس کا تنہا قانون نافذ ہو اسی کا قانون جاری و ساری ہو اس کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جائے، "دنیا کے تمام معاملات میں" مسجد سے لے کر سیاسیات و اجتماعیات تک انفرادی معاملات سے لیکر بین الاقوامی امور و معاملات تک سب کے سب اس کے قانون کی پابندی میں سطے ہوں۔

تخلیق آدم کا مقصد

یہی ذمہ داری زیادہ واضح اور پر زور انداز میں بیان کر کے امت محمدیہ پر ڈالی گئی ہے اور اسی لیے دنیا میں انسان کی خلقت ہوئی قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ کہ دنیا میں انسان کو صرف اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ وہ آکر مسجدوں کے کونے کو آباد کرے کیونکہ اس کی تسبیح و تحمید کے لیے فرشتوں کا وجود ہی کیا کم تھا جو پیکر عبادت پیدا ہی کیے گئے ہیں

بلکہ آدم کو زمین میں بھیجنے کا جب فیصلہ ہوا تو اللہ تعالٰے نے یہ فرمایا کہ "انی جاعل فی الارض خلیفہ" میں دُنیا میں اپنا خلیفہ بھیجنا چاہتا ہوں، خلیفہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کسی کا تابع ہو اور جو اپنے اختیارات کو صرف اپنے اصلی مالک کی مرضیوں کو پورا کرنے، اسی کے قانون کو نافذ کرنے اسی کی پسند کے مطابق احکام دینے اس کے خلاف مرضی چیزوں سے لوگوں کو روک دینے میں استعمال کرے۔

فرشتوں کو یہ چیز بہت ہی عجیب معلوم ہوئی کہ ہم جیسے مقدس اور پاک اور اطاعت کیش و فرماں بردار کو چھوڑ کر انسان جیسے فسادی عنصر کو زمین کی خلافت سونپی جارہی ہے یہ تو زمین میں امن قائم کرنے کے بجائے اس کو دارالفساد بنادیں گے، کشت و خون کا بازار گرم کریں گے۔

واذ قال ربك للملائكة انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك قال انی اعلم ما لا تعلمون ○	اور جب کہ آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا کیا آپ وہاں ان لوگوں کو بنائیں گے جو اس میں فساد پھیلائیں گے اور خوں ریزی کریں گے حالانکہ ہم آپ کی حمد کے ساتھ آپ کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں، فرمایا میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

لیکن دنیا میں خلافت الٰہی کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لیے قوانین الٰہی کو نافذ کرنے اور اس کے مرضی کو تشریعی حیثیت سے پوری کرنے کے لیے صرف بنی آدم سزاوار ہو سکتے تھے۔

اسی خلافت ارضی کے قائم کرنے کے لیے انسان دنیا میں بھیجا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی خلافت اپنے اندر کیا وسعت رکھتی ہے اس کو سمجھیے اور دین اسلام کی روشنی میں معلوم کرنے کی کوشش کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ قیامت میں یہ عذر پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہو کہ خدایا ہم نے تیری عائد کردہ ذمہ داری کو نہیں سمجھا، تیری خلافت کو ہم نے قائم نہ کیا۔ (اعراف۔ ۱۷۱)

واذ اخذ ربك من بنی ادم من ظہورہم ذریتہم واشہدہم علی انفسہم الست بربکم قالوا بلیٰ شہدنا ان تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ہذا غافلین۔	اور جب کہ آپ کے رب نے بنی آدم سے ان کی پشتوں سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ ٹھیراتے ہوئے پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا ہاں، ہم گواہ ہیں، یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ کہو کہ ہم اس سے غافل تھے۔

اسی اللہ کا جس کے رب ہونے کا ہم سے عہد لیا گیا ہے اس کی خلافت زمین میں اس طرح سے قائم کرنی ہے

کہ ہمارے دل بھی اس کے رب ہونے کی گواہی دیں، ہماری انفرادی زندگیاں بھی اس کی شاہد ہوں۔ ہمارے گھر اور بازار بھی اس کے گواہ ہوں اور ہمارے تمام اجتماعی، سیاسی اور تمدنی معاملات بھی اس کے گواہ ہوں اور دنیا میں جہاں کہیں بھی جو کام ہو اللہ کی ربوبیت کے ماتحت انسان کی خلافت کی ذمہ داری کے مطابق ہو۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم میثاقہ	اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور اس کے اس عہد پیمان
الذی واثقکم بہ اذ قلتم سمعنا	کو جو اس نے تم سے لیا جب کہ تم نے کہا ہم نے سنا
واطعنا واتقوا اللہ ان اللہ علیم	اطاعت کی اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، یقیناً
بذات الصدور یاایھا الذین	اللہ دلوں کے بھیدوں سے خوب واقف ہے، اے
امنوا کونوا قوامین شھداء	ایمان لانے والو! اللہ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے والے
بالقسط ولا یجرمنکم شنآن قوم	اور انصاف کے گواہ بنو اور تم کو کسی قوم کی دشمنی ہرگز
علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب	اس بات پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ انصاف نہ کرو انصاف
للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر	کرو یہی تقوے سے اقرب ہے اور اللہ کا تقویٰ اختیار
بما تعملون (مائدہ آیت ۸-۷)	کرو یقیناً اللہ ان تمام کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو

اس آیت کو سامنے رکھنے سے یہ بات کس قدر واضح ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں سے کتنا بھاری عہد لیا ہے اور ان کے کندھوں پر بار امانت کی کتنی سخت ذمہ داری ڈالی ہے جس عہد کے بارے میں ہم سب نے بآواز بلند یہ اقرار کیا ہے کہ اس بار کو خوشی خوشی اٹھاتے اور سنتے ہیں اور اس کو سننے کے ساتھ کرنے کا بھی عہد کرتے ہیں ہم نے اس میثاق عظیم پر آمنا و صدقنا کی آواز بلند کی اور یہودیوں کے طریقہ اور سمعنا وعصینا" کے بجائے پیکر تسلیم و اطاعت بن کر اس کو قبول کیا ہے اگر اس ذمہ داری میں کوتاہی ہوئی اور اس کو پس پشت ڈالا گیا تو اس دن جب سب لوگ ایک علیم و خبیر ہستی کے سامنے بے کسی و کس مپرسی کی حالت میں ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے تو اس دن کوئی عذر کام نہ دے گا کہ اس ذات بے ہمتا نے فرما دیا ہے کہ "الا تقولوا یوم القیامۃ انا کنا عن ھذا غافلین" اس بار امانت کے اٹھانے میں وہ مصیبتیں جھیلنی ہوں گی جو انبیاء کرام جھیلتے رہے۔ اور انہوں نے زندہ جاوید مثالیں اور نمونے قائم کر دیئے اس بار گراں کی اہمیت کا تذکرہ سورہ احزاب سے بھی معلوم کیجیے جو مسلمانوں کی عزم و ہمت اور قوت و شجاعت اور جواں مردی کا مفصل نوشتہ ہے جنہوں نے اسی عہد ہی کو پورا کرنے کے لیے جانگداز مصیبتوں میں اپنی جانیں ڈال دیں اور ہوشربا اوقات ہلاکت میں اپنی ہستی کو خدائے وحدہ لاشریک کے میثاق کے

مطابق فن کے گھاٹ اتار دیے کے لیے تیار ہو گئے۔

واذ اخذ نا من النبین میثاقھم ومنک ومن نوح وابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ابن مریم واخذ نا منھم میثاقاً غلیظاً لیسئل الصادقین عن صدقھم واعد للکافرین عذاباً الیماً۔ (احزاب ۸)

اور جب کہ ہم نبیوں سے ان کا عہد لیا اور آپ سے اور نوح ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے اور ان سب سے ہم نے بہت پختہ عہد لیا۔ تاکہ سچے آدمیوں کی سچائی کے بارے میں پوچھے اور منکرین کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اسی عہد ومیثاق کی وجہ سے صادقین دکاذبین سے محاسبہ ہوگا کہ انھوں نے جو عہد اللہ تعالیٰ سے کیا تھا، اس کو کہاں تک پورا کیا اور کہاں تک نفس پرستی کے پھندوں میں پھنس کر اس کو ترک کیا ہے۔

اسی سورۂ احزاب کے آخر میں اس عہد کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کے علاوہ دنیا کی کسی مخلوق نے اس امانت کو اٹھانے کی اپنے دست وبازو میں قوت نہیں پائی اور اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوماً جھولاً۔

ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے، انسان نے اس کو اٹھا لیا (اس کے باوجود) وہ ظلم کرنے والا اور نادان ہے

اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے مسلمان کی اپنی جانیں جوکھم میں ڈالیں، اس راہ حق میں ہاتھ پیر بیلنے اور موت وہلاکت کے جانکاہ مناظر وحشت وبربریت کے ہوشربا مواقع اور مشرکین کی طرف سے کھیلی جانے والی آگ وخون کی ہولیوں میں کود گئے کہ:۔

لما رای المومنون الاحزاب قالوا ھذا ما وعدنا اللہ ورسولہ لقد صدق اللہ ورسولہ ما زادھم الا ایماناً وتسلیماً من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلاً۔

جب اہل ایمان نے لشکروں کو دیکھا تو کہا یہ (آزمائش) وہ ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے یقیناً سچا وعدہ کیا تھا اور اس (ہولناک مصیبت) سے بجز اس کے اور کچھ نہ ہوا کہ ان کا ایمان اور ان کی اطاعت اور بڑھ گئی۔ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ سے کیے ہوئے عہد میں صادق تھے تو ان میں بعض نے اپنی جان نذر کر دی اور بعض اس کا انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

یہی معاہدہ مسلمانوں سے کیا گیا تھا جنھوں نے اس عہد کو پورا کیا مسلمانوں ہی سے نہیں دنیا میں جتنے انبیا مبعوث فرمائے گئے سبھی سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ راہ حق میں کوئی مداہنت نہ برتیں گے شہادت کا تلخ گھونٹ اپنے حلقوں سے اتار لیں گے اپنے جسم کے ایک ایک قطرہ خون کو راہ حق میں پانی بنا کر بہا دیں گے لیکن اس کام کے سلسلے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں گے جیسا کہ اس سے قبل کی آیتوں میں گذر چکا ہے

دوسری جگہ اس عہد کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا :-

یا ایھا الذین امنو کونوا قوامین	اے ایمان لانے والو! انصاف کے لیے اٹھ کھڑے
بالقسط شہداء للہ ولو علی انفسکم	ہونے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو
او الوالدین والاقربین ان یکن غنیا	اگرچہ گواہی خود تمہارے، تمہارے والدین
او فقیرا فاللہ اولیٰ بھما فلا تتبعوا	اور اعزہ کے خلاف ہو، اگر وہ شخص (جس کے خلاف
الھوی ان تعدلوا وان تلؤا او	تمہاری شہادت حق پر رہی ہے) مالدار یا غریب
تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون	ہو تو بہر صورت اللہ تم سے زیادہ اس سے قریب ہے،
خبیرا ۔ (نساء)	اور اگر تم لاگ لپیٹ سے کام لو (یا صحیح گواہی سے)

اعراض کرو تو اللہ تعالےٰ ان تمام کاموں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

یہ بڑی ذمہ داری جو قوام بالقسط اور شہداء للہ کی حیثیت سے اُمت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے یہی ذمہ داری یہودیوں پر بھی ڈالی گئی تھی، لیکن انھوں نے اس عظیم عہد کا پاس نہ کیا اور اس کو اپنی خواہشوں کا پابند بنا لیا، اس لیے امت مسلمہ کو جب اس کے فرض اقامت دین اور شہادت حق کے عظیم الشان فرض سے باخبر کیا جاتا ہے تو فوراً ہی ان کے سامنے یہود کی سیاہ تاریخ کے اوراق اور ان کی نازیبا حرکتوں کے دفتر کھول کر رکھ دیے جاتے ہیں کہ امت مسلمہ اس مہلک مرض اور اس کے تباہ کن نتائج سے ہمیشہ گریزاں رہے۔

سورۃ مائدہ میں اس میثاق کے ذکر کے بعد جو مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ یہود کے میثاق کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کی شرارتوں، عہد شکنیوں اور باطل پرستیوں کا ذکر شروع ہو جاتا ہے

ولقد اخذ اللہ میثاق بنی اسرائیل	اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا
وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبا وقال	اور (اس غرض سے) ہم نے ان میں سے بارہ سردار
اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ	چنے اور اللہ نے فرمایا یقیناً میں تمہارے ساتھ
واتیتم الزکوٰۃ وآمنتم برسلی	ہوں، اگر تم نے نماز قائم کی، زکوٰۃ ادا کی، میرے

وعزرتموهم واقرضتم الله قرضا حسنا لاکفرن عنکم سیٰاتکم ولادخلنکم جنت تجری من تحتها الانهار فمن کفر بعد ذالك منکم فقد ضل سواء السبیل فبما نقضهم میثاقهم لعنا هم وجعلنا قلوبهم قاسیة یحرفون الکلم عن مواضعه ونسوا حظا مما ذکروا به ولا تزال تطلع علی خائنة منهم الا قلیلا منهم فاعف عنهم واصفح ان الله یحب المحسنین۔ (مائدہ)

رسولوں پر ایمان لے آئے، ان کی امداد کی اور اللہ کو قرض حسن دیا تو یقیناً میں تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دوں گا اور تم کو باغات میں داخل کروں گا، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی پس جو کوئی اس (عہد کے) کا بعد تم میں سے کفر رویہ اختیار کریگا وہ سیدھی راہ سے بالکل بھٹک جائے گا۔ پس بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے عہد کو توڑ دیا ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دلوں کو سخت بنایا کہ وہ (اللہ) کی باتوں کو اپنی جگہوں سے ہٹاتے ہیں اور جن باتوں کی انہیں یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے ہیں اور ان کی ایک نہ ایک خیانت تمہارے سامنے آتی ہی رہتی ہے پس انہیں معاف کر دیں اور ان سے درگذر کریں' اللہ حسن سلوک کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

یہ اور اس قسم کے بہت سے عہد و مواثیق کا ذکر قرآن میں آتا ہے ان عہدوں اور یہود کی ان شرارتوں کا ذکر تورات میں بھی آتا ہے جس میں سے ایک ٹکڑا یہاں ذکر کیا جاتا ہے "میرا عہد لاوی کے ساتھ رہا۔ رب الافواج فرماتا ہے میرا عہد زندگی اور سلامتی کی بابت جو کہ میں نے اسے دیا اس کے ساتھ تھا کیوں کہ وہ مجھ سے ڈرتا رہا اور میرے نام کے حضور ترساں رہا، سچائی کی شراب اس کے منہ میں تھی اور اس کے لبوں میں کوئی شرارت پائی نہیں گئی وہ میرے ساتھ سلامتی اور راستی سے چلتا رہا اور اس نے بہتوں کو بدی کی راہ سے پھیرا کیوں کہ کاہن کے ہونٹوں میں چاہیے کہ معرفت حفاظت سے رہے اور لازم ہے کہ لوگ اس کے منہ سے شریعت کو تلاش کریں کیونکہ وہ رب الافواج کا رسول ہے، پھر تم راہ سے کنارے ہو گئے تم نے بہتوں کو شریعت سے ٹھوکر کھلائی تم نے لاوی کے عہد کو خراب کیا رب الافواج فرماتا ہے اور اس لیے میں نے تم کو تمام قوم کے آگے ذلیل کیا کہ تم نے میری راہوں کو حفظ نہیں کیا بلکہ تم شریعت میں طرف دار ہوئے۔" ملاکی باب ۲، ۷تا ۱۰ ۔ (باقی آئندہ)

مصارف زکوٰۃ کے سلسلہ میں چند ضروری باتیں

مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف "فی سبیل اللہ" ہے جس کے بارے میں عام مفسرین اور فقہاء یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اعانت مجاہدین ۔ اور وہ سامان جہاد ہے جو ان کی ملک میں دیدیا جائے بعض لوگوں کے نزدیک سفر حج بھی اس کے تحت داخل ہے ۔ جیسا کہ ام معقل والی حدیث میں آگیا ہے !

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا "فی سبیل اللہ" کے مصرف کو اس سے زیادہ وسعت دی جا سکتی ہے، یعنی تبلیغ واشاعت اسلام اور اقامت دین کے دوسرے کاموں میں بغیر تملیک کے بھی زکوٰۃ کا مال فی سبیل اللہ کے تحت صرف کیا جا سکتا ہے یا نہیں ؟

میرے علم میں قدماء میں سے کسی کی رائے توسیع کی موافقت میں نہیں ہے البتہ کتاب الاموال میں انس بن مالک کا ایک اثر مل گیا ہے جس سے اس پر کچھ روشنی پڑتی ہے وہ اثر یہ ہے عن انس بن مالک والحسن قالا" ما اعطیت فی الجسور والطرق فہی صدقۃ مرضیۃ" اسمٰعیل بن ابراہیم جو ابن علیہ کے نام سے معروف ہیں، اس اثر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"انہا تجزیٔ من الزکوٰۃ" (کتاب الاموال ص۵۶۴)

امام ابو یوسفؒ کے متعلق عام فقہاء یہ لکھتے ہیں کہ انھوں نے فی سبیل اللہ سے مراد جہاد ہی لیا ہے، لیکن کتاب الخراج دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تحدید کے قائل نہیں تھے ۔ مصارف کی تشریح کرتے ہوتے فرماتے ہیں :۔

فالمؤلفۃ قلوبہم قد ذہبوا۔ والعاملون علیہا یعطیہم الامام ما یکفیہم وان قل من الثمن او اکثر۔ اعطی الوالی منہا ما لیسعہ ویسع عمالہ

من غیر صرف ولا تقتیر۔ وقسمت بقیۃ الصدقات بینھم۔ فالفقراء والمساکین سھم۔ وللغارمین وھم الذین لا یقدرون علی قضاء دیونھم سھم وفی ابناء السبیل المنقطع بھم سھم یحملون بہ ویعاونون وفی الرقاب سھم وسھم فی اصلاح طرق المسلمین الخ

خط کشیدہ الفاظ خاص طور سے قابل غور ہیں۔ اور آٹھواں مصرف جس سے مراد فی سبیل اللہ ہی ہو سکتا ہے اس لیے کہ اس سے پہلے یا بعد اس مصرف کی تشریح نہیں کی ہے اور نہ تشریح میں قرآن کی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔

بخاریؒ باب القیامۃ اور ابو داؤدؒ "باب القتل بالقسامۃ" میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن سہل کے قتل کے سلسلہ میں زکوٰۃ کے سو اونٹ دیت کے طور پر دیئے۔

(فوداہ مائۃ من ابل الصدقۃ) بعض روایتوں میں "من عندہ" کا لفظ ہے بہرحال ترجیح جس لفظ کو بھی ہو۔ لیکن من ابل الصدقۃ" کے لفظ کو محدثین نے رد نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس کو تسلیم کر کے دونوں روایتوں میں تطبیق دی ہے پوری تفصیل فتح الباری میں موجود ہے (صفحہ ۲۰۶ ج ۱۲)

اسی روایت کے ماتحت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بعض علماء کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے مال کو مصالح عامہ کے کاموں میں صرف کرنا جائز سمجھتے ہیں اور وہ خود بھی اسی کے قائل تھے۔ (فتح الباری)

البدائع والصنائع میں ہے کہ "اما قولہ فی سبیل اللہ عبارۃ عن جمیع القرب فید خل فی کل من سعی فی طاعۃ اللہ وسبل الخیرات (ج ۲)

حال کے مفسرین میں نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ نے قیل کے لفظ سے مصالح عامہ کے جواز کا قول نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ علامہ رشید رضا مصری اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے اپنی تفسیروں میں وسعت دی ہے، حضرت الاستاذ جناب سید صاحب نے بھی سیرت کی پانچویں جلد میں وسعت ہی کا پہلو اختیار کیا ہے، اس کے علاوہ ایک اور بات قابل غور ہے کہ فقہاء کرام "للفقراء" اور اس کے معطوفات علیہ کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ اس پر "لام" تملیک کا ہے اور قرآن میں فی سبیل اللہ کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اس سے مراد جہاد ہی ہے اس کے متعلق حضرت سید صاحب نے سیرت میں جو کچھ لکھا ہے ہم اُسے نقل کرتے ہیں۔

اکثر فقہاء نے فی سبیل اللہ" سے مراد صرف جہاد ہی لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

ابھی آیت گذر چکی ہے۔ للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ، یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دین کا کام مراد ہے اکثر فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے بہت کچھ مشتبہ ہے ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے خلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ (ح ۵ صفحہ ۲۳ سیرت)

ابن عربی مالکی نے اپنی کتاب الاحکام میں لکھا ہے کہ :-

واختلف العلماء فی معنی الذی افادت ھذہ اللام لام الاجل کقولک ھذا السرج للدابۃ والباب للدار وبہ قال مالک وابو حنیفۃ ومنھم من قال ان ھذہ لام التملیک کقولک ھذا المال لزید وبہ قال الشافعی ج ۱ صفحہ ۱۹

اس وقت اقامت دین کے کاموں اور مدارس کے قیام و بقاء کی اہمیت ملحوظ خاطر رہے، نیز یہ کہ اس وقت ان مدات کے خرچ کرنے میں عربی مدارس میں جو فقہی حیلے کیے جاتے ہیں اس کی کیا ضرورت ہے اس لیے کہ جب تملیک کا مسئلہ نص کی حیثیت نہیں رکھتا تو فقہی حیلوں کے بجائے اس کو اصولی طور پر کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے، اور بہر حال حیلہ کی حیثیت اباحت مرضیہ نہیں ہے بلکہ دین کی روح کے لحاظ سے تو غیر مرضیہ ہی معلوم ہوتی ہے۔

رسائل و مسائل

ایک غیر مسلم دوست کا خط

سوال نمبر (۱)

"زندگی بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایک نیک دل شرنارتھی کا ایک خط اور اس کا جواب شائع ہوا تھا، اس سلسلہ کے چند اور خطوط شائع کیے جا رہے ہیں، ان خطوط کے شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو مسلمان ہندوستان کے موجودہ حالات میں مایوس ہیں وہ اس نیک دل غیر مسلم کے جذبات سے اندازہ کرلیں کہ انسانیت کی روح یہاں مردہ نہیں ہوگئی ہے اور یہ کہ اگر سچی خدا پرستی اور وحدت انسانی کو بنیاد بنا کر خلوص سے کام کیا جائے تو کامیابی کی کتنی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔

(ادارہ)

...... آپ کے دفتر کی طرف سے ایک کارڈ بھی ملا تھا اور اب رسالہ ماہوار "زندگی" ماہ اکتوبر میں میرے خط کا جواب بھی شائع آپ کی طرف سے ہوا، جناب کا شکریہ! مجھے آج آپ کو بہت سی باتیں لکھنی ہیں، جس میں کئی باتیں ایسی ہوں گی کہ آپ شاید غلط اندازہ میرے خیالات کی بابت کریں۔ لیکن میں ایک صاف گو اور صرف خدا سے ڈرنے والا ہوں، کسی کا ڈر مجھے نہیں ہے لیکن میرے خیالات جو انسانیت پر قائم ہیں بدستور رہیں گے، خواہ مجھے کتنی ہی دشواریوں سے یا کسی کی ناراضگی کے جذبہ سے کیوں نہ گذرنا پڑے، اس لیے میں آپ سے بھی استدعا کرتا ہوں کہ میرے عریضہ کو بغور ملاحظہ فرمادیں، غلطی انسانوں سے ہوتی ہے۔ اگر میری باتوں کا آپ کو صحیح معنوں میں یقین آئے تو اسے اپنانے کی کوشش کریں، اور امیر جماعت اور ہر ایک رکن کو سمجھانے کی تحریک کریں بصورت

دیگر وہم کا علاج نہیں ہے۔

(۱) آپ کے رسالہ کے جواب میں میرے متعلق آپ نے جو تحریر کیا ہے کہ "مجھے خود کوئی کام نہ کرنا پڑے، دوسرے اس کام کو انجام دیں اور غالباً مولانا مودودی کو ہندوستان بلانے کی خواہش بھی اسی جذبہ کی ترجمان ہے" میرے خیالات کے بالکل برعکس ہے۔ مولانا صاحب آپ ذرا ہوا کا ایک رُخ دیکھنا چھوڑ کر سب طرف خیالات کو صحیح انداز میں لا دیں، معمولی سی مثال ہے کہ جب تک بچہ روتا نہیں ہے، ماں بھی دودھ نہیں پلاتی، میرے دل میں آپ کی تحریک کی بڑی عزت ہے اور صحیح معنوں میں ہر قسمی کام جو ہندو مسلمان کے مل بیٹھنے اور امن کا ہے، کرنے کو تیار رہوں، بلکہ میں خاص طور پر . . . . کے ساتھ . . . . کے امیر جماعت کے پاس جو جیل کا کام کرتے ہیں، گیا تھا، اور کئی دفعہ میں نے . . . . کو کہا کہ جب بھی آپ کا جلسہ یا اکٹھا ہوں، میں چلنے کو تیار رہوں اور جو کام بھی مجھے سونپا جائے وقت دینے کو تیار رہوں۔ لیکن کوئی ایسا اتفاق نہیں ہوا، اور ساتھ ہی سر قوم کی اصلاح کے لیے کئی تجویزیں میں نے رکھیں اور کہا عملی کام ہونا چاہیے۔ آپ ایک مسجد میں سب اکٹھے ہو کر گھنٹہ دو گھنٹہ باتیں اور تجویزیں جو کرتے ہیں ان کو عملی جامہ پہنانے کی طرف بھی اتنا خیال رکھو تو بہت سی اصلاح ہو سکتی ہے۔ جب تک آپ کے امیر جماعت کے کچھ آدمی میرے ساتھ نہ ہوں میں اکیلا اتنے بڑے شہر میں کیا کر سکتا ہوں جب کہ نو وارد ہوں، ہاں! پھر بھی جو کچھ مجھ سے عملی طور پر ہو سکتا ہے، کر رہا ہوں۔ دو تین دفعہ بھی یا صحیح معنوں میں جب کہ میں سمجھتا تھا کہ مسلمان بھائی کا قصور ہے فساد ہوتے روکا اور بیچ میں کو دپڑا۔ جس بازار میں میری دوکان تھی وہاں ایک قصاب کا لڑکا ایک ہندو لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا، میرے سامنے کا واقعہ ہے، میں نے بالکل معمولی طور پر ایک سگرٹ ایجنٹ جو مسلمان تھا اس کے سامنے ڈانٹ کر کسی کو نہ بتایا۔ اس کے جو تھے روز پھر وہ چھیڑ چھاڑ کرتا ہوا کسی اور صاحب نے دیکھا، قصہ مختصر فساد کا اندیشہ تھا۔ وہ خود کہنے لگا کہ شاید آپ کو . . . . نے کہا ہوگا، پھر وہاں کے لوگ میرے پیچھے لگ گئے کہ آپ کو جب معلوم تھا آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا، میں چپ تھا کیونکہ واقعہ ایسا تھا۔ الٹا وہی مسلمان جھوٹ کر قرآن کی قسم جب کھانے لگا تو مجھے غصہ آ گیا کہ مسلمان ہو کر آپ کیوں قرآن کو بیچ میں لاتے ہیں، اس کو سخت جھاڑا، اور لوگوں کو بھی جھاڑا، اور منت کر کے آگ جو بھڑک رہی تھی ٹھنڈی کی، ایک دو کام اور بھی ایسے ہوئے جو میں سمجھتا تھا کہ مسلمان بھائیوں کی غلطی ہے، اپنے رسوخ اور منت سے سرانجام دیے، جس کے متعلق . . . . صاحب جانتے ہیں، کیونکہ وہ ہمارے کچھ نزدیک بیٹھتے تھے، میں نے جو کچھ کیا ہے اپنا فرض سمجھ کر، کسی پر احسان تھوڑا کیا ہے، کیونکہ میرے دل میں خدا کا ڈر ہے۔ گو میں جب یہاں آیا۔ گمنام شخصیت کے ساتھ رہنا چاہتا تھا اور رہ رہا ہوں اور رہوں گا پہلے بھی

یہی حالت تھی کہ میں کسی پارٹی میں، سماج، ہندو مہاسبھا، کانگریس اور سنگھ میں بھی کبھی حصہ نہیں لیا، اور نہ کبھی ان کے جلسوں میں جاتا تھا، اب وہی حالت ہے، مجھے اپنے دھرم سے اور پرماتما سے سروکار ہے جو انسان کا فرض ہے اور ایک حق پسند شہری ہونے کا ہر وقت دھیان رہتا ہے، جو بھی حکومت ہو اس کا پورے طور پر رعایا بن کے رہنا ہے، اس کے قوانین اور حکم پر چلنا ہے، پاکستان میں بھی جب تھے اس حالت میں رہتا تھا، اب بھی وہی ہے۔ سات سال میں کلاتھ مارکیٹ ایسوسی ایشن کا پریسیڈنٹ رہا اور دو سال پورے میرے پاس کپڑے کا ڈپو .... شہر کا رہا اور افسر بھی اکثر چھوٹے بڑے مسلمان تھے اور ہمارے ضلع کا ڈپٹی کمشنر .... جو سارے ہندوستان بھر میں اس جیسا سخت اور بیدار مغز کوئی نہ تھا اس کے زمانے میں بھی کسی سے، خواہ افسر ہو یا بڑا آدمی، نہ ڈرتا تھا۔ افسر وہاں کے مجھے شیر ببر کہتے تھے، کیونکہ میں نے بالکل بلیک نہیں کی اور ہندو مسلمان سب مجھ پر خوش تھے تو اس لیے کسی کے ساتھ میں رو رعایت، امیر غریب کا سوال یا ہندو مسلمان کا سوال نہ رکھتا تھا۔ میرے ڈپو پر ہر ایک کے ساتھ انسانوں کا سلوک ہوتا تھا۔ بلیک کرنے میں مجھے قدرتی نفرت تھی۔ اور افسران بھی خوش تھے کہ میرا حساب کتاب اور قواعد کی پابندی اتنی تھی شاید پنجاب بھر میں ہو، حساب صاف اور شیشہ کی طرح، اس لیے میں کسی سے بھی نہ ڈرتا تھا اور ٹھیک راہ پر لوگوں کو چلاتا تھا کیونکہ میرے دل میں کوئی پاپ گناہ نہ تھا، ہمیشہ گناہ گار اور پاپی کو اپنا پاپ خراب کرتا ہے ویسے تو ہر ایک شخص گناہ گار ہے لیکن خدا کا ڈر جس کو ہو اچھا ہے۔ اس میں آپ کو سچے دھرم سے لکھتا ہوں کہ امن کے لیے جو بھی میری خدمات جو میں کرنے کے قابل ہوں، کوتاہی نہ کروں گا، اور نہ پہلے کی ہے۔

(۲) دوسرا آپ نے لکھا کہ یہاں کے مسلمان غیر مطمئن اور پریشان ہیں اور چند آدمی جو ملتے ہیں وہ کچھ لحظہ رہ کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور غیر مسلم کا دھیان اس طرف نہ لانا اور خفیہ پولس کا پریشان کرنا ان سب باتوں کا جواب میں اکٹھا دیتا ہوں کہ مسلمان یہاں کے ایسے پریشان ہوئے ہیں جیسا کہ میں پہلے اوپر لکھ چکا ہوں ان کو اپنا نعرہ "لے کے رہیں گے پاکستان" جب یاد آتا ہے، پریشانی کرتا ہے ورنہ میں نے تو یہاں بھی دیکھا ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے بہت اچھا انتظام ہے اور پولس ہر وقت چوکنی رہتی ہے، یو۔پی۔ کا پولس اسٹاف چھوٹے سے بڑے تک سب اچھے اور کارکن ہیں، کبھی فساد کا یہاں اندیشہ نہیں ہو سکتا، اور پہلے بھی جیسے غربی اور شرقی پنجاب میں فسادات ہوئے ہیں یہاں سننے کو بھی نہیں آیا۔ پنڈت جواہر لال کا سارا زور اقلیت پر لگ چکا ہے کہ آرام سے رہیں پھر مسلمانوں کا پریشان ہونا اور گورنمنٹ پر اعتبار نہ کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جب ایک گورنمنٹ کا رویہ ٹھیک ہے اور وہ دل سے چاہتی ہے کہ امن رہے اور ہندو مسلمان بھائی بن کر رہیں، اور میں آپ کو سب دیکھ کر لکھ رہا ہوں کہ عوام اب بھی نہیں چاہتے کہ ملک میں کسی قسم کا شور و شر ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ

ساری دنیا جواہر لال، پٹیل اور راجندر پرشاد نہیں بن سکتی، لیکن آخر یہاں کے نیتا تو وہی ہیں، سب کام ان کی مرضی سے ہوتے ہیں اور فسادات کا نتیجہ عوام بھگت چکے ہیں، اس لیے وہ بھی اب آرام سے رہنا چاہتے ہیں ایک آدمی اپنے کنبہ کا انتظام ٹھیک نہیں رکھ سکتا، اتنی بڑی سلطنت کو سدھارنے کو وقت لگے گا آپ اور آپ کی جماعت کے رکن اگر حوصلہ چھوڑ دیں تو ٹھیک نہیں ہے بلکہ پورے طور پر کوشش کریں کہ مسلمانوں کے دل سے شکوک دور ہو جاویں، اور ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے ہوئے ملک کی بہتری سمجھیں۔ ان کا اور سب کا بھلا اسی میں ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں کئی پارٹیاں مختلف ناموں سے پیدا ہو کر گورنمنٹ کو پریشان کر رہی ہیں جس سے گورنمنٹ اصلاح کی طرف پوری راغب نہیں ہوتی، آپ صاحبان اگر غیر مسلم کو اپنا بھائی کہیں گے اور مل کر کام کرنے کی کوشش کریں گے تو کوئی ایسا پاگل غیر مسلم ہوگا جو آپ کو اپنا بھائی نہ سمجھے گا اور آپ کی باتوں پر دھیان نہ دے گا، میرے خیال میں ابھی آپ اور آپ کے امیر جماعت غیر مسلم کی طرف اپنا بھائی بنانے کی سعی نہیں کی۔ ہر چھوٹا بڑا سمجھتا ہے کہ ایک خدا کی مخلوق ہیں اور سب بھائی ہیں،

باقی رہا خفیہ پولس کا معاملہ! اگر آپ کے دل میں سچ ہے اور آپ اور امیر جماعت صحیح معنی میں امن چاہتے ہیں اور گورنمنٹ کے وفادار بن کر رہنا چاہتے ہیں تو کسی سے ڈرنے کی یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جب وہ دیکھیں گے یہ سیدھے راستے پر چل رہے ہیں اور صحیح عمل پر ہیں تو خود بخود شرمندہ ہوں گے اور کسی قسم کا آپ پر شک نہ کریں گے، یا ایسی معمولی باتوں سے گھبرا کر آپ کے امیر جماعت کو جو مقصد حاصل کرنا ہے چھوڑ چھوڑا دیں گے۔ آپ اپنی طرف سے خدا کے نام پر لوگوں کو بلا مذہب و ملت کا خیال کرتے ہوئے سیدھے راستے پر لا دیں، اس کا اجر آپ کو خدا دیوے گا۔ گورنمنٹ بھی خدا کی بنائی ہوئی ہے سب کام خدا کے حکم سے ہو رہے ہیں، ایک خفیہ پولس نہ سو خفیہ پولس والے آویں جب آپ کا اور امیر جماعت کا دل صاف ہوگا کیا کریں گے۔ ڈر صرف خدا کا ہونا چاہیے۔

مجھے عرصہ بیس روز سے سخت تکلیف ہے۔ پیر پھسلنے سے موچ آگئی ہے، پیر سوج گیا ہے اور ہر وقت سخت درد رہتا ہے، علاج کر رہا ہوں، خدا کے فضل سے جلدی آرام ہو جاوے گا۔ لکھنا بہت کچھ تھا پھر کبھی لکھوں گا۔ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں اس لیے خط بھی ٹھیک نہیں لکھا گیا۔ خیالات کیونکہ بہت تھے درد کی پریشانی سے خط ادھورا چھوڑ رہا ہوں، آرام آتے تو بہت کچھ اور صحیح انداز میں اور صاف صاف لکھوں گا۔

ہاں! اگر مجھ سے آپ کے امیر جماعت کا آدمی یہاں آکر ملے تو میں عملی کام جو کرنے ہیں اس کے

اصلاح مشورہ کریں گے کہ کس طرح سیدھے راستے میں لوگوں کو ڈھکیل سکتے ہیں اور ساتھ ہی جو درد کی وجہ سے مفصل نہیں لکھ سکا اس کے ساتھ بحث مباحثہ ہونے پر وہ میرے خیالات اور کام کے متعلق آپ کو صحیح معنوں میں تحریر کریں گے۔ جو بھی امداد مجھ غریب سے ہو سکے میں کروں گا، آپ کے امیر جماعت کے آدمیوں کو معلوم ہے کہ میں بھی اس وقت سخت پریشانی کی حالت میں ہوں، کیونکہ مالی حالت بہت خراب ہے پھر بھی جو وقت نکل سکے دوں گا۔ اب اور درد کی وجہ سے کچھ نہیں لکھا جا سکتا معاف کریں گے۔

دعاگو..............

جواب :۔

مجھے نہایت افسوس ہے کہ گرامی نامہ کا جواب بہت تاخیر سے جا رہا ہے، میں اس دوران میں پندرہ بیس روز باہر رہا اور واپسی پر کچھ طبیعت خراب ہو گئی تھی اور ساتھ ہی کچھ ضروری کام بھی پیش آتے رہے اس لیے باوجود کوشش کے آپ کے خط کا جواب بروقت نہیں لکھ سکا، امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔

آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ پچھلے دنوں پاؤں میں چوٹ لگ جانے کی وجہ سے آپ کو خاص تکلیف اٹھانا پڑی۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس تکلیف سے اللہ نے نجات دی ہو گی، لیکن طبیعت کو تردد ہے، اس لیے براہ عنایت مفصل حالات سے مطلع فرمائیے کہ اب آپ کیسے ہیں۔ آپ کے خطوط نے آپ کے ساتھ ایک خاص طرح کا انس پیدا کر دیا ہے، اس لیے خیریت مزاج معلوم کرنے کا انتظار رہے گا۔

آپ کے اس خط سے آپ کے جذبات کا نسبتاً بہتر اندازہ کرنے کا موقع ملا اور اسی دوران میں مجھے یہاں کے بعض رفقاء کی زبانی بھی آپ کے حالات معلوم ہوئے ہیں۔ مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے دل میں اپنے خالق و مالک کے حقوق کا احساس ہے اور اس کی مخلوق کے ساتھ آپ یکساں انس محسوس کرتے ہیں، کاش کسی موقع پر آپ سے ملاقات ہو سکتی تو آپ سے ان مسائل پر زبانی بات چیت ہو سکتی۔ انشاءاللہ کبھی آنا ہوا تو میں ضرور آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔

۱ آپ نے ہمیں جس انداز میں بے خوفی کی تلقین فرمائی ہے اس سے بھی دل متاثر ہوا۔ لیکن آپ کو شاید میرے خط سے غلط فہمی ہوئی ہے، میں نے عام مسلمانوں کے خوف و ہراس کا ذکر کیا تھا کہ وہ ہمارے کام میں مانع ہے نہ کہ اپنے خوف و ہراس کا۔ الحمدللہ ہمیں خدا پر اعتماد ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اس کا خوف اگر کسی درجہ میں بھی کسی کے دل میں سما جائے۔ پھر کسی اور کے خوف کے لیے دل میں گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پھر ہم جو کام کرنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں بھی ہمیں یہ اطمینان ہے کہ وہ کوئی غلط کام نہیں ہے بلکہ اس سے قوم د

ملک کو فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اس لیے جوں جوں لوگ اس سے واقف ہوتے جائیں گے، اس کی قدر کرنے یا کم از کم اس کی مخالفت نہ کرنے پر اپنے کو مجبور پائیں گے۔ آپ کے خط سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ شاید آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے آپ کو بے عملی کا طعنہ دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا اس کا مقصود محض تحریص یعنی کام پر زیادہ آمادہ کرنا تھا۔ آپ کی تنقیص کا کوئی ادنیٰ سا خیال بھی میرے دل میں نہیں تھا۔ آپ .... میں جو کام کر رہے ہیں، اس کا مجھے پہلے ہی سے کچھ اندازہ ہو چکا ہے اور میں اسے بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، میں اپنے .... کے رفقاء کو لکھ رہا ہوں کہ وقتاً فوقتاً آپ سے ملاقات کرتے رہیں، اور اپنے کاموں میں آپ کا تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں۔

مندرجہ ذیل خط اس کے جواب میں آیا:۔

.... یاد آوری و تکلیف کا مشکور ہوں، بندہ کو اب آرام ہے، صرف تھوڑی پیر میں کمزوری ہے، پھر بھی جلد خدا کے فضل سے آرام آجاوے گا، مجھے فخر ہے کہ جناب والا کو میری معمولی تکلیف کا احساس ہے اور فکر ہے۔ شکریہ۔

بموجب آپ کی تحریر کے چند صاحبان مع امیر جماعت کے میرے پاس آئے، یہ آپ کا حسن ظن ہے ورنہ بندہ اس وقت ایک معمولی حالت میں ہے، خدا آپ کو توفیق دے تاکہ خدا کی مخلوق کی خدمت اور زیادہ کر سکیں، میری تو ہر وقت یہی دعا ہے، نیک کام کرنے سے جہاں آپ اپنا توشہ بنا رہے ہیں، خدا کے دربار میں بھی سرخرو ہوں گے۔ ہمیشہ نیکی کے کام اور اچھے راستے چلانے پر لوگ جلدی توجہ نہیں دیتے، بُرے کام میں جلدی آتے ہیں لیکن فتح اور اجر اچھے کام میں خواہ دیر سے ملے ملتا ہے۔ اس لیے آپ کسی قسم کی گھبراہٹ کو اپنے نزدیک نہ لائیے، آپ ایک بچہ کی مانند نڈر اور پاک دل رہیں پھر آپ کی خدا مدد کرے گا، انسان اپنی انسانیت پر پھر آجاوے گا۔

دعا گو ....

جماعت اسلامی اور علماء کرام!

سوال نمبر (۲)

"میں جماعت اسلامی سے متاثر ہوں، اور دو سال سے باقاعدہ اس کی کتابوں کا مطالعہ

کر رہا ہوں۔ درخواست یہ ہے کہ آنجناب بذریعہ " زندگی " موجودہ علماء دین کو مخاطب فرمائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمیں تمام کام آپ ہی پر نہ ڈال دینے چاہییں، بلکہ ہمیں اپنی ذمہ داری بھی محسوس کرنی چاہیے۔ لیکن یہ کام ایسا ہے کہ میں اس کو اچھی طرح انجام نہیں دے سکتا ورنہ میرا ارادہ تھا کہ میں علماء کو بعض امور کی طرف متوجہ کروں۔ مثلاً علماء دین وعظ و نصیحت کے ذریعہ جو اسلام پیش کرتے ہیں وہ محض جزوی اسلام ہے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام ایک جامع دین ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ اس کی طرف ان کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

موجودہ علماء کرام کے مانند، مشائخ عظام بھی دنیا میں اسلام کا کوئی مقصد بتائے بغیر، چند اشخاص کو بغیر کسی ذمہ داری کے ٹریننگ دیتے رہتے ہیں، برائے مہربانی مسلمانوں کے مذکورہ بالا دونوں رہنما طبقوں کو خطاب فرمایئے۔

میں جماعت اسلامی کا اس لیے بہت مشکور ہوں کہ اس نے مجھے اشتراکی خیالات سے ہٹایا میں اسلام کی علمی و عملی اقتصادیات سے ناواقفیت کی بنا پر اشتراکیت کی طرف جھک پڑا تھا۔ خدا تعالےٰ کا بڑا فضل ہوا کہ مجھے اپنے مذہب ہی میں سب کچھ مل گیا۔

والسلام

جواب :-

آپ کا یہ جذبہ بہت قابل قدر ہے کہ علماء اور مشائخ کو ان امور کی طرف توجہ دلائی جائے جن کا آپ نے اپنے خط میں تذکرہ فرمایا ہے۔ ہم بھی اس ضرورت کا احساس رکھتے ہیں اور آپ کے توجہ دلانے کے پہلے ہی سے کچھ نہ کچھ اس سلسلے میں کرتے ہی رہتے ہیں، نہ صرف رسالہ " زندگی " کے ذریعہ بلکہ خط و کتابت اور ملاقات وغیرہ کے ذریعہ بھی، لیکن ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ اظہار کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت تک ہماری کوششیں ۔۔۔ اکابر علماء کی حد تک جن کی طرف لوگوں کی عام طور سے نگاہیں اٹھتی ہیں ۔۔۔ زیادہ تر بے سود ثابت ہوئی ہیں۔ وہ جن کاموں میں مشغول ہیں، ان کی اہمیت کا اتنا گہرا احساس ان پر چھایا ہوا ہے کہ وہ ان کے ماسوا کسی اور کام کو ضروری ہی نہیں سمجھتے، یا ضروری سمجھتے ہیں تو ہماری طرف سے چھوٹی چھوٹی بدگمانیاں جو زیادہ تر ناواقفیت پر مبنی ہیں، ان کے لیے روک بن جاتی ہیں، اس لیے وہ ہم سے دور ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ایسا بھی نہیں کرتے کہ اگر وہ ہمارا ساتھ نہ دے سکیں تو

جو کام ان کو کرنا ہے اور جس کی اہمیت و صداقت سے خود ان کو علانیہ انکار کرنے کی جرأت نہیں ہے، اسی کو از خود بغیر ہماری شرکت کے انجام دیں۔

ان کے اس مایوس کن رویہ سے بہر حال ہمیں رنج ہوتا ہے، لیکن ہم ابھی تک مایوس نہیں ہیں۔ اپنے ذرائع جہاں تک ساتھ دے سکتے ہیں ہم ان کو ان کی اصل ذمہ داریوں کی طرف ان شاء اللہ برابر توجہ دلاتے رہیں گے، یہ نہ صرف یہ کہ ہمارا دینی فریضہ ہے بلکہ اس میں ہماری دعوتی غرض بھی ہے، یعنی ہم چاہتے ہیں کہ وہ آگے بڑھ کر اس کام کو سنبھالیں جو ہمارے پیش نظر ہے۔ اور ہم سے زیادہ بہتر صلاحیت و قابلیت کے ساتھ انجام دیں، لیکن اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرات علماء کرام کو متوجہ کرنے کے لیے ہماری یہ کوششیں ہی کافی نہیں ہو سکتیں، بلکہ اس کے لیے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں میں اس دعوت کے کام کو زیادہ عام اور مقبول بنایا جائے۔ یہ کام کا بہت وسیع میدان ہے۔

موجودہ زمانہ اپنی بہت سی خصوصیات میں گزشتہ زمانوں سے مختلف ہے۔ اب اکابر اور قائدین کو کسی امر کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ جو لوگ ان کے زیر اثر ہوں پہلے ان میں تبدیلی پیدا کی جائے، وہ زمانہ اور تھا جب اکابر اپنے اتباع کے آگے آگے چلتے تھے، اب ان کو بہت سے معاملات میں اپنے اتباع کا رُخ دیکھنا پڑتا ہے۔

آپ کی یہ بات آپ کی دانش مندی کی دلیل ہے کہ آپ خود علماء و مشائخ میں دعوت پیش کرنے سے اجتناب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان سے بات چیت کے لیے ہر شخص موزوں نہیں ہو سکتا۔

یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھنے کے بعد آپ اشتراکیت سے تائب ہو چکے ہیں۔ حقیقتاً یہ اللہ کا بڑا فضل ہے، لیکن آپ کو شاید یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ ہمارے بہت سے علماء کرام کو تو یہ پسند ہے کہ مسلمان اشتراکی بن جائیں کیوں کہ وہ ابھی تک یہ سمجھتے ہی نہیں ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت میں کوئی تضاد ہو سکتا ہے، لیکن ان کو یہ گوارا نہیں کہ کوئی شخص جماعت اسلامی کی دعوت کا کوئی معمولی اثر بھی قبول کرے، کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق اس سے ان کی مقلدیت یا غیر مقلدیت متاثر ہو جاتی ہے اور یہ ان کے نزدیک اشتراکی الحاد سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

انتخابی مسلک کی توضیح

سوال نمبر (۳)

حالیہ مارچ کے "زندگی" میں مہاسبھا کی فتنہ انگیزیوں کی وجہ اد نکارناتھ شاستری کے

بیان کی روشنی میں جو بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ "مہاسبھا، غیرہ مسلمانوں کے وجود کو اس لیے برداشت نہیں کرتی کہ ان کی موجودگی میں یہ الیکشن نہیں جیت سکتی، اگر یہ بھاگ جائیں تو مہاسبھا کانگرس سے حکومت چھین سکتی ہے۔

آپ فرماتے ہیں مسلمان الکشن سے دست کش ہو جائیں، گو یا مسلمان کا ہند سے ہجرت کر جانا یا الیکشن سے دست کش ہو جانا ایک ہی معنی رکھتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بخیال مہاسبھا کانگرس کو جتانے والا مسلمان ہے، وہ بھاگ جائے یا الیکشن سے علحدہ ہو جائے تو مہاسبھا الیکشن جیت سکتی ہے، اور مہاسبھا کے الیکشن جیتنے کے معنے یہ ہوں گے کہ پھر وہ برسر اقتدار آکر مسلمانوں کا خوب اچھی طرح کھلم کھلا قلع قمع کرے جیسا کہ اس کا ایمان ہے اور جس کا وہ اعلان کر رہی ہے۔

مہربانی فرماکر اس چیز پر روشنی ڈالیے کہ دو نقصانوں کی صورت میں کم نقصان کو گوارا کیا جائے یا زیادہ کو۔ مہاسبھا، سنگھ وغیرہ کی جیت مسلمان کا بڑا نقصان معلوم ہوتا ہے۔ جہاں بظاہر لفظ جمہوریت کا پردہ بھی ختم ہو جائے گا اور جو برائے نام دنیا کی لاج یا دکھاوے کے لیے مسلمان کی بربادی پر جھوٹا سچا اظہار افسوس یا ظاہری مرہم پٹی کر دی جاتی ہے وہ بھی باقی نہ رہے گی اور مسلمان کا کھلم کھلا شکار عین ثواب ہوگا، قانوناً بھی، مذہباً بھی۔

یہ مضمون پر نہ کوئی اعتراض ہے نہ خامی کا اظہار، بلکہ ایک نہایت پر خلوص خدشہ ہے جس کا اظہار کرنا میں نے ضروری تصور کیا۔ امید کہ اس معاملہ کے عواقب و نتائج پر اظہار خیال فرماکر مطمئن کریں گے۔

" والسلام "

جواب :-

گرامی نامہ موصول ہوا۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ زندگی کا بغور و فکر مطالعہ فرماتے ہیں اور جن باتوں کے سلسلے میں کوئی شبہ یا خدشہ لاحق ہوتا ہے اس کو لکھ کر دور فرمانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، یہ بڑی اچھی بات ہے ورنہ کچھ لوگ شبہات کی پرورش دل میں کرتے رہتے ہیں اور ان کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے، یہ بہت بڑا مرض ہے، جو بدقسمتی سے لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے، بالخصوص ایسے مسائل کے ضمن میں تو یہ بات بہت زیادہ غلط ہے جن کا تعلق براہ راست مسلمانوں کی موت و زیست سے ہو۔

آپ نے جس شبہ کا اظہار فرمایا ہے، اس کا جواب آپ کو اگلے ماہ کے اشارات میں مل جائے گا، ماہ مارچ کے اشارات میں جو بحث اٹھائی گئی ہے، اس پرچہ میں مکمل نہیں ہو سکی ہے، اس کا ایک معتد بہ حصہ جگہ کی کمی کی وجہ

سے اگلے ماہ کے لیے اٹھا رکھا گیا تھا، جواب شائع ہو رہا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اس پوری بحث کے پڑھ لینے کے بعد آپ کا شبہ خود بخود رفع ہو جائے گا۔

ہندو مہاسبھا کی کامیابی سے جو نقصانات پہونچ سکتے ہیں اور جن کی طرف آپ نے اپنے خط میں اشارہ فرمایا ہے، ان کے ہم منکر نہیں ہیں، البتہ ہمارا یہ مستقل خیال ہے کہ الیکشن میں کسی پارٹی کی کامیابی یا ناکامیابی کا دارو مدار مسلمانوں کی شرکت یا عدم شرکت پر نہیں ہے، اس کے وجوہ پہلے بھی بیان کیے جا چکے ہیں اور اس ماہ کے اشارات میں بھی مستقل بحث آرہی ہے۔

پنڈت اونکار ناتھ شاستری کے مضمون کے حوالہ سے جو باتیں لکھی گئی ہیں، ان کا منشا یہ نہیں ہے کہ ہمارے نزدیک ہجرت اور الیکشن سے علیحدگی دونوں ہم معنی ہیں، ہندو مہاسبھا کے عزائم وغیرہ کا ذکر محض یہ ثابت کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ ہندو مہاسبھا کی دشمنی کی ایک اہم بنیاد یہ ہے کہ مسلمان الیکشن میں ان کا ساتھ دینے کے بجائے ان کے مخالف پارٹیوں کا ساتھ دیں گے۔ اس لیے اگر اسے یہ اطمینان ہو جائے کہ مسلمانوں کا ووٹ ان کی مخالفت میں، استعمال نہیں ہوگا تو اس کی دشمنی کے جذبہ میں بہت کچھ کمی واقع ہو سکتی ہے۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس وقت ہندو مہاسبھا ہی مسلمانوں کی علانیہ دشمنی میں سب سے پیش پیش ہے، اور الکشن کے زمانے میں اگر مسلمانوں کی طرف سے اس کی یہ بے اطمینانی بدستور باقی رہی تو اس کے ہاتھوں مسلمانوں کو خاصہ نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔

طلبہ اور نماز جمعہ

سوال نمبر (۴)

درج ذیل مسائل میں آپ کی رہ نمائی چاہتا ہوں:-

(۱) مڈیکل کالج میں آخر سال میں تعلیم پا رہا ہوں، سالانہ امتحان شروع ہونے والا ہے، گذشتہ جمعہ سے علم جراحی کا عملی کلاس شروع ہو گیا ہے، ہفتہ میں جمعہ اور سنیچر دو دن کلاس ہوں گے جن میں اس علم کے متعلق ضروری باتیں بتلا دی جائیں گی، امتحان کے پیش نظر اس کلاس کی حاضری میرے لیے ضروری ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ۱۲ بجے سے ۲ بجے کلاس کا وقت رکھا گیا ہے، جس سے جمعہ کی نماز ادا کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔

(Class routine) میں تبدیلی کے لیے پرنسپل صاحب سے ملنا فضول ہے وجہ اس کی یہ ہے

کہ میرے ساتھیوں میں کوئی بھی نماز کا باقاعدہ پابند نہیں ہے۔ اس لیے وہ لوگ تیار نہیں ہیں کہ اس بات کے لیے پرنسپل صاحب سے ملا جائے۔ جب تک کہ مسلم طلباء کی طرف سے (Backing) نہ ہو اس وقت تک (Routine) کی تبدیلی کے لیے تنہا کوشش کرنا فضول ہے، ماسوا اس کے (M.C.G.C.) کی طرف سے یہ (Routine) نافذ کیا گیا ہے، جو تین ماہ کے لیے ناقابلِ تغیر ہے، عجب شش و پنج میں مبتلا ہوں کہ کیا کروں؟ اگر کلاس جاتا ہوں تو جمعہ کی نماز چھوٹ جاتی ہے۔ یا اگر جمعہ کی نماز ادا کرتا ہوں تو کلاس چھوٹ جاتی ہے۔ براہِ کرم یہ بتائیں کہ مجھے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟

(۲) اب تک غیر شادی شدہ ہوں۔ چاہتا ہوں کہ مجھے ایسی رفیقۂ حیات ملے جو صحیح معنوں میں اسلام کی روح کو سمجھ چکی ہو اور حلقۂ نسواں میں تحریکِ اسلامی کا کام کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو۔ لیکن اپنے دیار میں مجھے ایسی لڑکیاں نہیں مل سکتی ہیں جو اسلامی سیرت کی حامل ہوں، ایک ہی صورت ممکن ہے کہ باہر شادی کروں، لیکن اس سلسلہ میں دو اہم باتیں قابلِ غور ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ والدہ صاحبہ باہر شادی کرنے کی اجازت بخوشی نہ دیں گی۔ اگر ان پر زور ڈالا جائے تو بادلِ ناخواستہ اجازت دے سکتی ہیں، میں نہیں چاہتا کہ والدہ صاحبہ کی مرضی کے خلاف شادی کروں۔ اسی طرح وہ بھی نہیں چاہتیں کہ میری مرضی کے خلاف شادی ہو۔ ان حالات کے تحت کیا میں والدہ صاحبہ پر دباؤ ڈال سکتا ہوں؟ اگر دباؤ ڈال سکتا ہوں تو کس حد تک؟

دوسرا قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ میں اس سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہوں، جہاں کے لوگوں کی زندگی زیادہ تر غیر اسلامی ہے۔ ہماری سوسائٹی میں بہت سی خرابیاں اور عملی کوتاہیاں ہیں، جن کے تحت یہ سوچتا ہوں کہ اگر کسی اچھی سوسائٹی کی لڑکی کو اپنے ہاں کی غیر اسلامی سوسائٹی میں لاؤں تو گویا اس لڑکی پر ظلم ہوگا۔ اس لیے کبھی یہ سوچنے لگتا ہوں کہ اپنے اس ارادے کو ترک کردوں، اس سلسلہ میں بھی آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

جواب:

(۱) ہمارے نزدیک نمازِ جمعہ کی اہمیت ہر دنیاوی کام سے زیادہ ہے، اس لیے ہم آپ کو یہ کسی طرح مشورہ نہیں دے سکتے کہ آپ تعلیم کی خاطر نمازِ جمعہ ترک کردیں، سب سے پہلے آپ اس بات کے لیے ہر ممکن کوشش

کریں کہ آپ کے تعلیمی اوقات میں کچھ تبدیلی ہو جائے اور اس کے لیے مسلم طلبہ کو اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کریں۔ ہر چند یہ بات افسوس ناک ہے کہ وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی نماز بالخصوص نماز جمعہ کی کوئی اہمیت نہیں محسوس کرتے اور عملاً اس کے تارک ہیں اور وہ اسی لیے جیسا کہ آپ کا خیال ہے وہ شاید ہی آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو سکیں، لیکن اوّل تو یہ آپ کا دینی فریضہ ہے کہ ان کو ان کے فرض کی یاد دہانی کریں، دوسرے یہ ناممکن نہیں ہے کہ وہ آپ کی تحریض کے بعد اپنے ادائے فرض پر آمادہ ہو سکیں۔ بہت سے موجودہ ماحول وغیرہ کے زیر اثر احکام دین کے سلسلہ میں بہت غفلت و کوتاہی سے کام لیتے ہیں، لیکن یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ اگر ان کو حکمت و خلوص کے ساتھ ان کی ادائگی پر آمادہ کیا جائے اور اس کے سلسلہ میں ان کے سامنے کوئی اچھا نمونہ پیش کیا جائے تو وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اسی کے مطابق اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ بدقسمتی سے وہ آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ ہوں تو آپ تنہا اپنے پرنسپل صاحب سے ملاقات کریں اور اپنی پریشانیوں کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان پر واضح کرنے کی کوشش کریں ممکن ہے وہ آپ کی مشکل کا کوئی حل نکال سکیں۔ اور آپ یہ نہ سمجھیں کہ کوئی بات محض پیش کرنے والوں کی کثرت ہی کی قوت پر سنوائی جا سکتی ہے۔ معقول بات اور جائز خواہش بجائے خود اپنے اندر ایک بڑی زبردست قوت رکھتی ہے، خواہ اس کے پیش کرنے والے ایک یا چند ہی کیوں نہ ہوں، بہرحال اگر پرنسپل صاحب سے آپ کی ملاقات مفید مقصد ہو سکے تو بڑی اچھی بات ہے، ورنہ بدرجہ مجبوری یہ بھی گوارا کیا جا سکتا ہے کہ شہر کی کسی ایسی مسجد میں آپ نماز جمعہ ادا کریں، جہاں آپ اپنے کلاس کا کم سے کم نقصان اٹھائے بغیر ادا کر سکتے ہوں، لیکن اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ آپ نماز جمعہ وقت پر ادا کریں اور تعلیمی نقصان اس کی خاطر گوارا کر لیں خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) شادی کے سلسلے میں آپ کو یہ حق ضرور حاصل ہے کہ آپ کسی دین دار عورت کو رفیقۂ حیات بنانے کی خاطر اپنے خاندان و دیار سے الگ کسی اور جگہ شادی کر لیں، لیکن اگر آپ کو اپنے ہی ماحول میں آئندہ زندگی گذارنی ہے تو یقیناً اس سے طرح طرح کی گھریلو دشواریاں پیش آئیں گی جو آپ کے لیے زحمتوں کا باعث ثابت ہوں گی۔ اس لیے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی والدہ صاحبہ کے حسب خواہش اپنے ہی خاندان یا برادری میں کسی صالح اور ذہین لڑکی کے ساتھ شادی کریں۔ اور پھر رفتہ رفتہ اپنی تعلیم و تربیت سے اس کو اپنا حقیقی معاون اور رفیقہ بنانے کی کوشش کریں۔

(ابواللیث)

قرعہ اندازی

سوال نمبر (۵)

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ (سورۃ مائدہ، آیت ۳)

"تفہیم القرآن (از مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی) میں اس کا ترجمہ یوں تحریر ہے :-

"نیز یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔"

اس کی تشریح میں مولانا فرماتے ہیں" یہ جامع ہدایت ہے، پانسوں کی تعریف میں قرعہ اندازی کے وہ تمام طریقے آجاتے ہیں جو محض بخت و اتفاق پر مبنی ہوں، حتیٰ کہ گھوڑ دوڑ، لاٹری اور فال و رمل بھی اسی حکم میں داخل ہیں۔ پھر "قسمت معلوم کرنے" کا مفہوم بھی وسیع ہے، کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کسی مال کی تقسیم مطلوب ہو، یا لین دین کے معاملات ہوں، ان سب امور میں مذکورہ بالا طریقوں سے فیصلہ کرنا حرام ہے۔"

اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ قرعہ اندازی بہرصورت ناجائز ہے حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ سفر میں جاتے وقت ازواج مطہرات میں سے کسی ایک کا انتخاب بذریعہ قرعہ کیا کرتے تھے۔ نیز جہاں تک مجھے معلوم ہے خود مولانا موصوف کا طرز عمل بھی قرعہ اندازی کے موافق ہے تو کیا مولانا نے سہواً ایسا لکھ دیا ہے، یا مندرجہ بالا عبارت سے کچھ اور مفہوم نکلتا ہے۔

جواب :-

مناسب تو یہ تھا کہ آپ اس سلسلہ میں خود مولانا ہی کی طرف رجوع فرماتے، کیونکہ اپنے پیش کردہ خیالات کی صحیح توجیہہ وہی کر سکتے تھے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس آیت سے قرعہ اندازی کی معروف صورتیں ناجائز نہیں ٹھہرتیں اور نہ اس کا قرعہ اندازی کے مسئلہ کوئی تعلق ہے، الا آنکہ اس کی کچھ مخصوص صورتیں فرض کی جائیں "استقسام بالازلام" کا حرام ہونا اس بنیاد پر نہیں ہے کہ اس میں ایک بات کا فیصلہ اتفاق محض کی بنا پر ہوتا ہے بلکہ اس کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے اندر شرک یا افتراء علی اللہ پایا جاتا ہے۔

اَزْلام ان تیروں کو کہتے ہیں جن کو زمانہ جاہلیت میں مشرکین عرب بطور "استخارہ" استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ تین تیر ہوتے تھے، ایک پر "اَمَرَنِی رَبِّیْ" (میرے رب کا حکم ہے) لکھا ہوتا، دوسرے پر "نَھَانِیْ رَبِّیْ" (میرا رب منع کر رہا ہے)، اور تیسرا خالی ہوتا۔ یہ تینوں تیر کسی چھوٹے جیبی چیز میں رکھے ہوتے جب کسی شخص کو کوئی اہم کام کرنا ہوتا تو وہ ان کے ذریعہ "استخارہ کرتا"، اس کی شکل یہ ہوتی کہ وہ ہاتھ ڈال کر جھولے میں سے ایک تیر نکالتا، اگر وہ "اَمَرَنِیْ رَبِّیْ" والا تیر ہوتا تو اس کا اس کے نزدیک مطلب یہ ہوتا کہ میرا رب اس کام کی اجازت دے رہا ہے اور مجھے یہ کام کرنا چاہیے، اور اگر "نَھَانِیْ رَبِّیْ" والا تیر نکلتا تو سمجھتا کہ ممانعت ہو رہی ہے اور وہ اس کام سے رک جاتا۔ اگر خالی تیر نکلتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ رب کا کوئی حکم صادر نہیں ہوا، اس لیے پھر سے تیر نکالتا اور جب "امر و نہی" کے تیروں میں سے کوئی ایک نکل آتا تو اس کے نوشتہ کے مطابق عمل کرتا۔

اب غور فرمایئے، اگر "رب" سے مراد ان کا کوئی بت ہے، جیسا کہ بعض روایات سے معلوم بھی ہوتا ہے، تو یہ کھلا ہوا شرک ہے، اور اگر "رب" سے ان کی مراد ذات باری تعالیٰ ہوتی تو یہ اللہ پر علانیہ افترا ہے۔ اگر امر دینے والا تیر نکل آتا اور ایک شخص اس کو اذن خدا سمجھ بیٹھتا تو یہ اس کے وہم کی خلاقی ہوتی نہ کہ واقعۃً اذن خدا۔

اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ استقسام بالازلام (تیروں کے ذریعہ قسمت معلوم کرنا) کیوں حرام ہے اور فسق قرار دیے جانے کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ یہ حرمت محض اس بنا پر نہیں ہے کہ اس میں اتفاق محض کو حکم تسلیم کر لیا جاتا ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ اس میں شرک صریح یا افترا علی اللہ پایا جاتا ہے۔ پس اس آیت کے تحت قسمت معلوم کرنے کے وہ طریقے تو ضرور حرام ہیں جن کو اتفاق محض کے بجائے اشارۂ غیبی اور حکم الٰہی کا ترجمان گمان کیا جائے، مگر جن طریقوں کے اندر اس قسم کا کوئی عقیدہ یا وہم موجود نہ ہو، اور اس طرح کے فیصلوں کو اشارۂ غیبی کا نتیجہ نہ سمجھا جائے وہ اس حکم حرمت سے باہر ہے۔ قرعہ اندازی کی عام صورتیں اسی طرز کی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ان کے اندر بھی اسی قسم کا وہم کا دخل ہو تو وہ بھی حرام ہو جائیں گی۔ غالباً مولانا نے اسی قسم کی قرعہ اندازیوں کی بابت تحریر فرمایا ہوگا۔

قصر نماز

سوال نمبر (۶)

نماز میں قصر کرنے کا حکم قرآن کریم کی جس آیت میں ملتا ہے وہ یہ ہے:-

وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ

إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ اس کے معانی میں خصوصاً الفاظ "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ" سے صرف امر اختیاری پایا جاتا ہے نہ کہ وجوب۔ قرآن میں لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ یا لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تقریباً بیس جگہ پر آیا ہے اور ان میں سے ہر موقعہ پر شان جواز واختیار ہی پائی جاتی ہے کسی موقعہ پر وجوب نہیں پایا جاتا۔ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ میں بھی فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ کے الفاظ وجوب سعی صفا و مروہ کے متعلق نہیں ہیں بلکہ یہ وجوب پیشتر سے ہی موجود تھا، اور جیسا کہ شان نزول میں پایا جاتا ہے، یہ آیت اس شبہ کے ازالہ کے لیے نازل ہوئی تھی کہ چونکہ سعی صفا و مروہ عہد جاہلیت میں بھی کی جاتی تھی اور وہاں پر دو بت نصب تھے اس لیے صحابہ کو گمان ہوا کہ کہیں یہ سعی اُن بتوں کے اعزاز میں تو نہیں تھی اور اس طرح وہ مرتکب جرم شرک کے ہو رہے ہوں۔ اگر یہ کہا جاوے کہ آیہ قصر نماز میں بھی اسی قسم کے کسی شبہ کا ازالہ مقصود تھا تو یہ صرف اُسی صورت میں ہو سکتا تھا جب کہ قصر اس آیہ کے نزول سے پیشتر کیا جاتا رہا ہو، اور اس میں کوئی شبہ کمی ثواب وغیرہ کا پیدا ہوتا ہو جس کے ازالہ کے لیے یہ آیہ نازل ہوئی۔ لیکن چونکہ قصر کی ابتداء صرف اسی آیۃ کے نزول سے ہوتی ہے اس لیے آیہ سعی صفا و مروہ کی مثال اس آیہ پر نہیں دی جا سکتی۔

طبیعت یہ چاہتی ہے کہ ائمہ متقدمین نے جن دلائل کی بنا پر قصر کو واجب قرار دیا ہے وہ قرآن کریم کے سیاق و سباق اور معانی کی روشنی میں اطمینان قلب کے لیے بیان فرمائے جاویں۔ کہا جاتا ہے کہ سرکار دو عالم نے صلی اللہ علیہ وسلم اس آیۃ کے نزول کے بعد سفر میں ہمیشہ قصر فرمایا، اس لحاظ سے قصر کو سنت موکدہ کا درجہ تو دیا جا سکتا ہے، لیکن واجب کا نہیں۔

جواب:۔

جن علماء نے قصر نماز کو واجب کہا ہے، انہوں نے اس آیت کی بنا پر نہیں کہا ہے، بلکہ ان کا استدلال حدیث سے ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کا مسلک بہت مضبوط ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے وجوب اور واجب کی اصطلاح سمجھ لینی چاہیے۔ واجب فقہ حنفی کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، جو دوسرے مذاہب میں نہیں پائی جاتی۔ واجب کا مقام ان کے یہاں فرض سے

کم از سنت مؤکدہ سے کچھ زیادہ ہے۔ فرضیت کے اثبات کے لیے تو قرآن کی سند ان کے اصول کے لحاظ سے ضروری ہے مگر وجوب کے لیے نہیں، بلکہ ان کے لیے احادیث صحیحہ بھی کافی ہیں۔ البتہ دوسرے مذاہب کے اندر واجب اور فرض میں کوئی فرق نہیں ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں ہمیشہ قصر کیا کرتے تھے۔ پھر ایک حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کے سامنے قصر کی عدم ضرورت کا اظہار کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ "یہ اللہ کا صدقہ ہے اسے قبول کرو، (صدقۃ تصدق اللہ بہا علیکم فاقبلوا) اب ایک طرف تو آپؐ کا اور عام صحابہؓ کا یہ تعامل ہے جو اسے سنت مؤکدہ قرار دینے کے لیے کافی ہے، دوسری طرف آپ کا حکم "فاقبلوا" بھی جو قصر کی اہمیت کو اور زیادہ ابھار کر کے وجوب تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث سامنے آتی ہے:

فرضت الصلوٰۃ رکعتین فی الحضر	پہلے نماز دو ہی رکعتیں فرض تھی، حضر میں بھی
والسفر فاقرت صلوٰۃ السفر	اور سفر میں بھی، پھر سفر کی نماز تو علی حالہ قائم رکھی
وزید صلوٰۃ الحضر (موطا)	گئی مگر حضر کی نماز بڑھا دی گئی۔

یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے مگر راوی کے ساتھ ساتھ ایک صحابیہ کا مرسل ہے اور صحابیہ بھی حضرت عائشہ جیسی فقیہہ صحابیہ، پس اس حدیث سے تو ثابت ہوتا ہے کہ سفر میں چار رکعتیں مشروع اور فرض ہیں ہی نہیں بلکہ دو ہی رکعتیں فرض ہیں، اور جب ایسا ہے تو قصر کرنا ہی ضروری ہے۔

رہی یہ بات کہ آیت مذکورہ کے الفاظ "لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ" سے قصر کا صرف جواز ثابت ہوتا ہے، تو فی الواقع اس آیت کا تعلق مسئلہ زیر بحث (قصر رکعات نماز) سے ہے ہی نہیں، نہ کہ اس خیال کی کوئی اہمیت ہے کہ قصر کی ابتداء اسی آیت کے نزول سے ہوئی ہے۔ اس آیت میں جس قصر کا ذکر ہے وہ ارکان و آداب نماز کا قصر ہے نہ کہ قصر رکعات کا۔ قصر رکعات کا مطلب یہ ہے کہ چار رکعتی نمازوں کو دو ہی رکعت سے ادا کیا جائے، اور قصر ارکان و آداب کا مدعا یہ ہے کہ ان کو ان کی کامل صورت میں ادا نہ کیا جائے، بلکہ ان میں تخفیف کر دی جائے، مثلاً رکوع اور سجدہ صرف اشارتاً کر لیے جائیں، قیام کے بجائے قعود پر اکتفا کر لیا جائے، ایک جگہ نماز ختم ہونے تک [illegible] رفتار [illegible] چلتے رہنے کی اجازت [illegible] ضرورت [illegible] حرکت [illegible] ہو جائے [illegible] سے علمائے [illegible] کا یہ خیال نہیں ہے کہ آیت میں قصر ارکان کا ذکر ہے، لیکن [illegible] آیت کے الفاظ اور اس کا سیاق و سباق [illegible] خیال کا [illegible]

لیے ہیں۔ آیت کے الفاظ پر غور کیجئے۔ اس آیت میں دو شرطیں یا قیدیں ہیں، ایک تو قید سفر اور دوسری قید خوف۔ عام طور سے لوگوں نے قید سفر کو قید اصلی اور قید خوف کو اتفاقی مانا ہے، مگر صورت حال اس کے برعکس ہے، اور یہ آیت حالت خوف میں پڑھی جانے والی نماز کا ذکر کر رہی ہے نہ کہ حالت سفر میں پڑھی جانے والی نماز کا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی

وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ ـ	اور اے نبی جب تم بنفس خود ان میں موجود ہو اور انہیں نماز پڑھاؤ تو چاہیے کہ ان کا ایک حصہ تمہارے پیچھے کھڑا ہو جائے الخ

کے لفظوں میں اس نماز خوف کا طریقہ بھی بیان کیا جا رہا ہے۔ اس دوسری آیت کو سبھی صلوٰۃ خوف کی آیت مانتے ہیں، دراں حالیکہ اس میں لفظ خوف کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں۔ اس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ صلوٰۃ خوف کا سلسلہ بیان یہیں سے نہیں شروع ہوا ہے بلکہ اوپر والی آیت سے چلا آ رہا ہے، جس میں "اِنْ خِفْتُمْ" کے الفاظ موجود ہیں۔ بعض تابعین اور صحابہ نے بھی ایسا ہی سمجھا ہے، حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا گیا کیا بات ہے کہ ہم قرآن میں نماز حضر اور نماز خوف کی بابت تو ہدایات پاتے ہیں مگر نماز سفر سے پورا قرآن خاموش ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا:-

یا ابن اخی ان اللہ بعث الینا محمدا صلی اللہ علیہ وسلم ولا نعلم شیئا فانما نفعل کما رأیناہ یفعل (موطا)	برادر زادے! اللہ نے ہمارے پاس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم و رہنما بنا کر بھیجا تھا جب کہ ہمیں کچھ نہ معلوم تھا، پس ہم تو وہی کچھ کریں گے جیسے ہم نے آپ کو کرتے دیکھا ہے۔

بقول حضرت شاہ ولی اللہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا یہ ارشاد کھلی شہادت ہے اس بات کی کہ ان کے نزدیک آیت وَاِذَا ضَرَبْتُمْ الخ صلوٰۃ خوف سے متعلق ہے نہ کہ صلوٰۃ سفر سے (اور خود حضرت شاہ صاحب کا رجحان بھی اسی طرف ہے) اور اس میں قید اتفاقی، حالت سفر ہے نہ کہ حالت خوف۔ قرآن کی اتفاقی قیود ایک ضابطے کے تحت آئی ہیں، ایسا نہیں ہوتا کہ جب اور جہاں چاہا قید اتفاقی کا اضافہ کر دیا۔ قرآن میں اتفاقی قیدیں بالعموم دو مواقع پر اور دو اصولوں کے تحت آئی ہیں، ایک تو وہ ہوتا ہے جہاں کسی چیز کا انتہائی گھناؤنا پن نمایاں کرنا ہو، جیسے سورہ نور کی آیت وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا میں ارادہ عفت کی قید [illegible] کرانے، شناعت و ناشائستگی نگاہوں کے سامنے مشکل ہو جائے، دوسرا [illegible]

کے ساتھ کسی دوسری شے کے بالعموم موجود اور مشہور ہونے کا اظہار مدنظر ہو، جیسے وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُم میں سوتیلی بچی کے زیر پرورش ہونے کی قید۔ اب اگر آپ غور فرمائیں تو پائیں گے کہ آیت زیر بحث میں جو قید اتفاقی ہے وہ اسی دوسری قسم کی ہے۔ پھر جب آپ غور کرتے ہوئے اس سوال پر پہنچیں گے کہ ان دو قیدوں میں سے، جو آیت میں موجود ہیں، کون سی اصلی ہے اور کون سی اتفاقی، تو آپ کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ ان دونوں حالتوں (سفر اور خوف) میں سے کون سی حالت ایسی ہے جو دوسری حالت کے ساتھ بالعموم پیش آیا کرتی ہے؟ اس سوال کا جواب عادت عام آپ کو یہی دے گی کہ سفر کے ساتھ خوف کی حالت اس قدر عموم کے ساتھ نہیں پیش آیا کرتی جس قدر کہ حالت خوف (یعنی حالت جنگ) کے ساتھ سفر کی حالت۔ آدمی ہزاروں سفر اگر حالت امن میں اور غیر جنگی حالات میں کرتا ہے تو کہیں دو چار سفر حالت خوف میں اور جنگی کیفیات میں کرتا ہے، جب کہ جنگ کے ساتھ سفر اور گھر بار سے دوری کچھ لازم سی ہوتی ہے۔ اس لیے ان دونوں قیدوں میں سے اگر کسی قید کو اتفاقی قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ قید سفر ہی ہو سکتی ہے نہ کہ قید خوف، قید خوف تو قید اصلی ہوگی۔

پھر ایک اور پہلو سے دیکھیے، اگر یہ آیت واقعۃً قصر رکعات ہی سے متعلق ہے تو غور کرنے کی بات ہے کہ اس قصر سے فتنۂ کفار کے خوف کا ازالہ کیسے ہوگا؟ دشمن اگر چار رکعتیں پڑھنے میں اچانک ٹوٹ پڑ سکتا ہے تو دو رکعتوں کے پڑھنے میں بھی وہ ایسا کر سکتا ہے، اگر یہ دو رکعتیں اپنی عام شکل میں پورے ارکان و آداب کے ساتھ پڑھی جائیں۔ خوف فتنہ کا ازالہ تو صرف قصر ارکان و آداب ہی سے ہو سکتا ہے (نہ کہ قصر رکعات سے) جس کے مختلف مدارج ہیں۔ جتنا سخت اور شدید خوف ہوگا اتنا ہی زیادہ قصر کیا جائے گا۔

قرآن نے ان مختلف مواقع خوف کے لیے مختلف صورتیں قصر کی بیان فرما دی ہیں، مثلاً اس آیت کے بعد ہی جو آیت ہے اس میں ادائے نماز کی جو شکل تجویز کی گئی ہے وہ ایسی حالت سے متعلق ہے جب دو فوجیں میدان جنگ میں آمنے سامنے موجود تو ہوں مگر بالفعل جنگ ہو نہ رہی ہو، لیکن جب جنگ کا ہنگامہ گرم ہو تو اس قصر میں مزید قصر کا حکم دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "اگر تمہیں لڑائی کا خوف لگا ہوا ہو تو پیدل یا سوار [illegible] پڑھی جائے" فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا

اب رہا قصر رکعات کا مسئلہ، تو اصل یہ ہے کہ جس طرح رکعتوں کی تعداد سنت سے ثابت ہے اور قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں، اسی طرح اس کا قصر بھی اسی سنت [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible] ہے [illegible] بھی کوئی ہدایت نہیں۔ البتہ ارکان نماز کا ذکر قرآن میں

(صدر الدین اصلاحی)

نماز اور جرمانہ

سوال نمبر (۸)

ایک دینی جماعت کے امیر (صدر) صاحب نے اپنی جماعت کے لوگوں کو یہ تلقین کی ہے
کہ اگر کسی وجہ سے تمہاری کوئی نماز جماعت سے چھوٹ جائے تو اس نماز کو پڑھتے وقت چار
رکعت نفل فرض جماعت سے نماز چھوٹ جانے کے بعد اور زائد پڑھ لیا کرو تاکہ،

اس خیال سے پھر تم جماعت سے کوتاہی نہ کرو۔ اور یہ کہ جب جماعت سے نماز چھوٹ گئی
تو اول تو تم ایک بہت بڑے ثواب سے محروم ہو گئے، اب جب کہ تم نے اس نماز کے بعد
چار رکعت نفل زائد پڑھ لیے ہوں تو اس ثواب کی کمی بھی پوری ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا "ہدایت امیر" میں وہ چار رکعت جو زائد پڑھی جائے گی، کیا اس کی طرح
سزا کی سی نہیں ہے اگر ہے تو کیا جائز ہے اور اگر جائز ہے تو کیا وجہ ہے کہ جماعت اسلامی
والے نقدی جرمانہ کی وہ جرمانہ جو وصول ہونے کے بعد کار خیر میں صرف کر دیے جائیں کیوں
مخالفت کرتے ہیں۔

جواب:۔

آپ اسلام کے بارے میں بنیادی طور پر یہ حقیقت سمجھ لیں کہ اس کے قبول و انکار کا انحصار سراسر
انسان کے اپنے فیصلہ اور اس کی آمادگی قلب پر ہے یعنی وہ جس چیز کو منوانا چاہتا ہے اس کے لیے اس کا
مطالبہ انسان کے ذاتی فیصلہ اور اختیار سے ہوتا ہے اور اسی طرح وہ جس چیز کے چھوڑنے کا تقاضا
کرتا ہے اس کے لیے بھی کسی خارجی دباؤ اور اثر سے مجبور ہونے کے بجائے خود اس کے اپنے احساس فرض کا ہونا
ضروری ہے۔

نماز باجماعت فوت ہو جانے میں سنت مؤکدہ یا واجب میں کوتاہی سرزد ہوتی ہے اور اس لیے بلاشبہ بڑے ثواب سے محرومی ہو جاتی ہے، لیکن اس پر اگر خود اس شخص کو اپنی کوتاہی کا ندامت انگیز احساس نہ ہو تو خواہ جلد بجا ہے عتاب بھی ڈبا ڈ ڈالا جائے اور کتنے ہی جرمانے لگا دیئے جائیں کچھ بھی کارگر نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ترک جماعت پر جرمانے وغیرہ عائد کرنے کو غیر مفید سمجھتے ہیں۔

رہ گیا کسی صاحب کا یہ فرمانا کہ ترک جماعت کی صورت میں چار رکعت نماز اور پڑھ لی جائے تاکہ آئندہ جماعت ترک کرنے کی کوتاہی نہ ہو، کوئی شرعی حکم کی حیثیت نہیں رکھتا۔ البتہ اگر کوئی شخص بطور خود اس طرح کا التزام کر لے، صرف اس لیے کہ اس کا نفس آئندہ سے ایسی کوتاہی کا ارتکاب نہ کر سکے تو غفلت نفس کے علاج کے طور پر ایسا کرنے کا مجاز ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے اگر کوئی شخص یہ طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس میں سزا اور جرمانہ کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے متعلق ایسا سمجھنا کہ یہ مشروع حکم ہے صحیح نہیں، اس لیے کہ کتاب و سنت میں اس طرح کا کوئی حکم موجود نہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی صحیح نہیں کہ ترک جماعت سے جو ثواب جاتا رہتا ہے اس چار رکعت نفل پڑھنے سے اس کی پوری ہو جائے گی۔ جماعت کی جو فضیلتیں ہیں اور اس کے جو فوائد ہیں وہ چار رکعت نفل پڑھنے سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نماز باجماعت اس نماز کے مقابلہ میں، ۲۷ گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے جو تنہا پڑھی جائے۔ پس اگر قیاس ہی سے کام لیا جائے تو اس حدیث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر نماز باجماعت چھوٹ جائے اس کا کھویا ہوا ثواب حاصل کرنے کے لیے وہ نماز ایک بار کی بجائے ۲۷ بار پڑھی جائے یعنی دو رکعت کے بجائے ۵۴ رکعت، یا تین کے بجائے ۸۱ رکعت اور چار کے بجائے ۱۰۸ رکعت پڑھنا چاہیے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ شریعت نے اس قسم کا کوئی حکم نہیں دیا ہے، اس لیے نماز وغیرہ اور دین کے معاملہ میں حساب کتاب سے کام لینے کے بجائے یہ رویہ اختیار کرنا چاہیے یعنی بھول چوک یا غفلت کی وجہ سے جماعت چھوٹ جائے تو اس پر حد درجہ ندامت کا اظہار کرانا اور آئندہ سے اصلاح حال کی طرف توجہ دلانا چاہیے اور بار بار یاد دلاتے رہنا چاہیے، ورنہ اگر لوگوں کو یہ باور کرا دیا گیا کہ چار رکعت نفل ثواب جماعت کا بدل بن جاتی ہے تو پابندی جماعت کا رہا سہا احساس بھی ختم ہو جائے گا، اور لوگ جماعت کی اب تک تھوڑی بہت جو اہمیت محسوس کرتے ہیں شاید وہ بھی ختم ہو جائے گی۔

(محمد ایوب اصلاحی)

تنقید و تبصرہ

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں — شائع کردہ :- مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد دکن۔

مرتبہ

سید اصغر علی عابدی

۲۸۰ صفحات ، قیمت تین روپے (سے)

اشتراکیت نے اپنے مقصود کے چہرہ پر پروپیگنڈہ کی اتنی نظر فریب چادر کو ڈال رکھا ہے کہ بہت کم ذہنوں کو یہ توفیق ہوتی ہے کہ وہ اس کے مضر اور مفید پہلو پر منصفانہ اور معتدلانہ نگاہ ڈال سکیں، اگرچہ آج کی مشغول دنیا کو نظریات پر زیادہ غور و فکر کی فرصت نہیں ملتی لیکن اشتراکیت نے زندگی کے قافلے کو جس دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے اس موقع پر بغیر غور و فکر کے بغیر سنجیدہ اقدام کر بیٹھنا نہ تو دیانت دارانہ رویہ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی عقل و ہوش رکھنے والا انسان ایسے طریقہ کار کو سراہ سکتا ہے، کیونکہ زندگی کوئی بازار میں بکنے والی چیز نہیں ہے، کہ اسے چوراہے پر کھڑے ہو کر نیلام کر دیا جائے، بلکہ جب یہ کسی نظریہ کے حوالے کی جاتی ہے تو اس وقت پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہوتا ہے کہ آج جس سے رشتہ استوار کیا جا رہا ہے وہ مستقبل میں دھوکا تو نہ دے جائے گا۔

آج کا انسان اب دو ٹوک فیصلہ کرنے ہی والا ہے، الحاد اپنی تمام فکری و عملی قوتوں کے ساتھ اس پر کمربستہ ہے کہ وہ انسانیت کے قافلہ پر ڈاکہ ڈال کر اس متاع پر ہمیشگی کا قبضہ جما لے، دوسری طرف انسان کی صحیح فطرت اس کے سامنے سربسجود ہونے سے انکار کرتی ہے، لیکن اس احتجاج کے پیچھے فکری و عملی دونوں میں سے کسی طرح کی بھی قوت موجود نہیں ہے، اس لیے الحاد کو بہانگ دہل انا ولا غیری کا نعرہ لگانے کا موقع مل گیا ہے اور جس حد تک ذہنوں میں اتنی سکت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ وہ اس نگاہ فریب پردے کے [illegible]

تنقید و تبصرہ

سید اصغر علی عابدی نے ان تمام مضامین کو اکٹھا کر دیا ہے جن میں اس جنت ارضی کے "اسرار" کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو پولینڈ کی سرحد سے لے کر کوہ یورال تک پھیلی ہوئی ہے۔ آج تک کمیونزم پر علمی حیثیت سے اتنی باتیں کی گئی ہیں کہ اس کی مخالفت اور موافقت میں وسیع لٹریچر تقریباً دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے۔ لیکن اردو زبان میں کوئی ایسی مستند اور مضبوط تصنیف نہیں تھی جو واضح طور پر سامنے لا سکتی کہ جب کمیونزم کو زندگی سپرد کر دی جاتی ہے زندگی کے شعبوں میں کس قسم کا فساد رونما ہوتا ہے، مرتب اس لحاظ سے خاص شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے ایسی تمام تحریروں کو شامل کر دیا ہے جو اپنی صداقت کے ساتھ ساتھ زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ پر کمیونزم کی اثر اندازی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد وہ آہنی پردہ سرکنے لگتا ہے جو اشتراکیت کی پہلی تجربہ گاہ کے چہرہ پر پڑا ہوا ہے اور زندگی کے مسائل کو عملی طور پر حل کرنے میں اس الحادی تحریک کو جو شاندار ناکامی حاصل ہوئی ہے اس کی داستان عبرت کے روپ میں سامنے آجاتی ہے۔

کمیونزم کے خلاف جب کوئی اصولی بحث کی جاتی ہے تو الحاد زدہ حلقوں کی طرف سے بڑی ہوشیاری کے ساتھ یہ جواب دیا جاتا ہے کہ "ہم تو زندگی کے معاشی مسائل کو حل کرنا چاہتے ہیں" اور آج کا انسان جس کا پیٹ اب مہاجن کی توند کو بھی شرمانے لگا ہے، یہ سن کر کچھ مرعوبیت اور کچھ دلچسپی کے ساتھ اس پوری تقریر کو سن لیتا ہے، جس کے ایک ایک لفظ میں اخلاق، تہذیب، شرافت و انسانیت کے خلاف شدید نفرت بھری ہوئی ہوتی ہے، لیکن اس کتاب میں پانچ عنوانوں کے تحت اس بے اصل دعوے کی بھی قلعی کھولی گئی ہے، خصوصاً "روس میں معاشی عدم مساوات" "اشتراکی مملکت کا مزدور" تو ایک آئینہ ہے، جس میں کمیونزم کی اس انسانی ہمدردی کے انجام کا پوری طرح مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جس کے نیچے آج فکر و ضمیر کی آواز دب کر رہ گئی ہے۔ "روسی عوام کا معیار زندگی" ایک نکیلا نیچہ ہے جو جرأت کے ساتھ اس غازہ آمیز خول کو نوچ کر پھینک دیتا ہے۔ جسے "سرخ دیو" نے اپنے چہرہ پر لگا کر گل گلاب بننے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کی حیثیت اس وقت اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے، جب خود روس زدہ مصنفین کی وہ تحریریں سامنے آتی ہیں جو لکھی تو گئی تھیں "مدح خود" کے طور پر، لیکن جوش قصیدہ خوانی میں اکثر ان پہلوؤں کو بھی واضح کر دیتی ہیں جو کٹر سے کٹر مخالف اشتراکیت بھی لکھتے وقت قلم کو روک کر سوچنے کی زحمت گوارا کرنے لگتا ہے۔

بہرحال یہ کتاب اس کا جائز مطالبہ کرتی ہے کہ آج کے ہر قسم کے علمی حلقہ میں اس کے لیے جگہ پیدا کی جائے۔ عمدہ ڈیپ، کتابت و طباعت اوسط درجہ کی ہے۔

تنقید و تبصرہ

جمہوریت کی مغربی تحریکیں

شائع کردہ: مکتبۂ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکٹ۔
(۲۴۲) صفحات۔ قیمت تین روپے۔ (۳؍)

مترجمہ
عبدالوہاب۔ ظہوری۔

مغربی دنیا جب اپنے ہی جیسے انسانوں کے مظالم سے تنگ آ گئی ہے تو اس نے ایک خوفناک جدوجہد کے بعد انقلاب فرانس کو جنم دیا۔ یہ انقلاب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ اس کے لیے تقریباً ڈیڑھ صدی سے اس کی تیاری کی جا رہی تھی، چنانچہ جس وقت یہ تحریک شروع کی گئی تو وہاں کے باشندے حریت فکر و ضمیر کا عجیب و غریب خواب دیکھ رہے تھے، ان کے خیال میں ایک ایسی جنت کا نقشہ تھا جہاں سکھ اور شانتی کی فضا میں زندگی ایک ندی کی طرح اپنا سفر جاری رکھ سکے گی!

مگر۔ ڈاکٹر ایڈورڈ بینس (   ) جو زیر نظر کتاب کے مصنف ہیں، ان کا بیان ہے کہ جمہوریت کی تحریک دو صدی کی طویل تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں رکھتی، جس سے معلوم ہو سکے واقعتاً اس تحریک نے اپنے معتقدین کی آرزوؤں کو پورا کیا ہو۔

ڈاکٹر بینس مغرب کی سیاسی دنیا میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ نے وہاں کی بیسوی صدی کے آغاز سے وہاں کی متعدد سیاسی تحریکوں میں براہ راست حصہ لیا ہے، اس لیے آپ نے جو رائے مغربی تحریکوں کے بارے میں دی ہے وہ لاعلمی پر نہیں بلکہ اس یقین پر مبنی ہے جو انہیں تحریکوں کے گہرے مطالعہ کے بعد حاصل ہوا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ مغرب میں جمہوریت کی تحریک کی ناکامی کے جو اسباب مصنف نے گنائے ہیں اگرچہ ان میں سے تھوڑے بہت ماحول سے شدید تاثر کی وجہ سے دور از کار معلوم ہوتے ہیں، لیکن اکثر جگہوں پر ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے حالات کی نبض پر انگلی رکھ کر موصوف مغرب کے دل کی دھڑکن تک محسوس کر رہے ہیں۔

بہر حال یہ کتاب مغربی سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے سامنے واقعات کا ایک نیا رخ پیش کرتی ہے جس میں دعوت فکر ہے کہ وہ دنیا جو آج مغرب کی امامت کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر چکی ہے آنکھ کھول کر دیکھے کہ ابھی تک قبلہ ہی درست نہیں ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ عربی میں حسن صعب مصری نے کیا تھا جس ترجمہ کا ترجمہ ظہوری صاحب نے کیا ہے۔ مترجم متعدد کتابوں کو اردو میں منتقل کر چکے ہیں، لیکن زیر نظر کتاب بعض جگہ گنجلک ہو گئی ہے شاید یہ ترجمے کے ترجمہ کا اثر ہو مجموعی طور پر یہ ترجمہ بہت کامیاب ہے۔ اور جن کو تھوڑی بہت مغربی سیاسیات سے واقفیت ہے ان کے لیے کوئی خاص قباحت نہیں۔ (الف۔ الف۔)

مطبوعات ادارۂ الحسنات

ابتدائی تعلیم (یعنی قاعدہ) قیمت ۳ر

بچوں کے لیے پہلی کتاب 〃 ۳ر

〃 〃 دوسری کتاب 〃 ۳ر

〃 〃 تیسری کتاب 〃 ۳ر

عبادت . . . . . . 〃 ۸ر

نماز (اردو) 〃 ۸ر

غار والے . . . . . . 〃 ۵ر

سنیچر والے . . . . . 〃 ۵ر

انسان کی کہانی . . . . 〃 ۱۱ر

آپ کیا کریں (مسلم خواتین کے لیے راہ عمل) ۱۳ر

گاؤں والے . . . . . 〃 ۵ر

(نوٹ)

کمیشن صرف تاجروں کو دیا جاتا ہے۔

رحمت عالم اردو اور ہندی اور رحمتہ للعالمین ہندی پر صرف ½ ۱۲ فیصدی کمیشن ہے۔ ادارہ الحسنات کی جملہ کتابوں پر اردو ہندی کی دوسری کتابوں پر ۲۵ فیصدی کمیشن اور دیگر کتابوں میں بعض پر ۲۵ فیصدی اور بقیہ پر ۲۰ فیصدی کمیشن ملے گا۔

دستور اور رودادیں

۱- دستور جماعت اسلامی ہند قیمت ۵ر

۲- روداد جماعت اسلامی حصہ اول 〃 ۸ر

۳- 〃 〃 〃 حصہ دوم 〃 ۱۴ر

۴- 〃 〃 〃 حصہ سوم 〃 ۱۲ر

۵- 〃 〃 〃 حصہ پنجم 〃 ۱۲ر

۶- 〃 〃 〃 حلقہ خواتین 〃 ۱۲ر

۷- روداد اجتماعات ہند (زیر طبع)

پوسٹر و چارٹ

۱- پوسٹر "چاہیے آپ" فی عدد قیمت ار

۲- 〃 - "انسان و خدا" 〃 ار

۳- 〃 - "مذہب کیا ہے؟" 〃 ار

۴- "کیا قوم پرستی اختیار کرنے کی چیز ہے؟" 〃 ار

۵- "امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے؟" 〃 ار

۶- "نام نہاد مسلم سوسائٹی" 〃 ار

۷- "اسلام" 〃 ار

۸- 〃 "ہمارا طریق کار" 〃 ار

۹- 〃 "قوموں کے اکھاڑے" 〃 ۲ر

۱۰- (بڑا چارٹ) بنیادی عقیدہ 〃 ۲ر

۱۱- (چھوٹا چارٹ) 〃 ۱ر

ملنے کا پتہ:-

[illegible] جماعت اسلامی ہند رامپور یوپی

مطبوعات انگریزی

۱- ٹوورڈس انڈر اسٹینڈنگ اسلام (رسالہ دینیات) ـــ ۱ے

۲- ہواٹ اِز اسلام؟ (اسلام کیا ہے؟) ۱مر

۳- آفٹر سیکولرزم ہواٹ (الحاد کے بعد کیا) ۱۲ر

۴- پراسیس آف اسلامک ریولیوشن (اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے) ۱۲ر

۵- اکنامک پرابلم آف مین (معاشی مسئلہ) ۱۲ر

۶- نیشنلزم اور انڈیا (مسئلہ قومیت) ۱۲ر

۷- ایتھیکل ویو پوائنٹ آف اسلام (اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر) ۱۲ر

۸- پولیٹیکل تھیوری آف اسلام (سیاسی نظریہ) ۱۲ر

۹- دی اسلامک وے آف لائف (نظام حیات) ۱۲ر

۱۰- دی میسیج آف اسلام (دعوت اسلامی) ۸ر

۱۱- اَوَر لیڈرز- (ہمارے لیڈر) للعہ

مطبوعات عربی

۱- نظریۃ الاسلام السیاسیہ (اسلام کا نظریہ سیاسی) ۱ر عمر

۲- منہاج الانقلاب الاسلامی

اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے عمر

رسالہ اُجالا (ہندی) ماہوار رامپور یوپی

اسلام کی بنیادی تعلیمات کو ہندی ادبی زبان میں اگر ملاحظہ کرنا ہو تو اس رسالہ کا مطالعہ فرمایئے اور ہندی حلقوں میں اسے عام جاری کرایئے۔ سالانہ چندہ- ۳ے

مطبوعات ہندی

۱- دشوبندھو درشک (سرورِ عالم ہندی) قیمت

۲- ست دھرم (دینِ حق ہندی) . . ۶ر ۶

۳- شانتی مارگ (سلامتی کا راستہ ہندی) . ۶ر ۵

۴- بناؤ بگاڑ (ہندی) ۶ر ۵

۵- جیون مرتیو کے پشچات. . . .

(زندگی بعد موت ہندی) ۳

۶- نماز (ہندی) ۶ر ۸ر

۷- رحمتِ عالم (ہندی) ۶ر ۶

۸- رحمتہ اللعالمین (ہندی) ۶ر للعہ

خوش خبری

۱- قرآن مبارک کا ہندی زبان میں ترجمہ اس وقت جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر اہتمام کے ساتھ ہم نے اس کام کو شروع کر دیا ہے۔ زبان نہایت بامحاورہ اور ادبی ہوگی۔ ترجمانی اور تشریح مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی کی ہوگی۔ انتظار فرمایئے۔

۲- ہندی تعلیم کا اسلامی نصاب تیار ہو رہا ہے۔ یہ نصاب پانچ کتابوں پر مشتمل ہوگا۔ پہلی کتاب حروف تہجی سے شروع ہوگی اور پانچویں کتاب رسالہ دینیات پر ختم ہوگی۔ اس کے لئے خاص طور پر انتظار کرنا چاہئے۔

ملنے کا پتہ:-

ناظم مکتبہ جماعت اسلامی ہند رامپور

Regd. No. A-656 "ZINDGI" Monthly RAMPUR U. P.
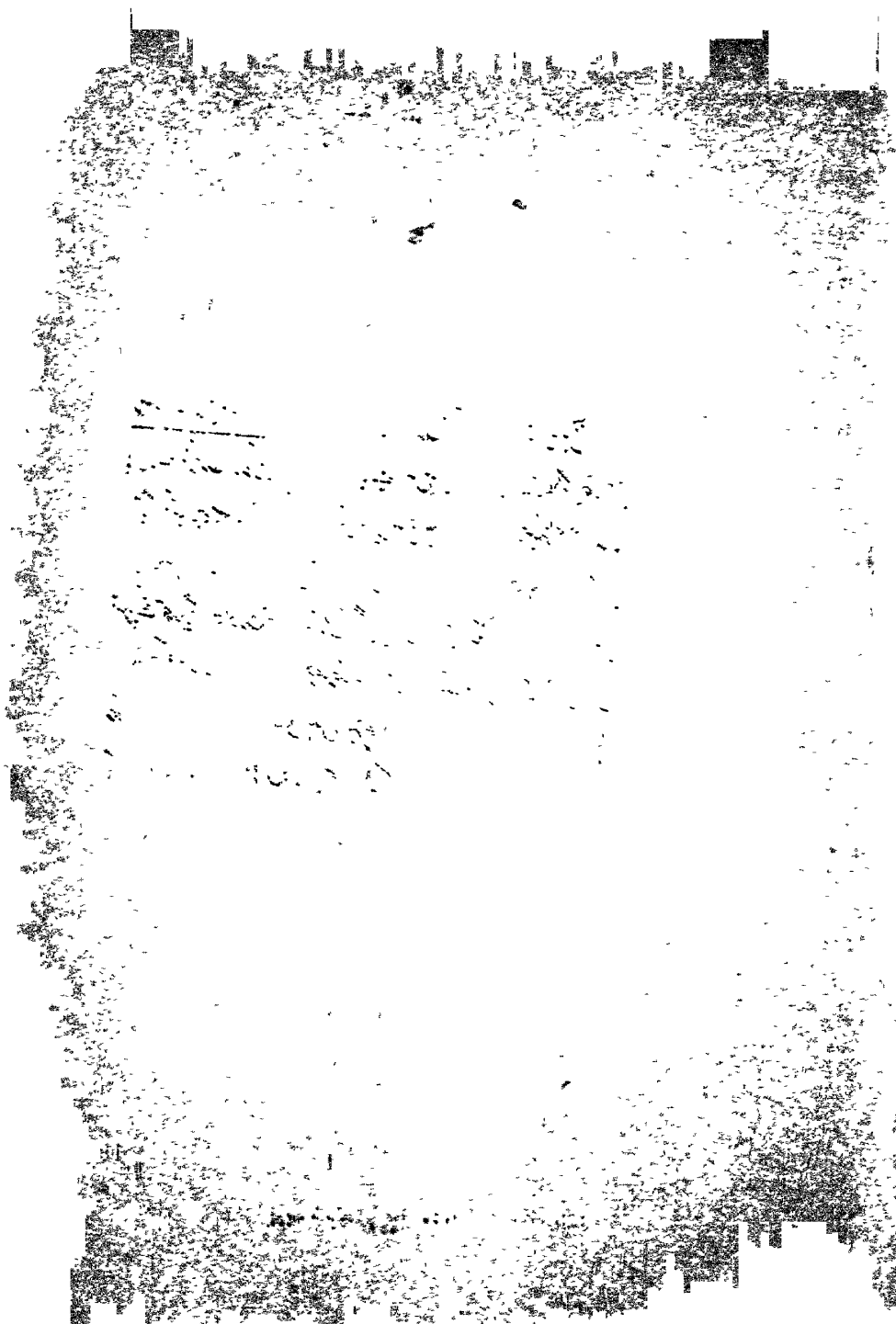
رسالۂ دینیات | یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانیوالے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں بہترین عقلی دلائل کیساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصول شرح کے سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانہ حال کے دماغوں میں عموماً پیدا ہوتے ہیں۔ طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بھی اس رسالہ کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔ نیز علماء بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ ان کو بتائے گا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔
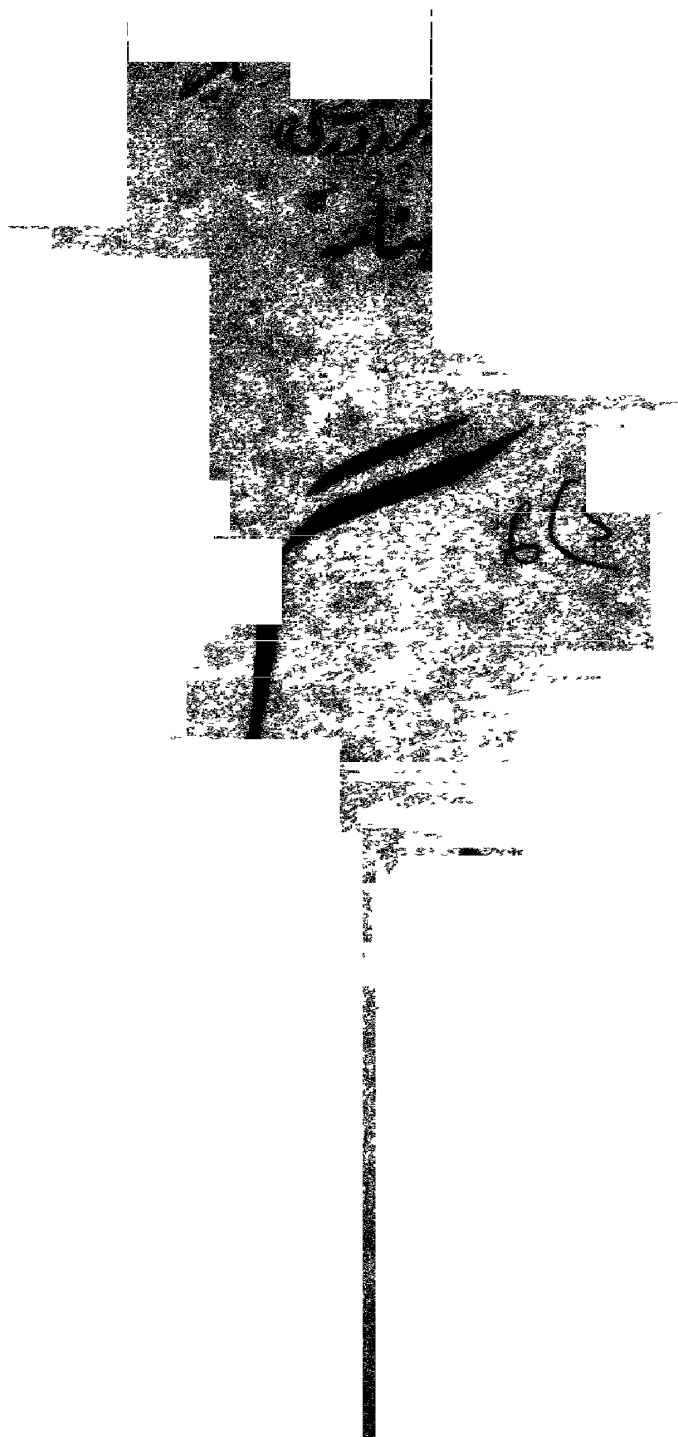
DELHI PHOTO ART PRESS RAMPUR U. P.

جلد (۶)
نمبر (۵)

ستمبر ۱۹۵۱ء

ذوالحجہ ۱۳۷۰ھ

مرتبہ سید حامد علی

دفتر رسالہ زندگی رامپور یو۔پی

سالانہ پانچ روپے۔ فی کاپی آٹھ آنے اس کاپی کے بارہ آنے۔

سید حامد علی پرنٹر و پبلشر نے ناظم پریس رامپور سے چھپوا کر دفتر رسالہ زندگی رامپور۔ یو۔ پی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابو اللیث اصلاحی ندوی

اشارات

ایک دوست جو ایک اخبار کے اڈیٹر بھی ہیں، لکھتے ہیں :-

"مولانا محمد میاں کا مضمون الجمعیۃ میں جناب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ اب جمعیۃ العلماء کھل کر مخالفت پر آگئی ہے۔ یہ مضمون اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ ضرورت ہے کہ جمعیۃ کے نقطۂ نظر پر واضح طور پر تنقید کی جائے۔ اس مضمون میں مصنف نے جماعت اسلامی اور جمعیۃ کو باہم متصادم کرنے کی سعی کی ہے۔ ضرورت اگر جناب اس بیان کے متعلق ایک وضاحتی نوٹ ارسال فرمائیں تو مناسب ہے۔ نیز مطلع فرمائیے کہ جمعیۃ العلماء کی پالیسی پر بھی تنقید کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

اسی طرح کے سوالات بعض اور لوگوں نے بھی کیے ہیں اور خیال یہ ہے کہ مذکورہ مضمون کے پڑھنے کے بعد بہت سے لوگوں کے ذہن میں عام طور سے اس قسم کے سوالات پیدا ہوں گے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جمعیۃ العلماء کی بظاہر اس نئی پالیسی کے بارے میں جس کی اس مضمون سے ابتدا ہوتی ہے، میں اپنے تاثرات "زندگی" کے ذریعہ ظاہر کردوں اور اس بات کی بھی وضاحت کردوں کہ ہمارے رفقاء کو خاص طور سے اس موقع پر کیا روش اختیار کرنی چاہیے۔

مجھے یقین تو نہیں آتا کہ جمعیۃ العلماء نے بحیثیت جماعت کھل کر جماعت اسلامی کی مخالفت کرنے کا ارادہ کر لیا ہے کیونکہ جمعیۃ میں بحمد اللہ متعدد ایسے حضرات موجود ہیں جو اس مخالفت کے نتائج اور ساتھ ہی زمانہ کے مصالح و مقتضیات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں چنانچہ غالباً ان ہی حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ہر چند جمعیۃ العلماء کے بہت سے ذمہ دار لوگ حتی کہ اس کے صدر محترم تک جماعت کے خلاف فتووں کی مہم میں بہت نمایاں طور سے حصہ لے رہے ہیں لیکن جمعیۃ نے بحیثیت جماعت اپنے کو اب تک اس سے علیحدہ ہی رکھا تھا یہاں تک کہ اس کا ترجمان الجمعیۃ بھی اس سلسلہ میں مکمل خاموش رہا ہے۔ لیکن بظاہر حالات مکتوب نگار کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ جمعیۃ نے اب اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کر لی ہے اور جو حضرات اب تک جماعت کے ساتھ کسی کش مکش پیدا کرنے سے احتراز فرما رہے تھے یا خود ان کا مقصد بھی اپنی ہی رائے کی تبدیلی کے نتیجہ میں یا کسی مجبوری یا مصلحت کی خاطر بدل چکا ہے، اور غالباً یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ الجمعیۃ میں مولانا محمد میاں کا مذکورہ بالا مضمون جس میں واقعی دونوں جماعتوں کو باہم متصادم کرنے کی سعی کی گئی ہے شائع ہوا ہے، اور اس کے بعد چند ہی روز کے اندر دفتر الجمعیۃ میں بیٹھ کر وہ کام انجام دیا گیا ہے جو بصورت بیان الجمعیۃ مورخہ ۲۸ اگست اور غالباً مزید اظہار و توضیح کی خاطر دوبارہ ۳۰ اگست کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم اس پر اظہار افسوس کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔

تقسیم کے بعد یہاں کے مسلمان جن حالات سے گذر رہے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری انتہائی کوشش اور خواہش تو یہی تھی کہ ہم اور جمعیۃ دونوں اپنے اپنے اختلافات اپنی جگہ پر برقرار رکھتے ہوئے بھی کم از کم مشترک مسائل میں باہم متحد ہو سکیں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت ہم نے گذشتہ دنوں تعلیمی مسائل میں جمعیۃ کی طرف تعاون اور اشتراک کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اور کم از کم یہ چاہتے تھے کہ ہمارے مابین کوئی نئی کش مکش پیدا نہ ہو سکے اور اسی کی خاطر ہم نے تقسیم کے بعد بالقصد اپنی تنقید اور اظہار خیال میں بہت نرمی اور سہل کا انداز اختیار کیا تھا اور ہماری اس کوشش میں یہ اعتراف ہے کہ الجمعیۃ کے متعدد ذمہ دار حضرات جن سے ہمیں واقفیت کا شرف حاصل ہے، وہ بھی اپنے طور سے اس دوران میں اس کے لیے کوشاں رہے ہیں لیکن اگر اب ان سب لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ صورت کوئی پسندیدہ صورت نہیں ہے اور اسلام اور مسلمانوں کا اور جمعیۃ کا فائدہ اسی میں ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں کش مکش پیدا ہو تو بہرحال ان کو یہ فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ ہمیں اس پر شکایت کا حق ہی کیا ہے! البتہ چونکہ ہم اپنے طور سے طے کیے ہوئے ہیں کہ ہم خود کسی نئی کش مکش کا موجب نہیں بنیں گے، اس لیے انشاء اللہ ہم اپنے پر اس الزام کا کوئی موقع نہیں آنے دینا چاہتے۔ چنانچہ اس وقت بھی باوجود اس بات کے کہ جمعیت کے بہت سے ذمہ دار افراد حتی کہ اس کے صدر محترم ہمارے خلاف ہنگامہ آرائی میں کھل کر حصہ لے رہے ہیں ہم نے اس کو ان کی ذات تک محدود رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں اپنی کسی بحث میں ہم نے بالقصد جمعیت کا نام نہیں آنے دیا ہے، اور میں اپنے رفقاء سے اس موقع پر بھی یہ درخواست کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ جمعیت کا رویہ جماعت کے سلسلہ میں آئندہ جو کچھ بھی ہو انہیں حتی الوسع اپنے کو کش مکش سے علیحدہ رکھنا چاہیے۔ رہا جمعیۃ کی پالیسی پر تنقید کا سوال تو اس کے بارے میں ہماری جو پالیسی ہمیشہ سے رہی ہے وہ میرے نزدیک ہر حال کے لیے موزوں ہے، یعنی صحیح تنقید بوقت ضرورت ہمیشہ کی جا سکتی ہے اور تنقید میں ہمیشہ اعتدال اور رفق، انصاف کو ملحوظ رکھنے اور دل آزاری اور تنقیص سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ موجودہ حالات کی مناسبت سے میں اتنی بات اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس موقع پر اگر یہ سمجھ کر تنقید کا فرض انجام دیا جائے تو قدم قدم پر اپنے نفس کا جائزہ لیا جائے کہ وہ کسی جذبہ سے متاثر تو نہیں ہے کیونکہ اس طرح کے موقع پر طبیعت دوسروں کی طرز عمل یا اس طرح کی اور دوسری باتوں سے بھی متاثر ہو جایا کرتی ہے اور اس کا اثر تنقید میں نمایاں ہو جایا کرتا ہے اس لیے اپنے شدید احتساب کی ضرورت ہے۔ ہم کسی سے راضی ہوں یا ناراض دونوں حالتوں میں ہمیں کلمۂ حق اور اعتدال کو شدت کے ساتھ ملحوظ رکھنا چاہیے یہی ایک مسلمان کا شیوہ ہے۔

مولانا محمد میاں صاحب سے مجھے شخصی طور سے نیاز حاصل ہے۔ یہ اپنے علمی وقار اور سنجیدگی کے لحاظ سے جمعیۃ العلماء کے حلقہ میں ایک خاص ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ابھی چند ماہ ہوئے جب یہ میری دعوت پر یہاں تشریف لائے تھے تو اس موقع پر ان کی بات چیت سے ہمیں یہ اندازہ کر کے خوشی ہوئی تھی کہ وہ بھی ہماری طرح ان دونوں جماعتوں کے اتفاق و تعاون کے دل سے خواہشمند ہیں بلکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جہاں ہمارے اور ان کے درمیان بہت سے معاملات و مسائل کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا، وہیں ہماری بہت کا

بنیادی باتوں کے سلسلہ میں انہوں نے ہم سے اپنے اتفاق رائے کا بھی اظہار فرمایا تھا اور یہ بات کہ اس کے سلسلہ میں بہت سے لوگوں کو یاد ہو گی کہ ابھی گذشتہ سال الجمعیۃ میں کیا اچھا ہو کے عنوان سے ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے رمزی آبادی صاحب کی اس تمنا کے جواب میں کہ مسلمانوں کی یہ تینوں جماعتیں جمعیۃ العلماء، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی۔ کاش ایک ہو سکیں، ان الفاظ میں تشفی فرمائی تھی کہ :۔

"اگر رمزی صاحب تقسیم کار کے اصول کی طرف بھی توجہ فرماتے تو کیا اچھا ہوتا کہ تمنا کے بجائے مسرت و استعجاب کے ساتھ شاید وہ یہ کہتے کہ کیا اچھا ہے"۔

اور اس کے بعد انھوں نے اس پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ تقسیم کے بعد کسی باقاعدہ تقسیم کے تحت تو نہیں لیکن از خود ان جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر عصری تقاضوں کا احساس کرتے ہوئے اپنے رجحانات کے مطابق کام تقسیم کر لیے ہیں اور اسی کے مطابق اس وقت کام ہو رہا ہے (الجمعیۃ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔) اس سوال کو سردست چھوڑ دیجئے کہ مولانا نے رمزی صاحب کی تشفی و تسلی کے لیے جو بات ارشاد فرمائی تھی وہ کہاں تک قابل تشفی یا واقعہ کے مطابق تھی لیکن اس سے کم از کم اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ مولانا بذات خود ان جماعتوں کے اشتراک و تعاون کے قائل ہیں اور دل سے اس کو پسند کرتے ہیں مولانا کی مذکورہ بالا خصوصیات کے پیش نظر ہم مولانا کے بارے میں اگر کوئی تصور قائم کر سکتے تھے تو وہ یہی ہو سکتا تھا کہ جمعیۃ العلماء کے حلقہ میں وہ آخری شخص ہوں گے جو جماعت کے خلاف موجودہ ہنگامہ آرائی سے متاثر ہو سکتے ہیں اور اس کی بنا پر اپنی محتاط اور صلح پسندانہ روش کو ترک فرما سکتے ہیں اور اس کا تو کسی حال میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اگر بالفرض وہ اس سے متاثر ہو بھی گئے تو ان کا ماتم اپنے اظہار کے لیے کوئی ایسی شکل اختیار کرے گا جو ان کی متانت اور سنجیدگی اور ان کے وقار علمی کے لیے کسی طرح شایان شان نہ ہو، لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ یہ دونوں باتیں وقوع اور ظہور میں آ گئی ہیں، مکتوب نگار کے بقول جمعیۃ العلماء کی طرف سے مخالفت کی ابتدا اسی مضمون سے ہوئی ہو اور یہ آپکو آگے معلوم ہو گا کہ اس مخالفت کا انداز کیا ہے مولانا کے مضمون کا پہلا فقرہ یہ ہے :- "یہ کچھ عرصہ سے مودودی صاحب کی جماعت جو جماعت اسلامی کے نام سے مشہور ہے" الخ یہ کتنا بڑا اور بے بنیاد الزام ہے جو مولانا جیسے ثقہ بزرگ کی طرف سے ہم پر لگایا گیا ہے؟ یہ بات تفصیل کے ساتھ وضاحت کی جا چکی ہے کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب دونوں ایک نہیں ہیں اور جہاں تک جماعت اسلامی ہند کا تعلق ہے اس کے ضمن میں مولانا مودودی کا نام لینا تو جماعت پر انتہائی ظلم ہے کیونکہ تقسیم کے بعد یہاں کا نظم جماعت خود اپنی مستقل بنیاد پر قائم ہے اور اس کا مودودی صاحب سے آئینی وغیرہ آئینی کسی طرح کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے لیکن مولانا ہیں کہ پھر بھی دونوں کو ایک سمجھے جاتے ہیں اور ان کا تذکرہ اس انداز میں کر رہے ہیں کہ اگر اس کو تنابز بالالقاب کہا جائے تو شاید کوئی بے جا بات نہیں ہو گی کیونکہ جماعت اسلامی کے منتسبین سے اپنی انتہائی توہین خیال کرتے ہیں کہ ان کی نسبت اسلام کی بجائے مولانا مودودی کی طرف کی جائے بلکہ زیادہ سے زیادہ حیثیت اگر ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ بھی جماعت اسلامی کے ایک خادم ہیں جن کو تشکیل جماعت کے وقت ارکان جماعت نے اپنا امیر اور سربراہ کار تسلیم کر لیا تھا اور تقسیم کے بعد وہ حصہ پاکستان کی جماعت کے اب بھی امیر ہیں، اگر مولانا محمد میاں صاحب نے جان بوجھ کر جماعت اسلامی کا یہ تعارف کرایا ہے جب بہرحال جماعت اسلامی ہند ہی مراد ہو سکتی ہے ـــــ بلکہ ہندوستان میں رہ کر جب جماعت اسلامی کے نام سے تنقید ہو گی اور صراحتاً اس کو مستثنیٰ نہ کیا گیا ہو تو سب سے پہلے پڑھنے والوں کا ذہن لازمی طور سے جماعت اسلامی ہند ہی کی طرف منتقل ہو گا اور اس کے علاوہ مضمون کا آخری حصہ تو کھلے طور جماعت اسلامی ہند ہی سے متعلق باتوں پر مشتمل ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ سوچ لینا چاہیے تھا کہ سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے کتنے مسلمانوں کی زندگیوں پر اس کا کیا اثر مرتب ہو سکتا ہے اور اس ضمن میں انھیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت تھی کہ جماعت اسلامی سے بے تعلقی کے اعلان کے بعد بھی یہ بات ناممکن نہیں ہو کہ اس الزام کے سیاسی نتائج کے کچھ چھینٹے ان سے محفوظ نہ رہ سکیں اور اس تک بھی پہنچ جائیں کیونکہ ہمارے خلاف کتنے ہی فتوے کیوں شائع کیے جائیں یہاں حضرات کے بس کی بات نہیں ہو کہ وہ ہمیں مسلمانوں سے چھانٹ کر الگ کر سکیں اور کم از کم گورنمنٹ کی نگاہ میں تو ہم کسی طرح بھی مسلمانوں سے الگ نہیں ہو سکتے ہیں اس لیے یہ عین ممکن ہو کہ اس وعدہ بدگمانی میں پاکستان سے تعلق رکھنے کے جرم میں جو مولانا کے ارشاد کا ایک لازمی نتیجہ ہے ہمارے ساتھ خود مولانا بھی اپنی معروف حیثیتوں میں ہی اس کے نتائج بھگتنے میں برابر کے شریک حال ہوں اور اتنی بات تو بہرحال یقینی ہو کہ اگر خدانخواستہ اس الزام کے سیاسی نتائج میں ہمیں مبتلا ہونا پڑا تو مولانا اور ان کے زمرہ کے کتنے متوسلین کے قریبی عزیز ہمارے ساتھ ہوں گے۔ کیونکہ یہ واقعہ ہے جس سے مولانا غالباً اچھی طرح آگاہ ہوں گے کہ ان حضرات کی کوششوں کے علی الرغم جماعت اسلامی کی دعوت ان کے گھروں میں بھی داخل ہو چکی ہے اور ان کے کتنے بھائی بھتیجے اور ان سے بھی قریبی ان کے صاحبزادے جماعت سے تعلق رکھتے ہیں،

اور اگر یہ الزام مولانا نے بے سوچے سمجھے اور ناواقفیت میں لگا دیا ہے تو ہمارے خیال میں انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ مولانا پہلے جماعت کے بارے میں کم از کم یہ ابتدائی تحقیق فرما لیتے کہ جماعت کس طرح بنی ہو اور اس کا کس سے تعلق ہے اور کس سے نہیں ہے؟ اور اس کے بعد کچھ ارشاد فرماتے تو یہ زیادہ بہتر ہوتا۔

مولانا نے اپنے اس مضمون میں کچھ ایسے طنز و تعریض سے بھی کام لیا ہے جس کو ہم ان کے مرتبۂ شان کے خلاف سمجھتے ہیں ہم اگر اس سے ملوث ہوں تو ہمارے لیے تو یہ چنداں عیب کی بات نہیں ہو گی، کیونکہ ان کے بقول ہمارا تو کام ہی دوسروں کو برا بھلا کہنا ہو، لیکن مولانا جیسے لوگ جو ہماری اصلاح کے لیے کھڑے ہوئے ہیں انھیں تو کم از کم اپنا دامن اس سے پاک رکھنا چاہیے تھا تاکہ خدا اگر ہمیں کبھی توفیق عطا فرمائے تو ہم ان کے اسوہ کی پیروی کر سکیں۔ چند فقرے بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ (۱) "اور اگر باعث فخر مباہات وہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوتے رہے ہیں اور جن کے مجموعہ کو تنقیحات اور تفہیمات وغیرہ کے نام سے تجارتی اصول پر شائع کیا جا رہا ہے" الخ

اس فقرے کو پڑھ کر ہمیں الجمعیۃ کا ایک پرانا مضمون یاد آ گیا، جس میں مودودی صاحب کو علاوہ اور دل نشین خطابات کے خطیب ترقی سے خطاب [illegible] گیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ پرانی بات ابھی تک ذہن سے نکل نہیں ہو سکا حالانکہ ہمارا خیال ہے کہ اس طرح کی باتوں کا اب موقع نہیں رہا ہو، کیونکہ خدا کے فضل سے الجمعیۃ میں [illegible] خود [illegible] ہیں جب مولانا کا یہ مضمون شائع ہوا ہو، اور علماء ہند کے مجاہدانہ [illegible] عنوان [illegible] الجمعیۃ میں [illegible] [illegible] "حیات شیخ الاسلام" وغیرہ کا تعارف [illegible] کے ساتھ [illegible]

جمعیۃ کے اہل قلم کی جو کثیر تصنیفات ملک میں شائع ہو رہی ہیں وہ کچھ مفت تقسیم ہو رہی ہوں پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا نے تجارتی اصول کے لفظ سے کس فرق کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ ضرور ہے کہ کتابوں کی نوعیت وغیرہ میں فرق ہو جو مذکورہ بالا اشتہارات اور جماعت اسلامی کی مطبوعات پر ایک نظر ڈالنے سے بخوبی آشکارا ہو جاتا ہے اور یہ فرق ہونا بھی چاہیے کیونکہ ہر مصنف یا ہر ادارہ کا اپنا اپنا علیحدہ ذوق ہوتا ہے لیکن جہاں تک تجارت کا سوال ہے اس کے پہلو سے تو ہمیں دونوں جگہ یکسانی ہی نظر آتی ہے، پھر آخر یہ اعتراض کس بات پر ہے؟ کیا اس بات پر کہ جماعت کی مطبوعات کی فروخت سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ کسی شخص کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ وہ جماعت کی ملک ہوتی ہے اور جماعت اسے اپنی ضرورت کے مطابق دینی ضروریات پر --- جنہیں غالباً مولانا ان کو دینی ضروریات سمجھیں --- صرف کرتی ہے اور اس کے اس طرز عمل ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ اپنے کاموں کے لیے پبلک چندوں سے بے نیازی کے اصول کو نباہتی جا رہی ہے --- اور یہ صورت غالباً ان مطبوعات کی نہیں ہے اور اگر ہو تو ہمیں اس کا کچھ علم نہیں ہے خدا کرے ایسا ہی ہو کیونکہ اس صورت میں یہ فرق بھی باقی نہیں رہے گا اور مولانا کا مذکورہ بالا اعتراض از خود بے محل ہو جائے گا۔ (۲) "اور اگر فقرہ مباحث کا منشا یہ ہے کہ کوئی جماعت جو اسلامی اصول پر اپنا نظم قائم کرنا چاہتی ہو اور اسلامی طریق فکر کے بموجب انقلاب کرنا چاہتی ہو وہ آج تک قائم نہیں ہوئی، صرف مودودی صاحب کو اس کا فخر حاصل ہوا ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ ان شہیدان باکباز کو ہم کس زمرہ میں رکھیں جنہوں نے امیر المومنین حضرت سید احمد صاحب کی زیر قیادت محض تصنیف و تالیف کی نمائش نہیں کی بلکہ اس ملک اور مذہبی جہاد کے لیے اپنی عزیز ترین جانوں، اپنے اہل و عیال اور اپنے بیش بہا سرمایہ کو قربان کر دیا اور جنکی تحریک کا سلسلہ کسی جیل خانہ پر ختم نہیں ہوا اور نہ کسی معمولی سزا کے بعد اپنی تحریک کے رخ کو انقلاب سے ہٹا کر پارلیمنٹری سیاست کی طرف انہوں نے پھیر دیا بلکہ ان حضرات نے خود اپنی جانیں قربان کیں، اور ان کے پس ماندگان نے کم و بیش تیس برس تک اس جذبے کو سربلند رکھا؟" اس تحریر میں جو تعریض ہے اس کا اشارہ صریح طور سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی پاکستان کی طرف ہوا ہے ہمیں اس کے جواب میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے یہ وہاں کے لوگ بتا سکتے ہیں کہ یہ بے محل ہیں یا برمحل! البتہ ان جملوں سے مولانا کے جس مجاہدانہ عزم اور جذبہ قربانی کا اظہار ہوتا ہے اس پر ہم مولانا کو مبارکباد دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اسے مبارک کرے، لیکن ہم کم سے کم اتنی بات ضرور عرض کرنی چاہتے ہیں کہ کیا مولانا نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ اگر جماعت اسلامی پاکستان کے لوگ بھی جرأت کر کے اس کے جواب میں کہہ دیں کہ "تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" تو مولانا ہی فرمائیں کہ چپ ہو جانے کے علاوہ ان کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ سوچنے کی بات ہے کہ جو لوگ پارلیمنٹری سیاست سے بھی دست کش ہو چکے ہوں ان کو کسی جماعت پر یہ اعتراض کرنے کا حق کیا ہے کہ انقلاب کی راہ سے ہٹ کر اس نے اپنا رخ پارلیمنٹری سیاست کی طرف پھیر دیا! اور ہاں تو یہ تبدیلی مولانا کے بقول جیل کی معمولی سزا کے نتیجہ میں ظہور میں آئی ہو لیکن ان کا انقلاب حال تو غالباً محض اندیشہ جیل کا نتیجہ ہو حالانکہ یہ ان حضرات کے لیے چنداں اندیشہ کی چیز بھی نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ یہ لوگ تحریک آزادی کے دوران میں بارہا اسے آزما کر دیکھ چکے ہیں۔ بہرحال اس تعریض کا تعلق چونکہ ہم سے نہیں ہے اس لیے اس کے جواب سے بھی ہم کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے، البتہ اسی مناسبت سے ایک بات مولانا سے ضرور پوچھنے کو جی چاہتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہی دم خم ہیں تو جماعت اسلامی کی دعوت پر "خطرناک" کے پہلو سے کیوں اعتراض کیا جاتا ہے جیسا کہ جمعیۃ العلماء کے صدر محترم اور دوسرے حضرات نے کیا ہے اور خود آنجناب نے بھی اس مضمون میں کیا زندگی کے سایہ میں پناہ ڈھونڈنے کی کیوں کوشش کی ہے اور وہ بھی اس ایسے تصور کے ساتھ جس کے بموجب زندگی بھی زیر سایہ کفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جو واقعہ بالکل برخلاف ہے جیسا کہ سیرت کا ہر مطالعہ کرنے والا جانتا ہے۔ (۳) "جمعیۃ علماء ہند کے طریق فکر میں یہی تصور کہا جا سکتا ہے کہ وہ سطحی اور نمائشی چیزوں کی طرف التفات نہیں کرتی بلکہ گہرے غور و خوض کے بعد صحیح تفقہ کے ساتھ فیصلے صادر کرتی ہے" کاش مولانا نے یہاں یہ بھی تشریح فرما دی ہوتی کہ سطحی اور نمائشی چیزوں سے ان کی مراد کیا ہے؟ تو ہم انہی کے سامنے اپنا بھی جائزہ لے سکتے کہ ہم کہاں تک اس میں مبتلا ہیں اور جمعیۃ العلماء کو بھی پرکھ سکتے تھے کہ وہ اس سے کس قدر دور ہے؟ اس کے بغیر تو ظاہر ہے ہم سطحیت اور نمائش کے اپنے مفہوم کے ساتھ ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں، اور اس کے مطابق ہمیں افسوس ہے کہ یہ عیب ہمیں اپنے سے زیادہ ان کے یہاں ہی نظر آتا ہے، اس کی مثالیں بھی عرض کی جا سکتی ہیں، لیکن اس سے خواہ مخواہ شکایت ہوگی۔

رہا تفقہ کا معاملہ تو ہمیں اس کا کوئی حصہ ہی کہاں ملا ہو کہ ہم جمعیۃ العلماء کے تفقہ کے بارے میں کچھ عرض کر سکیں، لیکن اگر ہم کچھ جرأت سے کام لے کر کچھ کہیں گے بھی تو وہ اسی طرح کی باتیں ہوں گی جو اس سے پہلے ہم جمعیۃ العلماء کے مسلک اور روش کے بارے میں اپنے لٹریچر میں جا بجا کہہ چکے ہیں اور جو ہمارے خلاف جمعیۃ العلماء کی موجودہ شکایات کا ایک بہت بڑا سبب ہیں اس لیے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں بھی خاموشی ہی اختیار کریں خواہ مخواہ تنقص بڑھانے سے فائدہ ہی کیا ہو سکتا ہے؟ باقی ناظرین کو حق حاصل ہے کہ وہ جمعیۃ العلماء کی پچھلی اور موجودہ روش کو صحیح اسلامی تفقہ کے مطابق سمجھیں یا اس کے خلاف، ہم ان کی آزادانہ رائے کو اپنے خیالات سے متاثر کرنا نہیں چاہتے۔ (۴) "ایک دوسرا قصور یہ بھی ہے کہ جمعیۃ علماء ہند اور اس کے خدام نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اپنی برتری کے لیے دوسروں کی تحقیر کریں اور یہ گستاخی تو ان کے نزدیک انتہائی درجہ نفرت انگیز گستاخی ہے کہ اپنے علم کی شان و شوکت ثابت کرنے کے لیے سلف صالحین کی فروگذاشتوں کو طمطراق سے سامنے پیش کیا جائے اور انا ولا غیری کے زعم کے لیے عوام کے دماغوں کو تختۂ مشق بنایا جائے" جمعیۃ العلماء کی مدح و منقبت فرماتے ہوئے مولانا نے جماعت اسلامی کی طرف جو گھناؤنے الزامات منسوب کیے ہیں ان کی صفائی میں ہم اس سے پہلے بہت کچھ عرض کر چکے ہیں اگر ان سے مولانا کو اطمینان نہیں ہو سکا ہے تو اس سلسلہ کی مزید کوشش شاید ایک لاحاصل ہی ہوگی، اس لیے ان کے جواب میں بس اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر مولانا کو جماعت اسلامی کی مذمت کرنی ہو تو وہ شوق سے کریں، ہم سخت سے سخت باتیں سننے کے عادی ہو چکے ہیں، یہ ان کی باتیں جو بہرحال کچھ نہ کچھ متانت کا پہلو لیے ہوئے ہیں ہمیں زیادہ ناگوار نہیں ہوں گی اور اگر وہ جمعیۃ العلماء کی مدح و منقبت فرمانا چاہتے ہیں تو اس سلسلہ کی بھی ہم ان کی ہر بات سننے کے لیے آمادہ ہیں کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ ہمیں جمعیۃ العلماء سے کوئی خواہ مخواہ بیر نہیں ہے بلکہ اس کی جو خوبیاں ہو سکتی ہیں ان کے ہم خود دل سے معترف ہیں لیکن آخر یہ کیا بات نہیں ہے کہ وہ اس طرح مذمت کے ضمن میں ہی ایسی بات ارشاد فرمائیں جو نتیجاً خود ان کے دعوے کی تردید ہو جائے۔ غور فرمائیے آپ کی اوپر کی عبارت میں کتنے ایسے جملے ہیں جن میں ایک کا منظر بھی ہے جن سے آپ ہمارے بارے میں ثابت کرنا چاہتے ہیں، آپ جمعیۃ العلماء کی مدح فرمانا چاہتے ہیں کہ وہ دوسروں کی تحقیر نہیں کرتی لیکن ...

جماعت اسلامی کے لیے تعریضاً سخت سخت فقرے بے تکلف استعمال کر گئے ہیں، اپنی برتری کے لیے دوسروں کی تحقیر کرنا، اپنے علم کی شان و شوکت کا جھوٹا مظاہرہ کرنا، مسلمانوں کی توڑ کر ان کو طبقوں سے ساتھ چھپی کرنا اور اس کے ذریعہ انتہا درجہ نفرت انگیز گستاخی کا مرتکب ہونا اور انا ولاغیری کے زعم کے ساتھ عوام کے دماغوں کو تختۂ مشق بنانا، یہ کتنے الزامات ہیں جو اس چند سطری عبارت میں ایک ساتھ ہی لگا دیئے گئے ہیں، اور اس پر یہ دعویٰ ہے کہ ہم کسی کی تحقیر نہیں کرتے، برا بھلا نہیں کہتے، معلوم نہیں مولانا کے نزدیک لفظ تحقیر و توہین کے کچھ اور معنی ہیں جو ہم نہیں سمجھتے یا مذکورہ بالا جملے مدح و منقبت کے موقع پر استعمال ہونے ہیں، اور یہ انا ولاغیری کا الزام بھی مولانا کی زبان سے کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے، مولانا اگر اپنے اس مضمون پر غور فرمائیں تو شاید انھیں خود حیرت ہو کہ یہ ایک انا ولاغیری کی بولتی ہوئی تصویر ہے، اس میں شروع سے لیکر آخر تک اس کے سوا اور کیا ہے کہ جماعت اسلامی جن باتوں میں اپنی کسی خصوصیت کی مدعی بھی نہیں ہے ان کے بارے میں بھی انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جماعت اسلامی ان کو اپنی مخصوص چیز سمجھتی ہے، اور پھر پورے زور و شور کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان چیزوں کو پیش کرنے کا سہرا ان کی جماعت کے سر ہے یا ان ہی میں وہ جماعت اسلامی کی پیش رو ہے، یہاں تک کہ جوش میں آ کر انھوں نے ان باتوں کے سلسلہ میں بھی اپنی سبقت اور پیش روی کا اظہار کر دیا ہے جن کا سرے سے اسلامی ہونا بھی ابھی ان کی اس وقت کے اکابر کے نزدیک مشتبہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں:- "(ان حضرات (مولانا محمد سجاد صاحبؒ، مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری وغیرہ) کی تصانیف مودودی صاحب کی تحریک سے تقریباً دس سال پیشتر مجلّد تحریر میں آ چکی ہیں، اور ناظرین کو تعجب ہوگا کہ اس نام کے ساتھ آ چکی ہیں جس نام پر آج مودودی صاحب فخر کر رہے ہیں اور اس کو پیش کرنے کو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی فکر کی ایجاد کا سہرا آپ ہی کے سر بندھا ہے)" اور آگے چل کر تو وہ غالباً یہ اشارہ بھی دینا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ انہی کا مال مسروق ہے چنانچہ لکھتے ہیں:-

"حضرت مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاری نے غالباً ۱۹۳۸ء میں حکومت الٰہی کا دستور مرتب کیا اور چند رسالے اس سلسلہ میں تصنیف کیے، ناظرین کو یہ خبر بھی حیرت کرنے گی کہ مولانا موصوف کے مسودات کا یہ ذخیرہ ان کے قیام گاہ سے سرقہ ہو گیا، بڑی کاوش کے بعد مولانا موصوف نے چند رسالے مرتب فرمائے" اسی طرح انھوں نے جماعت اسلامی کے دوسرے مخصوص ادعاؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ان کی مراد عا کو یہ کہہ کر توڑا ہے کہ اس میں اولیت اور اقدمیت کا مقام ان کے گروہ کو حاصل رہا ہے، افسوس ہے کہ گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ہم اس پرچے میں یہ پورا مضمون نقل نہیں کر سکتے ورنہ ناظرین خود اسے دیکھ کر اندازہ کر سکتے تھے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط، لیکن جو اقتباسات اوپر گذر چکے ہیں یا آئندہ نقل ہوں گے وہ غالباً اس اندازہ کے لیے کافی ہوں گے۔

بہرحال یہاں بھی ہمیں یہی صورت نظر آتی ہے کہ مولانا نے جو الزام ہم پر عاید فرمایا ہے وہ اس کے سوا نہیں ہے کہ پہلے خود انھوں نے عملی طور سے اس میں مبتلا ہونے کا اعلان فرما دیا، اب رہی یہ بات کہ مولانا کا یہ الزام ہمارے بارے میں کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے تو جہاں تک ہمارے عمل کا تعلق ہے، اس کی تردید کے لیے غالباً ابھی چند ماہ پیشتر ایک واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔ مولانا کو شاید ابھی یہ بات بھولی نہیں ہوگی کہ مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کے ضمن میں جمعیۃ العلماء، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کے تین نمائندوں نے باہم مشورے کے بعد جو مشترکہ قرارداد مشترکہ کوشش کے سلسلہ میں تجویز کی تھی اس کو واحد نمائندگی کے جذبہ کے تحت ٹھکرا دینے والی جماعت جماعت اسلامی نہیں تھی، کیونکہ اسے نہ کسی نمائندگی کی خواہش ہے اور نہ دعویٰ، بلکہ جمعیۃ العلماء ہی تھی، کیا اس کے بعد بھی مولانا جماعت اسلامی پر یہ الزام عائد کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھ سکتے ہیں۔ اور اگر مولانا کی مراد یہ ہے کہ ہم تحریری یا زبانی طور سے کچھ امور کے سلسلہ میں (جن کا مولانا نے تذکرہ فرمایا ہے) اپنی تخصیص کا دعویٰ کیا کرتے ہیں تو مولانا کے اطمینان کے لیے غالباً ہمارا یہ اعلان کافی ہوگا کہ ان امور کے سلسلہ میں ہمارا یہ ہرگز دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ہماری مخصوص چیزیں ہیں، جو اور دوسری جگہ نہیں پائی جاتیں، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ہم خود اس کا اعلان کیا کرتے ہیں کہ یہ چیزیں نئی ہیں اور نہ یہ کسی جماعت کی کوئی مخصوص چیز ہیں بلکہ وہ پرانی ہیں اور ہمیشہ اہل حق نے انھیں اپنایا اور پیش کیا ہے۔ بس زیادہ سے زیادہ جو بات ہم اس ضمن میں کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ باتیں محض پیش کرنے کی نہیں ہیں اور یہی ہم ہم وقت جمعیۃ العلماء سے بھی کہتے ہیں، رہے ان کے سلف تو وہ ہمارے نزدیک بھی محترم ہیں اور جن لوگوں نے ان باتوں کو عملاً اپنایا ہے اور جس حد تک بھی اپنایا ہے ہم دل سے اس کی قدر کرتے ہیں اور زبان سے اس کے اعتراف میں بھی کسی طرح کے بخل سے کام نہیں لیتے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم میں کچھ لوگ اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس پہلو کا پورا پورا حق ادا نہ کرتے ہوں یا ناواقفیت ہی کی بنا پر اپنے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہوں، لیکن مولانا یقین فرمائیں کہ یہ ناواقفیت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے، اس کو کبر و نخوت یا حسد و رشک کے جذبہ سے منسوب کرنا صحیح نہیں ہوگا اور ان شاء اللہ اس بارے میں صحیح معلومات حاصل ہونے پر ان کی اصلاح باسانی ہو سکتی ہے، یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے جو لوگ دین کا کام کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہوں ان کا عجب و کبر اور رشک و حسد کے جذبات میں مبتلا ہونا بڑی افسوسناک بات ہوگی، اس لیے اگر یہ ناگوار بحث ہمارے اس اعلان سے ختم ہو سکے کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ سب مولانا کے بزرگوں کی جن کو ہم بھی بزرگ سمجھتے ہیں کہی ہوئی باتیں ہیں تو اس سے بھی کوئی انکار نہیں ہے، دینی کام جن لوگوں نے بھی کیا ہو خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں وہ ہمارے احترام کے مستحق ہیں اور اب یا آئندہ جو لوگ بھی کر رہے ہوں یا کرنے والے ہوں ان سب کی کوششیں قابل مبارکباد ہیں، اس میں لڑائی جھگڑے کی بات ہی کیا ہے، ہاں اس ضمن میں اپنی ایک غلطی کا ہمیں اعتراف ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض مواقع پر ہم نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ہمارے لٹریچر میں فلاں فلاں خوبیاں بھی ہیں، ہو سکتا ہے کہ مولانا نے کسی خاص زاویہ نگاہ سے اس کا مطالعہ کیا ہو تو یہ باتیں ان کی نگاہ کو کھٹکی ہوں لیکن میں مولانا کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ باتیں ہم نے فخر و مباہات کے جذبہ کے تحت نہیں کہی ہیں بلکہ ان کا محرک یا تو جذبہ تشکر و امتنان ہوتا ہے یا لوگوں کی ہٹ دھرمی کہ وہ انھیں ہمارے لٹریچر میں سوا کفر و ضلالت کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا، بہرحال اگر یہ باتیں بھی باعث ناگواری ہیں تو ہم ان کو بھی ترک کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن مولانا ہمیں کوئی ایسی تدبیر بتا دیں کہ ہمارے مخالف دھڑلے سے اس قسم کی باتیں کہہ دیا کرتے ہیں ان کو ہم اس سے روکنے کا کیا انتظام کریں، مثلاً دیوبند ہی کے ایک رسالہ میں دارالعلوم دیوبند ہی کے ایک فاضل کے قلم سے حسب ذیل عبارتیں شائع ہوئی ہیں۔

کسی تقریب میں ان سے سوال کیا تھا کہ مجھے ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں اسلام اور کمیونزم پر بحث ہو، اسی کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

---

۲۵ سال ایک سیٹی کی مشہور کتاب ... حکومت الٰہیہ ... جس میں یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہیں کہتے اور دوسروں نے بھی یہ باتیں کہی ہیں۔

"افسوس ہو کہ جن علماء کرام پر جماعت المسلمین کو بھروسہ تھا اور جو منصب کے اعتبار سے باطل سے جنگ کرنے میں صف اول کے مجاہد ہونے چاہئیں تھے، انھوں نے کمیونزم کی تحقیق و تنقید میں کوئی تحریری کارگزاری نہیں دکھائی، اگر کچھ کیا ہے تو مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی سے جماعت اسلامی کی کوئی بھی بحث اور جد و جہد خواہ وہ کتنی ہی قرآن و حدیث کے مطابق ہو بعض حضرات کے نزدیک لائق اعتنا نہیں ہے اس لیے اس کا تذکرہ ممکن ہے آپکو بھی پسند نہ ہو بہرحال ہمارے اکثر علماء چونکہ متحدہ قومیت کے اثبات و احقاق میں بے حد مصروف تھے اس لیے کمیونزم پر قلم نہ اٹھا سکے، چند کتابیں ہیں جو جماعت اسلامی کے واسطے سے قوم کو ملی ہیں (۱) اشتراکیت اور نظام اسلام (۲) اشتراکیت اور اسلام (۳) ہیگل مارکس اور اسلام، مزید مطلوب ہوں تو آپ جماعت اسلامی رامپور سے خط و کتابت کر سکتے ہیں" (تجلی ماہ اگست ص۵۱)

بہرحال مولانا محمد میاں صاحب کا مضمون ان دو پہلوؤں سے ہمارے لیے تعجب انگیز ہونے کے ساتھ افسوسناک بھی ہے ایک اس پہلو سے کہ باوجود صلح پسندانہ رجحانات رکھنے کے انھوں نے اس نازک موقع پر جماعت اسلامی کی مخالفت کرنا ضروری سمجھا اور جمعیۃ کی طرف سے اس کام کی ابتداء ان کے مضمون سے ہوئی، اور دوسرے اس پہلو سے کہ ان جیسے ثقہ اور بزرگ کے بارے میں ہم جس سنجیدگی اور متانت کے متوقع تھے اس کے خلاف انھوں نے خواہ مخواہ جا بجا غیر مناسب طنز و تعریض کا رویہ اختیار فرمایا۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑی بے انصافی ہوگی اگر مولانا کے اس مضمون کے ایک خوش گوار پہلو کا اعتراف نہ کریں اور اس پر ان کی خدمت میں شکریہ اور مبارکباد پیش نہ کریں اور وہ پہلو یہ ہے کہ انھوں نے اس مضمون میں جماعت اسلامی کی ان تمام باتوں کی صحت کا اعتراف فرما لیا ہے بلکہ ان باتوں کو اپنے اکابر کا طغرائے امتیاز قرار دیا ہے جس کو سن کر یا دیکھ کر خود ان کے حلقے کے معتقدین نے ہمارے بارے میں کفر و ضلالت کا فتویٰ صادر فرما دیا ہے۔[1]

جماعت اسلامی جن باتوں پر زور دیتی ہے وہ اس کے ماسوا اور کیا ہے کہ مسلمان اسلام کو بطور ایک ضابطہ حیات کے اپنائیں اور اس کو اپنے جملہ شعبہ ہائے زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کریں اور اس کو دوسروں تک بھی پہونچائیں اور اس کو عملاً برپا کرنے کے لیے متفقہ کوشش عمل میں لائیں۔ اور ان ہی باتوں کو مولانا موصوف نے اپنے اکابر کا مقصود اور مطمح زندگی قرار دیا ہے خود مولانا کی عبارتیں ملاحظہ ہوں:۔ "(الف) باعث فخر و مباہات اگر ایسی تصانیف ہیں جن میں اسلام کی سیاست اور اسلامی نظریات کے بموجب حکومت قائم کرنے اور اس کو چلانے کی صورتیں بیان کی گئی ہوں تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ کتابوں کا وہ بے شمار ذخیرہ جو سلف و خلف کی تصانیف کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اس کو ہم کس طرح نظر انداز کر دیں" اس کے بعد سلف صالحین اور متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہما کے تصنیفی کارناموں کا تذکرہ فرمانے کے بعد مولانا نے مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب اور مولانا محمد میاں صاحب منصور کے اسمائے گرامی پیش کیے ہیں جنھوں نے ان کے ہی الفاظ میں:۔ "ان مسائل کے اوپر اس درجہ منضبط اور مستحکم بحث کی ہو کہ آج تک یہ ضبط و استحکام مودودی صاحب یا ان کی جماعت کی کسی تصنیف کو حاصل نہیں ہو سکا" اس کے بعد وہی عبارت ہے جو اوپر مثال ۲۳ کے حوالہ میں گذر چکی ہے اسے ہمارے حاکر پڑھ لیجیے اور پھر آگے بڑھیے۔ "سب سے پہلے مولانا موصوف (محمد میاں صاحب منصور) کا فارسی کا رسالہ "حکومت الٰہی" آپ کے فرزند ارجمند مولانا حامد الانصاری غازی نے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا، دوسری مرتبہ رسالہ اردو ترجمہ کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں احقر کے زیر اہتمام کتب خانہ فخریہ مرادآباد نے شائع کیا ایسے ہی ایک دوسرا رسالہ "امامت امت کا سیاسی نظام" بھی اسی سال شائع کیا گیا، ایک تیسرا رسالہ جو اسی اسلوب پر ہے جس میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کی گئی ہے "سورۂ فاتحہ کی سیاسی تفسیر" کے نام سے رسالہ قائد میں شائع کیا جا چکا ہے، فارسی کا ایک رسالہ "انواع الاول" جس میں حکومت کی تمام قسموں پر بحث کرتے ہوئے اسلامی حکومت کے طرز اور اسلامی طریق فکر کو نہایت بہتر اسلوب پر مرتب کیا گیا ہو اشاعت پذیر ہو چکا ہے اب دوسری مرتبہ زیر طباعت ہو، حضرت مولانا محمد میاں صاحب کے رسائل کے مختصر تعارف کے بعد دوسرے بزرگ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کا رسالہ اسی موضوع پر بہت بہتر رسالہ ہے مولانا نے اسی موضوع پر ایک مفصل تصنیف مرتب کی تھی، افسوس یہ ہے کہ پوری کتاب شائع نہیں ہو سکی ان کی وفات کے بعد اس تصنیف کا ایک حصہ مولانا منت اللہ صاحب مونگیری نے شائع کیا ہے، اس کا نام حکومت الٰہی ہے رسالہ کی اشاعت اگرچہ ۱۹۴۰ء میں ہوئی ہو مگر اس کے مسودات اس سے بہت پہلے مرتب ہو چکے تھے" اس اقتباس کے پڑھ لینے کے بعد کیا کوئی شخص انصاف کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ جماعت اسلامی دین کی کوئی "محدث" شکل پیش کر رہی ہے یا اس کا جرم اس کے سوا اور بھی کچھ ہے کہ ہم ان بزرگوں کے ساتھ صرف اظہار عقیدت ہی کافی نہیں سمجھتے، بلکہ اپنی امکانی حد تک ان کے افکار کے بموجب کچھ تگ و دو بھی کرنا چاہتے ہیں، (ب) "مختلف اشخاص اور اداروں کی تصنیفات اور مطبوعات کا حوالہ دیتے ہوئے:۔ ...... کی قابل قدر مطبوعات جن میں زیادہ تر مسائل حاضرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے بحث کرتے ہوئے فکر اسلامی کو ہر شعبہ زندگی میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے ان تمام مضامین اور تصنیفات کو کس طرح نظر انداز کر دیں" ہماری ہرگز یہ خواہش نہیں ہو کہ آپ ان کو نظر انداز کر دیں اور نہ ہم خود ان کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں، البتہ اسی کے ساتھ ہماری خواہش یہ بھی ہے کہ محض داد و تحسین کی حد تک ان مضامین و تصنیفات سے واسطہ نہ رکھیں بلکہ ذاتی ان کو اپنے عمل کی بنیاد بنائیں۔ (ج) اس کے تحت ہم جو عبارت نقل کرنی چاہتے تھے وہ مثال ۲۲ صفحہ ۶۱ میں گذر چکی ہے اس لیے یہاں مکرر نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے اس صفحہ پر اسے لوٹ کر دوبارہ پڑھ لیجیے البتہ بعد کے فقرے بھی پڑھنے کے قابل ہیں اس لیے وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔ "۱۹۲۱ء کی تحریک میں علماء کرام نے جس انداز سے حصہ لیا اور جو طریق فکر ان کی جد و جہد کا سنگ بنیاد تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جنہوں نے ان الحکم الا للہ العالم کے قرآنی اصول پر اپنا امیر مجلس تحریکی اور قاضی مقرر کر لیا تھا، ان تحریکات کے سلسلہ میں اگر انصاف کرنے میں بخل نہ کیا جائے اور حضرت شیخ الہند کی تحریک کو بھی سامنے لایا جائے تو مودودی جماعت کے فخر و مباہات کی تصدیق وہی کر سکتا ہے جس کے لیے بر خود غلط کے علاوہ اور کوئی لفظ موزوں نہیں ہو سکتا۔"

---

[1] اور غالباً ان حضرات کو مولانا کے یہ اعترافات جو ناقابل تردید واقعات و شواہد پر مبنی ہیں کچھ پسند نہیں آتے ہیں اور کیا عجب کہ جماعت اسلامی سے بے تعلقی کا اعلان جس کا اوپر حوالہ آ چکا ہے اس کا ایک محرک علاوہ سیاسی محرکات و مصالح کے ان حضرات کی یہ ناگواری بھی ہو،

سنہ ۱۹۱۹ء میں وہ جماعت قائم کی گئی جو مودودی صاحب کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت جماعت ہے یعنی جمعیۃ العلماء ہند ہے جس کو قائم کرنے کا منشا ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر اسلام کا طریق فکر قائم رہے، اور جب انقلابی تحریک کی بنیاد ۱۹۱۷ء میں پڑی تھی اور جس کا نتیجہ لامحالہ یورپین طرز کی جمہوریت ہوتا تھا، اس انقلاب کے دور میں مسلمان اپنے طریق فکر کو فراموش نہ کر سکیں جس خاص نظام کو حکومت الٰہیہ کہا جاتا ہو، علماء امت نے اس سے ایک لمحہ کے لیے بھی صرف نظر نہیں کیا اور تحریک امارت شرعیہ کی داغ بیل ڈالی گئی ہے۔"

مولانا نے یہاں جمعیۃ العلماء کے تعارف میں اگرچہ غالباً مصالح وقت کے تحت وہ زور دار الفاظ استعمال نہیں فرمائے ہیں جو پہلی تحریکات کے ضمن میں وہ لکھ چکے ہیں در آں حالیکہ ان کے پہلو بہ پہلو جمعیۃ کے ذکر کا تقاضا یہی تھا بالخصوص جبکہ مولانا کے بقول جمعیۃ ان ہی تحریکات کے نقش قدم پر قائم ہوئی ہے، لیکن پھر بھی مولانا کے الفاظ سے ــ اگر وہ مبنی بر حقیقت ہیں ــ جمعیۃ کے بارے میں جو تصور قائم ہوتا ہے، اس کے لحاظ سے تو بظاہر ہمیں اس میں اور جماعت اسلامی میں کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا، پھر آخر یہ کیا ہے کہ آج جمعیۃ کو جماعت اسلامی سے اس شد و مد کے ساتھ اعلان تبری کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اور اس کی مخالفت میں یہ زور و شور دکھلایا جا رہا ہے۔

بہر حال ہم خوش ہیں کہ مولانا نے تاریخی واقعات و حقائق بیان فرما کر ہماری دعوت اور کام کی صحت کی توثیق فرما دی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزاء خیر عطا فرمائے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ باتیں کچھ اس جذبہ کے تحت پیش نہیں فرمائی ہیں کہ لوگ کوئی ان سے اثر لیں، بلکہ ان کا مدعا اتنا ہی ہے کہ جماعت اسلامی جو باتیں پیش کرتی ہے ان کے بارے میں ان کے گروہ کی اولیت و سبقت نمایاں ہو سکے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون کے آخر میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ان باتوں سے بھی کوئی ربط نہیں رکھتا، چنانچہ وہ علماء جمعیۃ کے دینی تفقہ اور سیاسی بصیرت کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔ "انھوں نے سلف کی تاریخ کو پڑھ کر اپنے لیے سبق حاصل کیا، وہ پوری طرح سمجھتے تھے کہ ان الحکم الا للہ کا مقدس کلمہ اسلام کی تاریخ میں بارہا ایسے مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؓ جیسے مقدس صحابی نے جن کو لسان رسالت نے باب العلم قرار دیا ہے، یہ فرمایا، کلمۃ حق ارید بہا الباطل، آج اس دور میں کہ سب طرف طاغوتی طاقتیں چھائی ہوئی ہیں ان الحکم الا للہ کے نمائشی بورڈ سے عوام کو مسحور کرنا، ایسی غلطی ہے جو قرن اول میں حضرت علیؓ کے مقابلہ کے لیے تعمداً کی جا چکی ہے" ان الفاظ کو پڑھ کر ہم حیران ہیں کہ ابھی مولانا کیا فرما رہے تھے اور اب دفعتاً کیا فرمانے لگے۔

ابھی تو وہ حکومت الٰہیہ کو اسلامی فکر اور اس کی دعوت کو اپنے اسلاف و اکابر کا طغرائے امتیاز قرار دے رہے تھے اور ابھی اسی کو خارجیوں کا نعرہ باطل بنا رہے ہیں اور پھر لطف بات یہ ہے کہ انھوں نے یہاں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا ہے کہ خارجیوں کی مراد باطل کے مقابلہ میں اس کلمہ کی مراد حق کیا ہے؟ یا معاذ اللہ قرآن کی اس آیت کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں؟ اور ایک بات اور بھی ہمارے ذہن میں الجھن پیدا کر رہی ہے، کاش مولانا اس پر بھی کچھ روشنی ڈالتے کہ اس زمانہ کے حضرت علی کون ہیں جن کے خلاف یہ "نعرہ باطل" لگایا جا رہا ہے۔ مولانا آگے چل کر فرماتے ہیں:۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی کے وہ تیرہ سال جو آپ نے مکہ مکرمہ میں گزارے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے، وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے طریق عمل پیش کرتے ہیں، علماء امت کا فرض ہے کہ وہ ملت و ملک کے حالات کا جائزہ لیں اور یہ غور کریں کہ ان دونوں زندگیوں کے کس سرچشمہ سے ان کو سیرابی حاصل کرنی ہے اور ان کے حالات کس زندگی کے حالات سے منطبق ہوتے ہیں یا وہ مدنی زندگی کے دور امامت و سیادت سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں، اس فرق کو نظر انداز کر کے ایک جوش آمیز تقریر کو اختیار کر لینا (کچھ طعن آمیز فقرے) اسلام یا مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کہی جا سکتی۔" مولانا کی یہ آخری سطریں خاص طور سے ہمارے لیے تکلیف دہ ثابت ہوئیں کیونکہ ان کا کھلا ہوا مقصد جماعت اسلامی پر اعتراض کرنا ہے، لیکن ان الفاظ سے یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ وہ کس چیز پر اعتراض کرنا چاہتے ہیں اور مکی زندگی کی وہ کیا خصوصیات ہیں جو ان کے نزدیک جمعیۃ العلماء اختیار کر رہی ہے اور ہم ان کو نظر انداز کر رہے ہیں، مولانا کو شاید دھوکا ہوا ہے، مکی اور مدنی زندگی کے فرق کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا اور نہ بہ ثبات عقل و ہوش کوئی ایسا کر سکتا ہے، البتہ اس کے ساتھ ہماری خواہش یہ ضرور ہے کہ مکی زندگی کا خاکہ اپنے ذہن سے تیار نہ کیا جائے، بلکہ وہی رکھا جائے جو فی الواقع تھا، ہم یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمارا طرز عمل ہر حیثیت سے اس حقیقی خاکہ کے مطابق ہی ہو، ہم حالات کی ناسازگاری اور اپنی کمزوریوں کو زیادہ سے زیادہ رعایت کا حق دے سکتے ہیں لیکن ہم اس بات کو کسی طرح صحیح قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے کہ اس سے آگے بڑھ کر مکی زندگی کا نقشہ ایسا بیان کرنا شروع کر دیں کہ جس سے ہماری کمزوریاں چھپ جائیں اور وہ اصلی نقشہ کچھ سے کچھ ہو جائے اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہمارے نزدیک جمعیۃ العلماء کا موجودہ طرز فکر و عمل اسی بات کے مترادف ہے، تفصیل کا موقع نہیں ہے، البتہ ہمارا تصور مکی زندگی کے سلسلہ میں یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کی بنیادی دعوت پیش کرنے کا تعلق ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے مشکل ترین حالات میں بھی اس کو مصالح پر قربان نہیں کیا ہے۔

اور اگر ایسا ہے تو مولانا کو چاہیے کہ اشاروں اشاروں میں بات کرنے کے بجائے تفصیل سے کام لیں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس پر کچھ دلیل بھی ارشاد فرمائیں ہم اس پر غور کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہیں۔

نوٹ:۔ جگہ کی قلت کی وجہ سے مجبوراً قلم کو خفی کر دینا پڑا ہے۔ ادارہ اس پر ناظرین سے معذرت خواہ ہے۔

(بقیہ) جواب :- مخدومی السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ... رمضان المبارک موصول ہوا، اگر یہ مجوزہ اجتماع حسب تجویز سابق اواخر شوال یا اوائل ذوقعدہ میں ہی ہو جناب کی تجویز کا علم ہونے کے بعد مجھے اس میں کوئی عذر نہیں ہے، رہا اس تاخیر کے نقصان کا وہ پہلو جس کا میں نے اپنے پچھلے خط میں تذکرہ کیا تھا تو میری اب بھی خواہش یہی ہے کہ اگر اس کا تدارک کا کوئی مناسب بندوبست ہو سکتا تو بہتر تھا لیکن اگر کسی وجہ سے وہ پہلو آنجناب کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا ہے تو میں اس کے لیے بھی اصرار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا، بہتر ہے حالات کو ان کی رفتار پر چلنے دیا جائے، ممکن ہے اس میں کوئی خیر کا پہلو نکل آئے۔ آنجناب کے مکتوب گرامی سے مجوزہ اجتماع کے عنوانات بحث کا علم ہوا، میں چونکہ آنجناب سے شرف نیاز حاصل کرنے کی دیرینہ خواہش رکھتا ہوں اس لیے ملاقات کی جو تقریب بھی پیدا ہو سکے میں اسے خوش آمدید کہنے کے لیے تیار رہوں گا اس بنا پر اگر آپ چاہتے ہیں تو مذکورہ عنوانات پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے لیکن میں یہ ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میرے خیال میں ہماری ملاقات و گفتگو کے اہم اور ضروری مسائل وہ ہیں جو خود جماعت کے ضمن میں ہیں، میرے نزدیک ان مسائل سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ جماعت جو دعوت بنیادی طور سے پیش کرتی ہے وہ آپ حضرات کے نزدیک کہاں تک قابل قبول ہے، کیونکہ اس ایک مسئلہ کے حل نہ ہونے کی بنا پر ہم میں اور آپ میں ایک زبردست بُعد پایا جاتا ہے جو بدقسمتی سے گوناگوں خرابیوں کا باعث ہے اور جس کا خاص طور سے اس زمانہ میں باقی رہنا، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے انتہائی نقصان کن ہے، بلکہ میرا احساس تو یہ ہے کہ آنجناب کی جماعت اسلامی کے خلاف موجودہ بدگمانیاں بھی درحقیقت اسی کا نتیجہ ہیں کہ آنجناب کو ہماری اصل دعوت سے براہ راست واقفیت حاصل نہیں ہو سکی ہے اس لیے میری اولین خواہش یہ ہے کہ آئندہ اجتماع میں سب سے پہلے تحریک اسلامی کی بنیادی باتوں کو موضوع بحث بنایا جائے جس کے ضمن میں مذکورہ باتوں کے بارے میں بھی آپ سے آپ ہمارا نقطۂ نظر کھل کر سامنے آ جائے گا، لیکن اگر کسی وجہ سے آنجناب اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور وہی مسائل آپ کے نزدیک زیر بحث ہو سکتے ہیں جن کا والا نامہ میں آنجناب نے ذکر فرمایا ہے تو میری سب سے پہلی گذارش یہ ہے کہ "زندگی" کے تازہ پرچے میں جس کی ایک کاپی کل ارسال خدمت کی جا چکی ہے "تصریحات" کے عنوان سے میں نے ان میں سے اکثر مسائل کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی ہے براہ عنایت اسے مطالعہ فرمالیں اور پھر اس کے بعد مطلع فرمائیں کہ عنوانات مذکورہ پر گفتگو کی ضرورت اب بھی باقی ہے اور اگر ہے تو کن مسائل پر اور کن پہلوؤں سے ۔

ہمارا نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ امور مذکورہ میں سے بعض سے تو ہمیں براہ راست تعلق ہو سکتا ہے کیونکہ ہم تفسیر بالرائے کو بھی غلط سمجھتے ہیں اور محققین اہل سنت کے مسلک سے خروج کو بھی اسی لیے اگر ان کے خلاف ہمارے لٹریچر میں کوئی بات پائی جاتی ہو تو وہ یقیناً قابل اصلاح ہے اور اس کے لیے ہم ہمیشہ سے آمادہ ہیں، لیکن ان کے علاوہ جو دیگر مسائل ہیں ان سے ہماری جماعت کو براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جماعت اس طرح کے امور کے تصفیہ کے لیے قائم نہیں ہوئی ہے، اس میں ہر اس شخص کے لیے گنجائش ہے جو کتاب و سنت کو مرکز حق تسلیم کر کے دین کی خدمت کے لیے آمادہ ہو خواہ وہ کسی امام کا مقلد ہو یا اہل حدیث ہو اور مروجہ تصوف کو مانتا ہو یا نہ مانتا ہو، اس ضمن میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ جن امور مذکورہ باتوں کو ہم قابل بحث سمجھتے ہیں ان کے سلسلے میں بھی ہمارے نزدیک زیادہ مناسب یہ ہو کہ حضرات علمائے کرام ہم سے گفتگو اور مباحثہ کرنے کی بجائے لٹریچر سے از خود ان مقامات کو متعین کر لیں جن پر ان کو اعتراض ہے اور خاص اس کام کے لیے کسی اجتماع کی بھی ضرورت نہیں ہے، ایک دو آدمی جن کو آپ متعین فرما دیں اس کام کو اپنے طور سے کر سکتے ہیں اور جب یہ کام ہو جائے تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ خود مصنف کتاب کو براہ راست قابل اعتراض باتوں سے مطلع کر دیا جائے ان کا اعلان بھی ہے اور ان کی ذات سے ہم توقع بھی رکھتے ہیں کہ وہ یا تو ان کو صحیح سمجھ کر آئندہ اصلاح کر لیں گے یا ان کے سلسلہ میں آپ حضرات کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں گے، لیکن اگر ایسا کرنے میں کوئی امر مانع ہو تو اس کام کے لیے ہماری خدمات بھی حاضر ہیں، اور میں اپنی حد تک یقین دلاتا ہوں کہ ہر چند مودودی صاحب کی تمام کتابیں ہم پوری طرح صحیح پاچکے ہیں اور نہ ہر طرح ذمہ دار، لیکن اگر ہمیں یہ اطمینان ہو جائے کہ ان کی کوئی بات خلاف کتاب و سنت ہے تو ہم حتی الوسع اس کو رفع کرنے یا اس سے اپنی حد تک بے تعلقی کا اظہار کرنے میں دریغ نہیں کریں گے، والسلام ۔ ابواللیث ۔ ۲۲ رمضان ۔

مولانا کے نام قیم جماعت کا خط

مرکز جماعت اسلامی ہند، ۶ شوال ۱۳۷۰ھ — محترم المقام زید مجدکم — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بتاریخ ۲۶ رمضان ۱۳۷۰ھ مولانا ابواللیث صاحب نے ایک خط آنجناب کی خدمت اقدس میں ارسال کیا تھا لیکن ابھی تک اس کے جواب کا انتظار ہے، خط چونکہ معمولی ڈاک سے روانہ کیا گیا تھا، اس لیے اندیشہ ہے کہ شاید نہ پہونچا ہو اگر ایسا ہے تو مطلع فرمائیں تاکہ اس کی نقل روانہ کی جائے بصورت دیگر براہ کرم جواب سے سرفراز فرمائیں ۔ والسلام ۔ "قیم"

جواب

محترم المقام زید مجدکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔

والا نامہ مولانا ابواللیث صاحب کا پہونچ گیا، حسب الحکم اطلاعاً عرض ہے ۔ والسلام ۔ مولانا حسین احمد غفرلہ ...... الہ آباد ۱۲ شوال ۔

نوٹ: "آپ حج کس طرح کریں" شائع کردہ مکتبہ الفرقان لکھنؤ، تبصرہ کے لیے موصول ہو چکی ہے، افسوس ہے جگہ کی کمی کی وجہ سے اس پر مفصل تبصرہ نہیں کیا جا سکا، اس کتاب سے زائرین بیت اللہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔

"ادارہ"

تدبر القرآن

(۹)

سورہ بقرہ از آیت (۷۵) تا آیت (۸۶)

مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ — تو کیا (اے ایمان لانے والو! ایسے سخت دلوں سے) تم یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے[1]؟

---

[1] "بات مان لیں گے؟" یعنی تمہاری تبلیغ سے متاثر ہو کر دعوت قرآنی پر لبیک کہیں گے، اور تمہاری طرح حق کے پیرو اور اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے؟

تمام بنی اسمٰعیل پر دینی حیثیت سے یہود کا زبردست رعب بیٹھا ہوا تھا، انھیں وہ صاحب کتاب سمجھتے تھے، جب کہ اس طرح کا کوئی "آسمانی سرمایۂ فخر" ان کے اپنے پاس نہ تھا۔ جب یہ لوگ قرآن پر ایمان لائے تو قدرتی طور پر انھیں یہ خیال ہوا کہ قرآن کی بنیادی تعلیمات (توحید، معاد، نبوت، وحی، ملائکہ اور جزا و سزا وغیرہ) سے بالکل نامانوس، بلکہ منکر ہونے کے باوجود جب ہم پر حق واضح ہو کر رہا اور قرآن کے اطمینان بخش دلائل نے ہمارے دلوں میں یقین پیدا کر دیا تو پھر بھلا یہ حضرات یہود، جو ان تمام باتوں کو پہلے ہی سے جانتے پہچانتے رہے ہیں، اس دعوت حق کے ماننے میں کوئی پس و پیش کیوں کرنے لگے؟ یہ لوگ تو ماشاء اللہ پہلے ہی سے ان حقائق سے نہ صرف مانوس رہے ہیں بلکہ ان کے علمبردار اور داعی بھی رہے ہیں۔ لیکن جب ان یہودیوں نے ان منطقی توقعات کو اپنی اسلام دشمن سرگرمیوں سے بے بنیاد ثابت کر دیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی اور ان پر اس سے ایک بددلی سی چھا گئی۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو یہاں سمجھا رہا ہے کہ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ

حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنا، اس کے مدعا کو اچھی طرح سمجھا، اور اس کے بعد جان بوجھ کر اس میں تحریف کر ڈالی،[۵] اور (آج ان کی روش یہ ہے کہ) جب (قرآن اور صاحب قرآن پر) ایمان لانے والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "ہم بھی (ان پر) ایمان لاتے ہیں" مگر جب باہم تخلیہ میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "کیا تم لوگ ان (مسلمانوں) کو وہ باتیں بتا دیا کرتے ہو، جنھیں اللہ نے تم پر

(بقیہ حواشیہ صفحہ گذشتہ) جن لوگوں کے دلوں کی سیاہی اور سختی اس درجہ کمال کو پہنچی ہوئی ہے ان سے تم ایسی معصوم توقعات کیوں وابستہ کرتے ہو۔ اقرار حق کی توفیق قومی مشیخت اور آبائی ادعائے دین داری سے یا ڈگریوں، علمی سندوں اور فضیلت کی دستاروں سے نہیں ملتی، وہ تو قلب کے گداز سے ملتی ہے، اور یہی وہ متاع ہے جس سے انکا جیب و دامن بالکل خالی ہے۔ جن آیات الٰہی کو سن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، ان ہی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں، جو دین انھیں دیا گیا تھا، اسے مسخ کر کے، اپنی خواہشوں کے مطابق ڈھال چکے ہیں، اصل کتاب الٰہی (توریت) کے ساتھ ان کا تعلق صرف یہ رہ گیا ہے کہ ان کے جذبات فخر کو تسکین دینے کا ایک آلہ ہے، وہ اس کا نام صرف اس حد تک لیتے ہیں کہ دنیا ان کے "صاحب کتاب" "واقف حق" اور "علم بردار شریعت" ہونے کی فضیلت کا اعتراف کرلے۔ باقی جہاں تک عمل کا تعلق ہے، کتاب کے پیرو وہ نہیں ہیں، بلکہ ان کی پیرو خود وہ کتاب ہے۔

(حواشی صفحہ ھذا) [۵] "ایک گروہ" سے مراد ان کے علماء اور دینی پیشوا ہیں۔ "اللہ کے کلام" سے توریت اور زبور اور وہ صحیفے مراد ہیں جو انبیائے بنی اسرائیل پر نازل ہوتے رہے ہیں۔ "تحریف" کے لفظی معنی ہیں کسی چیز کو اپنی اصل جگہ سے ہٹا کر کنارے کر دینا۔ اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کلام کو اس کے اصل مدعا سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دیے جائیں جو کہنے والے کے منشا کے خلاف ہوں، یا پھر اس غرض کے لیے اس کے الفاظ ادھر ادھر کر دیے جائیں، یا بعض الفاظ کی شکلیں بدل دی جائیں، یا انھیں عبارت کے درمیان سے بالکل نکال ہی دیا جائے۔ یہ ساری حرکتیں اہل کتاب کے علماء خدا کی امانتوں یعنی اس کی دی ہوئی کتابوں میں کرتے رہے ہیں، جس کی تفصیل بڑی طولانی ہے۔

یہ یہود کے نقض عہد کی چوتھی شہادت ہے، اور سب سے اونچی اور آخری مثال۔

اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ

منکشف[۵۱] فرمایا ہے، تاکہ کل تمہارے رب کے سامنے وہ ان کے ذریعہ تم پر حجت قائم کریں[۵۲]؟ کیا تم اتنی سمجھ بھی نہیں رکھتے؟ کیا (وہ ایسے جہل کی باتیں کرتے ہیں) اور انھیں نہیں معلوم کہ اللہ (تو خود ہی) ان کی ساری باتوں کو جانتا ہے، ان کو بھی جن کو وہ چھپاتے ہیں، اور ان کو بھی جنھیں وہ ظاہر کرتے ہیں؟ پھر ان میں ایک گروہ جہلا[۵۳] کا ہے، جنھیں کتاب الٰہی سے کوئی واقفیت نہیں، (جن کے علم دین کا تمام ترسرمایہ) چند آرزوئیں ہیں۔

---

[۵۱] "ان باتوں" سے مراد دو طرح کی چیزیں ہیں، ایک تو وہ پیشین گوئیاں، جو نبی اکرمؐ کے متعلق توراۃ میں موجود تھیں، اور جنھیں اب چھپانے کی پوری کوشش کی جا رہی تھی۔ تاکہ مخالفت کامیاب ہوسکے۔ دوسری چیز دین کے وہ اصول اور تصورات اور شریعت کی وہ تعلیمات تھیں، جنھیں یہودی علما، اور عوام اپنی دنیائے فکر و عمل سے خارج کرچکے تھے۔

[۵۲] یعنی قیامت میں جب تم سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کے بارے میں سوال ہوگا، تو تم یہ کہہ کر نہیں بچ سکتے کہ خدایا ہم نے انھیں پہچانا نہیں، اس لیے کہ یہ اہل قرآن جن کے سامنے جا کر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق پیشین گوئیاں بشرط حضوری میں، یا اپنی ذاتی مصلحت سے ظاہر کر آتے ہو، تاکہ تمہارے ادعائے ایمان سے وہ واقعی فریب کھا سکیں، اس وقت تمہاری زبان پکڑ لیں گے اور خدا سے کہیں گے کہ بارالٰہا! نہیں، ایسا نہیں ہے انھوں نے دانستہ قرآن کو ٹھکرایا تھا، اس لیے کہ ان لوگوں نے خود ہم سے کہا تھا کہ توریت میں نبی آخرالزماں کی بابت جو پیشین گوئیاں مذکور ہیں، وہ یہ ہیں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ان کا صحیح مصداق ہیں۔

یہ ان کے نقض عہد کی پانچویں شہادت ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے منجملہ اور باتوں کے ان سے بالتصریح یہ عہد بھی لیا تھا کہ جب بھی ہمارا کوئی پیغمبر تمہارے پاس جائے تمہیں اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ہوگا خصوصاً نبی آخرالزماں پر، (سورۂ آل عمران آیت ۸۱)

[۵۳] اس گروہ سے مراد عوام کا گروہ ہے اور "آرزوؤں" سے مراد ان کے یہ نظریات ہیں کہ ہم ہی نجات یافتہ گروہ ہیں، دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے، یہودیت نشان ہدایت ہے، ہم نہ صرف تمام عالم پر فضیلی برتری رکھتے ہیں، بلکہ خدا سے ہمارا خاندان ایک خاص رشتۂ قرب رکھتا ہے، ان کے ان سارے خود ساختہ نظریات کی تصریح خود اسی سورہ میں آگے آتی جائے گی۔ ان عقائد کو "آرزو" اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ ان کی نوعیت خالص دینی عقائد و نظریات کی ہے اور دین کے اصول و نظریات بہرحال توقیفی چیزیں ہیں، جن میں قیاس، گمان اور خواہش نفس کا کوئی دخل

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝ وَقَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ ٨٠

اور جو خالص اوہام کا شکار ہیں ___ پس ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب[۱۵] لکھتے ہیں پھر (اوروں سے) کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے عوض حقیر سا (دنیوی) فائدہ حاصل کرلیں۔ سو خرابی ہے ان کے لیے اس لکھنے پر، اور بربادی ہے ان کے لیے اس کمانے پر۔ ان کا کہنا ہے کہ "جہنم کی آگ ہمیں ہرگز نہ چھوئے گی، سوائے چند روز کے"۔ (اے نبی ذرا ان سے) پوچھو تو کہ "کیا تم نے اس بات کا خدا سے کوئی اقرار لے لیا ہے؟ (اگر ایسا ہے تو یقیناً) وہ کبھی بھی اس کی خلاف ورزی نہ کرے گا ___ یا پھر (واقعہ یہ ہے کہ) تم خدا کی طرف ایسی بات منسوب کر رہے ہو جس (کے فرمودۂ الٰہی ہونے) کا تمہیں کوئی علم نہیں؟"

(بقیہ حواشی صفحہ گذشتہ) نہیں۔ اب ان نظریات کی واقعیت کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی ان کی تعلیم نہیں دی، اور نہ اس کی کتاب "توریت" میں ان کا کوئی سراغ ملتا ہے، بلکہ وہ تو الٹی صاف صاف ان کی تکذیب کر رہی ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ نظریات ان جاہلوں کا مدارِ حیات بنے ہوئے ہیں، تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایمان کے جوہر، اور حسنِ عمل کی روح سے خالی تو یہ لوگ ہو گئے، مگر فلاحِ دنیا اور نجاتِ آخرت سے، جو بہرحال ایمان و عمل ہی کا ثمرہ ہے، بے نیازی اور بے رغبتی تو کسی طرح ممکن نہ تھی۔ یہ حرص تو انسان کے دل میں جوں کی توں ہی رہتی ہے۔ پس ان کے علماء نے دین میں غلو کرتے کرتے اپنی اور اپنے عوام کی اس حرص اور آرزو کو واقعات کی، اور پھر ان واقعات کو اصولِ دین کی حیثیت دے دی۔ پھر کیا تھا، عوام نے دونوں ہاتھوں ان کو لے کر سینے سے لگا لیا، کیوں کہ یہ وہ "اسمِ اعظم" تھا جس نے پلک جھپکانے ان کی ساری مشکلیں حل کر کے رکھ دیں۔

(حواشی صفحہ ھٰذا) [۱۵] یہ ذکر ان کے علماء کا ہے جنھوں نے بالعموم دین فروشی اور فتویٰ بازی کا کاروبار پھیلا رکھا تھا۔ "کتاب" کا لفظ کلامِ الٰہی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور احکامِ شریعت کے معنی میں بھی۔ اس جگہ یہ لفظ ان دونوں معنوں کا جامع ہے۔ علمائے یہود جب توریت لکھتے تو اس کی اصل عبارت کے ساتھ ساتھ ان تفسیروں اور اجتہادی مسئلوں کو بھی لکھتے جاتے جو سراسر ان کی اپنی یا اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی رائے کا نتیجہ تھے۔ اس طرح توریت کا متن اور اس کی تشریحات، دونوں چیزیں باہم خلط ملط ہو کر رہ گئیں، اور آج

(بقیہ حواشیہ بر صفحہ آیندہ)

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ
خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا
مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا
تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ
اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

ہاں (تم ضرور جہنم میں جاؤ گے) جو لوگ بھی بدی کمائیں گے اور (اس طرح کمائیں گے کہ بالآخر) ان کی بدیاں ان (کے دلوں) پر چھا گئی ہوں[ا]، وہ جہنمی ہیں، ہمیشہ کے جہنمی۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائیں۔ اور اعمال صالحہ کریں[ب]، وہ جنتی ہیں، سدا کے جنتی۔

(یاد کرو) وہ وقت جب ہم نے اولاد اسرائیل سے اس بات کا پختہ عہد لیا تھا کہ نہیں اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرنی ہے، (نہیں ہمارا حکم یہ ہے کہ) والدین کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرو۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کا پتہ لگانا ممکن نہیں رہا کہ کون سے الفاظ اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے ہیں اور کون سے تشریح و تفسیر کے طور پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔ آج تو خیر اس کا امکان ہی کیا باقی رہا، جس وقت ایسا کیا جا رہا تھا، اُس وقت تو تمیز کرنے والے لوگ موجود تھے، مگر ان کا حال بھی یہ تھا کہ عوام کے سامنے جب اس مخلوط کو پیش کرتے تو اس طرح کہ گویا یہ کالے حروف سب ہی یکساں ہیں، سب کو اللہ ہی کا کلام سمجھو۔ اسی طرح جب عام لوگ اُن سے شریعت کے فتوے پوچھتے، تو نفس کی خواہشوں، وقت کی مصلحتوں اور پیش کیے ہوئے نذرانوں کو سامنے رکھ کر فتوے مرتب کرتے، اور پھر شریعت کی چھاپ لگا کر پوچھنے والوں کے حوالے کر دیتے۔

(حواشی صفحہ ھٰذا) ا؎ "چھا جانے" کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی باگیں برائی کے ہاتھوں میں دے دے، اور گنہگاری سے آگے بڑھ کر گناہ پیشہ اور گناہ پرست بن جائے۔ ایسا شخص ضرور جہنم کا ایندھن بنے گا، خواہ اس کی زبان پر کیسے ہی دعوے یا نعرے اور اس کے نام کے ساتھ کیسے ہی القاب و آداب کیوں نہ ہوں، وہ کسی ولی اور نبی کا ہم خاندان نہیں، اس کا بیٹا ہی سہی۔

ب؎ یہاں قرآن حکیم کے انداز بیان سے سرسری طور پر نہ گذر جانا چاہیے، کیونکہ اس جگہ اس نے ایک اشارہ میں ہی ایمان و عمل کے تعلق کی بحث ختم کر دی ہے۔ "ایمان اور اعمال صالحہ" کا ذکر بجائے اس کے کہ "کفر کرنے اور دل پہ گناہوں کے چھا جانے" دونوں کے مقابلہ میں لایا جاتا، صرف "گناہوں کے چھا جانے" کے مقابلہ پر لایا گیا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ "گناہوں کا دل پر چھا جانا" ایمان کی موجودگی میں عملاً ممکن ہی نہیں۔ جس کا دوسرا پہلو یہ ہوا کہ ایمان کی موجودگی میں عمل صالح کا ہونا، خواہ وہ کسی مقدار میں ہو، بہر حال ضروری ہے۔

(بقیہ حواشیہ صفحہ آیندہ)

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ۝ ثُمَّ أَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسٰرٰى تُفٰدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ

سب لوگوں سے بھلی بات کہو[1] نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو[2] مگر ایک گروہ قلیل کے سوا تم سب پوری بے نیازی کے ساتھ اس عہد سے پھر گئے اور[3] یاد کرو وہ وقت جب ہم نے تم سے یہ عہد بھی لیا تھا کہ "اپنے (لوگوں کا خون نہ بہاؤ گے اور نہ اپنے (بھائیوں) کو گھروں سے نکالو گے" اور تم نے خود شاہد بنتے ہوئے اس کا اقرار بھی کر لیا تھا۔ مگر آج وہی تم ہو کہ اپنوں کا خون کیا کرتے ہو، اپنے ہی سے ایک گروہ کو اس کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو (اور وہ اس طرح کہ صریح) گناہ اور ظلم[4] کا ارتکاب کرتے ہوئے ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو پھر جب وہ قیدی بن کر تمہارے پاس آتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑاتے ہو، جب کہ انہیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی تمہارے لیے

(بقیہ حواشی صفحہ گذشتہ) اس موقع پر عمل صالح کا وہ اصطلاحی مفہوم نظر سے اوجھل نہ رہے جس کو کہیں اوپر وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] اسلامی ضابطہ معاشرت و اخلاق کی یہ ایک بنیادی دفعہ ہے۔ ہر انسان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو، تعلقات کے مدارج کا لحاظ اس سلوک میں تو ضرور کرنا چاہیے، لیکن دنیا کا ہر انسان، قطع نظر اس سے کہ اس کا نام، رنگ، وطن، مذہب، عقیدہ کیا ہے، اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کے ساتھ بھلا سلوک، انسانیت اور مروت کا سلوک کیا جائے۔ چنانچہ اس آیت میں ترتیب وار جن لوگوں کا ذکر آیا ہے، ان میں سے کسی کے ساتھ مسلم، غیر مسلم کی کوئی قید نہیں لگائی ہے، بلکہ عام حکم دیا گیا ہے۔ یہ وہ احکام ہیں جو ہمیشہ سے اسلامی نظام معاشرت کی ریڑھ کی ہڈی رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کیا حضرت آدمؑ کے زمانہ سے ہر داعی اسلام ان ہی بنیادوں پر انسانیت کی تعمیر کرتا رہا ہے۔

[2] "نماز" دوسرا نام ہے "صرف اللہ کی بندگی" کا، اور "زکوٰۃ" ایک جامع تعبیر ہے "والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں" کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کی۔

[3] پہلے اگلے پچھلے تمام یہودیوں کی عہد شکنی کا اصلی ذکر کیا گیا اب اس جگہ موجودہ یہود کے عہد سے پھر جانے کی ایک جزئی مثال دی جا رہی ہے تاکہ اسی ایک واقعہ سے ان کی عہد فراموشی کی پوری تصویر بنائی جا سکے۔

[4] آیت میں "اثم" اور "عدوان" کے الفاظ آئے ہیں۔ "اثم" کا تعلق اللہ تعالیٰ (بقیہ حواشی پر صفحہ آئندہ)

عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۞ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ

سرے سے حرام تھا۔[5] تو کیا تم کتابِ الٰہی کے کچھ حصّہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصّے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر بتاؤ تو سہی تم میں سے جن لوگوں کا طرزِ عمل یہ ہو، ان کی پاداش اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دُنیا کی زندگی میں بھی) خوار ہوں، اور قیامت کے روز سخت ترین سزا کی طرف منتقل کر دیے جائیں[6]! (یاد رکھو) تمہارے کرتوتوں سے اللہ بے خبر نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے عوض دُنیا خرید رکھی ہے، سو ان کی سزا میں کبھی کوئی تخفیف نہ ہوگی، اور نہ انھیں کہیں سے کوئی مدد پہنچے گی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سے ہے، اور عُدوان کا تعلق بندوں سے، یعنی اللہ کے حقوق کو فراموش کر دینا اثم ہے، اور بندوں کے حقوق کا پامال کر دینا عُدوان۔ ان دونوں لفظوں کے اکٹھا لانے کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ حرکت خدا اور بندگانِ خدا، دونوں کے حقوق تلف کر رہی تھی، جب کہ دین اور شریعت نام ہے ان ہی دوگونہ حقوق کی ادائگی کا۔ اور ان سے جو عہد لیا گیا تھا، وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہی دونوں حقوق پہچانیں اور ادا کریں، جیسا کہ ابھی اوپر گذر چکا۔

(حواشیہ صفحہ ہٰذا) [5] صورتِ حال یہ تھی کہ مختلف یہودی قبائل آپس کے برادرانہ اور دینی رشتے کاٹ چکے تھے، اور اب ان کے تعلقات کی بنیاد میں جاہلی عصبیتوں، مفاد پرستانہ کش مکشوں اور خاندانی خود غرضیوں پر اُٹھ رہی تھیں۔ بسا اوقات یہ جذبات یہاں تک اُبال کھاتے کہ ایک خاندان دوسرے کا اپنے گھروں میں رہنا دشوار کر دیتا، اور بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کو اتنا تنگ کرتا کہ اسے ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑتا۔ لیکن جب اس طرح وہ خاندان اپنے دینی اور قومی حلقۂ حمایت سے نکل کر غیروں کے درمیان جا بسا، اور اختلاف پیدا ہونے پر ان کے ہاتھوں قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتا، اور پھر اس "حادثہ" کی خبر اُن برادرانِ یہود تک پہنچی جنھوں نے اس کو جلاوطن ہونے پر مجبور کیا تھا، تو اس وقت کچھ تو ان کے قومی اور ملّی جذبات میں حرکت پیدا ہوتی، اور کچھ دین داری کا ذوقِ نمائش بر روئے کار آتا، یعنی انھیں یاد پڑتا کہ ہمارے بھائیوں کے ہم پر شریعت نے بڑے حقوق رکھے ہیں، اس لیے اگر یہ دوسروں کے ہاتھوں قیدی بن کر آئے ہیں تو ہمارا دینی فرض ہے کہ انھیں فدیہ دے کر چھڑا لیں۔ اس وقت فدیہ کی رقم جمع کی جاتی، اور قیدیوں کو چھڑا کر احکامِ شرع کی "اطاعت" اور دین داری کا حق

(بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ادا کر دیا جاتا۔ مگر جس وقت دین داری کے اس "پرفخر" کارنامے کو انجام دے کر وہ خود اپنے نفس کی مبارک بادوں سے مسرور ہو رہے ہوتے تھے، انہیں یہ یاد نہ پڑتا تھا کہ یہ نوبت آئی کیوں؟ اور ان کا ضمیر اندر سے یہ آواز نہ دیتا کہ تم نے جب ان لوگوں کو پریشان کر کے ترکِ وطن پر مجبور کیا تھا اس وقت تمہاری یہ شریعت نوازی کہاں مر گئی تھی؟ اگر تم انہیں گھر سے نہ نکالتے، تو قید و بند کی مصیبتوں میں یہ گرفتار ہی کیوں ہوتے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جب اپنے نفس کے جاہلی جذبات جوش میں آئیں، تو کتاب اللہ کے احکام ردی کی ٹوکری میں ڈال دو، اور جب یہ جذبات عداوت ٹھنڈے پڑے ہوئے ہوں، اور غیروں کے ہاتھوں میں خاندانِ اسرائیل کے افراد قید ہوں، تو تمہاری رگِ حمیت بیدار ہو جائے اور تورات کی آیتیں یاد آ جائیں، اُس وقت فدیے کا بندوبست کر کے دین داری کی سند حاصل کر لو۔ سوچو تو سہی یہ دین داری ہے یا دینداری کا ڈھونگ۔

۵۲ یہاں قرآن نے جس بات پر کفر کا اطلاق کیا ہے وہ احکام الٰہی کے ایک جزو کو عملاً ترک کر دینا ہے، نہ کہ اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دینا۔ اس سے ایک طرف تو اس جرم کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری طرف ایمان اور عمل میں جو رشتہ ہے، وہ بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ توراۃ کے ماننے والوں کا یہ تذکرہ قرآن کے ماننے والوں کے لیے بڑا حقیقت نما ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ چاہیں۔

۵۳ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک مستقل قانون ہے، وہ ایسی قوموں کو، جو ابھی تک اس کی بھیجی ہوئی کتاب کو نہ مان رہی ہوں، کم از کم دنیا میں جاہ و عظمت حاصل کرنے کا موقع دے دیتا ہے لیکن جو قوم اس کی کتاب پر ایمان لانے کا دعویٰ رکھتی ہو اور عمل حسبِ خواہش ہی کرتی ہو، وہ اس کی نگاہ میں بدترین مجرم ہے۔ وہ فی الواقع کتاب کی ماننے والی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک سنجیدہ مگر خطرناک مذاق کرنے والی ہے، اور اپنے طرزِ عمل کی بنا پر دوسرے بندگانِ خدا کو اس ہدایت کی طرف آنے سے روکنے کا قابلِ نفرت جرم کر رہی ہے جس کا نتیجہ نہ صرف آخرت ہی میں، بلکہ اس دنیا میں بھی ذلت و خواری، غلامی اور بے اطمینانی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اور وہ قوم خدا کے غضب کا نشانہ بن جاتی ہے یہ اس دنیا کے فرماں روا کی ایک مستقل سنت ہے، اس سے نہ کل کے یہود مستثنیٰ تھے نہ آج کے مسلمان، نہ کوئی اور۔

علماءِ کرام کی خدمت میں

از مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودیؒ

(ترجمان القرآن کی) گذشتہ اشاعت میں اُن فتووں اور اشتہارات کا ذکر آچکا ہے جو دیوبند، مظاہر العلوم، تھانہ بھون اور دہلی کے بعض مشہور علماء کے قلم سے نکلے ہیں۔ اب ہمیں ایک اور اشتہار وصول ہوا ہے جسے ہندوستان سے لاکر پاکستان میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

مولانا مولوی عبدالحمید بلند شہری مدرس مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ ضلع سہارن پور کے ایک خط کا وہ اقتباس ہے جو انھوں نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی عمت فیوضہم کو لکھا ہے، ذیل میں صرف وہ حصّہ ہے جس کا تعلق اس جماعت سے ہے جس نے اپنا نام جماعت اسلامی رکھا ہے۔

"یہ خیال اس وقت سے پیدا ہوا ہے جب سے وہ مودودیت جو گنگوہ میں صورت فتنہ اختیار کیے ہوئے ہے کچھ تبادلۂ خیالات اور کچھ اُن کے اخبارات کا مطالعہ نزدیک آگیا گیا یہ لوگ صحابہؓ تک متجاوز کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علیؓ ابن عمرؓ، عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہم کو احیاء تبلیغ دین میں متجاوز عن الاعتدال کے الفاظ اختیار کیے ہیں۔ نیز خود مسلک اعتدال میں فرماتے ہیں کہ میں نے اشخاص ماضی و حال بلا واسطہ دین کو کتاب السنۃ، کتاب اللہ سے سمجھا ہے۔ نیز حضرت حاجی علیہ الرحمۃ و مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کے متعلق لکھتے ہیں ان حضرات نے ابتدائے زندگی میں تو اچھا کام کیا مگر اخیر عمر میں ایسی سموم غذا مسلمانوں کو دے گئے ہیں کہ آج تک مسلمان اس کے زہر سے محفوظ نہیں ہے اور بھی تنقیدات تصوف پر بہت کی ہیں۔ بعض اہل گنگوہ نے دیگر بعض کو حضرت ابوسعید علیہ الرحمۃ کے مزار پر جانے سے روکتے ہوئے کہا کہ ایک سنیاسی ہے جو پتھروں میں پڑا ہے اور یہ مشہور مقولہ ہے مودودیوں کا کہ دیوبند مظاہر العلوم میں قربانی کے مینڈھے تیار کیے جاتے ہیں علماء پر زبردست ریمارک خاص کر ماضی و حال کے

بزرگوں پر غرض بالتفصیل پھر عرض کروں گا اس وقت یہ عرض کرنے کا مقصد ہے کہ آیا ہم مکمل کران لوگوں
کو جواب دیں کیونکہ خاص کر گنگوہ سے مجھ کو واسطہ ہے وہاں پر میں اشرف العلوم میں خدمت کرتا ہوں
اور شب و روز یہ منکرات سامنے آتے رہتے ہیں تو لامحالہ کہنا پڑتا ہے۔ جواب شافی سے نوازیں۔"

عبدالحمید بلند شہری

الجواب:۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ خواہ صحابہ کرام ہوں یا اولیاء عظام یا ائمہ حدیث
فقہ و کلام کوئی بھی معصوم نہیں ہے سب سے غلطیاں تو ہو سکتی ہیں مگر ان کے متعلق اعتمادیت کی شہادتیں
قرآن حدیث میں بکثرت موجود ہیں اور ان کے اعمال نامے اور اتقاء و علم کی تاریخی روایات معتبرہ اس
قدر امت کے پاس ہیں کہ قرون حالیہ کے پاس ان کا عشر عشیر بھی نہیں ہے ان پر تنقید ان ہی جیسے
پایۂ علم و اتقاء والا کر سکتا ہے ہمارے زمانے کے ٹٹ پونجیے جن کے پاس علم ہے نہ تقویٰ کیا منہ
رکھتے ہیں کہ زبان دراز کریں سوائے اپنی بدبختی کے اظہار کے اور کیا حیثیت رکھتے ہیں ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد
میلش اندر طعنہ پاکان زند

اللہ تعالیٰ ان کی تعریف فرماتے ہوئے فرماتا ہے محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار
الآیۃ دوسری جگہ ہے:۔ ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم الآیۃ۔
تیسری جگہ ہے:۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ الآیۃ۔ چوتھی جگہ ہے وکذلک
جعلناکم امۃ وسطا۔ الآیۃ۔ اور یہ کم بخت ان کی شان میں ہذیان بکتے ہیں جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔ اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی
غرضا۔ الحدیث خدا سے ڈرو میرے اصحاب کے متعلق میرے بعد ان کو نشانہ ملامت مت بناؤ
آپ فرماتے ہیں:۔ خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم الحدیث اور یہ بدبخت ان کی شان
میں بدگوئیاں کرتے ہیں، سوائے بدنصیبی کے اور کیا ہے ان خبیثوں سے گفتگو اور مناظرہ وغیرہ
کرنا اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے اللہ تعالیٰ ان کی اور ہماری ہدایت فرمائے آمین۔ دارالعلوم
اور مظاہر العلوم یا ان کے بنیاد رکھنے والوں اور طلباء اور مدرسین کے متعلق ہر گمراہ اور مخالف اہل
اسلام اور مخالف اہل سنت ایسے ہی الفاظ کہتا ہے۔"

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ دارالعلوم دیوبند ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

المشتہر مولوی سید شفیق الرحمن محلہ عالی کلاں، سہارن پور۔
مطبوعہ جلالت برقی پریس مراد آباد،

یہ اشتہار بازی بجائے خود اس نوعیت کی ہے کہ اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے سخت انقباض محسوس ہوتا ہے اور ناظرین ترجمان القرآن گواہ ہیں کہ اس طرز کے اشتہارات اور اخبارات و رسائل مضامین سے کبھی ان صفحات میں تعرض نہیں کیا گیا ہے، مگر افسوس ہے کہ بعض نادان مریدا ور شاگرد اب ایسے اکابر کو اس میدان میں اُتار لائے ہیں جو اپنے علم و تقویٰ اور روحانی مشیخت کے لحاظ سے ہندوستان و پاکستان کی مذہبی دُنیا میں معتمد علیہ ہیں، اس لیے مجبوراً پچھلی اشاعت میں بھی ان کی طرف توجہ کرنی پڑی تھی، اور اب اس اشاعت میں دوبارہ اس پر اظہار خیال کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری طرف سے اس سلسلہ میں یہ آخری گزارشات ہیں۔ خدا کرے کہ اس کے بعد پھر ان صفحات کو اس طرز خاص کے پروپیگنڈے کی جواب دہی سے آلودہ کرنے کی نوبت نہ آئے۔

(۱)

سب سے پہلی نمایاں چیز جو مولانا حسین احمد صاحب کے اس بیان میں نگاہ کو کھٹکتی ہے وہ اُن کی زبان ہے جسے ممکن ہے مولانا خود اپنے شایانِ شان سمجھتے ہوں، مگر ہم ان کے ساتھ اتنا حُسن ظن رکھتے ہیں کہ یہ زبان ہمیں ان کے مرتبے سے فروتر نظر آتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ سے اختلاف ہونا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ سخت سے سخت اختلافات ہوسکتے ہیں اور سخت سے سخت اظہار رائے شریفانہ زبان میں کیا جاسکتا ہے، مگر یہ زبان، کہ جس سے اختلاف ہو، اس کے خلاف ٹٹ پونجیے، کم بخت، بدبخت، اور خبیث جیسے رکیک الفاظ استعمال کر ڈالے جائیں، ایک مہذب آدمی کے بھی شایانِ شان نہیں ہے، کجا کہ ایک ایسا مرد بزرگ اس کو اختیار کرے جو اس برعظیم کی سب سے بڑی دینی درس گاہ کا مسند نشین ہے اور جس کی طرف ہزارہا آدمی تعلیم دین ہی کے لیے نہیں، تزکیۂ نفس کے لیے بھی رجوع کرتے ہیں۔ جب قوم کے مقتدا اور مربی و معلم اس طرح کی باتوں پر اُتر آئیں تو بعید نہیں کہ اُن سے اخلاق و تہذیب کا سبق لینے والے اصاغر آدمیت سے بالکل ہی عاری ہو جائیں اور اس قوم میں نام کو بھی ایک دوسرے کی عزت کا پاس باقی نہ رہ جائے۔

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص

مولانا کو اگر یہ یاد نہ ہو تو ہم انھیں یاد دلاتے ہیں کہ کسی وقت ہم نے بھی ان کے نظریہ قومیت اور ان کی کانگریس سے موافقت پر تنقید کی ہے۔ وہ تنقید اب بھی ہماری کتابوں "مسئلہ قومیت"، اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ دوم"، میں موجود ہے۔ وہ اور ان کے شاگرد اور مرید ہماری ان تنقیدی عبارات کو دیکھ کر خود رائے قائم فرمائیں کہ دونوں زبانوں میں کتنا فرق ہے۔ بالفرض اگر دس بارہ برس بعد اُس کا بدلہ لینا ہی ضرور تھا تو جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا کے اصول پر لیا جاسکتا تھا۔ یہ تعدی آخر کس آئین کی رو سے حضرت کے لیے جائز ہوگئی؟

(۲)

دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے، وہ مولانا کی انتہائی غیر ذمہ دارانہ روش ہے جو انھوں نے دوسروں کے دین و اعتقاد پر اظہارِ رائے کرنے میں اختیار کی ہے۔ ان کے سامنے ایک مفروضہ سوال پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک جماعت کا نام لے کر اس پر چند الزامات لگائے گئے تھے۔ تنابز بالالقاب سے قطعِ نظر، "مودودیوں" اور "مودودیت" کے الفاظ سے جس جماعت کا ذکر کیا گیا ہے، مولانا اُس سے بالکل ناواقف نہ تھے۔ اُن کو خوب معلوم تھا کہ ہندوستان و پاکستان میں ہزارہا مسلمان اُس سے وابستہ اور لاکھوں اُس سے متاثر ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس جماعت کے خیالات کہیں چھپے ہوئے نہیں ہیں بلکہ لکھے لکھائے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود ایک سائل نے جیسے کچھ بے سروپا الزامات بغیر کسی حوالے اور ثبوت کے اُس پر لگا دیئے اُن کو مولانا نے جوں کا توں تسلیم کر لیا اور اُن پر ایک تند و تلخ جواب غالباً یہ جانتے ہوئے سائل کے حوالہ کر دیا کہ اس سوال و جواب کو ان کے اپنے معتقدین اشتہار بازی کے لیے استعمال کرنے والے ہیں۔ انھوں نے کوئی ضرورت یہ تحقیق کرنے کی نہیں سمجھی کہ جس گروہ کے متعلق یہ سوال کیا جا رہا ہے اُس نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے بزرگوں کے متعلق فی الواقع کیا لکھا ہے، کن الفاظ میں لکھا ہے، کس سیاق و سباق میں لکھا ہے، اور اس کی دوسری تحریرات کیا شہادت دیتی ہیں کہ وہ اُن بزرگوں کے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے۔ انھوں نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ اس گروہ کے بعض اشخاص کی طرف منسوب کر کے جو باتیں سوال میں لکھی گئی ہیں فی الواقع کس نے کہی ہیں، اس کی اس گروہ میں کیا حیثیت ہے، اور اس کی کسی بات کو پورے گروہ کے خیالات کی ترجمانی قرار دیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ بالفرض اگر مولانا کے پاس اس گروہ کی مطبوعات پڑھنے کے لیے وقت نہ تھا، اور نہ بیان کردہ امور کی تحقیق ہی کے لیے وہ فرصت پاتے تھے، تو آخر کس طبیب نے مشورہ دیا تھا کہ حضرت اس معاملہ میں رائے ضرور دیں؟ میں پوچھتا ہوں، کیا مذہبی پیشوائی کی ایسی ذمہ دارانہ مسند پر بیٹھ کر ایک متقی عالم کی یہ روش ہونی چاہیے؟ کیا تقویٰ اور دیانت اسی کا نام ہے؟ کیا یہی وہ تزکیۂ نفس ہے جس سے حضرت خود بہرہ مند ہیں اور دوسروں کو بہرہ مند فرما رہے ہیں؟ کیا اس جواب کی تحریر کے وقت حضرت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات یاد تھے کہ:۔ سبابُ المسلم فسق اور کل المسلم علی المسلم حرام دمه وماله وعرضه؟ کیا یہ جواب لکھتے وقت حضرت نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ سوچا تھا کہ ہمیں اور انھیں ایک وقت مرنا اور اپنے رب کی عدالت میں حاضر ہونا ہے، وہاں اگر سائل کے الزامات محض بہتان و افترا ثابت ہو گئے تو حضرت اس کی توثیق کی پاداش سے کیا دے کر بچیں گے؟

(۳)

مولانا اور اُن کے گروہ کے دوسرے حضرات جن کی تحریریں حال میں جماعت اسلامی کے خلاف شائع ہوئی ہیں، اس بات کو بالکل بھول گئے ہیں کہ کسی شخص یا گروہ کے عقیدہ و مسلک کے متعلق کوئی رائے قائم یا ظاہر کرنا دیانتہً اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک کہ انصاف کے ساتھ اس کی تمام یا اکثر تحریروں کو خود نہ پڑھ لیا جائے۔ کسی خدا ترس آدمی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ محض سُنی سنائی باتوں پر دوسروں کو ضالّ اور مضلّ قرار دے بیٹھے، یا چند نیازمندوں کی پیش کی ہوئی نشان زدہ عبارتوں پر رائے قائم کرلے اور اُسے شائع کردے، یا پہلے کسی کی خبر لینے کا عزم کر لیا جائے اور پھر اس کی کتابیں اس غرض سے کھنگالی جائیں کہ کہاں کہاں اُس کو مطعون کرنے اور اس پر الزام تراشنے کی کوئی گنجائش ملتی ہے، یا ایک شخص کی بعض عبارتوں سے ایسے معانی اور نتائج نکالے جائیں جن کی تردید خود اسی شخص کی بہت سی دوسری عبارتیں کر رہی ہوں۔ اس طرح کی حرکتیں وہ لوگ تو کر سکتے ہیں جن کے پیش نظر صرف دُنیا اور اس کی زندگی ہے، مگر جنھیں خدا اور آخرت کا بھی کچھ خیال ہو اُن سے ایسی حرکات بالکل خلاف توقع ہیں۔

ان حضرات کی وہ تمام تحریریں ہم نے بالاستیعاب پڑھی ہیں جو اُنھوں نے ہمارے خلاف لکھی ہیں۔ اُن کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد جو کچھ ہم نے پایا ہے وہ یہ ہے :-

(۱) بعض مقامات پر ہماری اصل عبارتیں نقل کرنے کے بجائے اپنے نکالے ہوئے نتائج اپنے الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں اور انھیں ہمارے سر تھوپ دیا گیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں۔ یہ حرکت تمام ایسے مقامات پر کی گئی ہے جہاں الزام لگانے والے نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ ہماری عبارت کو ہمارے الفاظ میں نقل کرے گا تو اپنا الزام ثابت نہ کر سکے گا۔

(۲) بعض مقامات پر ہمارے چند فقرے ایک سلسلہ عبارت سے الگ کر کے اُن سے اپنے من مانے نتائج نکالے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر وہی مضمون پورا پڑھا جائے یا وہ کتاب پوری دیکھی جائے جس کے چند فقروں پر ان نتائج کی بنا رکھی گئی ہے تو اُس سے بالکل برعکس نتائج نکلتے ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یا تو محض کسی کے دکھلائے ہوئے نشان زدہ فقرے مفتی صاحب نے ملاحظہ فرما لیے اور فتویٰ رسید کر دیا، یا پھر پورا مضمون پڑھنے کے باوجود دانستہ الزام تراشی فرمائی۔

(۳) بعض مقامات پر ہماری عبارات میں کھلی کھلی تحریفیں کی گئی ہیں۔ کہیں آگے پیچھے اپنے الفاظ ملائے گئے ہیں اور کہیں ایک فقرے کو اُن فقروں سے الگ کیا گیا ہے جو اصل مدعا کو ظاہر کرتے تھے۔ اس طرح کی تحریفات غالباً یہ

سمجھتے ہوئے کی گئی ہیں کہ جن لوگوں کی نظر سے ہماری اصل مطبوعات گزری ہیں ان کی نگاہ میں چاہے محرّف کی رتی برابر وقعت باقی نہ رہے، مگر بہت سے ناواقف لوگ تو دھوکا کھا ہی جائیں گے۔

(۴) بعض مقامات پر ہماری عبارت تو صحیح نقل کی گئی ہیں مگر ہمارا منشا سمجھنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی گئی اور خالص بدظنی کے ساتھ ہمارے الفاظ سے بالکل غلط معنی نکال لیے گئے، حالانکہ ہم سے پوچھا جائے تو ہم اپنے الفاظ کا صحیح محمل بتا سکتے ہیں اور اپنی دوسری تحریروں سے ثابت کر سکتے ہیں کہ ان الفاظ سے ہمارا اصل مدعا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک عبارت اگر دو یا زائد معنوں کی محتمل ہو تو معتبر صرف وہی معنی ہوں گے جو خود مصنف بیان کرے اور جن کی شہادت اس کی دوسری عبارتیں دیں، نہ کہ وہ جو ایک معاند بیان کرے۔

(۵) بعض مقامات پر کسی ماخذ اور حوالے کے بغیر ہماری طرف ایک عقیدہ یا مسلک یا جربیہ منسوب کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہم اس سے بارہا بالفاظ صریح برارت ظاہر کر چکے ہیں اور ہماری تحریروں سے ہرگز اس الزام کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم حیران ہیں کہ یہ آخر دیانت کی کون سی قسم ہے کہ کسی کو زبردستی گمراہ، بدعقیدہ اور مجرم بنانے کی کوشش کی جائے درآں حالیکہ وہ بار بار اس سے برارت ظاہر کر رہا ہو۔

(۶) بعض مقامات پر ہمارے خلاف ایسے اعتراضات کیے گئے ہیں جن کے مدلل جوابات ہماری تحریروں میں موجود ہیں۔ یہ اعتراض اگر ان تحریروں کو پڑھے بغیر کیے گئے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان حضرات کو دوسروں پر اعتراض جڑنے کا بڑا شوق ہے مگر ان کے مسلک سے واقف ہونے کی تکلیف گوارا نہیں ہے۔ اور اگر جوابی دلائل سے واقف ہونے کے باوجود ان اعتراضات کو دہرایا گیا ہے اور جوابی دلائل سے تعرض نہیں کیا گیا تو یہ صریح جھگڑالو ذہنیت کی علامت ہے۔

(۷) بعض مقامات پر ہماری تحریک، یا ہمارے مسلک، یا کسی خاص معاملہ میں ہمارے نقطۂ نظر پر ایک جامع رائے کا اظہار کیا گیا ہے مگر اس کی تائید میں کوئی شہادت ہماری تحریروں سے پیش نہیں کی گئی، نہ یہ بتایا گیا کہ اس رائے کی بنیاد کیا ہے۔ اس طرح کی بے بنیاد رائے زنیاں کرنے پر اگر کوئی اُتر آئے تو دنیا میں کون ہے جو اس کی رائے کی ضرب سے بچ سکتا ہو۔

(۸) بعض مقامات پر ساری اعتراضی تقریر کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ہم نے کسی فقہی مسئلے کے بیان میں، یا کسی کلامی مسئلے کی تشریح میں کوئی غلطی کی ہے۔ لیکن اُسے بیان ایسے مبالغہ آمیز انداز سے کیا گیا ہے کہ گویا معاذ اللہ ہم نے سارے دین کو ہدم کر ڈالا ہے۔ حالانکہ نہ علمی مسائل میں غلطی کر جانا کوئی دنیا سے نرالا واقعہ ہے اور نہ ہر غلطی لازماً گمراہی ہوتی ہے۔

(۹) بعض مقامات پر ایسے اُمور کو مخالفت اور فتوے بازی کی بنیاد بنایا گیا ہے جن میں اختلاف کی گنجائش ہے

ہر فریقین کے پاس اپنے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں شرعی دلائل موجود ہیں۔ اس طرح کے اختلافی مسائل کو ایک علمی بحث کا
موضوع تو بنایا جاسکتا ہے، مگر کسی معقول انسان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ان کی بنیاد پر مخالفت کا طوفان اٹھائے گا
ور فتوے بازی پر اُتر آئے گا۔

یہ تجزیہ جو ہم نے ان حضرات کی مخالفانہ تحریروں کا کیا ہے اس کے ہر جزء کی نظیریں ہم ان کی تحریروں سے
پیش کرسکتے ہیں۔ وہ جب چاہیں اس کے نظائر ان کی خدمت میں حاضر کر دیئے جائیں گے۔ اس سے پہلے اشتراکی، قادیانی،
منکرین حدیث، بریلوی اور مسلم لیگی حضرات اس طرح کی زیادتیاں ہم پر کرتے رہے ہیں۔ بعض مناظرہ باز اہل حدیث نے
بھی یہ شیوہ اختیار کیے رکھا ہے۔ بعض اخبارات اور رسائل کا تو برسوں سے مستقل طریقہ ہی یہ رہا ہے کہ ان ہتھکنڈوں
سے ہمارے خلاف رائے عام پیدا کریں۔ لیکن ہم کسی ایسے شخص کو قابل التفات نہیں سمجھتے جس کے طرز عمل میں حیا اور خوف خدا
کے فقدان کی علامات پائی جاتی ہوں۔ دیوبند اور مظاہر العلوم کے ان اکابر کو ہم ابھی تک اس صف میں شامل نہیں سمجھتے۔
ان سے یہ توقع باقی ہے کہ وہ اس حد تک اپنے آپ کو گرا ہوا ثابت نہ کریں گے۔ اسی لیے ہم نے ان پر اتنا وقت صرف
کیا ہے۔ خدانخواستہ جس روز اس پہلو سے ہمیں مایوسی ہوگئی، اس کے بعد انشاء اللہ ان کے ہزار مضامین اور ان کی لاکھ
سخن طرازیوں کا ایک جواب بھی ادھر سے سُننے میں نہ آئے گا۔

(۴)

ہمارے لیے یہ بات سخت حیران کُن ہے کہ ہماری مخالفت میں صرف علمائے دیوبند ہی نہیں، دوسرے گروہوں
کے علماء بھی جن باتوں کو بار بار چھانٹ چھانٹ اور اُبھار اُبھار کر سامنے لا رہے ہیں وہ قریب قریب سب کی سب
وہ ہیں جن کو ہم نے احیاناً کبھی کسی بحث کے ضمن میں، یا کسی سوال کے جواب میں لکھ دیا ہے، بلکہ بعض باتیں تو ایسی نکال
نکال کر لائی جارہی ہیں جو برسوں سے ترجمان القرآن کے پُرانے فائلوں میں دبی پڑی تھیں اور خود ہمیں بھی یاد نہ تھیں کہ وہ
ہمارے قلم سے نکلی ہیں۔ اُن میں شاید کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کی ہم نے خاص طور پر تبلیغ کی ہو، یا جس کے ماننے
کی لوگوں کو دعوت دی ہو، یا جس کو ہم نے بار بار دُہرایا ہو۔ لیکن ہمارے یہ مخالف علماء اپنے فتووں اور مضامین اور
اشتہارات میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ گویا ہمارا اوڑھنا بچھونا یہی مسائل ہیں، ان ہی کے ذکر و بیان میں ہم نے
عمر کھپائی ہے اور ان ہی کو پھیلانے میں ہم رات دن لگے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس جن خیالات کو پھیلانے کی ہم انتھک
برسوں سے کوشش کر رہے ہیں، جن چیزوں کو ہم نے بار بار لکھا اور کہا ہے، جن باتوں کو ماننے کی دُنیا بھر کو دعوت
دی ہے، جس چیز کو قائم کرنے کی سعی میں ایک مدت دراز سے ہم اپنی جان کھپا رہے ہیں، اور جن چیزوں کو مٹانے کے لیے
ہم نے اپنا سارا زور صرف کر دیا ہے، ان کا یا تو سرے سے ان حضرات کی تحریروں میں کہیں ذکر ہی موجود نہیں ہے،

یا کبھی بجاطور پر کسی نے "غزش نیز بگو" کی شرط پوری کرنے کے لیے اُن کا ذکر کیا بھی ہے تو بس ایک اُچٹتا ہوا اشارہ کر دیا ہے۔ کیا ان حضرات میں سے کوئی صاحب ذرا سی تکلیف فرما کر ہمیں بتائیں گے کہ اس انتخاب میں کیا حکمت پیش نظر ہے؟ قرآن سے جو اُصول ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنے اُن کاموں سے جانچا جاتا ہے جن کی اسے زیادہ تر فکر ہو اور جن میں وہ اکثر مشغول رہے۔ یہ غالب فکر اور اکثری مشغولیت اگر حق ہو تو کبھی کبھار کے غلط کام بلا تو یہ بھی معاف ہو سکتے ہیں کہ اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ۔ مگر یہ عجیب ماجرا ہے کہ ہمارے دورِ حاضر کے بزرگانِ دین ایک گروہ کے وقتی اور احیانی اور عارضی کاموں کو اس مقصد کے لیے چُنتے اور پکڑتے پھرتے ہیں کہ اس کی مستقل دعوت اور اس کے شب و روز کے مشغلے اور اس کی غالب فکر پر اُن کے ذریعے سے پانی پھیر دیں۔ یہ حرکتیں دیکھ کر دل بے اختیار اللہ تعالےٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے آخرت کی عدالت کے جملہ اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے۔ اگر خدانخواستہ کچھ بھی اختیار ان حضرات کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہوتا تو نہ معلوم یہ کن ترازوؤں سے خلقِ خدا کو تولتے اور کیسی کیسی چھوٹی باتوں پر لوگوں کے عمر بھر کے اعمال حبط کر دیتے۔

ان حضرات کی خاص کوشش یہ ہے کہ ان باتوں کو کسی نہ کسی طرح ہمارے سر منڈھیں جن سے ہمارے خلاف عوام کے جذبات بھڑک سکتے ہوں۔ مثلاً یہ کہ جماعت اسلامی والے عام مسلمانوں کو تکفیر کرتے ہیں، اپنے سوا سب کو کافر سمجھتے ہیں۔ گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر سلب ایمان کا حکم لگاتے ہیں، صحابہ کرام کی توہین کرتے ہیں، بزرگانِ دین اور خصوصاً اکابر صوفیہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں، ان کا امیر مجدد اور مہدی ہونے کا مدعی ہے اور آگے کچھ اور بنا چاہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان الزامات کے ثبوت فراہم کرنے میں جیسی کچھ محنت کی جارہی ہے اور جس جانفشانی کے ساتھ ہزاروں صفحات کے مضامین میں سے لفظ لفظ چن کر ہمارے خیالات کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جارہا ہے جو خود ہمارے علم میں بھی پہلی مرتبہ ان ہی حضرات کے واسطے آیا ہے، وہ چاہے کسی اور کی نگاہ سے مخفی ہو، مگر ہماری نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہم اس کمالِ فن کی داد تو ضرور دیتے ہیں، کیونکہ ہم ہر کمالِ فن کے قدر شناس ہیں، خواہ وہ نقب زنی و جیب تراشی کا ہی کمال کیوں نہ ہو، مگر معلوم صرف یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی دُنیا اور عاقبت سنوارنے کی فکر چھوڑ کر آخر اس کام میں یہ عرق ریزی کس لیے کی جارہی ہے؟ اور یہ اصول قرآن، حدیث، یا طریق سلف میں کہاں سے اخذ کیا گیا ہے کہ تم ضرور ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں کو مطعون کرنے کے وجوہ تلاش کرو اور پھر بھی کام نہ چلے تو اپنی طرف سے کچھ ملا کر فردِ جرم مکمل کر دو؟

(۵)

ایک اور بات جو ہمارے لیے اس سے کچھ کم حیران کُن نہیں ہے وہ ہمارے معاملہ میں بعض اکابر کے نقطۂ نظر کا

تغیر ہے جو پچھلے چند برس میں رونما ہوا ہے، حالانکہ ہمارے خیالات برسوں پہلے جو کچھ تھے وہی آج ہیں، اور ہماری وہ تحریریں جن پر آج ہم ضالّ اور مضلّ، بلکہ بدبخت اور خبیث تک ٹھیرائے جا رہے ہیں، اس وقت سے بہت پہلے شائع ہو چکی تھیں جبکہ ان بزرگوں کی نگاہ میں ہم کم از کم ضالّ اور مضلّ تو نہ تھے۔

۱۹۴۵ء کے آغاز میں انجمن اصلاح القریٰ، ریواڑی آباد ضلع لائل پور سے جناب مولانا کفایت اللہ صاحب کی خدمت میں ہمارے متعلق ایک استفسار بھیجا گیا تھا۔ اس کا جو جواب مولانا کی طرف سے وصول ہوا اُس کے الفاظ یہ تھے:۔

"مودودی صاحب کی تحریرات بیشتر صحیح ہیں اور ان کی تحریک میں نظری طور پر کوئی غلطی اور گمراہی نہیں ہے۔ صرف یہ بات محلِ غور ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس تحریک کے مفید و بارآور ہونے کے لیے ظروف مساعد ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ محرک صاحب حال ہے یا صرف صاحب قال۔"

ایک اور صاحب نے ضلع بارہ بنکی سے اُسی زمانہ میں مولانا کی خدمت میں جماعت اسلامی کے متعلق ایک سوال بھیجا تھا جس کا یہ جواب آیا تھا:۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نظریہ اصولاً تو صحیح ہے مگر آج کل عملی نہیں ہے جیسے کوئی کہے کہ حدود شرعیہ جاری ہونی چاہئیں۔ یہ بات اُصولاً تو صحیح ہے مگر اس زمانہ میں قطع ید سارق پر اور رجم زانی پر جاری کرنا عملاً ممکن نہیں ہے کیونکہ غیر اسلامی حکومت حائل ہے۔ تاہم اگر کوئی ان کی جماعت میں داخل ہو کر حسب استطاعت اسلامی خدمت کرے تو مضائقہ نہیں ہے۔"

آج وہی مولانا کفایت اللہ صاحب ایک دوسرا فتویٰ صادر فرماتے ہیں جو سہارنپور کے شائع شدہ ایک اشتہار میں یوں درج ہے:۔

"مودودی جماعت کے افسر مولوی ابوالاعلیٰ مودودی کو میں جانتا ہوں۔ وہ کسی معتبر اور معتمد علیہ عالم کے شاگرد اور فیض یافتہ نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کی نظر اپنے مطالعہ کی وسعت کے لحاظ سے وسیع ہے تاہم دینی رجحان ضعیف ہے، اجتہادی شان نمایاں ہے، اور اسی وجہ سے ان کے مضامین میں بڑے بڑے علماء اعلام بلکہ صحابہ کرام پر بھی اعتراضات ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو اس تحریک سے علیحدہ رہنا چاہیے اور ان سے میل جول، ربط و اتحاد نہ رکھنا چاہیے۔ ان کے مضامین بظاہر دلکش اور اچھے معلوم ہوتے ہیں، مگر ان میں ہی وہ باتیں دل میں بیٹھتی جاتی ہیں جو طبیعت کو آزاد کر دیتی ہیں اور بزرگانِ اسلام سے بدظن بنا دیتی ہیں۔"

اسی ۱۹۴۵ء کے آخری مہینوں میں مولانا حسین احمد صاحب سے جماعت اسلامی کی دعوت کے متعلق سوال کیا گیا تھا اور اس کا جواب انھوں نے یہ دیا تھا:۔

مولانا مودودی کا نظریہ بہت سی تحریروں میں اور رسالوں وغیرہ میں شائع ہوتا رہا ہے مجھ کو اس قدر فرصت نہیں ہے کہ بالاستیعاب دیکھوں جس قدر مضامین نظر سے گزرے ہیں، حالات موجودہ میں ناممکن العمل ہیں، واللہ اعلم۔

میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ موجودہ دور میں اور اس ماحول میں کیا شرعی تکلیف ہم پر اِن اُمور پر حسب تصریحات عائد ہوتی ہے یا نہیں "

ایک اور صاحب نے جو اُس وقت فیروز پور جھرکہ میں نائب تحصیلدار تھے، جماعت کی تمام مطبوعات مولانا کو بھیجیں اور ان سے درخواست کی تھی کہ انہیں ملاحظہ فرما کر یہ بتائیں کہ جمعیت علماء ہند کے مسلک اور جماعت اسلامی کی دعوت میں سے کون حق پر ہے۔ نیز بالخصوصیت کے ساتھ "ایک اہم استعفا" کی طرف توجہ دلا کر پوچھا تھا کہ اس پمفلٹ کو پڑھ کر میرا دل اپنی ملازمت سے اُچاٹ ہوگیا ہے، آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ اس کا جو جواب حسین آباد ضلع مظفر نگر سے مولانا کے اپنے قلم کا لکھا ہوا (مورخہ ۳ ذی الحجہ ۶۴ھ) وصول ہوا اس کے الفاظ یہ تھے:۔

"محترما، میں اس قدر مصروف اور عدیم الفرصت ہوں کہ روزانہ ڈاک کا دیکھ لینا بھی نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ کتابوں کا دیکھنا اور جواب لکھنا۔ مودودی صاحب فارغ ہیں، جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں چھپوا دیتے ہیں۔ جمعیت العلماء نے جو طریقہ سیاسیات میں اختیار کیا ہے وہ حسب استطاعت اَیُّہَا الْکُبَیلِیْنِ کی بنا پر ہے۔ موجودہ گردوپیش میں جو طاقت اور قدرت موجود ہے اسی پر اس کی حرکت و سکون کا مدار ہے۔ مودودی صاحب جو فلسفہ پیش فرما رہے ہیں اس کے دیکھنے اور اس پر تنقید و تبصرہ کرنے یا اس کا جواب لکھنے کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور اگر آتی بھی تو مہلت نہیں ہے۔ مودودی صاحب اور ان کے موافقین اپنے عمل کو حرکت میں لائیں۔ ہم اُن کا مقابلہ نہ کریں گے اور نہ کوئی محاذ قائم کریں گے۔ اگر ہماری سمجھ میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے وہی عمل شرعی اور مفید سمجھ میں آیا تو ہم بھی متبع بن جائیں گے ورنہ حسب قاعدہ قرآنیہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ہم معذور ہوں گے۔

دوسری چیز آپ نے اپنی ملازمت کے متعلق پوچھی ہے۔ میں جہاں تک سمجھا ہوں آپ کو جبکہ دوسرا طریقہ اکل حلال میسر ہے تو آپ کو اس ملازمت کو چھوڑ ہی دینا چاہیے اگرچہ وہ "اہم استعفاء" میری نظر سے نہیں گزرا مگر جو مضمون آپ نے اس کا ذکر فرمایا ہے اقرب الی الصواب ہے۔ آپ کے احباب کا حکم میری سمجھ میں نہیں آتا اگرچہ وہ علماء ہیں "

آج ٹھیک پانچ برس بعد ذی الحجہ ۶۹ھ میں وہی مولانا حسین احمد صاحب ہمارے متعلق اس ملے کا

اظہار فرماتے ہیں جو اس مضمون کے آغاز میں نقل کی جا چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس انقلاب رائے اور اس تغیرِ فکر و نظر کی علت کیا ہے؟ اگر اس وقت سے اب تک کچھ نئی گمراہیاں ہم سے سرزد ہو گئی ہیں جن سے اس وقت تک ہمارا دامن پاک تھا، تو ازراہِ عنایت ضرور ہمیں اس سے آگاہ فرمایا جائے۔ یا اگر اب ان حضرات کو اُن کتابوں کے پڑھنے کی فرصت مل گئی جنہیں اُس وقت نہ پڑھا تھا، اور بالاستیعاب ان کا مطالعہ فرما کر وہ ہماری گمراہیوں پر آج مطلع ہوئے ہیں، تو کم از کم یہی بات بصراحت ارشاد فرما دی جائے۔ اور اگر بات یہ نہیں ہے بلکہ یہ سارے فتوے اور مضامین اب اس لیے بننے شروع ہوئے ہیں کہ جماعت اسلامی کی بڑھتی ہوئی تحریک سے اپنے حلقۂ اثر کے آدمیوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ ان بزرگوں کو لاحق ہو گیا ہے، اور ساری فکر انہیں اب ان ٹوٹنے والوں کو روکنے کی ہے — وہی فکر جس نے اشتراکیوں، مسلم لیگیوں، بریلویوں، قادیانیوں، اہل حدیث اور منکرین حدیث کو ہماری مخالفت میں متحرک کر رکھا ہے — تو گستاخی معاف، یہ انداز فکر اہل حق کو زیب نہیں دیتا اور نہ یہ ہتھکنڈے ان کے شایانِ شان ہیں۔ یہ تو دوکان داروں کے سوچنے کا انداز ہے کہ مقابل کی دوکان اُن کے گاہکوں اور اسامیوں کو توڑنے نہ پائے، اور شاید کوئی شریف دوکان دار بھی، اگر تھوڑی سی خدا ترسی اُس میں ہو، اس حد تک گرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ محض گاہک بچانے کے لیے حریف دکان دار کے مال میں کیڑے ڈالنے لگے۔ بہرحال اپنی پوزیشن مشخص کرنا ان حضرات کا اپنا کام ہے۔ رہے ہم، تو الحمدللہ کہ ہم دوکان دار نہیں ہیں، نہ کسی کے حریف تجارت ہیں۔ جس چیز کو ہم نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے حق پایا ہے اسے خلق اللہ کے سامنے پیش کرتے ہیں جسے حق معلوم ہو، قبول کرے، اس کا اپنا بھلا ہے۔ جسے حق نہ معلوم ہو، رد کر دے، اس کا معاملہ اُس کے خدا سے ہے۔ ساری دُنیا اسے قبول کر لے تو بجز آخرت کی منفعت کے ہمیں کوئی اجر اس سے مطلوب نہیں۔ اور اگر ساری دنیا اسے رد کر دے تو ہمارا اس سے کوئی نقصان نہیں۔

(۶)

آخر میں ہم تمام اُن علماء سے جو اپنے آپ کو اہل حق میں سے سمجھتے ہوں، اور جن کو فی الواقع دُنیا کے ساتھ آخرت کی بھی کچھ فکر ہو، تین باتیں صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں۔

اول یہ کہ ہم اس وقت فسق و ضلالت کی اُس حکمرانی کو مٹانے کے درپے ہیں جو علوم و افکار پر، اخلاق و معاشرت پر، تہذیب و تمدن پر اور معیشت و سیاست پر قائم ہے، اور ہماری تمام کوششیں اس کام کے لیے وقف ہیں کہ زندگی کے ان تمام شعبوں پر خدا کے دین کی حکمرانی قائم ہو۔ آپ حضرات اگر کچھ بھی تو تمیز کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کھلے کھلے آثار آپ کو یہ بتا سکتے ہیں کہ دین کی حمایت میں اس وقت وہ کون سی مستعد اور منظم طاقت ہے جس کو

فسق وضلالت کی ساری طاقتیں اپنا اصلی حریف سمجھ رہی ہیں اور کس کے خلاف اُنھوں نے اپنا پورا زور لگا رکھا ہے
اشتراکیوں سے پوچھیے کہ علماء کے پورے گروہ کو آپ اپنے لیے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں یا جماعت اسلامی کو؟ منکرین حدیث
کی اپنی تحریروں میں دیکھ لیجیے کہ اہل حدیث اور دوسرے تمام حامیان حدیث کے خلاف اُن کا غصہ زیادہ بھڑکا ہوا
ہے یا جماعت اسلامی کے خلاف؟ قادیانیوں کے اپنے اخبارات و رسائل آپ کو بتا دیں گے کہ ان کو جماعت اسلامی
کا زیادہ خوف لاحق ہے یا اپنے دوسرے مخالفین کا؟ مغربیت کے علم برداروں کی تقریریں اور تحریریں اور عملی تدبیریں
آپ کے سامنے خود شہادت دیں گی کہ وہ زیادہ پریشان جماعت اسلامی سے ہیں یا باقی ماندہ پورے مذہبی طبقے
سے؟ اس حالت میں جبکہ ان طاقتوں سے ہماری کش مکش برپا ہے، آپ کو خوب سوچ لینا چاہیے کہ آپ کا وزن
کس پلڑے کی طرف جا رہا ہے۔ آپ لڑنا چاہیں تو شوق سے لڑیں۔ مگر اپنا انجام سوچ لیں۔ اگر خدا کے ہاں آپ
سے باز پُرس ہوئی اور پوچھا گیا کہ جب طاعت اور فسق، اور ہدایت اور ضلالت کے درمیان معرکہ برپا تھا تو تم نے کس
کو کس پر ترجیح دی تھی، اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ اُس وقت آپ اپنے یہ فتوے اور یہ مضامین اور یہ اعتراضات
حجت میں پیش کر کے بچ نکلنے کی توقع رکھتے ہوں، اور آپ کو اُمید ہو کہ ہماری خطائیں اور لغزشیں گنا کر آپ ثابت
کر سکیں گے کہ اس معرکہ کے فریقین میں دراصل کشتنی و گردن زدنی ہم ہی تھے، تو بسم اللہ، اپنی یہ مہم جاری رکھیے
اور کچھ کسر ابھی باقی رہ گئی ہو تو اسے بھی پورا کر ڈالیے۔

دوم یہ کہ اگر فی الحقیقت آپ میں سے کوئی نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ حقانیت کی بنا پر ہم سے ناراض ہے
تو اس کو چاہیے کہ زبان کھولنے سے پہلے انصاف کے ساتھ ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کر کے اس معاملہ میں ایک جچی تلی
رائے قائم کر لے کہ آیا ہماری حیثیت ایک ایسے گروہ کی ہے جس سے صرف اختلاف کیا جا سکتا ہے، یا ایسے گروہ کی
جس کی مخالفت بھی کرنی ضروری ہے، یا ایسے گروہ کی جو مذکورہ بالا معرکہ کے فریقین میں سے اس بات کے لیے احق
ہے کہ آپ اس کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں؟ چونکہ اس وقت کش مکش برپا ہے اور یہ ایک قطعی فیصلہ پر پہنچے بغیر ختم
ہونے والی نہیں ہے، اس لیے آپ کو متفرق مسائل پر اپنی اعتراضی تقریریں مرتب کرنے سے پہلے یہ طے کرنا ہو گا
کہ کیا اپنی تمام کردہ و ناکردہ خطاؤں کے باوجود ہم اُن لوگوں کی بہ نسبت آپ حضرات کے لیے زیادہ قابل برداشت
ہیں جو یہاں فسق و ضلالت پھیلا رہے ہیں، یا ہم ایسے ناقابل برداشت ہو چکے ہیں کہ ہمارے مقابلہ میں اشتراکی،
قادیانی، منکرین حدیث، اور فرنگیت کے علم بردار، سب کو آپ برداشت کر سکتے ہیں؟

سوم یہ کہ ہمارا ہمیشہ سے یہ اعلان ہے اور آج بھی ہم اس پر قائم ہیں کہ ہماری جس بات کو خدا کی کتاب اور
اس کے رسول کی سنت کے خلاف ثابت کر دیا جائے ہم بلا تامل اس سے رجوع کر لیں گے۔ اب اگر ہم سے اختلاف
رکھنے والے حضرات محض فتنہ پردازی نہیں چاہتے بلکہ اختلافات کا تصفیہ چاہتے ہیں تو ان کے لیے صحیح راستہ

علمائے کرام کی خدمت میں

یہ نہیں ہے کہ اشتہار بازی کریں یا مخالفانہ پراپیگنڈے پر اتر آئیں، بلکہ صحیح راستہ یہ ہے اور یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ انھیں ہم پر جتنے بھی اعتراضات ہوں وہ انھیں یک جا مرتب کر کے ہمارے پاس بھیجدیں۔ ہم انشاء اللہ ان کی تحریر کو ان صفحات میں لفظ بلفظ درج کر دیں گے اور اپنے جوابات سے ان کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ یا اگر وہ خود اپنے ہی کسی اخبار اور رسالے میں اپنے اعتراضات شائع کرنا پسند فرمائیں تو ہم اس شرط کے ساتھ ان کا جواب دینے کے لیے تیار ہیں کہ اول تو وہ آئے دن کی طعنہ زنی بند کر کے اپنے جملہ اعتراضات بیک وقت مرتب فرما دیں اور دوسرے یہ کہ وہ اس بات پر راضی ہوں کہ جس طرح ہم ان کے اعتراضات کو لفظ بلفظ نقل کر کے ان کا جواب دیں گے اسی طرح وہ بھی ہمارے جواب کو اپنے ہاں لفظ بلفظ نقل کر کے پھر جو چاہیں اس پر خامہ فرسائی کریں۔

ترجمان القرآن بابت ماہ جون ۱۹۵۱ء

اشتراکیت کی ناکامی

فلسفہ اور عمل دونوں میدانوں میں

اقامتِ دین اور خلافت فی الارض

(۲)

مولوی نظام الدین صاحب اصلاحی

اس سے پہلے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ اقامت دین سے قرآن کا کیا مفہوم و مقصد ہے اور اس کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے اب یہ واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ انبیاء علیہم السّلام نے اس فریضہ کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوئی مداہنت نہ برتی اور کسی خاندان و قبیلہ کے رشتے کو حق کی راہ میں حائل نہ ہونے دیا اور تمام انبیاء کرام نے صاف صاف اعلان کیا :-

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔

قوم نے خدا کے سوا جتنے بھی "رب" بنا رکھے تھے سب کو باطل قرار دیا" اس اعلان حق کے نتیجے میں انھوں نے مختلف قسم کے مصائب جھیلے، راہِ حق میں دشوار گزار مراحل پیش نہ آنا اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب کہ حق کے پیش کرنے میں مداہنت برتی جانے لگے غنی و فقیر کا لحاظ ہو، وزیر و بادشاہ کا رعب و دبدبہ سدِ راہ بن جائے ارباب سیادت و اقتدار سے جاہ طلبی و زر اندوزی کی توقع باندھی جاتی ہے تو اس وقت حق کی آواز پست ہی نہیں بلکہ باطل کی ہمنوا بھی بن جاتی ہے۔ انبیاء کی زندگی پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حق کی راہ میں سب کچھ جھیلا مگر اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا نرمی کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

حضرت نوح علیہ السّلام کی اقامت دین کی جدوجہد

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں جب ہم قرآن اٹھا کر پڑھتے ہیں تو وہ پیکرِ صبر و عزم بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ انھوں نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو برابر دین کی دعوت دی، لیکن چند نفوس کے سوا کسی نے ان کی دعوت پر لبیک نہیں کہا حضرت نوح علیہ السّلام کی دعوت بھی یہی تھی جو تمام انبیاء کی

رہی ہے۔

اِتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور میری اطاعت کرو۔

جب مسلسل ایک ہزار برس تک اس دعوت کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہ گئے اور کسی نے کچھ نہ سنی تو اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا۔

(نوح نے) کہا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو دن رات دعوت دی تو میری دعوت سے اور بھی زیادہ وہ مجھ سے بھاگتے چلے گئے۔

وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (نوح)

اور میں نے جب بھی انھیں بلایا کہ وہ تیری مغفرت کے مستحق بن سکیں انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، اپنے آپ کو کپڑوں میں ڈھانک لیا، اپنی روش پر جم گئے اور بہت زیادہ سرکشی اختیار کی، پھر میں نے انہیں کھلم کھلا دعوت دی پھر میں نے ان سے علانیہ کہا اور چھپ چھپ کر باتیں کیں۔

کس قدر مایوس کن وقت رہا ہوگا جب کہ اس نبی اولوالعزم نے اپنی ساری کوششیں راہ حق میں لگا دیں اپنی زندگی کی ایک ایک سانس تبلیغ دین کے لیے صرف کر دی پھر بھی کامیابی کا منھ نہ دیکھ سکے، ظاہری نگاہیں دیکھ کر کے فوراً فیصلہ کرنے لگ جائیں گی کہ ان کو اپنی دعوت میں ناکامی ہوئی لیکن قلب حقائق شناس سے پوچھیے تو وہ آپ کو بتائے گا کہ اس راہ میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں ہے اس راہ میں تو صرف کامیابی ہی کامیابی ہے اس راہ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اپنے اوپر جو ذمہ داری خدا وند قدوس کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کر دیا جائے اور بس اس سے بڑھ کر کامیابی اس راہ میں کچھ بھی نہیں ہے اگر صرف ظاہری کامیابیوں پر نظریں جمائی رکھی جائیں تو تاریخ کے اوراق میں بہت سے اولوالعزم پیغمبران خدا کی زندگیاں ناکامی و نامرادی کی طویل داستانوں سے پر ملیں گی حالانکہ وہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ کامیاب اور منزل مقصود تک پہنچنے والے ہیں۔

دین کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جد و جہد

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی سامنے رکھئے اس وقت نمرود جیسے جابر بادشاہ نے اپنا تخت سلطنت بچھا رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تخت الوہیت بھی پورے ملک کے اندر بچھائے ہوئے سب کا معتقد اعلیٰ اور خدائے برتر بن بیٹھا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت جب اس کے کانوں تک پہنچی

تو اس کا بستر کانٹوں کا ڈھیر اور پھولوں کی سیج دہکتا ہوا انگارہ بن گئی، اس نے اس دعوت کے لب پر دہ اپنی حکومت و سیادت کا خاتمہ اور اس کے جلو میں اپنی ربوبیت باطلہ کی فنا اور اس دعوت کی ترقی و اشاعت میں اپنا عیش و آرام منغص ہوتا ہوا دیکھا، اس نے سمجھ لیا کر سیادت چھن جائے گی قیادت کی باگ ڈور میرے ہاتھوں سے نکل جائے گی، فوراً اس نے داعی حق کو بلا کر بحث شروع کر دی اور دلائل سے شکست کھانے کے باوجود غلط روی اور مخالفت حق سے باز نہ آیا اور دعوت حق کو ختم کرنے کے لیے حکم دیا کہ داعی کو دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا جائے، لیکن جس کے ساتھ حق کی صداقت ہوتی ہے اس کے ساتھ خدا وند قدوس کا مخفی ہاتھ بھی کام کرتا ہوتا ہے، چنانچہ وہ طاقت اس داعی حق کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکی اور :-

یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ — اے آگ ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی بن جا۔

کے مژدۂ جانفزا سے داعی حق کی نصرت کی گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جدّوجہد

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ عزّ وجل کی طرف سے سب سے پہلے یہ حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جا کر اس کو دعوت حق سے روشناس کرو، ابھی اس سے بحث نہیں کہ ارباب اقتدار ہی کی طرف پہلے کیوں بھیجا گیا اور اس میں دعوتی لحاظ سے کیا مصلحت پوشیدہ ہے انشاء اللہ کسی مقام پر اس سے بھی بحث کی جائے گی۔ یہ فرعون وہی تھا جس نے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کا دعوےٰ کیا تھا جس نے پورے باشندگان مصر کو اپنی مٹھی میں شل ایک بے جان آلے کے بنا رکھا تھا جو ہمیشہ اس کے اشارۂ چشم و ابرو پر حرکت کیا کرتے تھے، اپنی جابرانہ سیاست، ظالمانہ اقتدار اور متکبرانہ حکومت کی بنیاد پر فخر کرتا تھا اس سیاست و اقتدار کو جس نے تمام باشندگان ارض الٰہی کو قبول حق سے روک رکھا تھا، اس لیے ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس کو بندگی رب کا پیغام سنایا جائے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنا پیغام سنا دیا، لیکن فرعون نے اس پر فساد فی الارض کا الزام لگایا اور یہ اعلان کیا کہ :-

قَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّہٗ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَکُمْ اَوْ اَنْ یُّظْہِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔ — فرعون نے کہا مجھے موسیٰ کو قتل کر دینے دو اور وہ اپنے (بچاؤ کے لیے) اپنے رب کو بلائے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارا دین نہ بدل دے یا زمین میں فساد نہ پھیلا دے۔

حالانکہ اس کے دل میں یہ بات سما چکی تھی کہ موسیٰ جس خدا کی طرف بلاتا ہے جس کو صحیح طور پر مقتدر اعلیٰ سمجھتا ہے اور جس کا حکم دنیا کے اندر جاری کرنا چاہتا ہے وہی سچا حاکم ہے، چنانچہ دو بتے وقت اس نے یہ اعلان کر دیا کہ :- اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ۔ — میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لایا۔

آخرکار فرعون اور اُس کے پورے لشکر کو غرقاب کر دیا جاتا ہے اور اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو موقع ملتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے اندر دینی نظام قائم کریں۔

چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا پھر انھوں نے اسی کام کے لیے مختلف سردار مقرر فرمائے۔ اور جب حضرت موسیٰ کا انتقال ہونے لگا تو انھوں نے حضرت یوشعؑ کو اپنا جانشین مقرر فرما دیا تاکہ وہ دین الٰہی کو لے کر انھیں ممالک کی تسخیر کریں اور دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کریں، قرآن پاک میں اس کی طرف صاف صاف اشارات موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ دین کو بحیثیت کلی جاری و ساری اور نافذ کرنے کے لیے اُبھارتا ہے اور داعیان حق کو زمین میں غلبہ اسی لیے بخشتا ہے کہ وہ دین کو صحیح شکل میں قائم کریں، چنانچہ فرمایا :-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ ـ	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے اُن سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت بخشے گا جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو بخشی تھی اور جو دین اس نے ان کے لیے پسند کیا تھا

اُس کو ان کے لیے ضرور غالب فرما دے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ دین حق کو قوتِ نافذہ عطا کرنے کے لیے اہل ایمان کو حکومت و اقتدار سے بھی نوازتا ہے بشرطیکہ کوئی گروہ ایمان و عمل صالح کی تمام ذمہ داریاں پوری کرے۔ شاہ ولی اللہ مذکورہ بالا آیت کے تحت فرماتے ہیں کہ :-

"اور کلمہ کما استخلف الذین من قبلہم سے یہ مراد ہے کہ جس طرح تورات شریف میں اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ سے بلادِ شام وغیرہ کے فتح ہونے کا وعدہ کیا تھا مگر چونکہ اس کا ظہور حضرت موسیٰؑ کے زمانہ باسعادت میں نہیں ہوا اس لیے انھوں نے حضرت یوشعؑ کو خلیفہ بنایا چنانچہ حضرت یوشعؑ کے عہد خلافت میں اتنی شہر فتح ہوتے اور بنی اسرائیل کو ہر طرح کا امن حاصل ہوا، بعد ازاں حسب وصیت حضرت موسیٰؑ حضرت یوشعؑ نے ان شہروں کو بنی اسرائیل میں تقسیم کر دیا[1]"

اس طریقہ سے حضرت موسیٰؑ نے دین کے قائم کرنے اور نافذ کرنے کا کام انجام دیا اور جب بنی اسرائیل اپنی غفلتوں، عیش پرستیوں، اور دُنیا طلبیوں کی وجہ سے متفرق و منتشر ہو گئے اور تخت سلطنت سے اتار پھینکے گئے تو پھر حضرت سلیمان و حضرت داؤد علیہما السلام نے انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا اور انھیں پھر ان کی بھولی ہوئی تعلیم یاد دلائی اور ضائع شدہ حکومت و سلطنت کو واپس دلایا، چنانچہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :-

---

[1] ترجمہ ازالۃ الخفا، ج ۱، ص ۵۰۔

"نیز جس طرح غلبۂ عمالقہ کی وجہ سے بنی اسرائیل کے مغلوب ہو کر منتشر ہو جانے کے بعد حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ نے بنی اسرائیل کو مطمئن و مجتمع کر دیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ :۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ — اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔

اسی طرح مرتدین عرب کے وقت جبکہ وہ زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے آنحضرت کے خلفاء نے مسلمانوں کو اس عظیم الشان انقلاب سے بچا کر انھیں اس سے مطمئن کر دیا[۵۱]"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کوششیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس لیے مبعوث فرمائے گئے تھے کہ درس موسوی کو جسے یہودیوں نے اپنے دلوں سے محو کر دیا تھا اور جس تعلیم کو بدل کر اپنے خواہشات کے قالب میں ڈھال دیا تھا اس کو از سر نو تازہ کریں، ان کے مردہ جسموں میں ایمان کی روح اور ان کے پژمردہ دلوں کے اندر ہدایت ربانی کا چراغ دوبارہ روشن کر دیں انہوں نے اس سلسلے میں اپنی پوری کوشش صرف کر دی، لیکن ان کی مہاں نوازی بھی دار ورسن کے ذریعہ سے کی گئی، جو اس راہ کی ضروری منزل ہے لیکن خدائے ذوالجلال کا دست غیبی ان مناظر کو غیب سے دیکھ رہا تھا اور اس نے کوئی چال کامیاب نہ ہونے دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دینی ولولہ اور امر بالمعروف کا جذبہ اس خطبہ میں بہت نمایاں ہے جو انھوں نے اپنے حواریین کے سامنے دیا تھا، انجیل شریف میں مذکور ہے کہ :۔

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک روٹی ہاتھ میں لی اور حواریین سے فرمایا کہ یہ میرا گوشت و پوست ہے اس کے بعد آپ نے وہ روٹی حواریین کو تقسیم کر دی، جب حواریین وہ روٹی تناول کر چکے تو جناب بارگاہ الٰہی میں آپ نے مناجات کرنی شروع کی کہ اے پروردگار عالم جس طرح یہ نان ان کے جسم میں اترے خداوندا جو نظر رحمت تو مجھ پر رکھتا ہے ان پر بھی مبذول فرما تاکہ تیرے بندوں کو وہ تیری طرف بلا سکیں[۵۲]۔"

دیکھیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کتنے پر درد انداز میں بارگاہ الٰہی میں دعا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو ان پر نظر رحم فرما تاکہ یہ لوگوں کو تیرے دین کی طرف بلا سکیں۔

یہ ہے اس دین کی مختصر تاریخ اور اس کے علمبرداروں کی کوششیں، اور یہ ہے کہ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ ...... أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ کا مفہوم۔

---

۵۱ ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۵۰ اردو۔ ۵۲ ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۱۰۹۔

دوسری جگہ اس بات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا۔ لِّيَسْــَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ (احزاب)	جب کہ ہم نے نبیوں سے عہد و پیمان لیا اور تم سے اور نوحؑ و ابراہیمؑ سے اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ بن مریم سے ان سب پختہ عہد لیا تاکہ سچوں کی سچائی کی پوچھ ہو اور کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار رکھا ہے۔

دونوں آیتوں کو ملا کر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کون سا میثاق تھا جو تمام انبیاء سے لیا سخت ترین میثاق تھا۔ کوئی کمزور و ناتوان میثاق نہیں تھا۔ وہ میثاق صرف اقامتِ دین کا میثاق تھا جسے مختلف ملکوں میں مختلف حیثیتوں سے بیان کیا گیا ہے، کہیں کہا جاتا ہے کہ:۔

اِنَّا سَنُلْقِىْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا۔	ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔

کہیں کہا جاتا ہے کہ:۔

لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔	(تم لوگوں پر اس حق) کو ضرور واضح کروگے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

کہیں کہا جاتا ہے کہ:۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى۔	فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔

کہیں کہا جاتا ہے کہ:۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِىْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ۔	میں نے وہی کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔

اور کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ۔	بے شک ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کے پاس بھیجا کہ اپنی قوم کو آگاہ و ہوشیار کر دو۔

اس طرح سے اس دین کو اور اس میثاق کو مختلف اندازِ بیان میں ان کے سامنے رکھا جاتا ہے اور مقصود ان سب سے اقامتِ دین ہی ہے۔

انبیاء کی قوت زمین خدا میں پہلے یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین کا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے تاکہ اس کا قانون دنیا میں نافذ ہو اور جس طرح

سے لوگ تکوینی قانون میں اس کے پابند اور اطاعت کیش ہیں اسی طرح سے تکوینی اور اختیاری احکام و قوانین میں بھی اُسی کی تابعداری اختیار کریں جیسا کہ تمام انبیاء نے یہ اعلان کیا کہ مالکم من الٰہ غیرہٗ اس کے سوا مطاع اور لائق اقتدار کوئی ہستی نہیں ہے، اور اپنی پوری کی زندگی اسی کے حوالہ کردو تو اس کے ساتھ ہی ساتھ خدا کے فیصلے میں یہ بات بھی قرار پائی کہ جو لوگ اس کو الٰہ مطاع ما فوق البشری قوت و طاقت اور حکومت و اقتدار کا سزاوار تسلیم نہ کریں اور اپنے اقتدار کا باطل نظریہ پھیلا کر زمین میں فساد مچائیں، اُنھیں اس زمین سے نیست و نابود کر دیا جائے تاکہ وہ صفحۂ تاریخ میں افسانۂ ماضیہ سے زیادہ حیثیت نہ پا سکیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو قوت و اختیار کی صلاحیت اس لیے نہیں بخشی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے فساد مچائیں اور زمین میں خون ریزی کریں بلکہ اسے اختیار صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ خدا کی اطاعت پورے شعور اور سمجھ بوجھ کے ساتھ کریں۔ اور اتمام حجت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ازل ہی سے یہ انتظام فرما دیا تھا کہ میری ہدایت برابر تمہارے پاس پہنچتی رہے گی تاکہ تم اس کی روشنی میں صحیح راہ معلوم کرو اور فساد فی الارض کا صحیح اور مکمل علاج ہو سکے اور جو اس کی پیروی کرے وہ اس کے قوانین تعزیرات و تازیانہ عذاب سے محفوظ ہو سکے چنانچہ اس نے فرمایا:-

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (البقرہ - ۳۸)

ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب، پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی ہدایت، تو جو چلا میری ہدایت پر، نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ (اعراف - ۳۵)

اے اولادِ آدم کی، اگر آویں تمہارے پاس رسول تم میں کے کہ سناویں تم کو آیتیں میری، تو جو کوئی ڈرے اور نیکی پکڑے تو نہ خوف ہوگا ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۔ (طٰہٰ - ۱۲۳)

فرمایا، اترو یہاں سے دونوں اکٹھے رہو ایک دوسرے کے دشمن، پھر اگر پہنچے تم کو میری طرف سے ہدایت، پھر جو چلا میری بتلائی راہ پر، سو نہ وہ بہکے گا اور نہ وہ تکلیف میں پڑے گا۔

اور مذکورہ بالا تینوں آیتوں کے ساتھ منکرین و معاندین کا بھی ذکر فرما دیا کہ جو لوگ اس ہدایت کو ہدایت اور اس کے قوانین کو اپنی زندگی کا قانون تسلیم نہ کریں گے ان کے لیے دُنیا و آخرت دونوں ہی میں خسارہ ہے من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا ونحشرہ یوم القیامۃ اعمیٰ ۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کی سنت جو ازل سے قائم و

ئد ہے اور ابد تک چلی جائے گی۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (فتح)

اللہ کا دستور ہے، جو پہلے سے چلا آتا ہے اور تو اللہ کے
دستور میں تبدیلی نہ پائے گا۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ
تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ
لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (فاطر) ۴۳۔

پھر اب وہی راہ دیکھتے ہیں پہلوں کے دستور کی، سو تو
نہ پائے گا بدلتا، اور نہ پائے گا اللہ کا دستور
ٹلتا۔

چونکہ اس ہدایت سے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، اعتراض کرنے والے راہ حق کے روڑے
نے ہیں اور پرستاران حق کے راستوں میں خار دار جھاڑی بن کر حائل ہو جاتے ہیں اس لیے ان کو صفحہ ہستی سے
ست و نابود کر دینا ضروری ہے۔ تاکہ انبیاء و رسل ان کی ایذا رسانیوں سے اور مومنین صادقین ان کی شرارتوں اور
فتنوں سے محفوظ ہو کر خدا کا قانون نافذ و جاری کر سکیں اس لیے تمام انبیاء کے ذکر میں یہ ہدایت ملتی ہے کہ ان کی
ش قوموں کو تباہ کر کے انہیں خلیفہ فی الارض اور زمین کا اصلی باشندہ قرار دیا گیا، چنانچہ آپ اس کو قرآن میں مطالعہ
فرمائیے :۔

حضرت آدمؑ کے بارے میں تو اس قسم کا ذکر قرآن میں نہیں مل سکتا، کیونکہ انہیں تو ازل ہی سے خلیفہ فی الارض
لقب مل چکا تھا، کیونکہ وہ دنیا میں کسی قوم کے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے، اسی لیے کہ اس وقت دنیا میں کوئی وجود
اسرے سے نہیں تھا۔

البتہ دوسرے انبیاء کی زندگی سامنے رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ انہیں زمین میں قوت و طاقت بخشی گئی اور
ہیں خلیفۃ فی الارض کا لقب وحدہٗ لاشریک کی طرف سے عنایت ہوا، اور اس طرح سے دین کی اقامت کے لیے
مین ہموار کر دی گئی تھی۔ (باقی آیندہ)

) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری اور ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے ورنہ تعمیل حکم نہیں ہو سکتی۔
) "دفتر زندگی" سے صرف امور متعلقہ زندگی کی بابت خط و کتابت کیجیے، وہ باتیں جو دفتر زندگی سے غیر متعلق ہوں گی ان کے
جواب سے دفتر معذور ہے۔
) "دفتر الحسنات" سے اب "دفتر زندگی" الگ ہو گیا ہے اس لیے "زندگی" کی بابت براہ راست "دفتر زندگی" کو
مخاطب کیجیے۔
) زندگی کے پرانے پرچے دفتر میں موجود ہیں، جن حضرات کی فائل نامکمل ہو، وہ طلب فرما سکتے ہیں۔ (منیجر)

اساسِ دین کی تعمیر

(۹)

(۴) صبر

مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی

صبر کی حقیقت } اساسِ دین کا چوتھا اور آخری بنیادی پتھر صبر ہے۔ صبر کا ہمارا ایک عرفی مفہوم ہے، ایک عرب کا لغوی مفہوم ہے اور ایک شرعی اصلاحی مفہوم :۔

عرفی مفہوم یہ ہے کہ انسان مصائب و آلام پر بے قرار نہ ہو، آہ و فغاں نہ کرے، واویلا نہ مچائے بلکہ جذبات کو قابو میں رکھے،

لغوی مفہوم یہ ہے کہ کسی اور کو یا خود اپنے آپ کو ناگوارِ خاطر حالت میں روک رکھا جائے۔ اگرچہ اس حالت سے نکل آنے کی راہ کھلی ہو، گویا صبر نام ہوا مشکل حالات میں ثبات و استقلال کا۔

شرعی اور اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ کوئی حالت بھی ہو، ناپسندِ خاطر ہو تو اور پسندِ خاطر ہو تو، ہر حال میں انسان دین کے تقاضوں اور بندگی کی ذمہ داریوں کو نبھائے، اور جس طرح اسے حالات کی ناسازگاریاں اور راہِ حق کی آزمائشیں، اعداء اعدائے دین کی فتنہ انگیزیاں اور بندگانِ ہوا کی مخالفتیں حدودِ شرع سے ہٹنے نہ دیں، ٹھیک اسی طرح دنیا کی زینتیں اور سامانِ عیش کی فراوانیاں، نام و نمود کی رغبتیں اور جاہ و حشمت کی مطلق العنانیاں بھی اس کے پائے استقلال کو منہاجِ شریعت سے بے گانہ ہونے دیں اور پھر اتنا ہی نہیں کہ "تیغِ ہندی" اور "کیسۂ زر" دونوں میں سے کوئی بھی اسے جنبش نہ دے سکے، بلکہ ایسا بھی ہو کہ ذاتی میلانات اور شخصی اذواق، خاندانی روایات اور آبائی رسوم قومی تعصبات اور وطنی مفادات وقت کے فتاوے اور زمانے کے فیصلے بھی اپنا زور دکھا کر تھک ہار جائیں مگر مومن

اپنی شاہراہِ ہدایت پر بدستور جما ہوا ہو۔

لیکن صبرِ شرعی کے مفہوم کی یہ جامعیت عام طور سے کم ہی مدِ نظر ہوا کرتی ہے، اور قرآن میں اس کا مفہوم بالعموم وہی لیا گیا ہے جو صبرِ لغوی کا ہے، یعنی مصائب و شدائد میں ثابت قدم رہنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی باتیں صبرِ شرعی کی اصل حقیقت نہیں ہیں بلکہ اس کے ثانوی تقاضے ہیں۔ بہرحال صبرِ عرفی سے صبرِ لغوی، اور پھر صبرِ لغوی سے صبرِ شرعی وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔

صبر کی اہمیت | بنائے دین کا آخری پتھر جس کے بعد اس کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے، اور اب اس کے اوپر دین کا قصرِ منیع بڑی آسانی سے اور تھوڑے ہی دنوں میں اٹھایا جا سکتا ہو۔ یہی صبر اور اس کی یہی وسیع اور ہمہ گیر حقیقت ہے۔ آپ قرآن مجید اٹھا لیجئے اور کسی نبی کی بھی تاریخِ دعوت پڑھنا شروع کر دیجئے، آپ دیکھیں گے کہ اس کی اولین ہدایات میں جن چیزوں کا ذکر ہے اُن میں نہ صرف یہ کہ صبر ضرور ہے بلکہ اس پر غیر معمولی زور بھی دیا گیا ہے۔ اور پھر اگر اس دعوت کو کامیابی حاصل ہوئی ہے تو وہ آخری شرط جس کو پوری کر لینے کے بعد ہی قدرت کی جانب سے اہلِ ایمان کو فتح کا پروانہ عنایت فرمایا گیا، یہی صبر ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری ہی وحی میں یہ ہدایت دی گئی :۔

.... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ (مدثر)
.... اور اپنے رب (کی رضا) کے لیے صبر کر۔

چند دن ٹھیر کر یہ ہدایت دہرائی گئی :۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا۔ (مزمل)
یہ (کفار) جو کچھ (تمہاری مخالفت میں) کہتے ہیں اس پر صبر کرو، اور عمدگی کے ساتھ ان سے علٰحدہ ہو جاؤ۔

یہ سورتیں (مدثر اور مزمل) بالکل ابتدائے بعثت کی سورتیں ہیں، اس لیے یہ تلقیناتِ صبر بھی نبی کے لیے اولین ہدایات میں سے ہیں۔ پھر جوں جوں دعوت و تبلیغ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، اور نتیجۃً جس جس طرح مشکلات و موانع کی آندھیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں، ان تلقیناتِ صبر کا بھی پیہم اعادہ ہوتا رہا، نہ صرف نبی کے لیے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر اصحابِ نبی کے لیے بھی۔ مٹھی بھر جماعت اپنے آپ کو اس حال میں پا رہی تھی گویا سرزمینِ عرب کا ذرہ ذرہ اسے نگل جانا چاہتا ہے اور سارے مادی اسباب اکٹھے ہو کر اسے بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہیں۔ ادھر صرف جماعت کی تعداد ہی مختصر نہ تھی بلکہ ظاہری سروسامان بھی ناپید تھے۔ حکم ہوا کہ :۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔ (بقرہ - ۱۵۳)
اے ایمان والو! (ان حالات کے مقابلے کے لیے) صبر اور نماز کے ذریعہ مدد لو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا
اے ایمان والو! خود صبر اختیار کرو، دوسروں کو صبر کی تلقین کرو

وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۔ (آل عمران ۔ ۲۰۰)

باہم جڑ کر رہو، اور اللہ سے ڈرو، تاکہ کامیاب ہو سکو ۔

یہ "اِصْبِرُوا" کی صدا مسلسل گونجی، اور اس انداز میں گونجتی رہی گویا یہی صبر وہ تنہا ہتھیار ہے جس سے مشکلات کے ہجوم کو زیر و زبر کیا جا سکتا اور یہ حق و باطل کا معرکہ سر کیا جا سکتا ہے، یہی قلت تعداد کا بھی بدل ہے اور سر و سامان کار کی کمی کا بھی ۔ چنانچہ یہ بتا بھی دیا گیا کہ ایسا کیوں کر ہوگا؟ ایسا اس لیے ہوگا کہ "صبر اختیار کرنے والوں کے ساتھ خود اللہ ہوتا ہے" اور کون ہے جو اس لشکر کو ہرا دینے کا حوصلہ کر سکے جس کی آستینوں میں سے خود اللہ کا ہاتھ نبرد آزمائی کر رہا ہو!

پھر یہی نہیں کہ صبر ہی حق و باطل کی کشاکشوں میں کامیابی کی شاہ کلید ہے، بلکہ کسی گروہ کا صدق ایمانی اسی وقت اللہ کے حضور سند قبول حاصل کرتا ہے جب وہ صبر و استقامت کا ثبوت مہیا کر دے :۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ...... وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ ۱۷۷)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے پورب یا پچھم کی طرف اپنا رُخ کر لیا (اور نہ ایسے لوگ فی الواقع نیک ہیں) بلکہ نیکی وہ عمل ان کی ہے جو اللہ پر ایمان لائیں ...... اور بالخصوص جو بھوک اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر و استقامت سے کام لیں۔ یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ حقیقی معنوں میں اگر کوئی ہدایت یاب اور مستحق رحمت ہے تو وہ یہی صابروں کا گروہ ہے۔

...... وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ)

...... اور اے نبی! صبر کرنے والوں کو (خوشنودی حق) کی بشارت سنا دو، جنھیں اگر کوئی مصیبت پہنچی ہے تو کہتے ہیں "ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اُسی کے حضور پلٹ کر جانا ہے"۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے عنایتیں ہوں گی اور وہ اس کی رحمت کے مورد ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت یاب ہیں۔

غور فرمایئے، صبر کا دین میں کیا مقام ہے، اور وہ کس طرح ایمان اور ایمانی زندگی کے آغاز کو بھی محیط ہے اور انجام کو بھی۔ یہ گمان نہ ہو کہ دین کے اندر صبر کو یہ بنیادی اہمیت بس دعوت قرآنی ہی میں حاصل ہے۔ نہیں، دعوت حق کی پوری تاریخ کا ایک ایک باب صبر کی اسی اساسی حیثیت کا گواہ ہے۔ دعوت موسوی کی شہادت ابھی اسی مضمون کے ابتدائی مباحث میں آپ کی نگاہوں سے گزر چکی ہے۔ وہاں آپ نے دیکھا کہ کوہ طور پر جو سب سے پہلی وحی حضرت موسیٰ

علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی ہے اس میں بھی خود آنحضرت کو صبر و استقامت کی ہدایت موجود ہوتی ہے۔ (وَلَا یَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَا یُؤْمِنُ بِهَا) اور جب دعوت شروع ہوتی ہے، اور کچھ لوگ ایمان لاتے ہیں اور فرعونی اقتداران پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا ہے تو بعینہٖ یہی ہدایت ان مومنوں کو بھی دی جاتی ہے :۔

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۔ (اعراف۔ ۱۲۵)
موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔ کہ اللہ سے مدد مانگو اور صبر اختیار کرو۔

اور آخرکار جب فرعونی مظالم کے آہنی پنجے سے انھیں نجات ملتی ہے تو اسی "صبر" ہی کے طفیل :۔

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا (اعراف۔ ۱۳۳)
بنی اسرائیل پر تیرے رب کا کلمۂ خیر پورا ہو کر رہا بوجہ ان کے صبر اختیار کرنے کے۔

تاریخ ہدایت کے اس سے بھی قدیم صفحات اگر آپ اُلٹ کر دیکھیں گے تو ایک ایک صفحہ اسی روشن حقیقت کا گواہ ثابت ہوگا۔

صبر و استقامت کی ان سعادت بخشیوں کو صرف اسی پار کی زندگی تک محدود نہ سمجھیئے اُس پار کی زندگی، حقیقی اور ابدی زندگی میں بھی خوش بخت وہی ہوں گے جو اپنے ساتھ صبر کا توشہ لے کر حاضر ہوتے ہوں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نیکوکاروں کو اپنی مغفرت اور رحمت کا انعام عطا کرتے ہوئے فرمائے گا :۔

إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا ۔
آج کے دن میں نے ان کو یہ جزائے خیر اس صبر کے سبب ہی سے جس کا انھوں نے مظاہرہ کیا تھا۔

اور اس بخشش اور بنائے بخشش کا اعلان کچھ اسی دن یکایک نہیں ہوگا، بلکہ اس کی اطلاع ہمیں یہیں دی جا چکی ہے۔

أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا (فرقان۔ ۷۵)
انھیں اجر میں (جنت کے) بالاخانے ان کے صبر کے باعث دیئے جائیں گے۔

اہمیت صبر کی وجہ صبر کو یہ غیر معمولی اہمیت کیوں حاصل ہے؟ بالخصوص ایسی شکل میں کہ وہ دین و ایمان کی کوئی مثبت حقیقت بھی نہیں ہے؟ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور نماز کو اس باب میں جو بنیادی حیثیتیں حاصل ہیں، ان کے لیے ان کی ایجابی نوعیت بجائے خود ایک بڑی بلکہ اصلی سفارش ہے۔ مگر صبر تو کچھ "ہونے یا کرنے" کا نام نہیں، وہ تو کچھ نہ "ہونے" یا "نہ کرنے" کا نام ہے۔ ایسی حالت میں دین کے اندر صبر کی یہ اہمیت ایک قابل غور مسئلہ ہے۔ آیئے اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اساس دین کی مذکورہ بالا جن تین بنیادوں کو آپ "مثبت حقیقتیں" قرار دیتے ہیں، بلاشبہ ان کی ایجابی نوعیت کے ساتھ ساتھ ان کی غیر معمولی عظمت و افضلیت بھی ناقابل تحدی ہے، اور صبر ہرگز ان کا مد مقابل نہیں ہو سکتا لیکن اس

بھی صبر، ہی اتنی حقیقت، اپنے اندر ایک ایسی شان امتیاز بھی رکھتی ہے جو کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔
اللہ، ایمان بالآخرت اور نماز وہ چیزیں ہیں جن کے اندر غلط بیانیوں اور فریب کاریوں سے کام
تا ہے، مگر صبر کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں، دوسری چیزیں بنائے حق تو ضرور ہیں مگر ان کا اظہار
و نمائشی اور ریاکارانہ بھی ہو سکتا ہے، مگر صبر کا نمائشی مظاہرہ نہیں ہو سکتا، اور اگر کسی نے اس کی زبردستی
بھی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ بجائے خود صبر کا کھوٹا سکہ نہیں چلایا جا سکتا بلکہ دوسرے سکوں کا
اصلی معلوم ہوتا ہے۔ دراصل جو چیز اللہ کو مطلوب ہے وہ صرف ایمان باللہ ہے، اور اس ایمان کے
ضے، رہا ایمان بالآخرت تو وہ بھی ایمان باللہ کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہے، اور نماز ان ہی دونوں
کا خارجی ظہور ہے، جیسا کہ ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ اب یہ ایمان باللہ اگر کہیں اپنے اندر صدق اخلاص
تا ہے تو کہیں نفاق و ریا کی نقاب اوڑھے بھی نمودار ہوتا ہے دو زبانیں ہیں اور دونوں سے یکساں بلند
ساختہ آمنا باللہ کے نعرے بلند ہوتے ہیں، درآں حالیکہ ایک کا نعرہ نیچے قلب کی گہرائیوں سے اٹھ کر زبان
ہے اور دوسرے کا وہیں کا وہیں، زبان ہی پر جنم لیتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ سچ کو جھوٹ سے الگ
اور ایمان صادق و ایمان کاذب کے درمیان امتیاز کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔

ابتلاء

اللہ تعالیٰ نے یہ "صورت" روز اول ہی سے متعین فرما رکھی ہے، جس کا نام قرآن میں سنت ابتلا
ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ادعائے ایمان کی صداقت اگر معلوم کی جا سکتی ہے تو صرف ایک طریقے
وہ یہ ہے اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کا جائزہ۔ کسی چھپی ہوئی اور ان دیکھی حقیقت کا وجود آدمی اسی وقت
ہے جب اس کے لوازم کا مشاہدہ کر لے۔ یہی لوازم اور مقتضیات وہ معیار ہیں جن پر کسی شے کے واقعی وجود
در پرکھا جا سکتا ہے اور پھر اس کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہ تھی کہ حیات
سب سے اہم حقیقت یعنی ایمان کو محض اس ہوائی توقع کی بنا پر تسلیم کر لیا جاتا جو کسی حلق سے آمنت باللہ کے
ے فضا میں پیدا ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو اپنی وفادارانہ بندگی کی سند عطا فرما دیتا
اپنی زبان سے اس کا دعویٰ کر دیا ہو۔ اس نے تو انسان کو پیدا ہی اس غرض کے لیے کیا تھا کہ اس کے
حق بندگی کو آزمایا جائے اور دیکھا جائے کہ کون اس کا بندہ بن کر رہتا ہے (خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ
اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) پھر یہ کتنی عجیب بات ہوتی اگر وہ لوگوں کے محض زبانی دعووں کو سن کر انھیں اس
کامیاب قرار دے دیتا۔ اس نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ بنی نوع انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے تاکہ
ے کون اللہ پر ایمان لانے کا اعلان کرتا ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ:۔ "اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا" تم میں سے

کون عمل اچھا نکلتا ہے۔ پس ضروری تھا کہ ایمان کے دعووں کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

یوں تو دنیا کا کوئی کام اور مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے پورا ہو جائے، مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں آپ اپنی نظیر ہو، اس کے لیے سعی و جہد کی کوئی معمولی مقدار ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ اللہ پر ایمان، اس کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور پھر اس کی اقامت کا مقصد وہ مقصد ہے جس کے لیے بڑی ہی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ آپ کوئی مقصود لے کر اٹھیں، راہ میں رکاوٹیں لیکن کہیں کہیں پیش آئیں گی، لیکن یہ مقصود گراں تو ایسا ہے جس کی راہ میں دور دور بھاری چٹانوں، گہرے غاروں، سنگلاخ وادیوں اور خار دار جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ کسی اور شئے کا نام لیجئے، اگر ایک طرف سے مخالفت کی ہمت شکن صدا بلند ہو گی تو تین طرف سے حوصلہ افزائی کی آوازیں بھی آئیں گی، مگر اللہ کا نام لیجئے اور دیکھیے کہ ہر سمت سے جگر شگاف نعرے گونج اٹھتے ہیں۔ کسی تحریک کا علم اٹھا لیجئے، مشکلوں اور مخالفتوں کی بارش ہی کیوں نہ ہونے لگے، مگر کہیں نفس کی لذت کہیں شہرت کی ہوس، کہیں خاندان کی حمایت، کہیں قوم کی عقیدت کہیں کسی خاص طبقے کی تحسین، کہیں حب وطن کی سند، غرض کوئی نہ کوئی چیز دل کو گرمانے اور تسلی دینے کے لیے ضرور موجود ہو گی، مگر دین کی دعوت دیجئے پھر دیکھیے وطن کی زمین آپ کے لیے تنگ ہو جاتی ہے، قوم غداری کے القاب سے نوازتی ہے، ملت طعنوں اور افترا پردازیوں سے استقبال کرتی ہے، خاندان برداشت کرنے سے انکار کر دیتا ہے، حتیٰ کہ خود اپنا نفس بھی آمادہ پیکار ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اس خوش فہمی کے علی الرغم کہ غلط مقاصد کے لیے بے شک مشکلات اور مصائب کا سامنا ہو، مگر جس مقصد کی بنا رضائے الٰہی پر ہو، اس کی راہ تو بڑی ہموار اور آسان گذار ہونی چاہیے، اس کی دشوار گذاریاں بھی دو چند ہیں یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اس عالم کے عام دستور کے مطابق جس طرح اور مقاصد کا حصول کم و بیش کچھ نہ کچھ قربانیوں پر موقوف ہے، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی کچھ قربانیاں دینی ہی پڑیں گی، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہاں عام دستور کے مطابق ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر مشکلیں برداشت کرنی ہوں گی، اور محض اُن ہی مصائب اور موانع سے سابقہ پیش نہیں آئے گا، جو اسباب عام کے تحت پیش آ جائیں بلکہ اللہ تعالیٰ بالقصد ایسے حالات سے دو چار کراتا رہتا ہے جو ناگوار خاطر ہوں، ایسے مواقع پیدا کرتے رہتا ہے جن میں جان و مال کا زیاں ہو اور کانوں کو کانوں میں پہنچتے رہنے کا اہتمام کرتا ہے جو جذبات دل پر شاق ہوں۔ وہ کہتا ہے:-

لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ	ہم تمہیں کچھ (خطرات جنگ کے) خوف سے، کچھ فاقوں سے
وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ	مال جان اور پیداوار کے نقصانوں سے ضرور آزمائیں گے

(بقرہ - ۱۵۰)

اور جب چھوٹے لوگ اس صورت حال سے گھبرا گھبرا کر چیخنے لگے تو فرمایا:-

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۔ (عنکبوت۔۲) — کیا ان لوگوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ وہ اتنا کہنے پر کہ ہم ایمان لائے، بس یوں ہی چھوڑ دیے جائیں گے اور انھیں آزمایا نہ جائے گا؟

اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ تمہارے لیے کوئی نرالا رویہ نہیں اختیار کیا گیا ہے بلکہ ہماری ہمیشہ سے یہی سنت چلی آرہی ہے۔ یہ "مجز" "آزمائش بہت قدیم ہے اور وہ سدا ہی سے " دوستوں کا" مخصوص حصّہ رہا ہے:۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ (عنکبوت۔۳) — اور ہم نے ان سبھی (مدعیان ایمان) کو آزمایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

آزمائشوں کا تنوع

گو آیات مذکورہ سے یہ بات روشنی میں آجاتی ہے کہ ایمان کی راہ پر قدم رکھنے والوں کو آزمائشوں کے دور سے گذرنا لازمی ہے۔ اور ایک نظری انسان کو تو اتنی روشنی بس کرتی ہے، لیکن ایک عملی انسان کو، ایسے انسان کو، جو اس حقیقت کا علم صرف برائے علم نہ حاصل کرنا چاہتا ہو بلکہ برائے عمل چاہتا ہو، اس سے زیادہ تیز روشنی کی ضرورت ہے۔ وہ دور کا تماشائی نہیں بلکہ بذاتِ خود اس راہ کا راہرو ہے، اس لیے وہ اس کے ایک ایک نشیب و فراز کو اپنی آنکھوں دیکھ لینا چاہے گا۔ وہ بس اتنا جان کر خاموش اور بے فکر نہیں ہو جائے گا کہ ایمان کی صراطِ مستقیم مشکلات سے گھری ہوئی ہے، بلکہ اُسے تجسس ہوگا کہ یہ مشکلیں کس طرح کی ہوں گی، تاکہ ان کے لیے وہ پہلے سے اپنے دل و دماغ کو تیار کرے، اور اچانک ان کا سامنا ہو جانے پر انتشارِ فکر و عمل کا شکار نہ ہو جائے۔ اس لیے ہم ان مشکلات و مصائب کا ذرا تفصیلی جائزہ لیں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اللہ تعالےٰ کی یہ سنّتِ ابتلا کن کن شکلوں میں ظہور کرتی ہے اور کن کن طریقوں سے علم بردارانِ حق کو آزمایا جاتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر ان مصائب کی سختیوں کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائشیں ہر جہتی ہوتی ہیں۔ انسان کو ہر طرف سے ٹھونک بجا کر دیکھا جاتا ہے، اس کے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ چھانا جاتا ہے، اور اس کے جذبات کا کوئی تار نہیں جس پر مضرابِ ابتلا کی ضرب نہ پڑتی ہے:۔

(۱) پُر فریب پروپگنڈا

اس زبردست امتحان کی ابتدا عوام کو بھڑکا دینے والے پُر فریب پروپگنڈوں سے ہوتی ہے۔ داعیِ حق سیدھے سادے لفظوں میں دُنیا کی سب سے بڑی سچائی کا پیغام دیتا ہے، اور اس بات کے قوی امکانات ہوتے ہیں کہ اس کی فطری مدلل اور دل نشیں دعوت عام لوگوں کو اپیل کر جائے کہ وقت کے سیاسی اور مذہبی اجارہ داروں کی طرف سے پہلے تکذیب و مخالفت کا مظاہرہ ہوتا ہے اور پھر یہ مظاہرہ عوام فریب پروپگنڈوں کے طوفان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بدگمانیوں کا ایک سیلاب امنڈ آتا ہے جس کی تیز و تند لہروں

میں داعی حق کی معصوم تمنائیں تنکوں کی طرح بہنے لگتی ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ	اے پیغمبر! ہم نے تم سے پہلے جس رسول یا نبی کو بھی بھیجا۔
وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ	(اس کو ضرور اس صورت حال سے سابقہ پیش آیا کہ) اس نے
فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (حج)	(اپنی دعوت پہنچانے کی) تمنا کی نہیں کہ شیطان نے اس
	میں دخل اندازی کردی۔

تمنائے نبوت میں یہ شیطانی دخل اندازیاں کیوں کر ہوتی ہیں؟ اس کی شرح بھی قرآن ہی سے سنیے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ	اور اے نبی (جس طرح آج تمہارے ساتھ ہو رہا ہے)
الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ	اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیاطین انس وجن کو
زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۔ (انعام-۱۱۲)	(دعوت حق کا) دشمن بنا کر کھڑا کیا تھا جو ایک دوسرے
	کو خوش نما باتیں سکھاتے تاکہ خلق خدا کو مبتلائے فریب کریں۔

"زخرف القول" جس کا ترجمہ ہم نے "خوش نما باتیں" کیا ہے، ان باتوں کو کہتے ہیں جو ہوں تو بے اصل مگر ایسے انداز میں کہی جائیں کہ عام لوگوں کو مسحور کرلیں جن کے اندر کوئی دینی، اخلاقی اور عقلی جوہر نہ ہو مگر اوپر حسن عقیدت کی ملمع کاری کردی گئی ہو۔ عوام الناس یوں بھی کہاں کے نکتہ رس اور صاحب فکر وتمیز ہوتے ہیں، لیکن جب ان کی ساری دین داری صرف چند خوش عقیدگیوں میں سمٹ آئی ہو تو ان کے جذبات کی نزاکت اپنی انتہا کو جا پہنچی ہے۔ ایسے وقت میں ان کے ان محبوب تصورات کو جنھیں پوری متاع دین لٹا کر انھوں نے بکمال حفاظت اپنے نہاں خانۂ عقیدت کی زینت بنا رکھا ہو، چھیڑ دینا کتنا خطرناک کام ہے۔ ہوشیار مخالفین حق نے ہمیشہ اس مؤثر مگر آسان چھکلوں کو بڑی ہی فراخ دلی سے استعمال کیا ہے، اور خدا کے ان سادہ لوح بندوں کو، جو دعوت حق سے قریب ہو رہے تھے، بس ایک "زخرف القول" سے اتنا دور کردیا کہ اب ان کے کانوں تک اس دعوت کی گونج بھی نہیں پہنچائی جا سکتی۔

شاید مثالوں کے ذریعہ یہ بات زیادہ وضاحت سے سامنے آسکے گی۔ اس لیے ان چند ایک چلتے ہوئے نعروں پر نظر ڈال لینی چاہیے جو دعوت قرآنی کی مخاصمت میں قریش مکہ اور یہود و منافقین مدینہ کی جانب سے پھیلائے گئے تھے:۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا، جواب دیا گیا کتنی عجیب بات ہے! ایک ہمارے ہی جیسا انسان اللہ رب العالمین کا ایلچی بن جائے! بھلا دنیا و جہان کا شہنشاہ اب ایسا گیا گذرا ہو گیا ہے! کیا اس کے پاس فرشتے نہ تھے جو وہ ایک بشر کو پیام بر بنانے پر مجبور ہو گیا۔ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل)

اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ ایک بشر ہی کو یہ خلعتِ رسالت مرحمت ہونی تھی، تو کیا اس کے لیے بس حضرت ہی کی ذاتِ گرامی لائقِ انتخاب تھی؟ ہم میں سے کوئی اس کا اہل نہ تھا؟ (ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا ۔ ص۔) حق تو یہ تھا کہ اس کے لیے طائف اور مکہ کے اعیان و اشراف میں سے کسی کو منتخب کیا گیا ہوتا، وہ شاید اس منصب جلیل کا کچھ اہل بھی ہوتا (لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۔ سورہ زخرف) لیکن ایسے شخص کا انتخاب تو عجائبات میں سے ہے جس کے پاس نہ دولت ہے نہ سرداری، جو اپنے سودے سلف کے لیے ایک غلام تک نہیں رکھتا (مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۔ سورہ فرقان) اور پھر یہ تو دیکھو اس شخص کے پیروؤں کا کیا حال ہے؟ دعویٰ تو یہ ہے کہ وہی اللہ تعالیٰ کے شکر گزار، حق شناس اور طاعت شعار بندے ہیں، اور اس لیے وہی محبوبِ خدا ہیں، اگر صورت دیکھیے تو جیسے فلاکت برس رہی ہے، چند لقموں اور چیتھڑوں تک کے لیے ترس رہے ہیں۔ کیا حق پرستی اور محبوبیتِ الٰہی کے علائم یہی ہیں! (اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ مِنْ بَيْنِنَا ۔ انعام) یا پھر اللہ کو اپنے چہیتوں کی خبر ہی نہیں۔ (اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۔ انعام)

پیغمبرِ خدا نے فرمایا، "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" اور جن کو تم فوق البشر قوتوں اور معبودانہ عظمتوں کا حامل سمجھتے ہو وہ سب مجبورِ محض ہیں"۔ شور اٹھا، کیا یہ عظیم و جلیل ہستیاں عظمت و شان کی اسی سطح پر ہیں جس پر ہم ہیں؟ یہ ان کی شان میں کیسی شدید گستاخی ہے! کیا آج سے معبودانِ عظام کی یہ پوری بزم برخواست کر دی جائے گی، اور بس ایک ہی معبود رہ جائے گا؟ یا للعجب (اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۔ ص۔)

متکلمِ حق نے شرک کے باطل ہونے پر اس طرح دلائل کے انبار لگا دیے کہ مشرکوں کی زبانِ استدلال لاکھ کوششوں کے باوجود کھلنے کی جرأت نہ کر سکی، مگر ان کی زبانِ جہل کون روک سکتا تھا! انھوں نے کہنا شروع کیا، ہم تو اسی راستے پر چل رہے ہیں جس پر اپنے اسلاف و اکابر کو چلتے پایا ہے (اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۔ زخرف) مطلب یہ تھا کہ آج تو تم یہ فرماتے ہو کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" مگر ہمارے اسلاف، جن میں فلاں فلاں جیسے مدبر، فلاں فلاں جیسے حکیم، فلاں فلاں جیسے معلمین اخلاق اور فلاں فلاں جیسے ماہرینِ الٰہیات شامل ہیں، مانتے اور فرماتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقربین خاص کو الوہیت کی بعض صفتوں سے نواز رکھا ہے، اور وہ اللہ کے دربار میں ہمارا ذریعۂ بخشش ہیں، اس لیے ہمیں ان کی پرستش کرنی چاہیے۔ اب اگر تمہاری بات صحیح مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے سارے اسلاف احمق تھے، گمراہ تھے اور جہنم کے کندے تھے۔ بس آپ ایک عقل مند اور واقف اسرارِ حقیقت ہیں!

شارع نے شریعت کے تفصیلی احکام دینے شروع کیے اور پوری انسانی زندگی کو ایک ہمہ گیر ضابطۂ ہدایات کا پابند بنانا شروع کیا، کہا جانے لگا کہ لو! دین کی ایک نئی قسم ایجاد ہوئی ہے، اب وہ معبدوں اور قربان گاہوں

کل کر بازار اور کھیت تک، حتیٰ کہ بیت الخلا، تک جا پہنچا، (قَدْ عَلَّمَكُمْ نَبِيُّكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الْخِرَاءَةَ؟) (زندگی،
آیت نازل ہوئی کہ مردار حرام ہے، صرف اُس حلال جانور کا گوشت کھاؤ جسے تم نے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا
، فرمایا گیا، کیا خوب، اللہ کا مارا ہوا تو حرام و نجس مگر اپنا مارا ہوا حلال وطیب!

تحویلِ قبلہ کا حکم آیا، یہودیوں اور یہودی منافقوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا، لوگوں سے کہا جانے لگا
یں تمہارے "نبی" جن کا خدا بھی جگہیں بدلتا رہتا ہے۔ کل تک تو بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا ہی دین و ایمان
ا، مگر آج اُس کی طرف منھ کرنا حرام ہو گیا۔ یہ ہوا کا رُخ دیکھ کر چلنا نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک ہی بات ماضی
ں فرض، اور حال و مستقبل میں موجبِ کفر! رائے اور فیصلے کی یہ دو رنگی بھی خوب ہے!

ہجرتِ مدینہ سے پہلے صحابۂ مظلومین کا ایک گروہ ستم کدۂ مکہ سے حبشہ ہجرت کر جاتا ہے: وہاں کے بادشاہ
اشی، سے پناہ کا طالب ہوتا ہے۔ سردارانِ قریش اپنے ڈپلومیٹوں کا ایک وفد بھیجتے ہیں، جو شاہی دربار میں
ضر ہو کر مطالبہ کرتا ہے کہ "یہ ہمارے بھاگے ہوئے غلام ہیں انھیں ہمارے حوالہ کر دیا جائے" لیکن بادشاہ
ن حال کے بعد یہ مطالبہ منظور کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وفد مجبور ہو جاتا ہے اور کچھ نئی ترکیبیں سوچتا ہے۔
رکارِ شیطان اس کو ایک "تیر بہدف" تدبیر سمجھاتا ہے۔ چنانچہ وہ اگلے دن پھر حاضر ہوتا ہے اور نجاشی سے
تا ہے "عزت مآب ذرا یہ تو دریافت فرمائیں کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ان لوگوں کا کیا عقیدہ ہے" بادشاہ
لمانوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیتا ہے۔ مسلمان موقع کی خوف ناک نزاکت محسوس کر گئے، وفد بے چینی کے ساتھ
نے اس کاری داؤ کا انجام دیکھنے کے لیے ہمہ تن چشم و گوش بن جاتا ہے، اسے یقین ہے کہ عیسیٰ کو انھوں نے
نی ہدایات کے مطابق "عبد اللہ و رسولہ" کہا نہیں کہ عیسائیت کا محافظ نجاشی اپنے مقتدا کی اس توہین پر آگ
ہ ہو جائے گا اور انھیں بدعقیدہ اور گستاخ قرار دے کر ہمارے حوالہ کر دے گا۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں
شیطانی تدبیر تھی بھی ایسی ہی بے پناہ، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کی نصرت و حمایت نے اسے کامیاب نہ
نے دیا اور جب حضرت جعفر طیار نے کہا کہ ہم حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول سمجھتے ہیں، تو نجاشی نے
ن سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ "خدا کی قسم، عیسیٰ اس سے اس تنکہ کے برابر بھی زیادہ نہ تھے"

عوام فریب پروپگنڈوں کی یہ چند مثالیں ہیں۔ ذرا نفسیاتِ انسانی کی روشنی میں ان کی سحر کاریوں کا
زہ لیجیے اور دیکھیے کہ وہ سادہ لوح عوام کی قوتِ فیصلہ پر کیسا زبردست شب خوں مارتا ہوگا، اور عوام بھی
جن کے قوائے فکر زنگ خوردہ ہوں، جو دین داری کے سہل ٹوٹکوں کے عادی ہو، آبا و اجداد کی عظمت اور
س تابی پر شک کرنا جن کی نگاہوں میں گناہِ عظیم ہو، اور جو بالعموم قدامت کے پرستار، اور کسی بھی اصلاح و
ب کے طبعی دشمن ہوں ـــــ اور پھر اس کا اندازہ کیجیے کہ نبی اور اس کے ساتھیوں کے دلوں پر کیا بیت

جاتی ہوگی جب وہ دیکھتے ہوں گے کہ ان کی گھنٹوں دنوں اور مہینوں کی داعیانہ مساعی کا حاصل بس ایک چلتے ہوئے فقرے کی نذر ہو گیا۔ کیا ان کے دلوں کا ٹوٹ ٹوٹ جانا غیر اغلب ہے؟ تجربہ اور مشاہدہ کہتا ہے کہ اغلب کیا یہ تو یقینی ہے۔ مگر اللہ تعالےٰ کہتا ہے کہ یوں ہی ہوتا آیا ہے اور یوں ہی ہوگا، صبر کرو اور اپنا کام کیے جاؤ اگر دعوتِ حق سے تمہیں قلبی تعلق ہے اور چاہتے ہو کہ دوسرے بھی اسے قبول کر لیں تو اس کا ثبوت یہ نہیں ہے کہ ان غوغا آرائیوں سے دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاؤ، تمہارا فرض تو اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانا ہے، ان کے دلوں میں اُتار دینا نہیں ہے۔ پس یہ طوفان مخالفت جہاں اپنے اندر اور بہت سی حکمتیں رکھتا ہے، اس کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ تمہارے اس تعلق خاطر کو جانچا جائے جو اس دعوت کے ساتھ تمہیں ہے۔ دراصل تمہارے حالات ان منکرینِ حق کے لیے وجہ آزمائش ہیں اور ان کے اطوار و افعال تمہارے لیے وجہ آزمائش (وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً (فرقان) پس صبر کرو۔ اَتَصْبِرُوْنَ ۔ (باقی آئندہ)

حیاتِ نو ہفتہ وار حیدر آباد (دکن)

ہندوستان میں تحریک اسلامی کا ممتاز داعی،

علمی، اخلاقی و دینی مضامین، دلچسپ اور مفید تنقیدیں، معیاری اور بامقصد افسانے، بلند پایہ اور پُر زور منظومات، مسلم اور غیر مسلم سبھی اصحاب کے لیے قابل مطالعہ ادارتی نوٹس۔ اس کی خصوصیات میں شامل ہیں، یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء سے بلند معیار اور نئے انتظامات کے ساتھ باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔

ہندوستان میں تحریک اسلامی کی رفتار کار کو معلوم کرنے اور اس کے طریق کار کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

چندہ سالانہ (سے) ششماہی (عہ) فی پرچہ دو آنے (۲ر)

پتہ:۔ دفتر حیاتِ نو، حیدر آباد، دکن۔ انڈیا۔

تحریک اور تعمیر افراد

(۲)

انور اعظمی

اس سے پہلے موجودہ دور کی بڑی بڑی اور علمی تحریکوں پر اس نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان کا اثر انسان کی انفرادی زندگی پر کس قسم کا ہوتا ہے؟ اور پھر جب یہی افراد اجتماعیت کو وجود میں لاتے ہیں تو اس کی مجموعی اثرات انسانی معاملات پر کس نوعیت کے ہوتے ہیں؟ اس دوران بحث میں یہ دکھانے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ان دو تحریکوں کے اندر وہ کیا بنیادی نقائص موجود ہیں؟ جن کی وجہ سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اندر ایک اختلال، بے ربطی بلکہ بسا اوقات وحشت و بربریت کی جھلک پیدا ہو جایا کرتی ہے، اور وہ اصول اور ضابطے جو علمی دنیا میں بڑے جاذب نظر اور دل کش معلوم ہوتے ہیں، جب عملی دنیا میں آتے ہیں تو مستقل لعنت بن جایا کرتے ہیں،

عام طور پر، جب اس عنوان فکر پر لوگ سوچتے ہیں تو ایک بنیادی غلطی کا شکار ہو جایا کرتے ہیں، وہ اس نقطہ پر غور ہی نہیں کرتے جس کے زہریلے بیج سے وہ شجر خبیث پیدا ہوا ہے جس کو مغربی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے، بلکہ اس کے بجائے وہ اس کے پھلوں اور پھولوں پر اپنا سارا زور تحقیق و تنقید پر صرف کرتے ہیں، اور اس طرح سمجھتے ہیں کہ ہم نے موجودہ تہذیب کے نقائص کو دور کرنے کا عظیم الشان کارنامہ اور انسانیت کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے، ظاہر ہے کہ کسی خرابی کے دور کرنے کا یہ کوئی معقول اور نتیجہ خیز طریقہ نہیں ہو سکتا، خاص کر کسی ایسی تہذیب کے متعلق کے سلسلے میں، جس نے کہ اپنی بنیاد ہوشیاری اور کمال عیاری کے ساتھ چند علمی اصولوں پر قائم کر رکھی ہو، یہ طریقہ تو مطلق فائدہ نہیں پہونچا سکتا، کیونکہ "تہذیب یا تمدن" ان مظاہر کا نام نہیں ہوتا ہے جو عام طور پر روزمرہ کی زندگی میں رائج ہوتے ہیں، بلکہ تہذیب دراصل وہ بنیاد یا جڑ ہوتی ہے۔ جو افراد کی ذہنیت کو بطور زمین کے استعمال کرتی ہے، اور جس میں سے نت نئی شاخیں پھوٹتی ہیں، طرح طرح کے غنچے نکلتے ہیں، رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں اور

بھانت بھانت کے پھل اس سے حاصل کیے جاتے ہیں، آپ نے اگر خفا ہو کر کسی ایک پھول، کسی ایک پھل، یا زیادہ ہمت سے کام لے کر کسی پوری شاخ پر اپنے تیشے کی ضرب لگائی تو، جڑ اگر قوت نمو رکھتی ہوگی تو اس پھول کی جگہ پر اور دوسرے پھول اس کٹی ہوئی شاخ کی جگہ پر اور کئی شاخیں نکال کر آپ کے اس خود فریبانہ عظیم الشان کارنامے پر پانی پھیر دے گی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جب کسی غلط اور مہلک تہذیب کی تباہ کاریاں کھل کر انسانیت کو موت کے گھاٹ اتارنے لگتی ہیں، تو ذہنوں کے اندر ایک اضطراب پیدا ہو جایا کرتا ہے، اور ہر حساس دل، اور قوت فکر رکھنے والا دماغ اس مسئلہ کو بنیادی حیثیت دے کر ایک مفید اور نفع بخش حل کی تلاش میں اپنا راحت و آرام تج دیتا ہے، چنانچہ جب موجودہ تہذیب کی ہلاکت آفرینیاں منظر عام پر آئیں تو ذہنوں کی توجہ اس طرف مڑ گئی اور مفکروں اور مصنفوں نے تمام مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے، اس مسئلہ کو اپنا محور فکر قرار دے لیا، یہ دو تحریکیں، جن کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ان کو علمی دلائل پر مرتب کرنے والوں نے بھی اپنے وقت کا بڑا قیمتی حصہ اس مقصد پر صرف کیا، لیکن جس نے ان کوششوں کی علمی و عملی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، اس پر یہ واضح ہوگا کہ ان میں سے اکثر حضرات، خواہ وہ مشرق کی پیداوار ہوں یا مغرب کی، ہمیشہ اس تہذیب کے نتائج سے اُلجھتے رہے ہیں، اس لیے ان کی ان تھک اور جاں گسل کوششوں کے بعد اگر کسی شعبۂ حیات میں کسی بہتری کی توقع ہوئی تو دوسرے شعبہ ہائے حیات اور زیادہ مسموم ہو کر رہ گئے۔

شلاً، کلیسا اور تخت کے امتزاج سے جو مفاسد سوسائٹی کی رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے، ان کو دُور کرنے اور سوسائٹی کو ان کے اثرات بد سے بچانے کے لیے، مغرب کی رائے عامہ اور سنجیدہ طبقہ نے جو کوشش کی، اور جس کے نتیجہ میں ایک آزاد ماحول اور حریت پسند معاشرہ کی تشکیل عمل میں آئی، اس کوشش میں بھی صرف انہیں "مظاہر" تمدن کو سامنے رکھا گیا، جو دن رات، زندگی سے براہ راست تعلق رکھتے تھے۔ یعنی جاگیرداروں اور اونچے طبقوں کی چیرہ دستیاں، مذہبی طبقہ کی "مقدس" تہرانیاں، اور ان کے مقابلہ میں مغلوب انسانی طبقہ کی مجبوریاں اور کس مپرسیاں، پھر اس صورت حالات نے جو خلیج ان دونوں طبقوں کے درمیان حائل کر دی تھی، اس کی روز افزوں وسعت، دن رات کے ناروا سلوک، پھر اس کے نتیجہ میں عام معاشی بدحالی اور اخلاقی و سماجی مفاسد وغیرہ وغیرہ، ایسے مسائل تھے، جنھوں نے کہ وقت کے مفکروں کے ذہن کو اتنا متاثر کر رکھا تھا کہ اُنھوں نے اس کی طرف مطلق توجہ ہی نہیں دی کہ یہ نظام حیات جو ایک طویل مدت سے پاپائیت اور شہنشاہیت کے گٹھ جوڑ کے نتیجہ میں سوسائٹی پر مسلط ہے، اور جس کو غذا نفسانیت اور بے قید خواہشات کے زہریلے مزبلے سے مل رہی ہے، یہ اصل بس کی گانٹھ ہے، جس کا زہریلا اثر سوسائٹی کو موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے، اور اگر اصلاح حالات کا جذبہ سنجیدگی کا حامل ہے تو سب سے پہلے اس جڑ پر کلہاڑی چلانی چاہیئے اور انسانوں کی آقائی اور خدائی کے خود ساختہ اور من گھڑت اصول کے بجائے ایک خدا پرستانہ نظام حیات کو رائج کرنے کی فکری و عملی جدوجہد کی جائے، تاکہ انسانیت صحیح معنوں میں انسان کی خدائی کے چنگل سے آزاد ہو سکے۔

لیکن اس سڑی ہوئی تہذیب کے بدنما مظاہر نے ان مفکرین اور اہل دانش و بینش حضرات کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ اس بنیادی مسئلہ پر غور کریں، اور عقلاً پرکھیں کہ کیا فی الواقعہ ایک ایسا نظام ہمارے مسائل کا حل ہے؟ کیا اس کے ذریعہ سوسائٹی کے افراد کے سیرت و کردار کو اتنا قابل اعتماد بنایا جا سکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک، دوسرے کے احساس، رائے، جان، مال اور آبرو کی نہ صرف حفاظت کرے بلکہ ان کو اتنا ہی محترم سمجھے جتنا کہ اپنی جان، مال، آبرو اور احساس و رائے کو سمجھتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خدا پرستانہ نظام حیات کی بدولت ایک وسیع الخیال تمدن، متوازن اور معتدل نظام معیشت، بے لاگ اور صالح فلسفہ سیاست وجود میں آ سکتا ہے؟ اور کیا اس کے ذریعہ ان تمام مفاسد کے سرچشمے بند کیے جا سکتے ہیں، جنھوں نے سوسائٹی کو سر سے لے کر پیر تک زہر آلود کر رکھا ہے؟ یہ حقیقی بنیاد تھی غور و فکر کی، اور کوئی وجہ نہیں کہ جب سوچنے والے دماغ، متلاشی ذہن اور دردمند دل اس بنیاد کو سامنے رکھ کر اپنے افکار و احساسات کی "دنیا میں سفر" کرتے تو ان پر حقیقت اور صداقت کی راہ نہ کھلتی، مگر اس کے برخلاف انھوں نے رائج الوقت نظام حیات کی بنیاد، یعنی خدا سے بیزاری اور بے گانگی، آخرت کی بازپرسیوں کے ضمن میں چند خوش فہمیوں پر اعتقاد راسخ، وحی اور ذریعہ وحی کے سلسلے میں مداہنت اور منافقت میں سے بعض کو تو جوں کا توں قبول کر لیا، اور بعض کو مسائل زمانہ کے لیے ناکارہ سمجھ کر رد کر دیا، اس طرح "بنا فاسد علی الفاسد" کی ایک اور تاریخی مثال قائم کرتے ہوئے، اپنے مذاق اور رجحان کے مطابق ایک نئی، دیدہ زیب، کشادہ، ہوادار اور صاف ستھری منزل تعمیر کر دی، اور دعوتِ عام دے دی کہ اب تک انسانیت جس کال کوٹھری میں پڑی ہوئی گھٹ رہی تھی، وہ آئے اور دیکھے کہ ہم نے ایک ایسی عمارت چن دی ہے، جو اس کے پھیپھڑوں کے لیے پاکیزہ ہوا، اس کی کملائی ہوئی آنکھوں کے لیے شفاف روشنی کا انتظام کرتی ہے اور وہ جملہ اسباب عیش مہیا کرتی ہے جس کی "بابر" نے دعوت دی تھی،

جس سوسائٹی کی عمارت "فساد" کی بنیاد پر اٹھائی جائے، جس کی ہر ایک اینٹ پر ظلم و ستم کا ٹھپہ لگا ہوا ہو، خواہ وہ اپنے چھب اور ڈھب کے لحاظ سے بڑی ہی نظر نواز اور دل کش کیوں نہ ہو، مگر اس سوسائٹی کی حقیقت ناگ پھنی کے پھلوں جیسی ہوگی، جو دیکھنے میں تو بڑے پیارے، بڑے خوش منظر لیکن اثر کے لحاظ سے سم قاتل ہوتے ہیں! چنانچہ "حریت فکر و نظر" اور "آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے" کا جو نعرہ لگایا گیا تھا، ابھی وہ فضا میں قاعدے سے تحلیل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ وہی پرانے مفاسد نئے روپ میں اور نئے ناموں کے ساتھ سوسائٹی کا امن اور چین غارت کرنے لگے۔

اس انقلاب کے بعد، جو محض وقتی حالات اور گرد و پیش سے شدید تاثر کا نتیجہ تھا، بہت جلد یہ محسوس ہونے لگا کہ جو خواب دیکھا گیا تھا وہ محض افسانہ تھا، اور حقیقت بھی یہی تھی کہ کلیسائی اور شاہی نظام معاشرت کی مخالفت صرف اس

بیے کی گئی تھی کہ کاشتکاروں پر بھاری بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں، اُن سے بے گار لی جاتی ہے، ملک کے چند "شرفا" کے ہاتھ میں افراد ملک کی تقدیر کا سررشتہ آگیا ہے اور بادشاہ اپنی ذات پر جتنا خرچ کرتا ہے، اس کا بوجھ غریب عوام پر آکر پڑتا ہے، پھر جب عوامی ذہن میں کبھی اس کے بارے میں کوئی سوال اُٹھتا ہے، ان کے دل میں کوئی خلش پیدا ہوتی ہے تو اسے مذہب کے نام پر تھپکی دے کر سُلا دیا جاتا ہے، اس لیے ایک ایسا معاشرہ برپا ہونا چاہیے جس میں ہر فرد کو اس کا پورا حق حاصل ہو کہ وہ اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکے، اپنا میدان عمل اپنے حوصلہ کے مطابق وسیع کر سکے اور اس سلسلہ میں اس کو پوری آسانیاں ریاست اور باہمی تعلق کی طرف سے فراہم کی جانی چاہئیں۔

یہ مطالبات بلاشبہ ایک انسان کے پیدائشی حقوق ہیں جنھیں ہر معاشرہ کی ترتیب کے اندر نمایاں جگہ ملنی چاہیے، لیکن یہ سوال کہ آخر ایسا معاشرہ کن بنیادوں پر استوار ہوگا، یہ کہرلی عمارت کن اینٹوں اور کس قسم کے گارے سے معرض وجود میں آئے گی، اس کی طرف اس وقت کے مفکرین نے مطلق توجہ نہیں کی[۱]، اور اگر بعض مفکرین نے اس کی ضرورت محسوس کی بھی تو اپنی ذہنی ساخت اور خارجی حالات کے دباؤ کی وجہ سے کوئی واضح نشان دہی نہ کر سکے، نتیجتہً یہ تمنائیں محض "امانی" ثابت ہوئیں، اور بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مذہبی طبقوں کی جگہ پر ملک اور قوم کے قائدین، جاگیرداروں اور "شرفا" کی جگہ پر بڑے بڑے سرمایہ دار وجود میں آگئے ہیں، بلکہ اب کے بار تو اس نفع پرست بلکہ خود پرست طبقہ کی بندش پہلے سے سخت تھی، اب عوام کے جسم ہی سے نہیں بلکہ ان کے دل و دماغ سے بھی بے گار لی جاتی تھی، پہلے وہ ایک چیز کو بُرا سمجھ کر کم از کم

---

[۱] فرانس میں جو انقلاب برپا ہوا اور جس نے پورے یورپ بلکہ تمام عالم کو متاثر کیا، اس کے برپا کرنے والے، ایک طرف تو یہ فلک شگاف نعرے لگاتے تھے اور دوسری طرف ان کے کردار کا یہ حال تھا کہ جب باستیل ( ) پر حملہ کرنے کے بعد ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا تو انھوں نے قلعہ کے سردار کو یہ کہہ کر رام کر لیا کہ "بادشاہ نے اطاعت کر لی ہے" اور اس کو فوجیوں سمیت جان کی امان دی جاتی ہے، اس شرط پر جب اس نے قلعہ کے پھاٹک کو کھول دیا تو مجمع ان پر ٹوٹ پڑا، اور مورخ کہتا ہے کہ "بری طرح ان کو قتل کر ڈالا۔

اسی طرح اس انقلابی سال کے ماہ ستمبر میں مورخ کے بیان کے مطابق" ( ) کے حکم کے مطابق فوری عدالتیں قائم کی گئیں، جن کے سامنے ان تمام قیدیوں کو پیش کیا گیا جو محض غداری کے شبہ میں گرفتار کیے گئے تھے معمولی مجرمین تو قید خانہ میں بھیج دیے گئے، مگر جو لوگ شاہ پرست یا موجودہ حکومت کے مخالف پائے گئے، ان کو قید خانہ سے نکال کر برسر راہ قتل کر دیا گیا، تین بلکہ پانچ دن تک یہی خوفناک عمل جاری رہا، اور تقریباً پندرہ سو آدمی جن میں بہت عورتیں شامل تھیں، ذبح کر دیے گئے۔

آگے چل کر یہی مورخ (اے، جے، گرانٹ) لکھتا ہے :۔

"مجرمین کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی، بادشاہ کے بعد ملکہ دار پر چڑھا دی گئی، اور بہت سے لوگ جنھوں نے انقلاب کے ابتدائی زمانہ میں نمایاں حصہ لیا تھا، اسی طرح مار ڈالے گئے، تھوڑے دنوں بعد تو اعتدالی جمہوریت پسند لوگ بھی ملک کے بدخواہ قرار دیے جانے لگے، اور تندرو مذہب فرقہ والے جو کسی زمانہ میں برسر اقتدار تھے، ایک ایک کر کے قید خانہ یا سولی کو بھیجے جانے لگے"

اس جیسے دلی نفرت تو کر سکتے تھے، مگر اب بہت سی باتیں اس لیے درست اور مناسب سمجھی جانے لگیں کہ ان کی پشت پر غلط صحیح چند علمی قسم کے دلائل بھی ہیں۔

کلیسا شاہی نظام معاشرت جن بنیادوں پر قائم تھا وہ کیا تھیں؟ اور ان بنیادوں میں کیا کجی تھی، جسے جوں کا توں بعد کے معاشرے نے قبول کر لیا، اس پر بحث آگے آئے گی، بہرحال صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ انقلاب کوئی خوش گوار تبدیلی سوسائٹی میں نہیں لا سکا، اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اصل جڑ کے بجائے شاخوں پر تغیر و انقلاب کی کلہاڑی چلائی گئی۔[1]

چنانچہ کچھ دنوں کے بعد جب "شخصی آزادی" کے غیر محدود تقدیر کے شجر خبیث کے تلخ نتائج نکلنے شروع ہوئے، اور سوسائٹی کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا، جو حسن اتفاق کی بدولت ملک کی دولت کو سمیٹ سمیٹ کر تجوریوں میں بند کرنے لگا، اور نئی مشینی دریافتوں کو آلۂ کار بنا کر مزدور طبقہ کی بھاری تعداد سے بے نیاز ہو کر سرمایہ کی پرستش کرنے لگا تو اس صورت حالات نے پھر دماغوں کو متوجہ کیا، اور مفکرین، اپنے دن اور رات اور بڑی حد تک راحت و آرام کو قربان کرنے کے بعد، جو "نسخہ کیمیا ساتھ لائے" اس میں صرف یہ لکھا ہوا تھا کہ "خواجہ بلند بام" کو "کوچہ گردی" کی سزا دی جائے اور "کوچہ گردوں" کو "بلند بامی" عطا کی جائے۔"

اگر جمہوری انقلاب کی تاریخ اور اس کے بعد کے واقعات پیش نظر ہوں، اور ان سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی تھوڑی بہت توفیق بھی ہو تو یہ معلوم کر لینا کوئی دشوار کام نہیں کہ یہ حل، جو بڑی دیدہ ریزیوں اور جاں کاہیوں کے بعد پیش کیا گیا تھا، درحقیقت سوسائٹی کے صرف ایک "کریہ منظر" کو مٹا دینے کے لیے تھا، رہ گیا ہلاکت انگیز اور فاسد سوسائٹی کو صالح بنیادوں پر استوار کرنے کا کام تو اس طرف اب کے بار بھی مطلق توجہ نہیں دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد یہ

---

[1] ان "عقل" کے پرستاروں کا انقلابی ذہن کس قسم کا تھا، اس کی مثال اس واقعہ سے مل سکتی ہے کہ ان میں سے ایک گروہ نے اپنا ایک نیا سنہ ایجاد کیا، پرانے مہینوں کے نام بدلے گئے، سات روز کے بجائے دس روز کا "ہفتہ" قرار دیا گیا۔ اگر اس طریق فکر کی مثال گردوپیش میں دیکھنا چاہتے ہیں تو آپ ہند کے موجودہ انقلاب کے بعد کے حالات پر نگاہ ڈالیے، جہاں انسانی معاملات کی بہتری اور استواری کا کوئی سوال نہیں، بلکہ اس انقلاب کی لہر اگر محسوس کی ہے تو پارکوں، گلیوں اور سڑکوں نے، اور اپنی فتح مندی کا اگر اظہار کیا گیا ہے تو ٹکٹوں اور جو رہے کے مجموں کے ذریعہ۔ درحقیقت ایسے انقلابات جو مجرد عقل اور خواہش کی مخلوط بنیادوں پر برپا کیے جاتے ہیں، وہ کبھی ایک ہمہ گیر اور متوازن نظام حیات پیش ہی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے سامنے زندگی کے مجموعی مسائل نہیں ہوتے، بلکہ غیر قوم کی چیرہ دستیوں سے اپنی قوم کی پامالی، غیر ملکی اقتدار کے تحت اپنے ملک کی بے بسی ایک طبقہ کی خوش حالی کے مقابلہ میں دوسرے طبقہ کے افراد کی مفلسی کا شدید احساس ہوتا ہے، جو انقلابی عمل پر دلوں کو ابھارتا ہے، یہ احساس اپنی جگہ پر لاکھ پاکیزہ اور ہمدردانہ سہی لیکن یہ کسی وسیع نظام حیات کی ٹھوس بنیاد تو نہیں بن سکتے۔

احیاس پھیلنے لگا کہ "ایک قدم اور اُٹھنا چاہیے، اور "منزل ابھی دور ہے" کیونکہ جہاں یہ نظام فکر کے گہوارے سے نکل کر عمل کی زمین پر برپا ہو چکا ہے، وہاں کے حالات کو مورخ ہی اچھی طرح بیان کر سکتا ہے[۱۵]۔" (باقی آیندہ)

---

[۱۵] لینن جب تک زندہ رہا اس کی شخصیت کے اثر سے بولشویک اکابر کے اختلافات بڑی حد تک دبے رہے، اور اگر کبھی اختلافات میں شدت پیدا ہوتی بھی تھی تو لینن کا ایک لفظ قول فیصل بن جاتا تھا، لیکن اس کی موت کے بعد اونچے لیڈروں کے درمیان اختلافات نے جتنی گھناؤنی شکل اختیار کر لی اس کا اندازہ اس وقت کی عدالتی کارروائیوں سے ہو سکتا ہے، جب کہ کل کے دوست آج کے دشمن بن گئے تھے، ٹراٹسکی اور اسٹالن کے اختلافات جو تاریخ کی روایت کے مطابق، محض جب اقتدار کے ساختہ و پرداختہ تھے" لینن ہی کے زمانہ میں منظر عام پر آگئے تھے، لیکن اس کی موت کے بعد یہ ذاتی عناد یہاں تک بڑھا کہ ایک کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور صرف ٹراٹسکی ہی نہیں بلکہ زنیوبیف جو پٹرو گراڈ سوویت کا صدر اور کیمونیف جو ماسکو سوویت کا صدر تھا جنھوں نے حکومت کے ابتدائی دنوں میں اسٹالن کے ساتھ سازشیں کر کے ٹراٹسکی کے اقتدار کو زخمی کیا تھا، ان کا حشر بھی بہت عبرت ناک ہوا، ان کے علاوہ جیسے کیروف، ڈاکٹر چاگیلا اور ڈرونیس وغیرہ جو کسی وقت کمیونسٹ پارٹی کے معزز ممبر اور انقلاب کے بعد اہم عہدوں پر فائز تھے، کیلئے اقتدار کی رقابت کی نذر ہو گئے، اور خود ان اکابر کا یہ حال یہ تھا کہ انھوں نے کبھی ذاتیات سے بلند ہو کر مسائل پر غور کرنے کی زحمت نہیں محسوس کی، اور موت کے وقت تک عجیب بے ربط کردار کا ثبوت پیش کرتے رہے، چنانچہ زنیویف، کیمونیف جو کچھ دنوں تک ٹراٹسکی کے خلاف اسٹالن کے ساتھ مل کر "اتحاد ثلاثہ" قائم کیے ہوئے تھے، جب خود کو زد میں پایا تو اسٹالن کے خلاف ٹراٹسکی سے مل گئے، بخارن کو جب جلاوطنی کی سزا ملتی ہے تو وہ چھپ کر کیمونیف کے مکان پر پہونچتا ہے اور اقرار کرتا ہے کہ "ہمارے اور اسٹالن کے اختلافات اتنے عمیق ہیں کہ ان کی نسبت ہمارے اور تمہارے اختلافات کچھ بھی نہیں" ٹراٹسکی جس کا کمیونسٹ اقتدار کو درجہ بدرجہ سطح آنے میں بہت اہم حصہ ہے، اسٹالینی اقتدار کے سامنے مصلحت کو ترجیح دیتا ہے، اور پارٹی اور حکومت کے اجلاس میں یوں شرکت کرتا ہے، گویا اسے کوئی اختلاف ہی نہیں۔

یہ تمام واقعات کیا اس کا بیّن ثبوت نہیں ہیں کہ یہ انقلاب جس کی مظلوم اور مزدور دُنیا چشم براہ تھی، اپنی نوعیت کے اعتبار سے قطعاً اس سے مختلف نہیں تھا، جو شاہی نظام کے خلاف جمہوریت پرستوں کی قیادت میں برپا ہوا تھا، اور انقلاب کے بعد جس قسم کی تباہ کاری اور ہلاکت روس کے اندر پھیلی ہے، اس نے ذہنوں کے اندر یہ سوال پھر اُٹھا دیا ہے کہ "ایک قدم اور اُٹھنا چاہیے" کیونکہ "منزل ابھی نہیں آئی" اب اگر کوئی انقلاب پھر انھیں فاسد بنیادوں پر برپا کیا جاتا ہے تو کیا دُنیا کو ایک صالح انقلاب کے لیے پھر چشم براہ رہنا پڑے گا، اور کیا اس کے انتظار کی گھڑیوں میں طوالت نہیں آجائے گی؟

رسائل و مسائل

فتویٰ نویسی کی افسوس ناک مثال

خط بنام قیم جماعت :-

محترم امیر جماعت نے " زندگی" میں اعتراضات کا جو جواب دیا ہے، وہ ماشاء اللہ خوب ہے، لیکن جوابات کے ضمن میں انھوں نے قطع و برید کی جو مثالیں پیش کی ہیں، ان میں درج ذیل مثال کا بیان کرنا نہایت ضروری تھا، کیونکہ اقتباسات پر تکیہ کر کے فتوے دینے کی یہ بدترین اور نمایاں ترین مثال ہے، اُمید کہ " زندگی" کے آئندہ پرچہ میں اسے ضرور پیش کیا جائے گا۔

" آئینۂ تحریکِ مودودی" کے صفحہ ۴۴ پر درج ذیل عبارت ہے :-

" بانی تحریک . . . . نے ایک اصول اور بھی ایجاد کیا ہے، جو سب سے زیادہ خطرناک ہے، جو ذیل سے بعبارت ملاحظہ ہو۔

"بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی کرنا گوارا کرلیں، جن پر ہم ایمان لاتے ہیں"

ترجمان القرآن بابت رمضان و شوال ۶۳ھ

ماخوذ از صدق لکھنؤ جلد ۱۱ ۴۲ فروری ۴۶ء

اس قانون کی بنا پر ہر ایمانی اصول وقتی مصلحت پر قربان ہو سکتا ہے، اس اعتبار سے اصول دین کی جو صورت ہونی چاہیے وہ ظاہر ہے۔ نئے مجتہد و مجدد کا اجتہاد اور اس کی تجدید دین کا ثمرہ یہی ہے" کتاب مذکور صفحہ ۴۴،

از مولانا مفتی مہدی حسن صاحب دار العلوم دیوبند"

مذکورہ فتوے میں جس عبارت کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں " ممکن ہے" کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ " ناممکن ہے" کے الفاظ ہیں، معلوم نہیں یہ دیانت داری کی کون سی قسم ہے جو " ناممکن" کو " ممکن" بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، اور پھر اس پر فتوے کی عمارت تعمیر کی جارہی ہے۔

جواب :-

فتویٰ نویسی کا یہ عجیب و غریب نمونہ "آئینہ تحریک مودودی" پر نظر ڈالتے ہی ہمارے سامنے آگیا تھا، لیکن میں نے قطع و برید کی مثالیں مولانا مدنی مدظلہٗ کے خط میں پیش کی ہیں، اور میں اس سے پہلے ہی اپنا خط مولانا مدنی مدظلہٗ کی خدمت میں روانہ کر چکا تھا، اس لیے دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم کا یہ شاہکار میں ان کی خدمت میں نہیں پیش کر سکا، اور ویسے بھی میں نے مولانا کے خط میں قطع و برید اور تحریف کی صرف چند مثالیں بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کی تھیں، حضرات مفتیان کرام کے عجیب و غریب کارناموں پر کوئی مستقل تبصرہ کرنا مقصود نہیں تھا، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے فتوے اس طرح کی معلوم نہیں کتنی بدترین قطع و برید کا مرقع ہیں۔

ہم نے محولہ بالا عبارت کو ترجمان القرآن میں بھی دیکھ لیا ہے، اور صدق میں بھی، جس کے حوالہ سے جناب مفتی صاحب نے اسے نقل فرمایا ہے، ترجمان القرآن میں تو "ہمارے لیے ناممکن ہے" بہت صاف چھپا ہوا ہے، البتہ صدق میں "ہمارے لیے" اور "ممکن ہے" کے درمیان لفظ "نا" واضح نہیں ہے، بلکہ اس نے کسی اور لفظ کی شکل اختیار کر لی ہے، جو بہر حال اس کا ثبوت ہے کہ یہاں عبارت میں کوئی لفظ ہے، اور غور سے پڑھا جائے تو "نا" کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، بہر حال یہ لفظ جب صاف پڑھا نہیں جا سکتا ہے تو قاعدہ کے مطابق یہاں رک کر مفتی صاحب کو غور کرنا چاہیے تھا کہ یہ کیا لفظ ہے، اور اسے پڑھنے کی کوشش کرتے اور وہاں سے حل نہ ہو سکتا تو اصل کی طرف مراجعت فرماتے یا کم از کم ایسی مشتبہ عبارت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے احتراز فرماتے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اہل تقویٰ کو تشابہ کے موقع پر جو روش اختیار کرنی چاہیے، اس کا جناب مفتی صاحب نے کوئی پاس و لحاظ نہیں کیا اور اس نامفہوم لفظ کو سرے سے معدوم فرض کر کے ایک جملہ تیار کر لیا اور پھر پورے اطمینان کے ساتھ "اصولوں کو مصلحتوں پر قربان کر دینے" جیسا سخت الزام بے تکلف عائد فرما دیا۔

اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جناب مفتی صاحب نے غالباً اعتراض کرنے کے شوق میں محولہ بالا عبارت پر غور کرنے کی بھی زحمت نہیں اٹھائی، ورنہ خود وہ عبارت ان کے منشاء کے خلاف ایک بولتی ہوئی تحریر ہے، عبارت کو اس موقع پر آپ ایک بار خود پڑھ لیں، کیا کوئی شخص با اصول ہونے کے ادعا کے ساتھ اسی شد و مد سے اپنے اصولوں کو مصلحتوں پر قربان کر دینے کا اعلان کیا کرتا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ یہ عبارت اپنے مفہوم و منشاء میں اتنی واضح ہے کہ اگر اس میں سے "نا" کا لفظ صاف طور سے غائب بھی ہو جاتا تو ایک باشعور اور سلیم الفطرت انسان کو، جو خواہ مخواہ اس کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے کے ارادہ سے نہ پڑھ رہا ہو، اس کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آ سکتی تھی وہ اسے سہو کتابت پر محمول کرتا، اور اس سے زبردستی وہ مطلب نکالنے کی کوشش نہ کرتا جو مفتی صاحب نے نکالے ہیں۔

اور آپ کو مزید حیرت ہو گی، اگر جملہ کی اس ساخت کے ساتھ آپ اس بات کو بھی ملحوظ رکھیں کہ یہ عبارت جس مضمون

سے ماخوذ ہے، اس کی ہر سطر مفتی صاحب کے بیان کردہ مطلب کی تردید ہے، اور اس مضمون کا کچھ حصہ خود صدق میں بھی جہاں سے مفتی صاحب نے اسے نقل فرمایا ہے، موجود ہے، تعجب ہے اس کے بعد بھی کوئی شخص اس کا مطلب سمجھنے میں دھوکا کھا سکتا ہے، بہرحال وہ حصہ درج ذیل ہے۔

محولہ بالا فقرے کے بعد ہی عبارت یوں شروع ہوتی ہے:۔

"موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور کی بنیاد پر قائم ہوا ہے، اور جمہور جس پارلیمنٹ اور اسمبلی کو قائم کریں، یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے، برخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو، اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے ماتحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز (ترجمان القرآن میں اس کے بعد اتنی عبارت اور ہے، جو ارادتاً یا بے ارادی طور پر صدق میں نقل نہیں ہوئی ہے" یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدہ سے ہے") اگر ہندوستان کے علماء اور عامۃ المسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے تقضیات ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جواب دہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے (اس کے بعد ترجمان میں یہ فقرے ہیں" لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشہ سے اس اصولی مسئلہ میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے") آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے ہم انتخابات میں کیسے حصہ لے سکتے ہیں، کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کو شرک قرار دیں، اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں، (اصل میں یہاں اتنا فقرہ اور ہے، جسے غالباً ارادتاً حذف کر دیا گیا ہے، کیونکہ ان کی بجائے نقطے لگے ہوئے ہیں" اگر ہم اپنے عقیدہ میں صادق ہیں تو") ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کریں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونا چاہیے، جب تک یہ اصول مان نہ لیا جائے، ہم کسی انتخاب اور کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے "

اس عبارت کے ساتھ مذکورہ بالا عبارت کو ملا کر پڑھیے، کیا اس کے بعد بھی" ناممکن" "ممکن" بن سکتا ہے؟

لیکن سچ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر ناممکن، ممکن ہے۔ کون قیاس کر سکتا تھا کہ دارالعلوم دیوبند جیسے مشہور دینی ادارہ کے مفتی اعظم فتویٰ نویسی کی ایسی نادر مثال قائم کریں گے۔[1]

---

[1] اور یہ واضح رہے کہ یہ فتویٰ دارالعلوم دیوبند کے ایک درجن سے زیادہ علماء و اساتذہ مشمول حضرت مولانا مدنی مدظلہ کی تصویب و تائید سے مزین ہے۔ اور فتوے کے اصل مصنف جناب مولانا مہدی حسن صاحب کے متعلق مولانا مدنی کی توثیق ہے کہ وہ "ایک معمر تجربہ کار فاضل اور محقق ہیں" ملاحظہ ہو مکتوب[illegible]

مرحوم ذکاء اللہ خان صاحب کو الیکشن وغیرہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب سے سخت ترین اختلافات تھے، چنانچہ انھوں نے ہی مذکورہ بالا عبارت نقل کر کے اس پر سخت ترین تنقید صدق میں شائع کرائی ہے، لیکن خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ وہ خان بہادر تھے مفتی نہیں تھے، اس لیے انھوں نے مودودی صاحب کی اولاً تو پوری متعلقہ عبارت نقل کی (سوا ان جملوں کے جن کو غالباً غیر ضروری سمجھ کر انھوں نے ارادتاً حذف کر دیا ہے) اور دوسرے انھوں نے یہ غلطی بھی کی کہ اس عبارت کا مطلب غلط نہیں سمجھا، اس لیے خواہ مخواہ انھوں نے اپنے کو تردید کی مشقت میں ڈالا۔ کاش ان کو اس وقت یہ پتہ چل جاتا کہ اس عبارت کا مطلب وہ نہیں ہے، جو وہ سمجھے ہیں، بلکہ مودودی صاحب نے تو اس عبارت کے ذریعہ اپنے خیالات کو مصلحتوں پر قربان کر دینے کا اعلان کیا ہے، تو وہ بیچارے بڑی دردسری اور زحمت و مشقت سے بچ جاتے۔

بہرحال دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں، یا تو مفتی صاحب نے اس پورے مضمون میں سے صرف مذکورہ بالا فقرہ مضمون کی دوسری عبارتوں سے آنکھیں بچا کر اچک لیا ہے اور اعتراض کرنے کے شوق میں خود اس جملہ کے دروبست اور مفہوم پر بھی غور نہیں کر سکے ہیں، اس لیے ان کو محسوس ہی نہیں ہو سکا ہے کہ حقیقتاً اس کا کیا مطلب ہے اور وہ کیا مطلب لے رہے ہیں یا پھر انہوں نے کسی فقہی جزئیہ پر اعتماد کرتے ہوئے اسے بالکل جائز سمجھ لیا ہے کہ "درء مفاسد" کے لیے کسی کو بدنام کرنا ضروری ہو تو اس کے لیے سب کچھ جائز ہے۔ بالفاظ دیگر انھوں نے مودودی صاحب کے بارے میں جو بات ثابت کرنی چاہی ہے، اسے خود عمل کر کے دکھا دیا ہے، یعنی یہ کہ اصول تقویٰ و دیانت کو کسی مخالف کو بدنام کرنے کے لیے قربان کیا جا سکتا ہے ——— اب یہ ناظرین کا کام ہے کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق یہ فیصلہ کریں کہ ان دونوں باتوں میں کون سی بات جناب مفتی صاحب کی جلالت شان کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی طرف منسوب کی جا سکتی ہے، ہمارے نزدیک تو پہلی بات نسبتاً ہون ہے، اس لیے ہم پہلی صورت ہی کی طرف رجحان رکھتے ہیں، اور اگر کسی کا خیال یہ ہو کہ ان دونوں صورتوں کے علاوہ اور کوئی صورت بھی فرض کی جا سکتی ہو اور اس سے مفتی صاحب کی جلالت شان پر کوئی حرف نہیں آسکتا ہے تو ہم خوش ہوں گے اگر ہمیں بھی اس سے مطلع کیا جائے، ہمیں خواہ مخواہ کسی کے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں کرنی ہے۔

سیاسی حربہ

خط: "زندگی" کا تازہ پرچہ مل گیا، ڈاکٹر کی تو مطالعہ کے لیے بہت ممانعت ہے، پھر بھی اتنی بد پرہیزی کرنی ہی پڑی کہ مزہ کا مقامات دیکھے بغیر رہا نہیں جا سکا۔ "الانصاف" میں "ترجمان القرآن" کے منقولہ مضامین بھی دیکھے، اللہ کا بڑا فضل ہے کہ مخالفین کی پوری قوت کے مقابلہ میں بھی جماعت کا علمی اور استدلالی پایہ مضبوط ہے، آپ کی "تصریحات" بھی ماشاء اللہ نہایت مضبوط اور معقول ہیں، انداز تحریر بھی نہایت ستھرا اور شائستہ ہے، خدا نے چاہا تو اس میدان میں مخالفین کو کامل شکست

اُٹھانی پڑے گی۔ جہاں تک عوام کے شور و غوغا کا تعلق ہے وہ بھی فرو ہو جائے گا، البتہ ایک چیز میرے دماغ میں کھٹک رہی ہے، اندیشہ ہے کہ شکست خوردہ لوگ اس اسلحہ سے بھی کام لیں، میری مراد سیاسی ذرائع ہیں، وہ جب اور طرح ناکام ہوں گے تو ممکن ہے وہ ارباب اقتدار کو بہکانے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ ان کو فتنہ سازی سے اور جماعت کو ابتلاء سے محفوظ رکھے"۔

جواب:-

آپ کا یہ خیال غلط نہیں ہے کہ مخالفین دلیل کے میدان میں شکست کھانے کے بعد اپنے جذبۂ انتقام کو اسی طرح تسکین دینا چاہیں گے کہ وہ ہمارے خلاف ارباب اقتدار کو بھڑکانے کی کوشش کریں، چنانچہ میرے علم کے مطابق اس طرح کی بعض کارروائیاں شروع بھی کر دی گئی ہیں، ابھی حال میں آگرہ سے ایک اشتہار شائع ہوا ہے، اس میں شروع سے آخر تک یہی جذبہ نمایاں ہے۔ بعض پمفلٹوں میں بھی یہ کوشش نمایاں ہے، لیکن بہرحال ہمیں اللہ پر اعتماد کرنا چاہیے، انشاء اللہ اس میدان میں بھی ان کی کوششیں ناکام ہوں گی، ہمارے خلاف گورنمنٹ کو بہکانے کے لیے ان کے پاس اس کے سوا اور کیا چیز ہو سکتی ہے کہ "اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں"

ہاں جھوٹ کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے، لیکن اللہ پر ایمان ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ جھوٹ کو چند روز سے زیادہ فروغ حاصل نہیں ہو سکتا، اور گورنمنٹ کے بارے میں بھی ہمیں یہ بدگمانی نہیں ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ بے بنیاد پروپیگنڈے کا شکار ہو جائے گی، اور بہرحال اگر اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ ہم آزمائش میں ڈالے جائیں تو جو اس کی مرضی ہو ہمیں دل سے منظور ہے، البتہ اس بات کا قلق ضرور ہوگا کہ آئندہ اگر ہم کسی ظلم و زیادتی کا شکار ہوں تو اس کا سبب ہمارے بھائی بند ہوں وظلم ذوی القربیٰ اشد مضاضۃ۔

دعا فرماتے رہیں کہ ہماری طاقت سے زیادہ ہم پر آزمائشوں کا بار نہ ڈالا جائے اور جو کچھ پیش آتے اس میں اللہ تعالیٰ ہمیں صبر و استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہ کا فتویٰ

میں نے ۱۹۴۲ء میں مفتی کفایت اللہ صاحب سے جماعت اسلامی کے لٹریچر اور اس کے اصول و ضوابط کے متعلق دریافت کیا تھا کہ یہ از روئے کتاب و سنت کہاں تک درست ہیں، مفتی صاحب محترم نے ازراہ نوازش میرے استفسار کا جواب دے کر نوازا بھی تھا۔

آج جب کہ جماعت کے خلاف فتویٰ بازی کا بازار گرم ہے، میں اپنے سوال اور مولانا کے جواب کی نقل ارسال خدمت

کیا ہوں، ممکن ہے یہ اس سلسلہ میں کچھ کارآمد ثابت ہو سکے مفتی صاحب کے نام خط کی نقل حسب ذیل ہے:-

۲۱ ربیع الثانی۔

مخدوم و محترم مدظلہ

بعد ہدیہ سلام و مسنون، دریافت طلب امر یہ ہے کہ جماعت اسلامی (جس کے بانی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں جس کا مرکز دارالاسلام جمال پور، پٹھان کوٹ ہے) کے لٹریچر اور اس کے اصول و ضوابط از روئے کتاب سنت کہاں تک صحیح ہیں؟ اور اگر کتاب و سنت کے مخالف ہیں تو اس کے دلائل کیا ہیں؟ اور اس جماعت میں شرکت اور ان کی کتابوں کو دیکھنا مسلمانوں کے لیے مفید ہے یا مضر، مدلل و مفصل تحریر فرمائیں۔ والسلام ....

مدرسہ جامع العلوم مظفر پور، بہار

جناب مفتی صاحب نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا تھا:-

الجواب

مولانا ابوالاعلیٰ کی کتابیں اکثر صحیح ہیں اور ان کے مضامین اچھے اور مؤثر ہیں، سوائے چند مقامات کے کہ جہاں انھوں نے اجتہادی رنگ اختیار کیا ہے اور ائمہ مذہب کے مذہب کے خلاف راستہ اختیار کیا ہے، وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

دستخط (مولانا محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ۔ دہلی۔

مہر دارالافتاء۔

جواب

مفتی صاحب مدظلہ، کے اس طرح کے متعدد فتوے ہماری نظر سے گذر چکے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ مودودی صاحب یا جماعت اسلامی سے اب کون سا نیا جرم سرزد ہوا ہے جس کی بنا پر مولانا موصوف کی رائے میں انقلاب واقع ہو گیا ہے۔ بہر حال اس بارے میں ہمیں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اسی طرح کے بلکہ کچھ اس سے زیادہ واضح فتووں کو پیش کر کے مولانا مودودی صاحب نے کچھ سوالات مولانا کی خدمت میں پیش کیے ہیں، انتظار کیجیے مولانا کیا جواب دیتے ہیں، یہ عقدہ ان کے ہی جواب سے کھل سکتا ہے، بشرطیکہ ان کا وقت اس کے لیے مساعدت کر سکے، اس کے لیے دعا کرتے رہیں۔

حصول فتویٰ کے لیے جدوجہد

سؤال: ہمارے ایک دوست ایک مشہور دینی درسگاہ سے تحریر فرماتے ہیں:-

"ایک طویل غیر حاضری کے بعد یہاں پہونچا ہوں، دیکھا تو حلقۂ اساتذہ میں "زندگی" کا تازہ شمارہ بڑی تیزی کے ساتھ پڑھا جا رہا ہے، آپ نے جس صبر و تحمل کے ساتھ جوابات سپردِ قلم کیے ہیں، اس کو نظرِ استحسان دیکھا گیا، اور دفع بالتی ہی احسن کے اصول کو آپ نے اپنے پورے مضامین میں جس طرح ملحوظ رکھا ہے، بہت سراہا گیا، اس کے مقابلہ میں مخالفین کی طرف سے جو ادچھے اور رکیک حملے کیے گئے ہیں اس سے لوگوں نے کافی دکھ اور تکلیف محسوس کی، مگر اس کے جواب میں آپ کی طرف سے (اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون) کہنے کے سوا حقیقت میں کوئی زیادہ مناسب بات بھی نہ ہوتی ....

..... پرسوں ایک صاحب فتووں کا پورا بنڈل لیے یہاں بھی پہونچے تھے کہ ان کے حسب منشاء یہاں سے بھی کوئی فتویٰ شائع ہو گا یا کم از کم ان فتووں کی تائید ہی کی جائے گی جو دیوبند اور سہارنپور سے شائع ہوئے ہیں، معلوم ہوا ہے جناب مہتمم صاحب نے بڑے مہذب پیرایہ میں اپنے جماعتی اختلافات کے اظہار کے ساتھ ان کی کوششوں اور فتووں پر بڑی ناگواری کا اظہار کیا ہے، جس سے مایوس ہو کر وہ واپس گئے، معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ سے پورے ملک میں دورے ہو رہے ہیں۔ اور ابھی یہ قصۂ ابل ہی رہا ہے۔

جواب:-

جو لوگ ہمیں کافر یا گمراہ ثابت کرنے کے لیے یہ دوڑ دھوپ کر رہے ہیں، ان کو ان کا یہ شوق مبارک ہو، ہمیں اس پر رنج یا شکوہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، جب کہ یہ کام یہ حضرات خالصاً لوجہ اللہ انجام دے رہے ہیں اور ان کو اپنے ضمیر کے فتوی کے ساتھ بعض بزرگوں کی طرف سے اس کام پر اجر و ثواب پانے کی خوش خبری بھی مل چکی ہے البتہ اگر گستاخی نہ ہو تو ان سے یہ درخواست کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ کاش آپ اپنا تھوڑا سا وقت کچھ نئے لوگوں کو اسلام سے روشناس کرنے پر بھی صرف فرمائیں۔ یا اگر یہ کام مشکل معلوم ہو تو کم از کم ان مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے کے لیے کچھ جدّ و جہد عمل میں لائیں جو تیزی کے ساتھ حالات کے دباؤ کی تاب نہ لا کر نامسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔

لیکن ہمیں یقین ہے، ہماری یہ درخواست گستاخانہ بھی سمجھی جائے گی اور بے محل بھی، کیونکہ ان حضرات کے نزدیک مسلمانوں کو کافر اور گمراہ بنانے کی مہم اس دوسرے کام کے مقابلہ میں زیادہ مقدس اور باعث ثواب ہے، اس لیے وہ یہ "غلطی" نہیں کر سکتے کہ وہ اس کم تر درجے کی چیز کی طرف اپنی توجہ مائل کر کے اس بڑے اور مقدس کام کو کسی طرح کا نقصان پہونچانا گوارا کرلیں۔

علامہ شبلی مرحوم نے اپنے زمانہ کے مکفرین سے یہی درخواست کرنے کی جرأت کی تھی تو ان کو ان حضرات کی زبان حال سے برجستہ جواب ملا تھا کہ تم اندھے ہو، ہمارے یہ کارنامے نہیں دیکھتے جو ہم مسلمانوں کو کافر قرار دے کر انجام دے رہے ہیں۔

"بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بے کار نہیں ہیں"

اور یہی جواب اس زمانہ کے ان کے بھائی بندوں کا بھی ہوگا، اور ظاہر ہے یہ بہت لاجواب جواب ہے، خدا کرے ان کا یہ جواب اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی قابل قبول سمجھا جائے۔

صبرُ و سکونُ کا مقامُ

ص ان دنوں فتووں کی ایک وبا پھوٹ پڑی ہے، اس کی لپیٹ میں ظاہر ہے آپ حضرات زیادہ ہوں گے، اگرچہ اس کی روحانی اذیت میں تمام رفقاء یکساں شریک ہیں، اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر رحم کرے۔

مجھے رام پور کے رفقاء کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ان خارجی آزمائشوں کے علاوہ ان کو کچھ مقامی آزمائشوں میں بھی ڈالا جا رہا ہے، اس خبر سے بے حد اذیت اور تکلیف ہے، خدا تعالیٰ سے خود دعا کرتا ہوں اور اپنے دوسرے رفقاء سے بھی کہتا رہتا ہوں، اس راہ کے چلنے والوں کے لیے تو یہ ایک لازمۂ حیات ہے، مگر اس سے مقابلہ کرنے کے لیے دعا ہی ہمارا سب سے بڑا حربہ ہے۔

مولانا امین احسن صاحب نے ترجمان القرآن میں جو کچھ لکھا تھا وہ معاندین کے لیے تو نہیں مگر مخالفین اور مذبذبین کے لیے بالکل مسکت اور قابل غور بن گیا تھا، مگر "زندگی" میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے، وہ مسکت ہونے کے ساتھ اپنے اندر لیطمئن قلبی کی کیفیت بھی رکھتا ہے، لیکن اس بارے میں میرا ناقص مشورہ یہ ہے کہ اب اس سلسلہ کو بالکل بند کر دیا جائے، جس قدر اس سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے، وہ میرے خیال میں بہت کافی ہے، اس کے علاوہ اگر اس طرف زیادہ توجہ کی گئی تو ان کو مزید شہ ملے گی اور ہمارے رفقاء کی توجہ بلا وجہ ایک غیر ضروری کام کی طرف مبذول ہوگی، جیسا کہ میں آج کل محسوس کر رہا ہوں۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ پورے لٹریچر پر ایک غیر جانبدارانہ اور محققانہ حیثیت سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، اگر مولانا مودودی یا مولانا امین احسن صاحب یا کسی اور صاحب کی رائے یا طرز تعبیر سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے یا یہی چیز کچھ لوگوں کے لیے مانع بن رہی ہے تو ہمیں اس کو دور کرنا چاہیے، ہمیں بہر حال کسی کی تحقیق یا رائے سے زیادہ محبوب دعوت ہے، اور میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ جتنی چیزیں یا خالص علمی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں، ان میں حرف زنی کی کم گنجائش نکلتی ہے، اور پھر حرف زنی یا اعتراض کا جو چیز سب سے زیادہ سبب بنی ہے وہ طرز تعبیر ہے، اصل مدعا سے کسی کو اختلاف نہیں ہے، اس لیے اس حیثیت سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

صحابہ کرام کی توہین کے سلسلہ میں تجدید و احیائے دین کی جو عبارت پیش کی جاتی ہے، اس کے بارے

مثلاً آپ نے "برہان" سے جو کچھ نقل کیا ہے، وہ بہت پسند آیا، میں آج کل ایک مضمون لکھ رہا ہوں اس سلسلہ میں ابن رجبؒ کی ایک عبارت نظر سے گذری جسے نقل کر دیتا ہوں۔

وتوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
والامر علی ذلک واهل الاسلام علی غایۃ
من الاستقامۃ فی دینهم وهم متعاضدون
متناصرون وکانوا علی ذلک فی زمن ابی بکر
وعمر رضی اللہ عنهما، ثم عمل الشیطان
مکائدہ علی المسلمین والقی بأسهم بینهم
وافشی فیهم فتنۃ الشبهات والشهوات
ولم تزل هاتان الطائفتان تزیدان شیئاً
فشیئاً حتی استحکمت مکیدۃ الشیطان
واطاعه اکثر الخلق فمنهم من فی طاعته
فی فتنۃ الشبهات ومنهم من دخل فی
فتنۃ الشهوات، ومنهم من جمع بینهما

صفحہ ۲۷ و ۵ "کشف الکربہ فی وصف حال اہل الغربۃ"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا تو حالت
یہی تھی اور اہل اسلام اپنے دین پر انتہائی مضبوطی
اور سلامت روی سے عمل رہے تھے اور ان میں یکجہتی
اور ایک دوسرے سے تعاون کا جذبہ کارفرما تھا، ان
کی یہ حالت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ تک
برقرار رہی، اس کے بعد شیطان نے مسلمانوں میں بہت
اندازیاں شروع کر دیں اور ان کے اندر شبہات و
شہوات کے فتنے پھیلا دیئے، یہ دونوں گروہ برابر
بڑھتے ہی رہے، یہاں تک کہ شیطان کی فریب کاریاں
پوری طرح مستحکم ہو گئیں اور اکثر لوگ اس کے مطیع و فرمانبردار
بن گئے، کچھ لوگوں نے شبہات میں پڑ کر اس کی پیروی
کی اور کچھ لوگ شہوات کے فتنے میں داخل ہو گئے اور کچھ
لوگوں نے ان دونوں طرح کے فتنوں کو خوش آمدید کہا۔

مولانا مودودی نے بہرحال اس سے زیادہ سخت نہیں لکھا ہے مگر بہرحال اگر ضرورت ہو تو اس میں ترمیم کر دیجئے۔

جواب:۔

فتووں کی وبا پھوٹ پڑنے سے تشویش کا پیش آنا ایک بالکل فدرتی بات ہے، کیونکہ یقینی طور سے بہت سے ناواقف حال لوگ اس وبا سے متاثر ہو سکتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہمارے کام میں طرح طرح کی رکاوٹیں بھی پیش آسکتی ہیں۔ لیکن یہ بات موجب اطمینان ہے کہ جہاں تک پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگوں کا تعلق ہے ان پر ان فتووں کا اگر کچھ اثر پڑا ہے تو وہ یہ ہے کہ ان کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہو گئی ہیں یا کم از کم وہ ہماری باتیں سننے اور لٹریچر پڑھنے کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے جو چاہے ہم سے اختلاف ہی کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن وہ موجودہ نازک حالات میں اس طرح کی ہنگامہ آرائی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لیے وہ اپنے جذبات کی حد تک اس معاملہ میں ہمارے ساتھ ہیں۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جو مقامات اس وبا سے کم و بیش متاثر ہوتے تھے

وہ رفتہ رفتہ اعتدال پر آ رہے ہیں۔ البتہ غالباً صرف ایک مقام یعنی سہارن پور اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ ہمارے علم کے مطابق وہاں اب بھی مخالفت جاری ہے بلکہ کچھ اور شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ مدرسہ کے لوگ مولانا قدوسی صاحب کو مدرسہ سے الگ کر دینے کے بعد بھی ابھی مطمئن نہیں ہوئے ہیں بلکہ اب اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ مولانا اور جماعت اسلامی کے دوسرے رفقاء وہاں رہ نہ سکیں بلکہ اپنی "گنہ گیوں" کو لے کر کسی اور مقام پر منتقل ہو جائیں ——

مدرسہ سے کچھ مزید طلبہ کا اخراج ہوا ہے اور قدوسی صاحب کے علاوہ ایک دوسرے استاذ کو بھی جو مظاہر العلوم کے زیر اثر ایک مدرسہ میں مدرس تھے، جماعت کی ہمدردی کے جرم میں نکال دیا گیا ہے اور ایک تیسرے رفیق مولانا...... صاحب کو نکالنے کے لیے ان کے مدرسہ کے منتظمین پر زور ڈالا جا رہا ہے۔ غرض وہاں ابھی مخالفت زوروں پر ہے لیکن اس پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے کیونکہ اس سرزمین کو اس فتنہ کے اصل منبع ہونے کا شرف حاصل ہے اس لیے قدرتی طور پر یہاں اس کے اثرات زیادہ اور دیرپا ہونے ہی چاہئیں۔

رامپور کے ضمن میں آپ کو جو اطلاعات ملی ہیں وہ ایک حد تک صحیح ہیں لیکن ان کا تعلق فتووں سے نہیں ہے۔ رامپور کو اگرچہ غالباً یہاں جماعت کا مرکز ہونے کی وجہ سے خاص توجہ کا مستحق گردانا گیا تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ مخالفین کی کوششیں ان سے زیادہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو رہی ہیں۔ البتہ بعض دوسرے اسباب کے تحت یہاں کی کچھ دنیوی جاہ و اقتدار رکھنے والی ہستیاں ہمارے خلاف خفیہ ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں اور اس کی وجہ سے ہمارے بعض رفقاء کو کچھ خاص طرح کی پریشانیاں پیش آ رہی ہیں۔ اس سے پہلے میں نے اس ضمن میں زندگی میں جو کچھ لکھا تھا اس کا اشارہ ان ہی حضرات کی اس طرح کی ریشہ دوانیوں کی طرف تھا، لیکن اس پر آپ کو یا کسی رفیق کو زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ ان حضرات کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ان کو درحقیقت ابھی معلوم ہی نہیں ہو سکا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں اور نہ ان کو اس بات کا اندازہ ہے کہ ہم نے اس طرح کی مشکلات کا، اچھی طرح اندازہ کرنے کے بعد اس راہ میں قدم بڑھانے کا ارادہ کیا ہے اور ان کے ساتھ شاید وہ اس وقت یہ بھی محسوس نہیں کر رہے ہیں کہ اس وقت جو فصل وہ بو رہے ہیں اس کا حاصل کس شکل میں خود ان کے سامنے آئے گا۔ انشاء اللہ جب یہ باتیں ان کے علم میں آ جائیں گی تو ہم توقع رکھتے ہیں کہ ان کا ذہنیہ خود بخود بدل جائے گا۔ بہرحال آپ اور دیگر رفقاء دعا سے غفلت نہ برتیں یقیناً ہمارا اول و آخر سہارا یہی ہے۔

فتووں کے جواب کے سلسلے میں آپ نے جو خیال ظاہر فرمایا ہے میں اس سے بالکل متفق ہوں، چنانچہ میں نے اس کے مطابق رفقاء کو ہدایت بھی دے دی ہے، اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ ان لوگوں کے لیے کافی ہے جو اس معاملہ کو نیک نیتی کے ساتھ کوئی رائے قائم کرنا چاہتے ہوں، رہے وہ لوگ جو ہر حال میں مخالفت کرنے کی قسم کھا چکے ہیں ان کے لیے بڑے سے بڑا ذخیرہ بھی بے کار ہے، اس لیے رفقاء کو بالکل یکسو ہو کر اپنے کام میں لگ جانا چاہیے اس وقت خود ان فتووں کی بدولت کام کا بڑا وسیع میدان کھل گیا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مخالفین خاموش بیٹھنے والے نہیں ہیں وہ تو چاہتے ہی یہ ہیں کہ ہمیں فضول بحثوں میں الجھا دیں تاکہ ہم اپنا اصل کام نہ کر سکیں اور کچھ لوگوں

کسی کے لیے تو یہ ایک عجیب مشغلہ ہے جسے وہ اپنی لذت کی خاطر ترک نہیں کر سکتے لیکن ہمارے رفقاء کا اس میں حصہ لینا کسی طرح مناسب نہیں ہے، مخالفین کی ہر بات قابل جواب نہیں ہے اور اگر ہو گی تو وہ اس کی فکر نہ کریں، اس کا انتظام بوقت ضرورت یہاں سے انشاء اللہ ہو جائے گا۔

لٹریچر پر نظر ثانی کی بابت میں اپنا نقطۂ نظر مولانا مدنی مدظلہ کے خط میں واضح کر چکا ہوں، ممکن ہے آپ نے وہ حصہ نہ دیکھا ہو یا خط لکھتے وقت یاد نہ رہ سکا ہو، براہِ عنایت اسے دوبارہ ملاحظہ فرما لیں، میں اس کی ضرورت سے بالکل متفق ہوں اور جیسا کہ میں نے اس خط میں واضح کیا ہے یہ کام موجودہ ہنگامہ آرائی سے پہلے سے ایک خاص رفتار کے ساتھ ہو بھی رہا ہے، میرے خیال میں ہمارے مخالفین کو اس پر اطمینان ہو جانا چاہیے، بالخصوص ایسی حالت میں کہ اب تک وہ ثابت نہیں کر سکے ہیں کہ اس میں واقعی کوئی ایسا زہر بھرا ہے جو ایمان و اسلام کے لیے تباہ کن ہو۔ (اور جن حضرات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان کو اس کے لیے کس طرح انصاف و دیانت کو قربان کرنا پڑا ہے اس کا حال پچھلے رسالہ "زندگی" میں آپ دیکھ ہی چکے ہیں) اور اگر فی الواقع وہ اس رفتار کار سے مطمئن نہیں ہیں تو خود مولانا مودودی صاحب کی طرف سے اعلان ہو چکا ہے کہ یہ حضرات اگر اپنے اعتراضات سے انہیں مطلع کر سکیں تو وہ یا تو اپنی اصلاح کر لیں گے یا ان کے اعتراضات غلط فہمی پر مبنی ہوں گے تو اس کا ازالہ کر دیں گے۔ ایسی حالت میں یہ بہت آسان ہے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں وہ جلد سے جلد ہو سکے گا لیکن مجھے توقع نہیں ہے کہ وہ یہ طریقہ اختیار کرنا پسند کریں گے اور یہ بھی یاد رکھیے کہ آپ سب کچھ کر چکنے کے بعد بھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان کے اعتراضات رفع ہی ہو جائیں گے۔ ان کی شکایات کا منشا محض لٹریچر نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں اور ان سب کو رفع کرنا یقیناً ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہر حال اس معاملہ میں ہمیں ان کے رویہ سے کوئی بحث نہیں ہے۔ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ ان سے قطع نظر ہم بطور خود جن چیزوں میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت سمجھتے ہوں ان میں اصلاح کرنے میں دریغ نہ کریں۔ اور انشاء اللہ وقت پر یہ کام ہو جائے گا۔

ابن رجب کی جو عبارت آپ نے نقل کی ہے اسے اس غرض کے لیے شائع کر دینا یقیناً مفید ہو گا کہ کسی دینی مصلحت کی خاطر قرن اول کے حالات پر ناقدانہ گفتگو کرنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے اور اگر ہے تو مودودی صاحب کا جرم بہت سے بزرگوں کے مقابلہ میں پھر بھی ہلکا ہے، اس خیال سے میں اس تحریر کو رسائل و مسائل میں دے رہا ہوں لیکن اب میں اس سلسلہ کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ مجھے یہ کچھ اچھی بات معلوم نہیں ہوتی کہ ہم مودودی صاحب کی کسی عبارت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے خواہ مخواہ ایسی عبارتوں کی تشہیر کریں جن میں سلف پر کوئی تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہو اس کی اگر کوئی دینی ضرورت ہمارے لیے ہو سکتی ہے تو صرف اس حد تک کہ اس بارے میں مودودی صاحب کو بے وجہ مطعون کیا جا رہا ہے جس سے ان کی مدافعت بحیثیت مسلمان ہمارا ایک دینی فریضہ ہے لیکن یہ فرض ایک حد تک انجام دیا جا چکا ہے تو اب اس معاملہ کو زیادہ آگے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود مودودی صاحب نے بھی نظر تنقید بدرجہ مجبوری اہم دینی اغراض ہی کے لیے گوارا کی ہے اور دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ انھوں نے

س خانوادہ کو کس طرح دامن بچاتے ہوئے اور کتنی ردا. روی میں طے کیا ہے۔ اعتراض کرنا تو بہت آسان کام ہے لیکن اگر خود معترض
خود تجربہ ان واقعات پر اظہار خیال کی زحمت اٹھائیں تو اس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ مودودی صاحب ان کی داد و تحسین کے
مستحق ہیں نہ کہ اعتراض و تنقید کے۔ آپ نے زندگی میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ ایک مفتی صاحب نے اعتراض کے شوق میں ان کی مذکورہ
عبارت پر اعتراض کیا ہے لیکن ان سے زیادہ قابل اعتراض بات خود لکھ گئے ہیں اور ان ہی صاحب کا یہ قول مجھ تک پہونچا ہے
، وہ اپنے وعظ میں واقعات کربلا پر تاریخی حیثیت سے گفتگو نہیں کرنا چاہتے کیونکہ "خارجیت یا شیعیت میں سے کسی ایک کا الزام
لیے بغیر یہ کام کیا ہی نہیں جا سکتا۔" اس سے اس کام کی اہمیت و نزاکت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے ہر ایک کے
لیے اس طرح اس کام سے پہلو بچا لینا آسان بات نہیں ہے بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو یہ بھی چاہتے ہوں کہ حق و صواب
صحیح شکل میں سامنے آجائیں تاکہ مسلمان صحیح راہ اسلام پر گامزن ہو سکیں۔

شخصی وقار اور دعوتی وقار

.... دوسری بات یہ ہے کہ مخالفتوں کے جواب میں اعتدال کی ہی ضرورت ہے، مجھ سے
جو غلطی ہوئی وہ تو غلطی ہوتی ہے، لیکن ان کے جواب میں، زندگی میں جو طرز اختیار کیا گیا ہے، دوسرے پہلو سے اس
سے مجھے اصولی اختلاف ہے، اس میں اس قدر نرمی بلکہ بعض جگہ عاجزی کا اظہار ہوتا ہے کہ عاجز کو یہ اندیشہ
ہوا کہ دعوت کا وقار اس سے متاثر ہو رہا ہے۔ قریب میں ان کے ساتھ گفتگو بھی ہونے والی ہے، اس گفتگو میں
اگر اس قدر عاجزانہ طرز ہو تو یہ چیز تو دوسروں کے عجب کے لیے نشہ بن جائے گی، براہ کرم میری ذہنی الجھن کو دور
فرمایئے، ویسے جو بھی پالیسی آپ کی ہے اس کی اطاعت میں کوتاہی ارادتاً نہ کروں گا۔

جواب:-

آپ نے زندگی کے طرز تحریر کے متعلق جو شکایت کی ہے، اسے پڑھ کر مجھے تعجب ہوا، یہ بات میرے خیال میں اس
سے پہلے نہیں آئی تھی کہ اس کے بارے میں ہمارے کسی رفیق کو اس طرح کی بھی شکایت ہو سکتی ہے، چنانچہ میں نے آپ کی شکایت
کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے مقامی رفقاء کا تاثر معلوم کیا تو انھوں نے بھی اس پر تعجب ظاہر کیا، اور باہر کے رفیقوں کے جو
خطوط اس ضمن میں آئے ہیں، ان سے بھی یہ محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کے علاوہ کسی کے دل میں بھی اس طرح کی کوئی خلش
پیدا نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے انداز کو عام طور سے پسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے اور
آپ کے سوچنے کا انداز ہی کچھ بدلا ہوا ہے، اور یہی آپ کے تاثر کا اصلی باعث ہے۔
میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دوسروں کے مرتبہ و عزت کا لحاظ اور ان کے مقابلہ میں اپنی عاجزی اور فروتنی کا اظہار

کو بھی پسند ہے اور یہ نفس دعوت کے لیے بھی مفید ہے، ہر انسان میں تھوڑی بہت یہ کمزوری ضرور پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے
سمجھتا ہے، اور دوسروں کی بڑائی قبول کرنا اس کے نفس پر شاق گذرتا ہے مخصوص لوگوں کو چھوڑ کر عام لوگوں کے
میں بے موقع اپنی بڑائی کا اظہار فتنہ ثابت ہوتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں عاجزی و فروتنی خود ان کے احساس کبر کو
دیتی ہے، اس لیے یہ طریقہ میرے نزدیک بہت پسندیدہ ہے، اور خاص طور سے جب علماء سے خطاب ہو اور اس میں
سی ایسے عالم دین سے جو ایک جم غفیر کا مقتدا بھی ہو تو اس میں اس کا لحاظ از بس ضروری ہے، رہا ان کے عجب کو فتنہ
کا اندیشہ تو درحقیقت یہ اشخاص پر موقوف ہے، عربی کی مثل ہے۔ اذا انت اکرمت الکریم ملکتہٗ + وان انت اکرمت اللئیم تمردا
تنی بات تو بہر حال یقینی ہے کہ اس سے انشاء اللہ ہمیں خود کوئی نقصان نہیں پہونچ سکے گا۔

ہاں! اسی کے ساتھ میں اس بات کا بھی قائل ہوں کہ شخصی احترام ایک اور چیز ہے اور کسی شخص کے خیالات پر تنقید اس سے
ت ایک دوسری چیز، اور ایسے ہی شخصی فروتنی ایک علیحدہ چیز ہے اور دعوتی وقار علیحدہ چیز، اور ان دونوں میں ایک مناسب توافق
س طرح ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے، کسی ایک کو نظر انداز کر دینا یا دونوں میں سے کسی ایک کے پہلو کو زیادہ اہمیت دے لینا نہ اصولاً صحیح
اور نہ باعتبار اپنے عام نتائج کے مفید، اور میں نے اپنے جواب میں اسی بات کی کوشش کی ہے کہ میں اس توافق کو ٹھیک طور سے
قائم رکھ سکوں، چنانچہ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ میں نے اپنے جواب میں اپنی فروتنی کے اظہار میں دعوت کے وقار کو کہیں مجروح نہیں ہونے دیا
ہے، اور مولانا مدنی کے شخصی احترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے بھی میں نے ان کے جن خیالات کو غلط سمجھا ہے، ان پر کھل کر تنقید کیا
یہ اور بات ہے کہ آپ طرز خطاب کی جس سختی کو اب تک پسندیدہ سمجھ رہے ہیں، وہ اس میں پیدا نہ ہو سکی ہو لیکن میں اس کے لیے معذرت
ا میں تکلفاً کسی چیز کے اختیار کرنے کا قائل نہیں ہوں، اور واقعتاً تکلف سے کوئی بات پیدا بھی نہیں کی جا سکتی ہے۔

جہاں تک آئندہ گفتگو کا تعلق ہے، اگر وہ ہو سکی تو اپنی کوشش تو بہر حال یہی ہوگی کہ وہ دعوتی اعتبار سے مفید ثابت ہو، لیکن
حال مجھ سے غلطیوں کا امکان ہے، اس لیے میرے لیے دعا فرماتے رہیں۔

آخر میں ایک بات اور عرض کرنی چاہتا ہوں کہ وقار کے مسئلہ میں نفس انسان کو بڑی آسانی کے ساتھ فتنہ میں مبتلا کر دیتا
ہے، دعوتی وقار اور نفس کا پندار بسا اوقات ایک دکھائی دینے لگتے ہیں، اس لیے اس بارے میں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

لٹریچر میں تبدیلی

...........میں ایک ہمدرد جماعت ہوں، جماعت سے تھوڑا اختلاف بھی رکھتا ہوں لیکن مرکزی دعوت سے
اتفاق رکھتا ہوں، مودودی صاحب نے اپنی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے، اس میں اگر شرعی تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے تو پھر آپ کو
اس کا کیا حق ہے کہ آپ ان ساری باتوں کو ان کی کتابوں سے نکال دیں گے۔ جو...... صاحب اور...... صاحب جیسے قوم
پرست علماء کے مقام باطل کو واضح کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں، ایسا کرنے سے پہلے خوب سوچ لیجیے" (ان صاحب نے اپنے خط کے بقیہ حصہ

میں مخالفین جماعت پر بہت تیز و تند لب و لہجہ میں تبصرہ فرمایا ہے جس کے نقل کرنے کی طبیعت روادار نہیں ہوئی، اس لیے اس حصہ کو اور اس کے متعلق جواب کو جو نرمی و اعتدال برتنے کی نصائح پر مشتمل تھا، حذف کر دیا گیا)

جواب :-

آپ نے شاید کسی سنی سنائی بات پر اپنے اس شبہ کی بنیاد رکھی ہے ورنہ میں تو خود مولانا مدنی مدظلہ کے جواب میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ جن باتوں کو ہم حق سمجھتے ہیں، ان کا پیش کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے، اس لیے ہم کسی ہنگامہ سے متاثر ہو کر اسے کسی حال میں ترک کر دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی (کہہ دو مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں اپنی طرف سے اس میں تبدیلی کر دوں) الا یہ کہ واقعی ہماری کسی بات کے سلسلہ میں ہمیں دلائل سے مطمئن کر دیا جائے کہ وہ غلط ہے۔
ایسی صورت میں اس پر اصرار کے بھی کوئی معنی نہیں ہو سکتے ہم صفائی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں گے اور اس کی اصلاح میں کسی طرح تاخیر سے کام نہیں لیں گے۔

لٹریچر میں جس قسم کی تبدیلی پر ہم آمادہ ہیں اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ حق، حق نہ رہے یا باطل حق ہو جائے، حاشا جو ہم اس کا خیال بھی کر سکیں یہ تو تعبیر وہ باتیں ہوں گی جن پر قرآن مجید میں سخت ترین وعیدیں آئی ہیں، بلکہ اس کا منشا محض یہ ہے کہ لٹریچر کی وہ عبارتیں جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ خود بخود غیر ضروری ہو گئی ہیں یا نئے حالات و مسائل پر ٹھیک طور سے منطبق نہیں ہو رہی ہیں یا محض زور کلام کا نتیجہ ہیں اور ان کا کوئی براہ راست تعلق ہماری کسی بنیادی بات سے نہیں ہے اور بے وجہ وہ ہمارے کام میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہیں، ان میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں یا ضرورت ہو تو ان کو سرے سے حذف کر دیا جائے، اور میرے نزدیک اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے بلکہ یہ مختلف وجوہ سے بے انتہا ضروری ہے، ہم کو اصل دلچسپی اپنے مقصد سے ہونی چاہیے اور لٹریچر ہمارے لیے محض ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی خاطر مقصد کا کوئی معمولی نقصان بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا، اور میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس ضرورت کا احساس کچھ اسی وقت ہمارے اندر نہیں پیدا ہوا ہے بلکہ ایک عرصہ سے میں اس کی ضرورت محسوس کرتا ہوں، چنانچہ [illegible] میں ہی میں نے اس کے سلسلہ میں تحریک شروع کی تھی، لیکن اس کے بعد ہی ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں نئے حالات و مسائل اور نئی نئی مصروفیتیں سامنے آتی رہیں، اس لیے یہ تحریک آگے نہیں بڑھ سکی۔

بہر حال اس ضرورت کا ہم از خود ایک عرصہ سے احساس رکھتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ خود مولانا مودودی صاحب کو بھی اس سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا ہے بلکہ میں آپ کے علم میں لے آنا چاہتا ہوں کہ ہم نے جماعت کی تشکیل جدید کے وقت ان سے بحیثیت مصنف ان کی کتابوں میں بعض جزوی ترمیمات کی اجازت چاہی تھی تو انھوں نے بخوشی اس کی اجازت دے دی تھی جس کے مطابق ہم نے نئی طبع شدہ کتابوں میں جزوی تبدیلیاں کر دی ہیں لیکن ظاہر بات ہے کہ سر دست اس اجازت سے آگے ہمیں ان کی تصنیفات میں کسی قسم کی ترمیم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اس لیے جو لوگ ان کی تصنیفات میں رد و بدل کے خواہاں ہیں انھیں خود آگے بڑھ کر اس سلسلہ میں خط و کتابت کرنی چاہیے جس کی انھوں نے حالیہ

خود دعوت بھی دی ہو اور بصورت اطمینان تبدیلی پر آمادگی کا بھی اظہار کیا ہو۔ ہم اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ جو کر سکتے ہیں وہ محض یہ ہے کہ اگر ہمیں خود ان اعتراضات پر اطمینان ہو جائے تو اپنے طور سے ان کی اشاعت کا ذریعہ نہ بنیں۔

ایک نیا فتنہ

.... تازہ ترجمان القرآن میں دار الکفر اور دار الاسلام کے سلسلے میں جو سوال و جواب شائع ہوا ہے وہ ہر طرف پھیل رہا ہے اور اس سے غلط فہمی کا ایک نیا دروازہ کھل رہا ہے۔ میں نے خود جواب پڑھا ہے اور میری تشفی اس سے نہ ہو سکی، مولانا مودودی صاحب نے ایسے اہم مسئلے کو اتنے اختصار کے ساتھ کیوں درج کیا یہ سمجھ میں نہیں آتا، اس سوال کا پوری وضاحت سے جواب دینا تھا، آپ کی طرف سے اس مسئلہ کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

جواب :-

شرعی حیثیت سے یہ مسئلہ واقعی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس پر بہت غور و خوض کے بعد کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے، جن لوگوں نے بے سوچے سمجھے اس پر بحث و گفتگو شروع کر دی ہے وہ شاید اس مسئلہ کی پوری اہمیت ہی سے واقف نہیں ہیں بہتر یہ ہے کہ خود مولانا مودودی صاحب کو توجہ دلائی جائے کہ وہ اس مسئلہ پر دوبارہ تفصیلی روشنی ڈالیں، اپنے اس جواب میں انھوں نے کسی وجہ سے بہت اختصار سے کام لیا ہے لیکن عام طور سے ان کی یہ عادت نہیں ہے کہ وہ ضروری تحقیق کے بغیر کسی مسئلہ پر اظہار خیال کر دیا کریں، ہو سکتا ہے وہ خود جو وضاحت کریں گے اس سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا، ورنہ ان کے دلائل سامنے آجانے کے بعد ان کے جواب پر گفتگو کی جا سکتی ہے، میں خود ابھی تک ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہو سکا ہوں، بلکہ اس وقت تک اپنی معلومات کے مطابق اس کے خلاف ہی رجحان رکھتا ہوں لیکن مسئلہ کی صحیح صورت کیا ہے؟ اس کی ضروری تحقیق کے لیے مجھے ابھی فرصت نہیں مل سکی ہے، انشاءاللہ فرصت میسر آنے پر میں اس پر اپنا کچھ وقت ضرور صرف کروں گا، اور یوں بھی ابھی اس بارے میں ہمیں توقف سے کام لینے کی ضرورت ہے، جو لوگ اس مسئلہ پر اظہار خیال کرنے کا ہم سے زیادہ حق رکھتے ہیں، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ان کو خود ہمارے بہت سے مخالفین نے اظہار رائے کی دعوت دی ہے ایسی حالت میں ان کی رایوں کا انتظار کر لینا زیادہ مناسب ہوگا، ویسے آپ خود صاحب علم ہیں اور غالباً تحقیق کے لیے وقت بھی نکال سکتے ہیں اس لیے آپ اپنے طور سے خود تحقیق کریں تو یہ اچھا ہی ہوگا۔

جو لوگ مودودی صاحب کے ذاتی خیالات و آراء کو جماعت کی مخالفت کا ذریعہ بنایا کرتے ہیں ان کی فکر چھوڑ ہی دینی چاہیے جب بار بار کی تصریحات کے بعد بھی کہ جماعت کی دعوت ایک الگ چیز ہے اور مودودی صاحب کے جزئی فقہی خیالات الگ، وہ ان کے فقہی خیالات ہی کو جماعت کی مخالفت کے لیے استعمال کیا کرتے ہیں تو ان کے پیچھے کہاں تک ہم اور آپ اپنا وقت ضائع کریں گے۔

مولانا مدنی سے خط و کتابت کا تتمہ

مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ نے میرے مفصل عریضہ (جو گذشتہ زندگی میں شائع ہو چکا ہے) کے جواب میں جو مکتوب گرامی تحریر فرمایا تھا، اس کا ذکر پچھلے ماہ کے اشارات میں ضمناً آ چکا ہے، اس وقت چونکہ مراسلت کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے اس خط کا شائع کرنا مناسب خیال نہیں کیا گیا تھا، لیکن ایک طرف وہ تاریخیں بھی گذر گئیں جن کو مولانا نے ملاقات کے لیے تجویز فرمایا تھا، اور باوجود یاددہانی کے اب تک اس کے سلسلہ میں مولانا نے کچھ تحریر نہیں فرمایا، جس کا بظاہر مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ مولانا نے غالباً اجتماع و ملاقات کا ارادہ ترک فرما دیا ہے، اور دوسری طرف الجمعیۃ مورخہ ۴ر اگست میں مولانا اور بعض دوسرے علماء جمعیۃ کی طرف سے ایک بیان شائع ہوا ہے، جس میں جماعت اسلامی کے خلاف تقریباً اسی طرح کے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں جو اس سے پہلے فتووں میں ظاہر کیے جا چکے ہیں، اور اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اب قطعی طور پر ایک رائے قائم کر لی ہے جس کے بعد بظاہر کسی مزید گفتگو اور ملاقات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے، اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دوران میں میرے اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے درمیان جو مزید خط و کتابت ہوئی تھی وہ بھی شائع کر دی جائے، تاکہ جو لوگ اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہیں یا جنھوں نے پچھلی خط و کتابت کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کے انجام سے بھی آگاہ ہو سکیں۔

خط و کتابت پڑھنے سے پہلے مذکورہ بالا بیان پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

"مودودی تحریک اور جماعت اسلامی کی موجودہ حیثیت" علماء کرام کی طرف سے لاتعلقی کا اظہار" کے دو عنوانات کے تحت لکھا گیا ہے:۔

"تحریک مودودی اور اسلامی جماعت کے سلسلہ میں کچھ دنوں سے فتاویٰ کا سلسلہ جاری ہے متعدد اداروں کی طرف سے بیانات بھی جاری ہو چکے ہیں، اس کے متعلق غور و بحث کے لیے علماء کرام کا آج ایک اجتماع ۲۸ر شوال ۷۰ھ یکم اگست ۱۹۵۱ء کو دفتر جمعیۃ علماء ہند دہلی میں ہوا، اس اجتماع میں شرکت فرمانے والے حضرات نے ایک متفقہ بیان بغرض اشاعت دیا ہے جس پر ان سب حضرات کے دستخط ہیں، بیان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"مودودی صاحب کی جماعت اور جماعت اسلامی کے لٹریچر سے عام لوگوں پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں کہ ائمہ ہدایت کے اتباع سے آزادی اور بے تعلقی پیدا ہو جاتی ہے جو عوام کے لیے مہلک اور گمراہی کا باعث ہے اور دین سے صحیح وابستگی قائم رکھنے کے لیے صحابہ کرام اور اسلاف عظام سے جو تعلق رہنا چاہیے اس میں کمی آ جاتی ہے، نیز مودودی صاحب کی بہت سی تحقیقات جو غلط ہیں لوگ ان سے متاثر ہو کر مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر ان امور سے ایک جدید فقہ بلکہ دین ہی کی ایک محدث اور نئے رنگ کی بنیاد پڑ جاتی ہے، جو یقیناً مسلمانوں کے دین کے لیے مضر ہے، اس لیے ہم ان امور اور ان پر مشتمل تحریک کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے ہیں اور اس سے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔"

دستخط حضرات شرکاء اجتماع:۔ (مولانا مفتی) محمد کفایت اللہ، مولانا سید حسین احمد (مدنی) مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا عبداللطیف (مہتمم مظاہر العلوم سہارن پور) مولانا محمد زکریا کاندھلوی (شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارن پور) مولانا احمد سعید، مولانا سعید احمد (مفتی مظاہر العلوم سہارن پور) مولانا محمد اعزاز علی امروہوی (شیخ الادب دارالعلوم دیوبند) مولانا سید فخر الحسن (استاذ دارالعلوم دیوبند) مولانا حبیب الرحمٰن لودھیانوی، مولانا محمد میاں،

اس بیان پر یہاں ہم کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں سمجھتے جماعت اسلامی کے خلاف جو الزامات عائد کیے گئے ہیں ان کا تفصیلی جواب زندگی میں شائع

کیا جا چکا ہے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی بات ان حضرات کے نزدیک قابل اعتراض باقی رہ جاتی ہو تو جیسا کہ اس خط و کتابت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ہم برطور لکھنے اور ہم پر ہماری کوئی غلطی واضح کردی جائے تو اس کی اصلاح کے لیے ہم ہر وقت آمادہ ہیں لیکن ظاہر ہے اس کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے کہ اپنے طور سے محض بدگمانی کی بنا پر ایک رائے قایم کر لی گئی ہے اور اس سلسلہ میں اقتباسات تزکیہ کرنے کے سوا نہ پہلے کسی تحقیق کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور نہ اب عرض معروض سننے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ جو تاریخیں ملاقات و گفتگو کے لیے متعین فرمائی گئی تھیں ان ہی تاریخوں میں اس طرح کا بیان ملاقات سے پہلے یا اس کے بغیر شائع کر دیا گیا ہے ——

خدا جانے یہ حضرات کیا چاہتے ہیں اور ان کے اندر اپنی ذمہ داریوں کا کچھ احساس ہے بھی یا نہیں؟ "ابو اللیث"

حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب کا مکتوب گرامی

محترم المقام زید مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج شریف۔ جناب کا نہایت طویل اور مفصل والا نامہ اوائل شعبان میں باعث سرافرازی ہوا تھا مگر وہ زمانہ اس قدر عدیم الفرصتی کا تھا کہ اس کا سرسری طور پر پڑھنا بھی کئی دن میں ہو سکا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں باوجود خواہش طبعی جناب کی رسید بھی مطلع نہ کر سکا حالانکہ اس کے مطالبہ میں ایک کارڈ بھی آپ کے دفتر سے موصول ہوا تھا۔ محترما میری مصروفیتیں، ضعیف العمری، بیماریاں طبعی کاہلی وغیرہ ایسے اسباب مجتمع ہو گئے ہیں (اور بالخصوص رجب شعبان رمضان میں) جن کے ہوتے ہوئے میں نہایت اشد ضروری اعمال میں بھی سخت ناکارہ ثابت ہوتا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجودیکہ ۵ شعبان سے دارالعلوم میں تعطیل ہو جاتی ہے میں ۲۰ شعبان کی شب میں مستفید ہو سکا۔ اس لیے معافی کا خواستگار ہوں۔ والا نامہ کے بڑے حصے میں اپنی مایوسیوں کو دور نہیں کر سکا البتہ آخری حصے سے کچھ امیدیں پیدا ہوتی ہیں اس لیے اگر ممکن ہو تو اواخر شوال یا ذیقعدہ میں دہلی دفتر جمعیۃ میں کوئی خصوصی اجتماع کی صورت ہو سکے تو شاید بہتر ہو۔ عریضہ سابقہ جو میں نے پیش کیا تھا اس کے متعلق جناب کو اختیار ہے شائع کرا دیں مجھ کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ وارد حال قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد محلہ الہداد پور، ۵ رمضان المبارک

جواب:- رام پور۔ ۱۱ رمضان المبارک محترمی السلام علیکم۔ گرامی نامہ مورخہ ۵ رمضان المبارک کل ۱۰ رمضان کو موصول ہوا، یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آنجناب اس مسئلہ پر خصوصی ملاقات و گفتگو کی ضرورت محسوس فرما رہے ہیں، اس کے بارے میں میری رائے اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایسا ضرور ہونا چاہیے، میں تو اول دن سے اس کا خواہش مند ہوں اور گذشتہ چند دنوں میں جو کچھ ہوا ہے اس کے پیش نظر میرا یہ احساس اب اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اگر آنجناب نے پہلے ہی اس پر آمادگی ظاہر فرمائی ہوتی تو یہ ہمارے اور آپ دونوں کے لیے اور ساتھ ہی عام مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ بہتر ہوا ہوتا۔ بہرحال اب بھی کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا ہے، اس لیے اس کی راہ آپ پیدا کر سکیں تو یہ بہت اچھی بات ہو گی۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اس ملاقات کو کس مجبوری یا مصلحت کی بنا پر آپ اتنا موخر فرمانا چاہتے ہیں، میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اواخر شوال یا اوائل ذوقعدہ کے بجائے اگر اوائل شوال ہی میں اس کی صورت نکل سکے تو یہ زیادہ بہتر ہو گا الا یہ کہ کوئی بڑی مجبوری درپیش ہو، زیادہ تاخیر کا ایک کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ جماعت کے خلاف اب تک جو کچھ کہا یا لکھا جا چکا ہے اسے اس دوران میں ہمارے مخالفین زیادہ وسعت کے ساتھ پھیلا دیں گے جس سے بہرحال جماعت کے خلاف بدگمانیاں بڑھیں گی اور پھر ہمیں بھی مدافعت کے لیے کچھ نہ کچھ عرض ہی کرنا پڑے گا، اور اس طرح جو باتیں نہیں ہونی چاہئیں وہ اس دوران میں ہو قائم رہیں گی اور ہو سکتا ہے کہ اس سلسلہ کی کچھ باتیں خواہ مخواستہ ہماری اور آنجناب کی گفتگو پر بھی اثر انداز ہو جائیں ہاں اگر یہ ممکن ہو کہ کم از کم ملاقات کے وقت تک کے لیے مخالفت کا سلسلہ رک جائے اور آپکا اس سلسلہ میں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس کے متعلق یہ واضح کر دیا جائے کہ لوگ اس کے بارے میں ابھی کوئی آخری رائے قائم کرنے میں جلدی نہ کریں کیونکہ معاملہ زیر تحقیق ہے تو تاخیر میرے نزدیک چنداں